

خوبصورت کسانوں کا مجموعہ

سنسنی ڈائجسٹ

ماہنامہ

مارچ 2014

نگرانِ اعلیٰ

معراجِ رسول

خود کی لائبریری اپنے اولاد کے سینئر
ممبر کا نام ہری پور ہزارہ (جلد سولہ)
ممبر: میمنہ بیگم طاہرہ محمود



پس زنداں

طاہرہ جاوید گل کے سوس خیر اور خیر انگریز قلم سے
ایک طویل کہانی ----- اندرونی فضیلت پر

ماؤنڈ سسٹم اور جلد سلائی کی سہولت موبو ہے
مٹے اور پرانے ڈا بجٹوں کی خرید و فروخت کی جاتی ہے
دکان نمبر 133 صدر بازار ہری پور



168

قارئین

محفل شعر سخن

آپ کے ہاتھوں بھی ایک انجمن رنگ رنگ
آپ کی پسند آپ کے ذوق سے ہم آہنگ

171

منظر امام

نئی الفیلہ

پرانی تصویر میں نئے رنگوں کا عجیب استرجاع.....
مصنف کی عہد حاضر پر گہری نظر

180

محی الدین نواب

ماروی

ایک چوکئی روپ، کبھی چھاؤں کبھی دھوپ، محبت کی
عنایتوں، رفاقتوں اور رقابتوں کا ایک دل باسلسلہ

227

شیاتسنیم بلگرامی

شہنشاہ

پیدائش انسان کے مسز کو
پانے والے دیوں میں سے ایک انتخاب

223

سلیم انور

جوان

اعداد و شمار سے زندگی کے لمحات
حیرانے والے ایک عقلمند کا قصہ

246

اسما قادری

بہول

سازش اور قضا، شول کے درمیان شتوں اور رتوں
کے انتخاب کی کشش میں مبتلا ایک موی بیک کا منظر اب

241

نصر عباس

انصاف

اپنے ہاتھوں اپنا ہی خون بہانے
والے ایک منصف کا انتقام

000

ارارہ

کترین

دنیا بھر سے ادھر ادھر سے لطیفے، چٹکے
انتخابات، سکرپٹس اور مقدمات کچھ آپ کے لیے



پبلشر پروپرائٹرز: نیشنل رسالہ، مقام اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیڈل ایکس نیشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

انسانیت

7

جون ایلیا

جب الفاظ بے معنی ٹھہریں اور کلام بے اثر ہو
جائے تو کس ہی لازوال شہرِ رستم ہوئی ہے

آپ کی نظر

8

مدیر اعلیٰ

سپنس کی مجلس مشاورت وقت سارین کی تلو
شیریں باتیں گلے شکوے اور چرخوں مشورے

آخری بادشاہ

16

ایچ اقبال

ماضی کا آئینہ - انتخاب اور بے اختیار
انسانوں کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات

پس نمل

82

طاہر جاوید مغل

دیباغی میں اپنوں سے دور کی اپنے کی تلاش میں گرداں
محبوب کی گرم فرمایاں اور قیوں کی عنایتوں کی داستان

وقت کا دھارا

132

مرزا امجد بیگ

آسان اقباط پر مشکلات کو دعوت
دینے والے وعود کا کھپا چٹھا



اصل کھیل

67

کاشف زبیر

طاقتور لوگوں کے درمیان دریافت
اور ایجابِ داست کی لرزہ خیز روداد

غلطی

119

تنویر ریاض

لباس کے مانند شیر کی سفر
بلنے والے شعبہ باز کی مستقل مزاجی

چارہ گر

161

عبدالقیوم شاد

ایک بے نیل و سرام کی فریب
نظر کا دلچسپ تماش

جلد 44 • شماره 03 مارچ 2014 • زمر سالانہ 700 روپے • قیمت فی پرچہ پاکستان 60 روپے •
E-mail: jdpgroup@hotmail.com (021) 35802551 نیکس (021) 35895313 • فون: 74200 • کراچی 215 سٹیکس نمبر 215
خط کتابت کا پتہ: وسٹیکس نمبر 215 کراچی 74200

ایسی اینڈ فرینک پوائنٹ
ڈاکٹر سیم اور صدا ساز کی بہت موجود ہے
میں اور پرانے ڈاکٹر سیم کی بہت کی پوائنٹ ہے
دکان نمبر 13 صدر بازار ہری پور

انشائیہ

جون ایلیا

”بے معنی“

تم دیکھ رہے ہو کہ انسانوں نے انسانیت کی طرف سے کس طرح آنکھیں پھیر لی ہیں۔ محبت ہماری بہتوں میں کس طرح نایاب ہو گئی ہے۔ ہر طرف نفرت کا دور دورہ ہے۔ نفرت کے جو مناظر ہم نے اپنے دور میں دیکھے ہیں، انہوں نے انسانیت کی نگاہیں بچھی کر دی ہیں۔ سیاست نے کیا کیا؟ زندگی کے خلاف فقط سازشیں کیں۔ اس کا ثمرہ یہ ہے کہ زندگی حرام ہو کر رہ گئی ہے۔ غرض مند علم نے کیا فرض انجام دیا؟ جہل کے حوصلے بڑھائے۔ اس کا فیضان یہ ہے کہ لوگ بدی کے نئے نئے گریکھ گئے ہیں۔

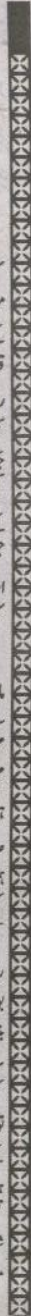
ہمارے مذہبے تدبیری میں طاق اور مشاق ہیں۔ سن لو! وہ ایسی باتیں کر رہے ہیں جو غریبوں، سادہ لوحوں اور مظلوموں کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ کا دشمن بنا دیں۔ یہ لسانی، علاقائی اور مذہبی تفرقہ کیوں پیدا کیا جا رہا ہے؟ اس لیے کہ مظلوم اور محروم آپس میں ٹکرا جائیں اور ظالم اور غاصب تماشا دیکھیں۔ یہی ان کا مذہب ہے اور یہی ان کی حکمت۔ سب سے زیادہ دکھ کی بات یہ ہے کہ ہمارے پڑھے لکھے لوگ تعصب کے سب سے بڑے وکیل ہیں۔ اگر یہ لوگ فریب کار نہیں ہیں تو یقیناً فریب خوردہ ہیں۔ یہ ایک دردناک حقیقت ہے کہ اس ملک میں جتنی نفرتیں پھیلائی ہیں، وہ پڑھے لکھے لوگوں ہی نے پھیلائی ہیں۔ یہاں پڑھا لکھا ہونا اور تعصب ہونا، دونوں کا ایک ہی مطلب ہے۔ علم نے جہل کو جس گرم جوشی کے ساتھ اپنے سینے سے لگا رکھا ہے، وہ ہمارے زمانے کا ایک طرفہ ماجرا ہے۔

تم ان لوگوں سے بات کرو جو پڑھے لکھے نہیں ہیں۔ اگر انہیں بری طرح بہکان دیا گیا ہو تو پھر تم دیکھو گے کہ نہ ان میں زبان کا تعصب ہے اور نہ علاقے کا۔ اگر انہیں کسی پر غصہ آئے گا یا کسی وجہ سے نفرت کریں گے تو وہ اپنے غصے اور نفرت کے حق میں کوئی فلسفہ نہیں گھڑیں گے۔ ان کی نفرت اس شخص کی ذات سے آگے نہیں بڑھے گی جس سے انہیں کوئی اذیت پہنچی ہو مگر یہ پڑھے لکھے لوگ اپنی نفرت اور غصے کو ایک منطق اور فلسفہ بنا کر پیش کرتے ہیں۔ یہ لوگ مسلمانہ کلیے بناتے ہیں اور گروہوں کے درمیان مستقل فتنے پھیلاتے ہیں۔ ہمیں ان لوگوں کی زبان سے اس قسم کے مقولے سننے کو ملتے ہیں کہ ہر فلاں قسمی ہوتا ہے..... فلاں شر پسند ہوتا ہے۔ اس قسم کے بے رحمانہ کلیے صرف چند مثالوں کو سامنے رکھ کر بڑی شامی اور نہایت بے حس اور بے شرمی کے ساتھ لاکھوں اور کروڑوں انسانوں پر قہو پ دے جاتے ہیں۔

آج کل ان ”نیکمانہ کلیوں“ اور ”دائش مندانہ مقولوں“ کی سماعتوں کے بازاروں میں بڑی مانگ ہے۔ لوگ یہ کلیے اور مقولے جتنے کے طور پر ایک دوسرے کی سماعت کو پیش کرتے ہیں۔ زہر ہے کہ پھیل رہا ہے، نفرتیں ہیں کہ بڑھ رہی ہیں۔ عقل دیوانی ہو گئی ہے اور دماغ ماؤف اور دائش بے دائش کے چپوڑے پر بیٹھی ہوئی ہوئی کواں کر رہی ہے۔ سمجھا جائے کہ ہم تاریخ کے جس دور سے گزر رہے ہیں، وہاں خود غرض اور مطلبی طبقے اس قسم کے شوشے اٹھایا کرتے ہیں اس طرح کے اسٹیلے چھوڑا کرتے ہیں ورنہ تم خود سوچو کہ زبانوں، تہذیبوں اور علاقوں کے درمیان بھلا کیا جھگڑا ہے۔ آخر اس بات کے کیا معنی ہیں کہ میں فلاں گروہ سے اس لیے نفرت کرنے لگوں کہ وہ ایک خاص زبان بولتا ہے اور ایک خاص گروہ پیش سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کے ہر گروہ کو اپنے گروہ کے سوا ہر گروہ کا دشمن ہونا چاہیے۔ یہ کتنی مجنونانہ بات ہے اور کتنی بے معنی ہے سنو کہ ہمیں اس بات کو اور ایسی ہی باتوں کو سختی سے رد کرنا ہے

.....





✽ محمد جاوید، تحصیل کی پورے محفل میں شریک ہوئے ہیں۔ بانی 16 مارچ سالہ چلتی ہوئی گئی ہے زرق برق 16 ستمبر پر 16 ستمبر محفل کے مایلوٹ حسن شناس کے 16 مارچ پر چھٹی ہے کہ کسی کی لگ رہی ہوں۔ ہم نے بھی ان کے کمال فیاضی کہہ دیا، بھنگ لگ رہی ہو۔ گلستان ادب سے پہلے جانے ستاروں کی بزم سنس کلب میں انہی دیتے ہیں۔ محترم ویلٹن جیسے خرافات تو انہیں مٹانے ان کے اہم اچھے تو ہمارا ہر انہی جوتوں جاتوں کا دل سے (دیری گز) خیم صاحب کا کابیت ناما اس لائق تھا کہ ان پر جانے کی طرح ان کا دیا جائے۔ لٹرائٹ سے ہو گئے ہیں پڑھ کر قسم سے خوشی سے آؤ گئے۔ کیوٹ بی بی شہلا گل ہے مرادت آپ 99 قصبہ جیسے حد و حساب پسند آیا۔ سید اکبر شاہ بادلون رشید کے سرخ زرخشاں پر برادرانہ پیار کرنے کے بعد ادراس احمد خان ہم مکافات کے انجام سے مطمئن نہیں ہیں۔ ہماری شیریں سرائیکی میں ہر زبان خاص و عام پر حق مشہور ہے کہ ماں ماری تو ہے ہمارے نہیں دینی۔ نیازی صاحب آپ کی بات بجا مگر اظہار رائے اور بے کار رائے میں بھی فرق کو سن کرنا چاہیے۔ میرے ہم نام میرے شہر کے باقی محمد جاوید شیریں آپ کا قلم میرے لیے ہمیشہ گونا گونا کیوں رہتا ہے؟ قیصر گوجا کو میرے بارے میں سوتے ہوئے پایا ظاہر ہے مگر جو تپا ہے وہ دھوکتا ہے۔ قیصر گوجا صاحب ایسے ہی سوتے رہو گئے ہمیشہ کھوتے ہی رہو گئے۔ عالم سنانہ پانچویں مہر میں بہا بھی خاتون ہیں ادب میں تیری تیری میری تیری کی کوئی کہ بعد میں مہر میں کی جنت کی کھٹ تو کی ہی سمجھیں مہر میں صلیب مرگ آپ کے..... وہ..... کی ن ترانیاں پڑھیں تو مجھ کو چھوٹا چھوٹا۔ بشری افضل آپ ایک اور ایک ایک بارہ کے چکر میں پڑی رہیں اور حق کی خاتون نے سعید بخاری کو سعید ہی چارے بنا کر رکھ دیا۔ شمس سلطان جس کھٹ کی کوئی ملی ہو اس کھٹ میں ہم نے چلائے ہیں۔ جج ہم نے بیاہے پانی ہم نے دیا ہے تو اپنے پوٹے کو تنہ سے میں ان کے بھجھاؤں؟ زو یا اعجاز آپ بے خوف قیصر گوجا کے پوچھ گئے ہیں کئے سوال کا جواب فرض نہیں غنا ایک ان پڑھ نمبر سے ایسے ہی بے کئے سوال کی امید کی جاسکتی ہے۔ بارہ عباس کیا کالی زبان پانی ہے آپ نے ادرہ کیا اور ادرہ کنگول ختم گلستان ادب سے سب سے پہلے علی الدین نواب کی ماری کا ملاحظہ کیا۔ حسن بذات خود مکت کا بہت بڑا ذوق ہے ایک اناروسو بیارن کی مورت مادی مراد یا بیچو یہ معلوم نہیں کس کس کے من کی مرادین کر من کے گل کی ملکہ بنتی ہے کنگول لاسٹ اکی موڈ میں اندروں لڑائی میں حامد نے اپنا فیصلہ خود کر کے ثابت کر دیا۔ ڈان ڈان سے بانی تو سب ڈاؤن ہیں۔ فقر عجیب پریس اور ذات قاترہ رنڈا ڈاؤن ایس بی نے دہرے گل کے کس کو کھن 72 کنگول میں چنگیلوں میں گل کے رنڈا ڈاؤن قاترہ عقدہ کے تمام کردار اپنی بی جگہ پر قصور وار تھے۔ ڈاکٹر شہناز امیر پڑھ کر انہوں کے سامنے انجیرا سچا کیا جان انسان ہوتے ہیں وہاں جوشیطان مغت میں ہوتے ہیں۔ دارغ کجوتہ کے اول و آخر یک ہڈوں پر مسکراتے کے ستارے کو توں کر رہے۔ دوسرے دوسرے دوسرے نے قلب کو توں کر دیا۔ اللہ جاننا فیہا تسبیح بکلی کی لہ کو کجوتہ کے پھولوں سے کلمے ہیں اللہ جاننا فرد ختمے جوئے ہے۔ کوئی مانے ڈانے ڈانے محفل شاعر میں ہیں ان کی تخیل اپنا شعری شیر لگا۔ تاریخ کا حجر و جہت اثر ہے اقتدار کی آخری شمشیر وحشی میں ڈوبے بارشاہ کی تاملی کے باعث جھگی۔ ایسی شمشیر جس کی روشنی سے خلق خدا مفرد و نہ بوجھ جانا ہی بہتر ہے کاف زہر کے ترے کمال و ماحل ہوتے ہیں تندرست صحت کے بعد آزادی بہت بڑی نعمت ہے۔ چند غالب حکمرانوں کے

✽ اور جا رہا جیل، ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا سے حاضر ہوئے ہیں ”سب سے پہلے تو معراج صاحب عمران اعلیٰ سسٹمز ڈائجسٹ سے ہنگامی کاغذات کے ذریعہ انہوں نے جیل کے ڈائجسٹ میں میرا تذکرہ شائع نہ کیا۔“ (غنا کو کیلے گا..... پہلے یہ بتاؤ) جنوری 2014ء کا شمار 7 جنوری کو سیشن عدالت سے والد سے وصول کیا اس کے بعد جنرل اعلیٰ کا اشتہار پڑھا، وہ اپنا ایمر پتہ قائم ہے۔ اور اسی امید کے سہارے انسان اہل ہند سے ہر ایک کو سخر کرتا ہے۔ خطوط کی منتقلی میں ایک کینٹ آف بلڈ ہے کہ کچی کچی صمدات پر برا بھلا نہیں لیں۔ سامانی جی حاضر یا آف سامانی جیل میری رب سے دعا ہے کہ خدا کی ذات آپ کو اس خاندان سے رہائی دلاوے۔ سب سے پہلے کوکھڑی شادی کی بیوی گل بی بی کا یاد آ رہا ہے یا کہ اس کے شادی کی بوند ہوئے ہوئے تھیں تو کی کیا۔ سیدہ سہو بی D.I.G سے شادی کر کے چپا کا ٹیوٹ دیا۔ رادیو کہانی کے خالق، ادارے کے پرانے ٹیکن کاردار مصطفیٰ الدین نواب کی اہلیہ کے انتقال کا دلیری رنج و افسوس۔ اندھا انہیں جنت میں جگہ ہے۔ رادیو کی کہانی پڑھی۔ محبوب چاٹو بی رادیو پر اسائن کی بارش کے چار پارے اور رادیو کی حفاظت کی خاطر رحمت جلالی پر کوئی کوئی اور دوسری طرف معروف محفلِ محبوب چاٹو بی کے کاردار کو بچانے اور رادیو اور محبوب کو کھانے کے لیے چائیں کیا سو سے پیشابے۔ محفلِ شعروں جن ہادون شاعر اور اکثر نامہ نگار کے اشعار اچھے لگے۔ باقی رسالہ زیر مطالعہ ہے کیونکہ میں قسط وار کہانیاں زیادہ پڑھتا ہوں۔“

بھائی گل مروت، بہن، نازاں آئی کوئے موسم کا چھل اچھا لگتا ہے۔ کھٹا ہونے کا دوا بلا جاتی ہے۔ رکھا جاتی ہے۔ قدرت اللہ بھائی، مسجد پر بناواں شاک پر عین ہونے کے ساتھ ساتھ بے غری پر عین بھی ہیں۔ مستان بھائی، مندر والی داسی کی کوئی خبر؟ نازاں آئی، آپ کو بھی تو چاہیے میں بیٹ اوارے کے لئے نواز اچھا لگتا ہے۔ آقا زینت کبھی آخری شخص ہے کیا۔ خاندان غلاماں کے واقعات سے بھر پور استفادہ کیا۔ کاشف ذہیر کی پیش طرح ایک بہترین کہانی چھکارا کی صورت میں لے کر آئے۔ اندرونی صفات پر مغل صاحب کی شاندار کہانی، جس کا ابھی آغاز ہے۔ آپ کے مغل کا مغل صاحب اپنی سائیت کبائوں کی طرح جس زعماء کی صورت میں بھی قارئین کو اپنا گرویدہ بنائیں گے۔ گلاؤں ڈسے میں دکن کی ہوشیاری اپنی جگہ شہرہ رہو بڑا ریڈ کو بھانسا نڈسے سکا۔ گواہی ہے تپا چلا کہ ہریر کا سوا سر ضرور ہوتا ہے عقدہ کی صورت میں ملک صاحب نے ایک اور کارنامہ اپنے کھاتے میں ڈالا۔ جاری میں قلب کالا را کے بارے میں کیا کیا فیصلہ اچھا لگتا ہے ڈاکٹر شیر شاہ اپنی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے اندراج کی صورت میں ایک نئی حقیقت لے کر آئے۔ نواب صاحب کی باروی بھی اسی بار قارئین کو ہوتا ہوا ہنسنا پائی گرفت میں لیتی جاتی ہے۔ خود فروش میں وی ایمان افروز واقعات سے آگاہی ملی۔ ڈاکٹر یعنی صاحب کی آخری کہانی چال بیٹ رسی حجت تو قربانی مانگتی ہے اور جہاں تکیر نے محبت کا حق ادا کر دیا۔ محفل شعر و سخن اور محفل جگہ کی پسند آئے۔

حوری علی مروت اینڈ محفل نورنگ سے تبصرہ کر رہے ہیں۔ جنوری کے سسٹن نے میں پہلی پرواز کرنے کے لیے خط لکھنے پر مجبور کیا تھا۔ مگر فروری کے رسالے میں تپا چلا کہ ہمارے برکات کریمیں بلک لٹ کے پھر دیا گیا ہے۔ ہاویں ہونے بغیر دوسری پرواز کر رہے ہیں۔ فروری کا شمارہ کافی لیٹ ملا۔ سرورق پر مسکرائی لڑی بہت اچھی لگی۔ چونکہ مشاعروں سے میں کوئی بچی نہیں اس لیے انٹائی مشاعرہ میں شاعروں کو نواز دیا، مے میں چل پڑے اپنی محفل کی جانب۔ ڈاکٹر کیم اکبر کے نماز کو کہتے تھے پھر بھی اشعار کا سیلاب بہا ہماروں کے بیٹ بکھر پھار مارا۔ بد۔ بہت ہی پیاری گل مروت بائی، نازاں آئی کو پچھو اچھا اور درد، ہائے کی سریف تھی ہے۔ اکبر شاہ بھائی دو بیٹوں کے آگے ایک ساتھ ہیں مت بجاؤ۔ عروہ آئی، تیراں نہ ہوں، بلکہ کیت سے ہمایوں کے تبصرے کو پسند کیا ہے تو عروہ آئی، ہر کوئی اپنی باروی کے لوگوں کو پسند کرتا ہے۔ اعجاز بھائی بھی شہر بے قدران کے گمن گاتے نظر آئے۔ کانج کی بے پناہ معرفت کے باوجود ہم نے مشکل سے وقت نکال کر تبصرہ لکھا ہے۔ (مگر کبائوں پر تبصرہ کہاں ہے بھی)

قمری قمری، کبود راولپنڈی سے تشریف لائے ہیں۔ ”طویل عرصے کے بعد باآ خر محفل میں شریک ہونے کا میں چاہا اور سوچا کہ ان تمام دوستوں کا گھر بھی ختم کروں جو کافی عرصے سے مجھے محفل میں دایں باارہے ہیں۔ فروری کا سسٹن 22 جنوری کو موصول ہوا۔ سرورق کی خار نما حینس گزارے لائے تھے میں مگر ان کے زیورات کافی Latest قسم کے لگے۔ اشتہار اور انٹائی کو نظر انداز کرتے ہوئے محفل میں پہنچے جہاں ڈاکٹر نعیم اکبر صاحب نمازوں کی قیت بڑھنے پر دھڑکا دینے تھے۔ گل مروت بھی اب اونچا اڑنے لگی ہیں آگے دیکھتے ہوتا ہے کیا۔ سید اکبر شاہ اوگی آپ کا بار جاس کو دیا گیا مشورہ بہت پسند آیا۔ ہارون شیدا آپ کا ظاہر بھرا کو کوئی کہنے والی بات پر بہت پیارا آیا۔ ایرادارث بھائی آپ کے خواب تو واقعی کمال کے ہوتے ہیں، اب آپ دفعہ سسٹن کی کرسی صدارت کا خواب دیکھ لیتا۔ میں سلطان! آرام سے بابا! اتنی اونچی چھلانگیں مت لگاؤ، پچھل جاؤ گے۔ سیدی الدین اشتقاق! انگنوں جیسی رفتار قرار کبائی آئے تو بھی آپ کو سلسلہ اگر گردا جیسی سلو ٹیو والی کہانی آئے تو بھی آپ کو اعتراض! کوئی محفل میں ایک عالم با بھی تشریف لے آئے۔ عالم بابا آپ کہتے ہیں ہیں؟ اس کا اندازہ مجھے مہینہ ناز کے محفل آپ کے شہری خیالات پڑھ کر ہوا۔ ذرا اعجاز اس رسالے کو کم معیار اور بد وقت کوئی نہیں خریدتے ہو۔ آپ بے فکر رہیں۔ کبائوں میں ہم ایک بھاک جس زعماء سے آقا زینت زعماء سے متعلق یہی کہوں گا کہ یہ کہانی کم اور نیچر زیادہ ہے، مصنف کہانی سے زیادہ خبر میں اپنے تجربات کا ظاہر جاوید مغل صاحب! آپ کا بہت بہت شہر۔ باروی کے متعلق یہی کہوں گا کہ یہ کہانی کم اور نیچر زیادہ ہے، مصنف کہانی سے زیادہ خبر میں اپنے تجربات کا تجربہ شامل کر دیتے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالرب بھی کی چال ایک سیدی خاندانی مسائل اور جوانی کی غلط راہوں پر چلنے کے خباثت سے پرہیز کی، کہانی ابھی تھی مگر جہاں تکیر کا آخری خدا اسرہ کر گیا۔ آخری شخص واقعی ایک تاریخی اور بے مثال کہانی تھی۔ بادشاہ قیتاوند نے اپنے باپ کا کھانا ناٹا اور ہوں و شہر میں پڑ کر زلی موت سے دوچار ہوا۔

مہرین ناز، حیدرآباد سے چلی آئی ہیں۔ ”ماہ فروری کا خوش نما دودید زیب شاہ اس بار 18 تاریخ کو ملا۔ سرورق پر نظر پڑی تو ہر طرف لوبان کی خوشبو نے ہمارا احاطہ کر لیا۔ حینس پر دو نوازوں سے محفل ملا دینے جانے کے لیے تیار ہے۔ انٹائی میں جن ایلیا صاحب نے میں ایک سنے قسم کے مشاعرے سے روشناس کر لیا۔ ادارہ میں ایڈیٹر صاحب نے ملکی حالات پر نظر ڈالتے ہوئے میں 14 فروری ویلنٹائن ڈے کے متعلق ہماری معلومات میں اضافہ کیا۔ اب چلتے ہیں اپنی محفل کی جانب جہاں اتنی خفہ کے باد جوڈ کا گرما کر رہے ہیں۔ صدارت اس بار مٹاڑوں کو، سرورق ڈاکٹر نعیم اکبر صاحب کو، مبارکباد۔ ہمارے چند تبصرہ نگار اپنے بچوں اور لڑکیوں کے پلوں میں چھپ کر آ رہے ہیں کیا بات ہے، گل باو پچھتری اپنی ہی اچھی ہوتی ہے، دوسروں کی چھتری میں تپا ہونے کی وہی انجام ہوگا۔ اکبر شاہ آپ کی بات سے متاثر کیا کہ آپ دوسروں کی خوبیں پر نظر رکھتے ہیں۔ ہارون رشید بھائی محمد قدرت اللہ بھائی آپ کے تہمرد کا اندازہ دلچپ ہے۔ صوبہ آئی ہم جگہ نظر لوگوں کو منہ پر نہیں لگاتے۔ سر کا مٹی صاحب جس زعماء پڑھتے وقت آنسو نہیں آتے چاہے۔ کبائوں میں سب سے پہلے ایلیا سینا پوری کی آخری شخص پر مٹی، قیتاوند بادشاہ شاہ و خویاں نہیں جس جویک کا سیلاب مگر ان میں ہوتی ہیں، وہ ہے امیر و دی سازشوں کا دکھار ہوگی۔ امیر الدین نواب کی باروی بہت اہمیت اختیار کر گئی، محبوب چاچو یوسف سابق باروی کی خوشنودی میں لگا ہوا ہے۔ اب دیکھا ہے کہ باروی کو کھانا ہونے سے کون بچاتا ہے۔ ظاہر جاوید مغل صاحب کی پس زعماء کے لیے انہی کہوں کی جس کا تھا انتقاد وہ شاہ کا لگیا۔ اس اسٹوری میں منظر نگاری اتنی خوب ہے کہ قاری اپنے آپ کو اس ماحول میں محسوس کرتا ہے۔ ہادی اور علیا کے کردار سامنے آئے۔ مختصر کبائوں میں محمد خویہ صاحب کی جہنم بہت پسند آئی۔ اکرام الدین کو جو ساتھ پیش آیا وہ تاحیات انسانی

دل و دماغ میں جہنم بن جاتا ہے۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید ہمیشہ حساس موضوع لے کر آتے ہیں۔ اندراج میں حقیقت بیان کی گئی، احمد جودوروں کی جان و حرمت بچانے گیا۔ ان کے مگر کی عزت انہوں کے ہاتھوں یا مال ہوئی۔ چال میں ڈاکٹر عبدالرب بھی کا سیلاب رہے۔ صنف و مشیرہ کی محبت، میرال کا قلعین صادم کا دکھار اور جہانگیر کا ایثار، غلط چلنے والے مگر جی جاتے ہیں، ملک مفدر حیات کی عقدہ، آجی آموز اسٹوری جس طرح حسد انسان کے سب سے بڑے مگر انسان نہیں سدھرتا۔ بائی کبائیاں پڑ پڑا طالع ہیں۔

علی ڈاکٹر، ساہیوال سے تشریف لارہے ہیں۔ ”فروری 2014 کا خوبصورت شمارہ انھوں کے سامنے ہے۔ بائیل اس دفعہ گزارے لائے۔ جن ایلیا صاحب کا انٹائی یہ وہی آپ کا ادارہ پر ہمیشہ کوئی سامنے لاتا ہے۔ صدارت اس دفعہ ڈاکٹر نعیم کے حصے میں آئی جو مٹاڑ سے ہونے پر خوشی سے مجلس بجا رہے تھے۔ اپنے بھائی راسیدا اکبر کا خدو دے گیا۔ ایرادارث صاحب کا مہینہ ناز آپ کے آپ کو کچھ کہا ہے جو اتنی فینشن لے رہے ہو۔ آپ کا تبصرہ اچھا تھا۔ لار قیصر اقبال لکھا ہے۔ آپ کے قلم کا زور ختم ہو گیا ہے۔ عالم سائیں مستان صاحب کا انداز بیان دل کو بھا گیا۔ اپنے بھائی اعجاز احمد راسل عرف چکا ڈوگر کا تبصرہ ہمیشہ کے مانند پیارا لگا۔ مہینہ ناز آپ کے ذوقی محفلے اور دل کو وہ لینے والے انداز خرمیے بہت اچھے لگتے ہیں۔ سب سے پہلے آخری شخص پر مٹی۔ یہ سچ ہے کہ اس دنیا میں کوئی بھی کسی کا ساتھ نہیں دیتا قیتاوند بادشاہ بھی انہوں کی سازشوں کا دکھار ہو گیا۔ امیر الدین نواب کی باروی نواب انگن کی تیسری قسط انھیں کا دکھار دی۔ نواب صاحب سے ریکوٹ ہے کہ باروی کو اس کے اصل ٹریک پر لایا جائے۔ مغل اعظم جناب ظاہر جاوید مغل صاحب نفور دایں زعماء دل خوش کر گئی۔ کہانی کی افغان اچھی ہے۔ ڈاکٹر عبدالرب بھی کی چال بقی آموز خرمیے رعایت ہوئی۔ انسان کو ہمیشہ اپنی خواہشیں اختیار میں رکھنی چاہئیں۔ ڈاکٹر شیر شاہ سیدی امیرا نصیحت آموز تھی۔ یہ سچ ہے کہ انسان ہمیشہ انہوں کی قلم و قلم کا دکھار ہوتا ہے۔ ملک مفدر حیات کی عقدہ حد و عرض کی آگ انسان کو ہمیشہ جلا دیتی ہے کہ تہ نہیں اور اشعار A-one ہیں۔

بشری افضل، بہاولپور سے تشریف لائی ہیں۔ ”20 جنوری کو سسٹن ملا۔ صنف نازک بائیل پر جگہ سے برہمان ہے اس کی مگر اہم نے کتوں کے دل کو موہ لیے ہوں گے۔ انٹائی میں جن ایلیا صاحب کا مشاعرہ پڑھا اچھا لگتا۔ اپنی محفل میں پہنچے تو انگن کی باتیں دل کو لگیں۔ مبادلت افادوں کی کرسی پر برہمان تھے۔ سنے لوگوں کو قفل میں خوش آیا۔ ڈاکٹر نعیم اکبر کی صدارت مبارک ہو۔ ڈاکٹر صاحب بڑیوں کے بھاؤ ناز کے نظر آئے۔ محمد قدرت اللہ نازی دراصل انگن انصاف کرتے ہیں کہ کسی کی دل آزاری نہ ہو۔ سب کو ایک ہی جگہ اکٹھا کر دیا۔ بلکہ کیت آپ بھی تو سکون سے بیٹھ جائیں۔ چوت تو نہیں گئی بلکہ کیت آپ تو اپنے اصل نام سے شروع کر دیں لکھنا اعلیٰ سائیں مستان آپ نے یہ کیا کام شروع کر رکھا ہے۔ امیرا شرعی پاکستان کے پس منظر میں کسی طرح بدل کو بھائی مال قیت میں خاصا سسٹن تھا۔ نام پر مشکل سے لکھا ہی رہا مگر آخر میں ڈاکٹر کے بغیر اس مشکل سے لکھنا نامکن تھا خود وہ فروشی دل مطومات میں خاصا خدا تھا۔ ایمان افروز واقعات سے دل معمور ہو جاتا ہے۔ گلاؤں ڈسے میں دکن کی ہوشیاری دکھائی کیتے ہیں تاکہ بے کی ماں تک بک خیر مٹانے کی مٹھن مشرقی پاکستان کے پس منظر میں کسی گئی کہ مگر بھائی خود کو پولیس کے حوالے کر دیتا تو ہم مگر غیر کے ہوا جتے نہ دیتا۔ پس زعماء میں ہادی نے پورے وطن کی سرکرا دی، علیا کے سربراہ۔ صادم نے چال تو چلی مگر اپنی ہی چال میں پھنس گیا۔ حیدر رضا پر آفرین ہے کہ اپنی غلطی کا ازالہ کرنے کے لیے کھل بیٹھا جرم کر بیٹھا۔

شوکت شہر یار، اوکاڑہ سے محفل میں شامل ہوئے ہیں۔ ”اس دفعہ 15 تاریخ کوئی سسٹن مل گیا اور میں اپنے سسٹن کا شکر گزار ہوں جس کی وجہ سے قیصر اقبال اور اعجاز احمد راسل جیسے خوبصورت اور پر غلوں دوستوں کی دوستی نصیب ہوئی۔ اس دفعہ کرسی صدارت پر ڈاکٹر نعیم اکبر نمازوں کا رونا دور ہے تھے جناب ڈاکٹر صاحب اگر آپ نماز کی قیت سے اتنے ہی تک ہیں تو بائیل میں دسی ڈال لیا کریں۔ گل مروت اور صوبہ اقبال نے مہینہ ناز کی خوب کھچائی کی۔ اب دیکھیں مہینہ ناز کیا جواب دیتی ہیں۔ ہارون رشید صاحب نے بخاری حالت میں خط لکھا اور خوب شہید صیب صاحب آپ اپنی سالگرہ کے دن (19 دسمبر) کے ساتھ 1960 لکھنا بھول گئی ہیں شاید۔ مہینہ ناز فرام حیدرآباد آپ کے خط پر صرف اتنا تبصرہ کروں گا کہ کوئی سید اکبر شاہ صاحب جناب ذرا تبصرہ ہوا رکھیں، سزا ایڈس مزید جاس تو محفل کی جان ہیں۔ سب سے پہلے ایلیا سینا پوری کی آخری شخص پر مٹی میں بادشاہ قیتاوند ایک اور بادشاہ شاہ و خویاں کی یاد دلادی۔ جس ملک کا شاہی ادب ایسا ہوگا اس ملک کے خاک تر کی کرنی ہے اس کا انجام اچھا ہوگا کاشف ذہیر کی چھکارا کچھ خاص لگتی۔ پس زعماء کی پہلی قسط بہت مزہ دیا۔ اگر کہ تم خود بھی مٹھن کی سر کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ یہ کہانی ظاہر صاحب کی شاہکار کبائوں میں ایک نیا اضافہ ہوگی۔ گلاؤں ڈسے ڈیک ڈیک کی واردات پر مشتمل ایک انوکھی تحریر تھی۔ کوئی لکھا ڈن ڈن ڈن پر پور اور دکھنا ہو چکا ہو گیا ملک مفدر حیات کی عقدہ اچھی تحریر تھی۔ جاری میں قلب نے اپنی منہ بولی بہن لال بہن کا بھانجے کے لیے اچھا جو کھانا اب پولیس اگر حسن کی بہن کے قاتل تک پہنچ جاتی ہے تو یہ را کی اپنی قیت مٹھن الدین نواب صاحب کی تحریر باروی آہستہ آہستہ مڑ پکڑتی جاتی ہے اور باروی کے خلاف سازشوں کا حال بنا جا رہا ہے۔ اب دیکھتے ہیں کہ محبوب چاچو باروی کو دشمنوں سے بچاتا ہے یا نہیں۔ انوکھی سرائیں چڑھتی ہے اپنی بیٹی کی قاتل کو واقعی انوکھی سزا دی ہے۔ دیگر کبائوں میں جہنم، گواہی، امیرا، مال قیت، بے دماغ منصوبہ اچھی کبائیاں تھیں۔ آخری صفحت پر مشتمل کہانی چال میں صنف سلطان نے اپنے شوہر مبارک احمد کو تمام حقیقت کا کچھ اچھا کیا اور مبارک احمد جیسے عظیم انسان اس دنیا میں ہی ملے ہیں۔ محفل شعر و سخن میں اعجاز احمد راسل دراصل ہوا بی، مہینہ ناز قدرت اللہ نازی کے اشعار اچھے لگے۔ کتر میں اس دفعہ سب کی سب شاندار ہیں۔ آخر میں سسٹن کو ایک شاندار شہر پیش کرنے پر مبارکباد۔

حسین احمد چٹانے، الگڈی کرک سے تبصرہ کر رہے ہیں۔ ”فروری کا شمارہ 21 جنوری کو ملا۔ مسلسل بلک لٹ ہونے کے بعد ایک مگر جہ

پھر کھڑا ہوا ہے کہ شاید اہل کوہ پر غریب پر دم آجائے۔ 20 مارچ کو میری سالگرہ ہے (مبارک ہو) ماضی پر پیشی چل دیکھ کر ڈر کے مارے کھل میں پھنس گئے۔ پھر آٹھ گھنٹے بند کر کے سونے پھاڑ دیا کہ ایسا نہ ہو دوبارہ ڈر کے مارے بے ہوش ہو جائیں۔ جون اٹھایا کا مشاعرہ پڑھا اور پھر خطوط میں جھانک کر دیکھا، ڈاکٹر نعیم اکبر صدارت کر رہے تھے۔ مبارکبادیں بھی، ڈاکٹر صاحب نے بڑی خوبصورتی سے شاعرانہ پیرایہ کیا اچھا لگا۔ گل مروت جتنوں میں دوستوں کو تکسم سے بلاتی ہے بلیک کیٹ کے لیے استعمال کیا ہوا لفظ (تورہ پیٹو) پڑھ کر فحشی لگن گئی۔ ویسے آپ کی عمر تھی بے ٹینک ہر دوست کے نام کے ساتھ ہانسی یا بھائی جان کا لٹکے قلمب میں ڈال دیتا ہے۔ ابراہم وارث پر اور اور تو میں میں کیا سیکھ لی کہ سید سے صنف ناک پر وار کر گئے۔ زویا انجاری کی دلی خواہش بھی پوری ہو گئی، طاہرہ یوسفہ افضل میں سے سلسلے داروں کے ساتھ حاضر ہیں اس مرتبہ بلیک کیٹ پڑھنا زیادہ عقیدہ ہوئی۔ کہانوں میں سب سے پہلے جبین پڑھ کر آنکھیں نم ہو گئیں۔ ڈاکٹر صاحب نے بڑے خوب صورت انداز میں کھلی حالت کو اجاگر کر دیا۔ احمدی بہن بیوی کی طرح پاکستان میں روزانہ سیکڑوں لڑکیوں کو پال لیا جاتا ہے۔ کیا اس لیے قاتلہ قسم نے پاکستان بنایا تھا۔ پڑے کھٹے لوگوں کے باوجود بھی ہم چاہنا زندگی گزار رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی حفظ و امان میں رکھیں آمین۔“

بلیک کیٹ، کراچی کی ایک ماہ کی غیر حاضری کے بعد، کامیابی سے سرشار نعرہ مستانہ بلند کرتی حواں و حار حاضری۔ ”ماہروری کے حسین ماضی کی اہلیں غزل ملی تھیں، نہ تین نہ جانے کتنے صنف کثرت کے بھونٹوں کے دلوں پر تیر چلائی 17 کی خوشگوار شام میرے کل ہاتھوں کی زینت تھی۔ ادارے میں آپ کی کچی اہل باتوں سے مکمل اتفاق کرتی ہوں۔ صدارت کے تحت پر فائز بھوت برادری کے خوب صورت نام کے ہمراہ کچھ جراح اور دھماکہ پھر تھیں کثرت کے اول قرار پائے۔ مبارکباد۔ ابراہم وارث، اکبر شاہ، احمدی، مٹی محمد عزیز، سید گلشن حسین کاظمی آپ سب کو بلیک کیٹ کا سلام پڑھوں ڈیڑھ بیٹری افضل اور زویا انجاری خوشگوار صنف کے میدان میں ڈٹی رہا، عظیم ہمارا خاتون مہرین ناز صلیب آپ نے منظر سلیم کو بھیٹ دے دے دل خوش کر دیا۔ ویلڈن۔ سحر بی بخاری آپ کے نام سے ہی صنف کثرت کو بخار چاڑھا جاتا ہے۔ اپنی نٹ کھٹ کی تصویر اچھن درشن تو کرادو۔ قدرت نیازی نے ماہا ایمان کے رنگ پر کتنے چولے سے تھیر جاس کو بلا آخر پڑھ کر کھٹ کے مکمل کاغذ ہاڑے ہوئے کا بھوت پیش کر دیا۔ کثر نہیں بھی خوب رہیں۔ اشعار سے مجھے بالکل دھچکی نہیں ہوا اشعار کے تھیرے سے حضرت۔ چال عبدالرب بھٹائی کی شاعرانہ کثرت، لفظ لفظ سطر سطر اپنے حشر میں جکڑے چال دل پران مٹ فٹوش چھوڑی، میرال خوش قسمت کی رسی اور بد قسمت بھی جگہ جگہ کی محبت کو سوسلاہ، ڈاکٹر بھٹی کو اتنی پیاری کہانی لکھنے کی مبارکباد۔ کاشف زہیر کی چھٹکارا سمجھ سے بالآخر کہانی اوسلا درجے کی کوشش رہی۔ اسلامی صفحات سسٹن کو چار چاند لگا دیتے ہیں جس میں خاتمہ بنگلہ کی کھٹور ہوں جو بنگلہ کی صاحبہ میں اویلائے کرام کی سوانح حیات پیش کرتی رہتی ہیں۔“

مٹی محمد عزیز سنے، لڑن خلق ہاڑی سے محفل میں شرکت کر رہے ہیں ”اب جبکہ میں باقاعدہ طور پر سسٹن کا سالانہ خریداری میں چکا ہوں اور پھر گزشتہ دو ماہ میں شائع ہونے والے دوستوں کے خطوط سے یہ پتا چل چکا ہے کہ کونسا سسٹن ڈائجسٹ 18 سے میں تاریخ تک مارکٹ میں آجاتا ہے۔ سرورق والی حینہ کو ویلڈن ڈے کے حوالے سے بھتیجا محبوب نے نقد دیا ہے جسے پا کر وہ خوشی سے پھولے نہیں ساری اور فائز کر رہی ہے کہ دیکھو محبوب ہوتو ایسا کہانوں کی فہرست کے پاس بھی حینہ نہیں پھول ہاتھ میں لیے سرکاری ہیں۔ بھتیجا یہ بھی ویلڈن ڈے سے منانے کی تیار ہیں، کوئی نہیں بھی بتلائے کہ ہم ”بڑے لوگ“ کیسے مانیں ویلڈن ڈے؟ کیونکہ ہمارے لیے تو سارا سال ہی ویلڈن ڈے ہے۔ ساریا وحت کو بھلا قید کیا جاسکے۔ عجیب ہی سلسلہ چل نکلا ہے۔ عجیب و غریب ”Days“۔ منانے کا آپ کے خط میں سب سے پہلے اپنا خط تلاش کیا۔ مگر شکر آخری لحاظ میں بھی آپ نے شائع تو کر دیا۔ ڈاکٹر نعیم اکبر صاحب ایک ماہ کے لیے کرسی صدارت پر بیٹھے کی مبارکباد قبول فرمائیے۔ ویسے کس کس چیز کا رونا روئیں گے آپ اور ہر لوگ۔ شہینہ حبیب جی! آپ کو کتابتیسوں سالگرہ مبارک ہو۔ شوکت شریار کا ڈاکوئی! آپ کی تیز رفتاری نے گزارشات یاد دلایا، جب ہم بھی لائین کی روشنی میں سسٹن ایک ہی رات میں شائع کر دیا کرتے تھے۔ ابراہم وارث جی! بڑے خوش نصیب ہیں آپ کو فرائی اپنے خواب کی تعبیر پائی ہے مبارکباد۔ مہرین ناز جی! کمال ہے جی! بزرگوں سے اتنی بے پروائی اور بے اعتنائی؟ اسے بھٹی! بزرگوں کے دم سے ہی تو یہ وقت سلامت ہے سسٹن کی۔ بشری افضل جی! آپ کے خط میں دو پہلے والی ہی خوشی نظر نہیں آتی کھٹل شروکت میں حسین عباس، طاہرہ یوسفہ، مبین سلطان، موبائی اور احسان عمر کا انتخاب پسند آیا۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی اندر پڑھ کر دل تڑپ کر گیا۔ ملک صفدر حیات نے بالآخر عقدہ کھول ہی لیا۔ انتہائی کافی ہے۔“

زویا انجاری تخت شادی، لاہور سے حاضر ہوئی ہیں ”باادب بلا حلقہ ہوشیار تخت شادی لاہور سے ہم تہرہ لیے سسٹن کی محفل میں حاضر ہیں امید ہے اب چرخوں میں روشنی نہ رہے گی۔ صدارت کو دو سب کے باعث سسٹن ڈائجسٹ کی پرواز تخت شادی میں قدر سے تاخیر سے ایک آف ہوئی۔ محفل صاحب اس بار دردم اور دیش کی سرگودھا نظر آئے۔ سحر نگاری کا تھوڑا سا گویا ان پر ختم ہے آبی گزرتا ہوں چرخ اور پارس کا خود کو کھڑے محسوس کرتے رہے انتہائی شاعرانہ آغاز ہے، چنانچہ اگلی طباعت کیسے ہر کراہیں گے اس کے بعد ڈاکٹر عبدالرب بھٹی نے اپنی چال میں لانا چاہا ابتدا میں تو ہم ان کی چال میں بھٹس کئے مگر اینڈ کے صفحات نے دوسرا طلسم توڑ ڈالا۔ چھانچہ کر دار بدست پسند آیا تا بہ اختتام پڑھ کر مایوسی ہوئی اسی مایوسی کے عالم میں باری سے بے چارہ دینے۔ ساری قسط میں اس کی ذات کو لے کر جو رسائی اور کھینچائی جاری رہی اس نے انتہائی کوفت زدہ کی بھی ماری نہ ہو گئی تیز تکلف ہو گئی۔ بھلا ہو ملک صفدر حیات کا جنہوں نے اس مایوسی کو فٹ کا کافی حد تک ازالہ کر دیا جو ان اولاد کے والدین اگر احتیاط و دانش مندی کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیں تو آگ اور پھیل کر کالا پت کی آشیانے خاستہ کر دیتا ہے۔ آخری طبع میں محمد ری تاریخ میں جتنے بھی حکمران اپنی اخلاقی کج رویوں کے باعث ذلت و رسوائی کی محسوس گھرائیوں میں دھنسے ہیں آج ہم انفرادی طور پر ان الاشاعت کا شکار ہیں، مختصر کہانوں میں چھٹکارا بدست بھی انسانی کجی بھلاؤ فحشی آزادی میں پوشیدہ ہے۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی اندر پڑھ کر دل کو خون کٹی جا رہی ہے ہماری تاریخ کا تاریک ترین دور ہے۔ جبین جیسے ان گنت اے ہمارے ماضی کی یادداشت میں شامل ہیں اور پاک سرزمین کی خون سے کی

مٹی آجاری کا احساس ولایت ہیں۔ جواری کے اختتام نے کافی چھٹکارا ہوا، ارمال تقیست قدر سے اور تین تھیں۔ بے داغ منصوبہ بندی پر اینڈ میں جو داغ لگا اس نے کافی محفوظ کیا۔ خود غرض وہ بھی محسوس نہ رہی۔ اب کچھ کر دیا جائے اپنی محفل کا جہاں نیازی صاحبہ کی خرافت ساس کی طرح جلی کی ستارے کو آزادی رائے کچھ پیٹھے ہیں۔ کمال کرتے ہو باغ سے جی۔ قیصر اقبال کو پتا نہیں کہ ہم ادوار کا حصول جس جس ادارے سے ممکن ہے وہاں داخلے کی عمر سے نہ صرف وہ تہاؤ کر چکے ہیں بلکہ داخلے کے دیگر لوازمات کی بھی کر رکھے ہیں۔ اپنی محفل میں اس بار اپنی کھٹا مٹی نظر آئی۔ سراسر ملات میں طالب حسین کا انتخاب بہت مثبت تھا جبکہ بڑی عمر کے سراسر ملات نے کافی مٹی تار دیا۔ اشعار میں ذوق انظار اور دھماکہ کرم کا انتخاب عمدہ تھا۔“

سید گلشن حسین کاظمی، اسلام آباد سے تقریر لائے ہیں ”اس دفعہ دارا ساجی دل نہیں تھا کہ تبصرہ لکھوں مگر سوچا اہتمام جت کے طور پر آپ سے الوداعی گفت و شنید کر لیا جائے۔ کیونکہ جہاں سے لے کر اب تک میں نے تین تہرے سراسر ملات کیے جن میں سے دو کوششیں کے کچھ صفحات پر جگہ ملی اور وہ بھی اس لحاظ سے کہ مجھے اپنا تبصرہ دیکھ کر ایک تبصرہ بھی خوش محسوس نہیں ہوئی۔ میرا تبصرہ زیادہ باریک بینی سے شاید پڑھا جاتا ہے۔ میرا یہ خط تو شائع ہونے سے رہا اس لیے کہانوں پر تبصرہ کرنے کا فائدہ نہیں۔ بس صرف آپ کو احساس دلانا تھا کہ شاید اور کسی کی نظر میں میرے الفاظ کی کوئی قدر نہ ہو مگر اپنی نظر میں میرے الفاظ کی بہت قدر ہے۔ یہ صرف ایک مستقبل کے خاموش قاری کا چھوٹا سا احتجاج تھا۔“ ”یہ تو شاید زیادتی کر رہے ہیں۔ بھتیجا آپ کو کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے۔ بہر حال سسٹن آپ کا اپنا پرچہ اور اینڈ کے ساتھ ایسا سلوک۔“ ”تین کیا کہتے ہیں؟“

طاہرہ یوسفہ، سرگودھا سے چلی آ رہی ہیں ”جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ میں اس وقت سے سسٹن سے پیار کرتی ہوں جب پتا چلی کہ یہ رسالہ ہوتا ہے کہ اس ماسوں کو پڑھنے کی بجائے خوش پیدا ہوئے آج اس مقام پر ہوں کہ رسالہ نہ پڑھوں تو مجھے اپنی ذات اجودری لگتی ہے۔ میں بہت عمر سے بعد محفل میں کھڑی ہوں اس کی بدصورت اور صرف مادی کی زبردست استری ہے جو کتنی پسند آتی کہ پڑا کام چھوڑ کر لکھ پڑھنا ویلڈن نواب افضل۔ عمران بلوچ کی وفات کا سن کر دل بہت اداس ہوا خدا ان کو جنت میں جگہ دے۔ آمین۔ پس زندان ہمارے غور لکھاری طاہر محفل صاحب کی تحریر بہت عمدہ اچھی ابتدا ہے۔ ہماری طرف سے طاہر صاحب کو شکریہ محفل کے اشعار بھی کچھ پسند آئے اور تاریخی کہانیاں پڑھ کر بہت متحرک آتا ہے۔ ملک صفدر حیات اور مرزا امجد بیک کی آج تک کوئی ایسی تحریر نہیں چھوڑی نہ آئی ہو۔ اپنی شاعرانہ بھی پڑھا ہے۔“

سید اکبر شاہ، اوکی ماہیو سے محفل میں شریک ہیں ”سسٹن کا ساتھ ہمیشہ رہے، یہ دعا ہمارے دل کی گہرائیوں سے نکلتی ہے۔ اس بار شمارہ اکس تاریخ کو لاہور میں سرورق میں قسطوں کی صورت تھی۔ محفل میں پہنچے ہم شہر ڈاکٹر نعیم کو اول پایا۔ آپ کی نو دو گیارہ پسند آتی۔ گل مروت کا تبصرہ اچھا تھا۔ تیسرے نمبر پر اپنا تبصرہ دیکھ کر خوشی سے تین کے تیرا ہو گئے۔ گلشن کاظمی ہمیشہ کی طرح ڈاکٹر نعیم کے لیے شریک محفل تھے۔ بلیک لسٹ (کالی فہرست) میں بڑے بڑے نام دیکھ کر دھواں آتا ہے ہیں کہانوں کی طرف۔ محفل اعظم کے شرابا گلم مانا تھوچے سے لگی ہیں زندان کا مطالعہ کیا۔ حدود و حدود سے تیرا زما تہات اور پراسرار حینہ (علیہ) کی داستان بہت زبردست تھی۔ ہادی بھی خوب دھنسی ہے اپنا کردار ہمارا نواب صاحب نے باروی کے ذریعے قارئین کو باروی کا عجیب بنایا۔ ملک صاحب کی عقدہ بھی اچھی تھی۔ اپنی چیزیت کا اختتام دوسرا نون کا کل کر کے لیتا ماضی کی حدود کو پار کرنے والی بات ہے۔ سمجھ رہیں کہ بے داغ منصوبہ اچھی رہی۔ پوزی کی خوش فہمیاں ہی اسے لے دوں۔ اندر پڑھ کر دل دھکی ہو گیا۔ اشعار میں کی طرح عمدہ تھے۔“

احمد خان تو حیدری، اسمٹل ٹاؤن کراچی سے تہرہ کر رہے ہیں ”سسٹن 16 جنوری کی شام آ گیا تھا، انتہائی جوں اطمینان، مشاعرہ دو عظیم شاعروں کا مقابلہ قتل و قمارت روزمرہ کا معمول بن چکا ہے۔ مجھے مانے ذہن کو تفریح فراہم کرنے والے عظیم ڈراما گرامر غفر سید مجھے بے ضرر انسان کو بھی گولیاں مار دیں۔ رہی بات شاعری و شریک حاکمات تو پیٹ و جھوڑی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ ڈاکٹر نعیم اکبر کو کرسی صدارت پر اکڑے پیٹھے دیکھا مگر ادا کردی، دیگر ساتھیوں کے مختصر جامع تبصرے اچھے ہیں۔ خود کو کچھ دھڑکا جانے والوں میں پایا۔ پیوستہ شہر سے امید بہار رکھ۔ (شکریہ۔۔۔) بس آگامہ آخر پر تھوڑا مشکل ہے) محفل صاحب سے پس زندان میں ہاتھ ملایا۔ ہادی علیہ کا دلچسپ ملاپ علیہ کا غائب ہونا محسوس میں جتلا، دوسری قسط کا انتظار ہے۔ ایسا بیتا پوری کی آخری شمع کو جلایا۔ غیاث الدین بلبن کے بارے میں تاریخ میں بہت پڑھا۔ تفصیل کا شکر ہے پھر نواب صاحب کی باروی سے ملے آئے۔ سیاست دانوں کا زیادہ تذکرہ کہانی کے لطف کو چھینک کر تا ہے۔ دیکھیں مراموٹی کی مراد بے پوری ہوتی ہے۔ کاش پھر خود صفدر حیات جیسے قائدانہ اور بیک صاحب جیسے وکیل ہوتے۔ شادی سے قبل لڑے لڑائی کا ملنا غلط اقدام ہے۔ بزرگوں کو درمیان میں لانا چاہیے۔ جبین، بدرالدین کا مبین کی عزت بچانے کے لیے خود بارڈر ڈاننا توقت تقسیم پر مقرر ایسے بہت سے واقعات پڑھے ہیں۔ محفل شروکت میں حسین و مکمل، جبابہر سید، مردار، طاہرہ یوسفہ سسٹن صفدر معاویہ، ماہین صنف کے اشعار اچھے ہیں۔ اندر اوٹن کی خاطر قربانیاں دینے والوں کی حالت بکدب بھی ہر طرف ملتی ہو رہا ہے۔ خود غرض وہی ایمان تازہ کرنے والی کہانی ہے۔ بے داغ منصوبہ شریک لیل پر یزمنون کا قاتل، سارنیک طرہ انجام خوب رہا۔ آخری صفحات پڑاؤ کثر بھی خوب چال چلتی اسوئی لائے صنفیہ وغیرہ کو بالکل ہونے پر میرال کو حقیقت بتا دینی چاہیے تھی۔ آخر میں جذبہ لاشیٰ نے غور سے پاند سلاسل ہونے والے ساتھیوں کو لٹھ جلد آزادی عطا کریں۔“

اب قارئین کے نام جن کے نام سے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔ عادل خان، سردیاب، طلحہ پارسندہ، قیصر اقبال کی بھول طبع بھکر۔ عاطف شاہین، ارونی، محمد زہیر ساگر، نوک ٹکٹ۔ معذرت، بلیر کثرت کراچی۔ بشیر احمد بھٹی، بہادر پور۔ رانا شعیب، جعفر، ملک، اعجاز، سنبل، منیل، سہاواں۔ افتخار حسین، عمران، مظفر آباد، آزاد کشمیر۔ طاہرہ بھگوار، پشاور۔ اورین احمد خان، ناظم آباد کراچی۔ محمد خوب، کورنگی، کراچی۔ اشفاق شاہین، کراچی۔ شہینہ حبیب، کوئٹہ۔



آخری بادشاہ

ایچ اقبال

ماضی کا آئینہ۔ باختیار
اور بے اختیار انسانوں
کے عبرت اثر واقعات



تاریخ گواہ ہے کہ حاکم اور محکوم کا سلسلہ ازل سے جاری ہے اور چولا بدل کر ابد تک جاری رہے گا۔... طاقت ایک خمار ہے جو باختیار طبقے کی ضرورت بن گیا ہے لیکن ہر دور کے تقاضے الگ رہے ہیں بالکل اسی طرح مغلیہ حکمرانوں نے بھی برصغیر پر ایک طویل عرصہ حکومت کی اور بالآخر جب رفتہ رفتہ یہ عہد عروج سے زوال کی سمت محو سفر ہوا تو آخری تاجدار ہند بہادر شاہ ظفر پر آکر یہ سلسلہ تھم گیا۔ مغلیہ سلطنت میں سب سے زیادہ پُر آشوب اور اذیت ناک یہی دور گزرا جب اس خاندان کا ہر فرد ایک الگ ہی داستان رقم کر رہا تھا۔... یہ اوراق ایک ایسی ہی مغل شہزادی کی شجاعت اور بے بسی کی داستان سے پردہ اٹھا رہے ہیں جو اپنے ماضی سے بے خبر اپنوں سے دور دیار غیر میں ایک اور ہی انداز میں زندگی بسر کر رہی تھی لیکن شاہی اطوار پھر بھی مزاج کا حصہ رہے جو ارد گرد کے لوگوں کے چونکنے کا سبب بنتے تھے مگر شاہی خاندان کا لہو قدم قدم پر خراج دیتا رہا کہ یہی کاتب تقدیر نے لکھا تھا کہ وہ جنگ وجدل اور محبت کے درمیان سولی پر لٹکی رہے اور خوابوں کو آنکھوں سے دور کرتی رہے۔... اگر وہ ایسا نہ کرتی تو اس مغل خاندان کی لاج کیسے رکھتی جس کا آخری غزل گو شہنشاہ اپنے اہل خانہ کے ساتھ انگریز حکومت کی گرفت میں قید و قفس کی زندگی گزارنے پر مجبور تھا۔... جس کے بعد مغلیہ عہد کا باب ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔ جس کا سارا درد دورانِ اسیری اس کی شاعری میں سمٹ آیا۔

وہ مجنوں ہوں کہ زخماں میں نگہبانوں کو
میری زنجیر کی جھکار نے سونے نہ دیا

مارا۔ ”اتنی اہم بات تم اب بتا رہے ہو؟“
دوسرے لکپٹن کے چہرے سے بھی ہنسی کا اظہار ہوئے لگا تھا۔

سارجنٹ شرمندہ سانس نظر آیا۔

میز پر گھونسا مارنے والے لکپٹن نے اس سے کہا۔ ”اب تم ہی فیضان ملی اور اس کے باپ کے بارے میں مکمل چھان بین کر کے جلد از جلد رپورٹ دو۔ اگر فیضان ہی ہمارا مطلوبہ شخص ثابت ہوا تو سارا کام آسان ہو جائے گا۔ براہ راست شاہی خاندان سے پوچھ چوک کرنا ہمارے لیے آسان نہیں۔“
اس گفتگو میں چونکہ شبہات کا رخ شاہی خاندان کی طرف ہو رہا تھا لہذا اجلاس اس بات پر ختم ہوا کہ یہ سارا معاملہ لازمی طور پر ریڈنٹ کرنل مکاف کے علم میں لایا جائے۔

☆☆☆

موم گروں کا چھتا، شرفاؤر قدرے آسودہ حال لوگوں کا محلہ تھا۔ وہیں ایک مکان میں تین خواتین ایک ضعیف ملازم اور ایک پختہ عمر کی ملازمہ کے ساتھ رہتی تھیں۔ ان تین خواتین میں سب سے زیادہ ضعیف خاتون کے بارے میں، پاس پڑوس کے لوگوں کا خیال تھا کہ ان کی عمر سو سال سے کم تو ہرگز نہیں ہوگی۔ وہ لوگ انہیں دایہ بیگم کہا کرتے تھے کیونکہ ان کی بیٹی نجم النساء بھی انہیں اسی نام سے مخاطب کیا کرتی تھی۔ اس کی عمر بھی پختہ سال کے لگ بھگ معلوم ہوتی تھی جبکہ اس کی بیٹی کی عمر تیس سال سے زیادہ نہیں ہو سکتی تھی۔

”میری عمر اس وقت پچھتالیس سال ہو چکی تھی جب زرتاج پیدا ہوئی۔“ نجم النساء نے پڑوس میں رہنے والی جان پہچان کی خواتین کو بتایا تھا۔ ”میں اور میرے شوہر تو اولاد کی طرف سے مایوس ہو چکے تھے لیکن خدا نے ہمیں اس عمر میں بھی نواز دیا۔“

نجم النساء کے شوہر کا نام ذیشان تھا جس کا انتقال ہوئے ڈیڑھ سال سے کچھ زیادہ عرصہ گزر چکا تھا۔ اس کا زینت سے تیار کیے جانے والے کم خواب کا کارخانہ تھا۔ وہ اس کپڑے کی تجارت کے لیے لکھنؤ جاتا رہتا تھا کیونکہ وہیں کے زیادہ تر لوگ اب اتنے خستہ حال ہو چکے تھے کہ اتنا قیمتی کپڑا خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے۔ ذیشان کے انتقال کے بعد کارخانہ فروخت کر دیا گیا تھا لیکن مرحوم خاصا کچھ پس انداز بھی کر گیا تھا۔

سنایا جاتا تھا کہ دایہ بیگم کے پاس ایک چھوٹی موٹی جاگیر بھی تھی جو ان کو اپنے والد سے ورثے میں ملی تھی۔ ان

کے والد عالم گہرثانی کے زمانے میں کسی اہم عہدے پر چناؤ تھے۔ جب عالم گہرثانی کو ایک درباری سازش کے بعد قتل کر دیا گیا تھا۔ اس وقت دایہ بیگم اپنی بیٹی نجم النساء اور اس کے شوہر ذیشان کے ساتھ دہلی میں کسی جگہ رہا کرتی تھیں، لیکن دہلی اور شاہی خاندان کے اہتر حالات نے انہیں دل برداشتہ کر دیا تھا۔ یہ دل برداشتگی اس وقت انتہا کو پہنچ گئی جب روہیلوں کا زور بڑھا اور غلام قارور وہیلہ نے شاہ عالم ثانی کو اندھا کر دیا جو اپنے والد عالم گہرثانی کے بعد تخت نشین ہوا تھا۔ خصوصاً نجم النساء دہلی سے بہت ہی زیادہ وحشت زدہ ہو گئی تھی۔ اس کی وجہ سے دایہ بیگم اسے اور اس کے شوہر ذیشان کے ساتھ دہلی سے ریاست میسور چلی گئی تھیں جہاں شیو سلطان انگریزوں سے نبرد آزما تھا۔ اس وقت نجم النساء کی عمر اٹھارہ سال تھی اور اس کی شادی ہوئے تقریباً تین سال ہو چکے تھے۔ ریاست میسور میں انہوں نے ایک طویل عرصہ گزارا۔ وہ طویل عرصہ گزارنے کے بعد نجم النساء کو وطن کی یاد ستانے لگی۔ اسی کی وجہ سے وہ لوگ میسور سے پھر دہلی آ گئے۔ میسور میں ابتدائی ڈیڑھ عشرے سے کچھ زیادہ گزارنے کے بعد انہیں یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ عالم شاہ ثانی کے بعد اس کا بیٹا مین الدین، اکبر شاہ ثانی کے لقب سے تخت دہلی پر بیٹھ چکا تھا لیکن حالات پہلے سے زیادہ اہتر ہو چکے تھے۔ اسی لیے دایہ بیگم نے دہلی لوٹنے کا ارادہ نہیں کیا حالانکہ اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد دہلی سے نجم النساء کی وحشت ختم ہو چکی تھی۔ پھر مزید ایک عشرے سے زائد گزر جانے کے بعد جب میسور کا شیر دل شیو سلطان انگریزوں سے لڑتے ہوئے جاں بحق ہو گیا تو نجم النساء میسور کے حالات سے دل برداشتہ ہوئی۔ اسے وطن کی یاد بھی ستانے لگی۔ اس کے اصرار پر اس سے شدید محبت کرنے والے شوہر ذیشان اور دایہ بیگم نے اس کی خواہش نظر انداز نہیں کی۔ چار افراد پر مشتمل خاندان نے دہلی آ کر موم گروں کے چھتے میں ایک مکان خرید لیا اور ذیشان نے اپنا کارخانہ قائم کیا۔ اس وقت زرتاج کی عمر تین سال تھی اور اب انہیں دہلی میں رہتے ہوئے دعوئوں سے کچھ کم وقت گزر چکا تھا۔

نجم النساء کے شوہر کی زندگی میں ان کے یہاں ایک سے زیادہ ملازم نہیں تھا مگر اس کے انتقال کے کچھ ہی دن بعد دایہ بیگم غلیل ہوئیں تو ایک ادیب عزم ملازم کا بندوبست کر لیا گیا تاکہ وہ ہمہ وقت دایہ بیگم کے قریب رہ سکے۔ انہی دنوں میں پڑوس کی کوئی عورت دایہ بیگم کی مزاج

پر سی کے لیے آئی تھی تو دایہ بیگم نے اس سے کہا تھا۔ ”مجھے اپنی بیٹی اور نواسی سے بہت پیار ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے وہ ہر وقت میرے بستر سے لگی بیٹھی رہیں۔ بس اسی لیے ملازم رکھ لی ہے۔“

لیکن نجم النساء کو ملازم رکھنا گراں گزرا تھا۔ ”آخر میرا بھی تو کچھ فرض ہے دایہ بیگم!“ نجم النساء نے کہا تھا۔ ”کیا میرا اور زرتاج کا فرض نہیں کہ ہم آپ کی خدمت کریں؟“

دایہ بیگم نے یہ بات کسی طرح ٹال دی تھی مگر کچھ ہی دن بعد جب ان کی علالت نے ثروت اختیار کی تھی، تب زرتاج کو اس کا علم ہوا تھا کہ ملازم دراصل کیوں رکھی گئی تھی۔

اس بات کو اب ایک سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا تھا۔ دایہ بیگم کی علالت کی شدت بدستور تھی۔ ایک بہت اچھی طبیبہ کے علاج کے باوجود ان کے رویہ صحت ہونے کا امکان نظر نہیں آ رہا تھا۔ ملازمہ کے ہوتے ہوئے بھی نجم النساء اور زرتاج بھی ان کا بہت خیال رکھتی تھیں لیکن زیادہ رات گزر جانے پر دایہ بیگم کے اصرار پر انہیں اپنے کمرے کا رخ کرنا پڑا تھا۔

دونوں ماں بیٹی ایک ہی کمرے میں سوتی تھیں۔ جس روز صدف رخاں روہیلہ کے قتل کا چرچا ہوا، اس رات نجم النساء رات کو دیر تک زرتاج سے اس کے بارے میں بات کرتی رہی۔ موضوع یہی سوال تھا کہ آخر وہ کون ہو سکتا ہے جو روہیلوں کا جانی دشمن بنا ہوا ہے۔

پھر رات گئے نجم النساء تو سو گئی لیکن زرتاج جاگتی رہی۔ اس کے چہرے پر غور و فکر کے آثار جیسے نمودار ہو کر رہ گئے تھے۔ پھر جب اس پر ہلکی سی خودگی طاری ہوئی تھی تو نجم النساء کی ہلکی سی چیخ نے اسے چونک کر اٹھنے پر مجبور کر دیا تھا۔ نجم النساء بستر پر بیٹھی لمبی لمبی سانس لے رہی تھی اور پینا اس کی پیشانی پر چمک رہا تھا۔ زرتاج اس سے کوئی سوال کیے بغیر اٹھی اور جلدی سے ایک پیالے میں پانی لے آئی۔

پانی پی کر نجم النساء کی حالت بتدریج سنبھلنے لگی۔ ”پھر وہی خواب؟“ زرتاج نے سنجیدگی سے پوچھا۔ نجم النساء نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے ٹھنڈی سانس لی۔

”ہاں! یہ خواب تو شاید مرتے دم تک میرا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔“ جواب دیتے ہوئے وہ آہستہ سے بستر پر لیٹ گئی۔ ”اس کی وجہ سے کئی بار تمہاری نیند خراب ہو چکی ہے۔“

زرتاج خاموش رہی۔ اس نے یہ بھی نہیں بتایا کہ وہ صرف خودگی میں تھی، ابھی سوئی نہیں تھی۔

غلام قارور سلطنت مغلیہ کے باغی ضابطہ خاں کا بیٹا تھا۔

نجم النساء ڈاڈر میں پھر سو گئی لیکن زرتاج کی آنکھوں میں اب غنودگی بھی نہیں رہی تھی۔ اس کے دماغ میں وہ خواب پھر اٹھنے لگا تھا جو نجم النساء سے بتا چکی تھی۔

وہ خواب جو محض خواب نہیں تھا۔ خواب میں نظر آنے والا وہ منظر نجم النساء جیتی جاگتی آنکھوں سے اس وقت دیکھ چکی تھی جب اس نے بیسویں سال میں قدم رکھا تھا۔ اس کی شادی ہوئے کئی سال گزر چکے تھے۔ وہ دایہ بیگم کے ساتھ کچھ خریداری کے لیے بازار گئی تھی۔ واپسی پر وہ ایک ایسی راہ سے گزری تھیں جو لال قلعے سے کچھ ہی فاصلے پر تھا۔ وہاں بہت سے لوگ ادھر ادھر جمع تھے اور درختوں سے لگے ہوئے ان انسانی اعضا کو دیکھ رہے تھے جن سے خون ٹپک رہا تھا۔ وہ جس لاش کے ٹکڑے تھے، اس کا ایک ہاتھ ایک درخت سے اور دوسرا ہاتھ کسی اور درخت سے لگ رہا تھا۔ دونوں ٹانگیں بھی مختلف درختوں سے لگی ہوئی تھیں۔ ایک درخت سے گردن سے کمر تک کا دھڑ اور دوسرے درخت سے کٹا ہوا سر لٹک رہا تھا۔ وہاں جمع ہونے والے لوگ بڑی نفرت سے لاش کے ان ٹکڑوں پر جوتے پھینک رہے تھے یا پتھر اڑا کر رہے تھے۔

نجم النساء منظر کو دیکھ کر اتنی دہشت زدہ ہوئی کہ ہڈیاں انداز میں چننے لگی۔ دایہ بیگم نے اسے کسی نہ کسی طرح سنبھالا اور ایک خالی پائلی دیکھ کر اس میں جا بیٹھی۔ وہ بالکیاں لوگوں سے کراہے لے کر انہیں ان کی منزل تک پہنچایا کرتی تھیں۔ بالکی چار آدمی اٹھاتے تھے۔

گھر پہنچنے تک، بالکی میں بھی نجم النساء دایہ بیگم سے لپٹی کا ہتی رہی تھی۔ گھر پہنچنے کے بعد بھی اس کا خوف بتدریج کم ہوا تھا اور اس نے دایہ بیگم سے پوچھا تھا کہ وہ لاش کی کس کس کی تھی جس کے ٹکڑے کر کے درختوں سے لٹکائے گئے تھے۔

دایہ بیگم نے جواب میں کہا تھا۔ ”خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ تم اس کے بارے میں بالکل نہ سوچو۔“

لیکن نجم النساء اتنی چھوٹی سی بیٹی نہیں تھی۔ وہ بیس سال کی ہو چکی تھی۔ اسے آسانی سے نہیں بہلایا جاسکتا تھا۔ اس نے باقی سارا دن اسی منظر کو یاد کرتے اور دہشت زدہ ہوتے ہوئے گزارا۔

شام کو نجم النساء کا شوہر ذیشان اپنے کام سے گھر واپس لوٹا تو اسے لاش کی ساری حقیقت معلوم ہو چکی تھی۔ اس نے دایہ بیگم اور نجم النساء کو بتایا کہ وہ لاش غلام قارور روہیلہ کی تھی۔

غلام قارور سلطنت مغلیہ کے باغی ضابطہ خاں کا بیٹا تھا۔

جس زمانے میں شاہ عالم ثانی اپنے باپ عالم گیر ثانی کے قتل کے بعد در بدری کی زندگی گزار رہا تھا اور اگر یہ اسے کسی طرح دہلی پہنچنے سے روکتے رہے تھے، اس زمانے میں اس کا بیٹا جوان بخت اپنی والدہ زینت محل کے ساتھ شاہی محل میں تھا۔ یہ ظاہر امور مملکت زینت محل نے سنہال رکھے تھے لیکن دراصل دہلی پر روہیلوں کی حکومت تھی۔ ان کا سردار ضابطہ خاں روہیلہ ہی دہلی کا حکمران بنا ہوا تھا۔ اس کے ایک رسالے کے تین ہزار سوار قلعہ معلیٰ کی حفاظت یا نگرانی پر مامور تھے۔ کسی میں ہمت نہیں تھی کہ ضابطہ خاں کو کسی بھی معاملے میں روک ٹوک سکتا۔ وہ جب چاہتا شاہی محل تو کیا، جرم سرا میں بھی داخل ہو جاتا اور شہزادیوں سے ناشائستہ حرکیں کر لیتا تھا۔ بعد میں جب شاہ عالم ثانی مرہٹوں کی مدد سے دہلی پہنچنے میں کامیاب ہوا تو روہیلے مرہٹوں کا مقابلہ نہ کر سکے۔ ضابطہ خاں گرفتار ہوا۔ اسے ذلیل کرنے کے لیے اسے زنانہ لباس پہنا کر شاہ عالم ثانی کے حضور پیش کیا گیا اور اس کے بیٹے غلام قادر کو بھی کر دیا گیا۔

اگرچہ اس سارے معاملے میں شاہ عالم ثانی کی تائید شامل نہیں تھی لیکن غلام قادر کے دل میں آگ بھڑکتی رہی کہ وہ شاہ عالم ثانی سے ان ساری باتوں کا انتقام لے۔ اپنے باپ ضابطہ خاں کے انتقال کے بعد جب بوجہ مرہٹہ سردار ماحوجی سندھیا، عسکری طور پر بہت کمزور پڑ گیا تو غلام قادر نے اپنے تیار کردہ لشکر کے ساتھ دہلی پر بیخار کر دی۔ مرہٹے اس کا مقابلہ نہ کر سکے۔ غلام قادر نے شاہی محل کو نہ صرف لوٹا بلکہ شہزادیوں تک کے کوڑے لگوائے اور خنجر سے شاہ عالم ثانی کی دونوں آنکھیں نکال دیں لیکن بعد میں اسے اس کا خمیازہ بھی بھگتنا پڑا۔

ماہوجی سندھیا نے طاقت حاصل کرنے کے بعد دوبارہ دہلی فتح کی۔ غلام قادر گرفتار ہوا اور سندھیا نے اسے قتل کر کے اس کی لاش کے ٹکڑے درختوں پر لٹکوا دیے۔ یہی وہ منظر تھا جسے دیکھ کر کرم النادہشت زدہ ہوئی تھی اور اسے دہلی کے گلی کوچوں سے بھی گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔ اس کی وجہ سے دایہ بینک اور ذیشان نے دہلی چھوڑی تھی اور تینوں ریاست میسور میں جا بیٹھے تھے۔ وہیں زرتاج کی پیدائش ہوئی تھی۔

☆☆☆

چار نقوس پر مشتمل یہ خاندان جب دہلی واپس لوٹا تو انیسویں صدی شروع ہوئے تین عشرے سے زیادہ گزر چکے تھے۔ اکبر شاہ ثانی کو تخت نشین ہوئے بھی اسی سال کا

عرصہ گزر چکا تھا۔

جب صدر خاں روہیلہ کے قتل کا واقعہ پیش آیا، اس وقت اکبر شاہ ثانی کی عمر پچھتر سال ہو چکی تھی۔ انگریزوں کا وظیفہ خوار ہونے کے باوجود اس کی بیویوں کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ وہ اپنے باپ شاہ عالم ثانی کا چھوٹا اور سب سے لاڈلا بیٹا تھا۔ جس کی ہر خواہش پوری کی جاتی تھی۔ اسی لیے صرف اٹھارہ سال کی عمر میں اس کی اٹھارہ بیویاں تھیں۔ بعد ازاں بھی اس نے متعدد شادیاں کی تھیں اور اسی لیے اس کی اتنی اولادیں تھیں کہ اب پچھتر سال کی عمر میں اسے اپنی کچھ ہی اولادوں کے نام یاد رہ گئے تھے۔

لیکن جن لوگوں کی رسائی شاہی محل تک نہیں تھی، وہ سمجھتے تھے کہ بادشاہ کے چھلڑے اور آٹھ لڑکیاں تھیں۔ بہت سی اولادیں مر بھی چکی تھیں، جو زندہ تھے، وہ بھی پختہ عروں تک پہنچ چکے تھے۔ بعض نے بڑھاپے میں بھی قدم رکھ دیا تھا۔ انہی میں سے ایک بیٹے، شہزادہ سراج الدین کی عمر ساٹھ سال ہو چکی تھی۔ کئی اور شہزادوں کی طرح وہ بھی جوان اولادوں کا باپ تھا۔ اس کی ماں لال بائی راجپوت تھی۔

عربی فارسی کی کتب بینی کا شوق زیادہ تر مغل شہزادوں کو تھا۔ اسی لیے شہزادہ سراج کو بھی ہمہ وقت پڑھتے رہنے یا شعر کہنے کی عادت تھی۔ صبح ناشتے کے بعد وہ اپنے کمرے میں لیٹا ابراہیم ذوق کا وہ قصیدہ پڑھ رہا تھا جو اس کے باپ اکبر شاہ ثانی کی شان میں کہا تھا۔ اسی قصیدے کے باعث ابراہیم ذوق کو ”خاقانی ہند“ کا خطاب ملا تھا۔ اس قصیدے سے متاثر ہو کر ہی شہزادہ سراج نے خود بھی ابراہیم ذوق سے اپنے اشعار پر اصلاح یعنی شروع کی تھی۔

وہ قصیدہ شہزادہ سراج نے متعدد بار پڑھا تھا لیکن اس وقت بھی اسے اٹھماک سے پڑھ رہا تھا جیسے پہلی بار پڑھ رہا ہو۔ وہ اس وقت چونکا جب ایک خواجہ سراج نے دروازے پر آکر دستک دی اور اندر آکر کہا۔ ”معلیٰ حضرت نے آپ کو یاد فرمایا ہے شہزادہ حضور!“

شہزادہ سراج فوراً اٹھا۔ اکبر ثانی کے کمرے میں پہنچ کر وہ کورٹس بجالایا۔ اکبر ثانی اس وقت بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ چہرے پر اضطرابی کیفیت تھی۔ ”پرہیز!“ وہ بولا تو اس کی آواز میں قناعت ہی تھی۔

شہزادہ سراج نے چونک کر پوچھا۔ ”نصیب دشمنان!..... آپ کی طبیعت کیا کچھ نامناسب ہے؟“ ”وہی سر کا درد..... جو دس پندرہ دن کے وقفے سے اچانک اٹھتا ہے۔ ابھی ہم نے طبیب کو بلایا ہے۔ آتا ہی

ہوگا۔ تم کو میں نے اس لیے بلایا ہے کہ دیوان خاص میں جا کر ریڈینٹ بیمار سے ملو۔ وہ ہم سے ملنے تعریف لائے ہیں!“ اس فقرے میں ”تعریف لائے ہیں“ کہتے ہوئے اکبر ثانی کے لیے میں جھبن گئی۔ ”بتاؤ دنیا کہ ہماری طبیعت کچھ نامناسب ہے۔“ ”وہ اتنی صحیح.....“

”خدا ہی بہتر جانتا ہے۔“ اکبر ثانی نے شہزادہ سراج کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”تم جا کر بات کرو گے، طبیعتی علم ہوگا کہ وہ کیوں آیا ہے۔“ ”بہتر.....“

شہزادہ سراج کمرے سے نکل کر دیوان خاص میں پہنچا۔ بیٹھا ہوا انگریز ریڈینٹ اسے دیکھ کر اترما کھڑا ہوا لیکن شہزادہ سراج خوب جانتا تھا کہ وہ فرنگی شاہی خاندان کے لوگوں کی عزت دلی سے نہیں کرتے تھے۔ یہ ان مکاروں کی سیاسی مصلحت تھی۔

”یور ہائی ٹس، صبح بخیر!“ ریڈینٹ نے کہا۔ ”آپ نے زحمت فرمائی، شکر گزار ہوں لیکن مجھے ہر جمعہ کی ملاقات کی خواہش تھی۔“

”آج ان کی طبیعت نامناسب ہو گئی ہے۔“ شہزادہ سراج نے جواب دیا۔ ”دو ماہ سے چل رہا ہے یہ سلسلہ۔ دس پندرہ دن کے وقفے سے یکا یک سر میں درد ہوتا ہے اور چوبیس گھنٹے یا اڑتالیس گھنٹے کے بعد فرخ ہوتا ہے۔ ابھی تک اطباء اس کا سبب سمجھنے کا قاصر رہے ہیں۔ ذاتی طور پر ہمیں درد شقیقہ کا شبہ ہے لیکن..... خیر چھوڑے.....! آپ نے اتنی صبح کیسے زحمت فرمائی؟“

ریڈینٹ نے جواب دینے کے بجائے تشریفات کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”کیا کمپنی کی طرف سے کسی اچھے ڈاکٹر کو بھیجا جائے؟“

”اس کی احتیاج نہیں۔“ شہزادہ سراج نے کہا۔ ”ہمارے طبیب کچھ کم نہیں ہیں۔ بھر یہ کہ ہمارے خاندان میں بھی کو حکمت پر اعتقاد ہے۔“

ریڈینٹ جواب میں کہہ سکتا تھا کہ کبھی مغل بادشاہوں نے کمپنی کے ڈاکٹروں سے شفا پائی ہے لیکن وہ بات ٹال گیا۔ ”جیسا آپ مناسب سمجھیں۔“ اس نے کہا۔

شہزادہ سراج متغیر انداز نگاہوں سے ریڈینٹ کی طرف دیکھتا رہا۔ اسے یقین تھا کہ اتنی صبح ریڈینٹ کی آمد کسی خاص سبب کے بغیر نہیں ہو سکتی تھی۔

”دراصل۔“ ریڈینٹ نے شہزادہ سراج کی

آنکھوں کا استفسار پڑھتے ہوئے جواب دیا۔ ”بات کچھ ایسی ہے کہ میں ہر جمعہ ہی سے بات کرتا تو زیادہ مناسب رہتا لیکن اب ان کی طبیعت نامناسب ہے تو پھر.....“ اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا لیکن واضح ہو گیا کہ وہ شہزادہ سراج سے بھی وہ بات کر سکتا تھا جس کے لیے آیا تھا۔

”کوئی خاص معاملہ ہے کیا ریڈینٹ صاحب؟“

شہزادہ سراج نے پوچھا۔

”خاص؟..... جی ہاں..... مگر..... یوں سمجھیے کہ خاص ہے بھی اور نہیں بھی..... ویسے تو پنڈاری تحریک کے لوگوں ہی کی وجہ سے آئے دن کچھ نہ کچھ ہوتا رہتا ہے لیکن پرسوں رات ایک ایسا قتل ہوا کہ تحقیقات کرنے والوں کے ذہن کا رخ ایک خاص جانب ہو گیا۔ اس قتل کے بارے میں تحقیقات کرنے والے افسران کا خیال ہے کہ یہ واردات پنڈاری تحریک کے لوگوں کی نہیں ہو سکتی اور یہ کہ گزشتہ ایک سال میں..... بلکہ واضح طور پر بتاؤں کہ گیارہ ماہ میں اسی قسم کے دس قتل ہو چکے ہیں۔“

”خوب!“ شہزادہ مسکرایا۔ ”ہمیں آج پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ قتل کی بھی اقسام ہوتی ہیں۔“

ریڈینٹ کے چہرے پر ہلکے بھر کے لیے جھنجھلاہٹ کا تاثر ابھرا جس پر اس نے فوری طور پر قابو پالیا اور بولا۔ ”دراصل بات کچھ یوں ہے کہ یہ سب ایک ہی انداز میں ہوئے ہیں۔ ہر مقتول کے سر پر یا گردن پر کوئی ماری گئی ہے اور دور سے ہی ماری گئی ہے۔ یعنی کسی مقتول کے قریب جا کر اسے لوٹا نہیں گیا۔ اسی لیے یقین کیا جا سکتا ہے کہ یہ وارداتیں پنڈاری والوں نے نہیں کی ہوں گی۔ اس کے علاوہ بھی ان میں ایک قدر مشترک ایسی ہے کہ تحقیقات کرنے والوں نے یہ ضروری سمجھا کہ یہ صورت حال ہر جمعہ کے علم میں لانی جائے۔“

”ایسی ایک قدر مشترک ہے؟“ شہزادہ سراج متحسب ہوا۔ ”وہ بھی روہیلے تھے۔“ ریڈینٹ نے بڑی تیزی سے کہا۔

”اوہ!“ شہزادہ سراج یکا یک سنجیدہ ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں فوراً آ گیا تھا کہ فرنگیوں کی سوچ کس راہ پر نکل گئی تھی۔ اس کے قیاس کی تقدیر خود ریڈینٹ نے کر دی جب اس نے اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”یہ ضروری اس لیے سمجھا گیا کہ شاہی خاندان سے روہیلوں کی کشمکش خاصے عرصے تک چلی تھی اور غلام قادر روہیلہ نے تو نہایت سفاکی کا ثبوت دیا تھا کہ خنجر سے آپ

کے دادا کی آنکھیں نکال لی تھیں۔

ریڈیڈنٹ کے دل کی بات شہزادہ سراج نے فوراً سمجھ لی۔ اسے یہ خیال بھی آیا کہ اگر اس وقت اس کی جگہ اس کا چھوٹا بھائی شہزادہ مرزا جھانگیر ہوتا تو بھڑک اٹھتا۔ انگریزوں کی برتری تسلیم کر لینے کے باوجود شہزادہ مرزا جھانگیر کے مزاج کی گہری فہم تو کیا، کم بھی نہیں ہوئی تھی۔ شہزادہ مرزا جھانگیر اس کا سوتیلا بھائی تھا جس کی ماں ممتاز بیگم تھی۔

”بہت خوب ریڈیڈنٹ صاحب، بہت خوب!“ شہزادہ سراج نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”گویا آپ لوگوں کی سوچ یہ ہے کہ شاہی خاندان اب آنجنابی شاہ عالم ثانی کا انتقام لینے کے لیے روہیلوں کو کھڑا کر رہا ہے یا قل کروا رہا ہے۔“

”ہرگز نہیں یورہائی نس!“ ریڈیڈنٹ نے جلدی سے کہا۔ ”در اصل صرف یہ قیاس کیا جا رہا ہے کہ ہرچیز شاہی کسی ایسے شخص سے واقف ہوں جو شاہی خاندان سے بے پناہ محبت اور روہیلوں سے شدید نفرت کرتا ہو اور ہرچیز ہرگز نہیں چاہیں گے کہ کوئی شخص ان کے خاندان کی محبت میں اس قسم کی وارداتیں کرے۔“

”ریڈیڈنٹ صاحب!“ شہزادہ سراج نے سکون سے کہا۔ ”میں یقین ہے کہ والد بزرگوار ایسے کسی شخص سے واقف نہیں ہوں گے۔ اگر واقف ہوتے تو ہم سے اس کا ذکر تو ضرور کرتے۔ اس قسم کے معاملات وہ کم از کم ہمارے علم میں ضرور لاتے ہیں، تاہم یہ سب باتیں ہم ان کے علم میں ضرور لے آئیں گے اور جو بھی ان کا جواب ہوگا، وہ آپ تک پہنچ جائے گا۔ شاید ہم آج ہی دوپہر تک آپ کو پیغام بھیجوا دیں۔“

”ہرچیز کی طبیعت ناساز ہے اس لیے جلدی کی ضرورت نہیں۔“ ریڈیڈنٹ نے ہمدردی کا اظہار کیا۔ ”ان کی طبیعت کی بجالی تک انتظار کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہوگا۔ بس اب مجھے اجازت دیجیے!“ وہ کھڑا ہو گیا۔

”ارے نہیں۔“ شہزادہ سراج جلدی سے بولا۔ ”آپ کوئی مشروب پیے بغیر تو ہرگز نہیں جا سکیں گے۔ ہم آپ لوگوں کے خاص مشروب کا بندوبست تو رکھتے ہیں۔ ہر چند اب ہمارے حالات پہلے جیسے نہیں رہے لیکن.....“ اس نے اپنا جملہ اور اسی چھوڑ دیا۔ اس کے لیے میں کک تھی۔

”اس کی ضرورت نہیں یورہائی نس!“ ریڈیڈنٹ نے کہا۔

شہزادہ سراج نے تالی بجا دی تھی۔ فوراً ہی ایک خواجہ سرا اندر آیا۔ شہزادہ سراج نے اس سے شراب لانے کے لیے کہا۔

”اچھا۔“ ریڈیڈنٹ طویل سانس لے کر بیٹھے ہوئے بولا۔ ”اب آپ کی خواہش کا احترام تو مجھ پر لازم ہے لیکن میں بس ایک ڈرنک لوں گا۔“ شہزادہ سراج نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اگرچہ یہ اصول میزبانی کے خلاف ہوگا لیکن ہم آپ کا ساتھ نہیں دے سکیں گے۔“

”میں جانتا ہوں۔“ ریڈیڈنٹ مسکرایا۔ ”لیکن ہرچیز اس کے بہت شوقین ہیں۔ ایک مرتبہ میں انہیں بہت اعلیٰ درجے کی شراب کا تحفہ بھی دے چکا ہوں۔ ایک مرتبہ مجھے ان کے ساتھ بیٹے کا شرف بھی حاصل ہوا ہے۔“

شہزادہ سراج مسکراتا رہا۔ اگرچہ وہ بھی شراب نوشی کا عادی تھا لیکن اب تک اس نے انگریزوں پر یہ بات ظاہر نہیں ہونے دی تھی۔ وہ ریڈیڈنٹ کی آمد کا سبب جان کر مکدر بھی ہوا تھا لیکن اس نے نمازی خوش مزاجی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا۔

☆☆☆

صفدر خاں روہیلہ کے قتل کے سلسلے میں انگریز پولیس کے صدر دفتر میں جو پہلا اجلاس ہوا تھا، اس کی صدارت بیک وقت دو افسروں نے کی تھی۔ وہ دونوں کیپٹن تھے۔ ان میں سے ایک کا نام اسٹیورٹ اور دوسرے کا نام اسمتھ تھا۔ وہ دونوں سہ پہر کے وقت صدر دفتر کے ایک کمرے میں بیٹھے اسی قتل کے سلسلے میں گفتگو کر رہے تھے۔

کیپٹن اسمتھ کہہ رہا تھا۔ ”ریڈیڈنٹ آج صبح پرنس سراج سے مل چکے ہیں۔ بادشاہ کی طبیعت خراب تھی اس لیے اس سے ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔ ریڈیڈنٹ کا خیال ہے کہ پرنس سراج روہیلوں کے قتل کے معاملے میں ہرگز ملوث نہیں ہے۔“

”اس یقین کی وجہ؟“ کیپٹن اسٹیورٹ نے سوال کیا۔ ”انہوں نے مجھے وہ سب باتیں بتائی ہیں جو پرنس سراج سے ہوئی تھیں۔“ کیپٹن اسمتھ نے جواب دیا اور پھر اس نے تفصیل سے وہ ساری گفتگو ہرادی جو ریڈیڈنٹ اور شہزادہ سراج کے مابین ہوئی تھی۔

سب کچھ سننے کے بعد کیپٹن اسٹیورٹ نے کہا۔ ”ان باتوں سے یہ نتیجہ کیسے اخذ کر لیا گیا کہ پرنس سراج اس معاملے میں ملوث نہیں۔“

”تم ابھی دو ہی مہینے پہلے انگلیڈ سے آئے ہو لیکن

میں یہاں بہت عرصے سے ہوں اور ریڈیڈنٹ کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ بلا کے چہرہ شناس ہیں۔ اسی بنا پر انہیں یقین ہے کہ پرنس سراج اس معاملے میں ہرگز ملوث نہیں۔ اس نے بہت سچائی سے باتیں کی تھیں۔ اس کے لہجے میں جھوٹ کا نشانہ بھی نہیں تھا۔ وہ اس خیال سے جھجھکا رہا تھا کہ ہم اس سلسلے میں شاہی خاندان پر شبہ کر رہے ہیں لیکن وہ بڑے سلیقے سے اپنی جھجھکاہٹ چھپا گیا تھا۔ ریڈیڈنٹ صاحب کا دعویٰ ہے کہ اگر ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو پرنس سراج کی جھجھکاہٹ کو قطعی محسوس نہیں کرتا۔“

کیپٹن اسٹیورٹ نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”چلو مان لیا کہ پرنس سراج اس معاملے میں ملوث نہیں لیکن اکبر شاہ تو ہو سکتا ہے۔“

”قتیرے پہر کو پرنس سراج نے پیغام بھیجوا دیا تھا کہ اکبر شاہ بھی اس سارے معاملے سے بے خبر ہے۔“

”کیا اکبر شاہ اپنے بیٹے سے جھوٹ نہیں بول سکتا؟“ ”ابھی بتا چکا ہوں میں تمہیں! پرنس سراج نے ریڈیڈنٹ سے کہا تھا کہ اس کا باپ اسے اتنے اہم معاملات سے بے خبر نہیں رکھتا۔“

”یہ اس کی خوش فہمی بھی ہو سکتی ہے۔“

کیپٹن اسمتھ نے ایک طویل سانس لی۔ ”گویا تم اس شے سے دست بردار ہونے کے لیے تیار نہیں کہ اکبر شاہ اس معاملے میں ملوث ہو سکتا ہے۔“

”اکبر شاہ کے علاوہ خاندان کا کوئی اور فرد بھی ہو سکتا ہے۔“ کیپٹن اسٹیورٹ نے کہا۔ ”اور مجھے خاصی حد تک شبہ ہے کہ یہ کام غالباً فیضان علی سے لیا جا رہا ہو۔“

”دادارحمان کے بیٹے؟“

”ہاں۔“ کیپٹن اسٹیورٹ نے کہا۔ ”سارجنٹ

جیکب نے بھی مجھے آج ہی رپورٹ دی ہے۔ اس نے دادا رحمان سے بہت صاف صاف سوال کیا تھا کہ اس نے لاش دیکھ کر صفدر خاں روہیلہ کو کیسے پہچان لیا تھا۔ دادارحمان نے اس کا بہت تفصیلی جواب دیا تھا جو خاصا قابل غور ہے۔“

”قابل غور؟“

”ہاں۔“ کیپٹن اسٹیورٹ نے جواب دیا۔ ”دادا رحمان نے بتایا تھا کہ آج بھی دہلی میں روہیلوں کی اچھی خاصی تعداد موجود ہے لیکن مقامی لوگوں کی وجہ سے انہوں نے یہ بات راز میں رکھی ہے کہ وہ روہیلے ہیں۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ صفدر خاں کے علاوہ جو روہیلے قتل کیے جا چکے ہیں، وہ انہیں بھی جانتا تھا۔ وہ سب غلام قادر کے ان

ساتھیوں میں سے تھے جنہوں نے دہلی پر حملہ کیا تھا۔“ کیپٹن اسمتھ نے چونک کر کہا۔ ”یعنی جب غلام قادر نے شاہ عالم کی دونوں آنکھیں نکال لی تھیں؟“

”ہاں۔“

”دادارحمان انہیں کیسے جانتا تھا؟“

”اپنے بیان کے مطابق وہ اس زمانے میں بحیثیت دربان شاہی محل میں ملازم تھا۔ اس نے حملہ آوروں کو دیکھا تھا اور ان میں سے بہت سوں کی فحشیں اسے یاد رہی تھیں۔ دادا رحمان کے اب وہی شوق رہ گئے ہیں، وہ اپنے ہم

عمروں کے ساتھ اپنے گھر کے ایک کمرے میں بیٹھا شطرنج یا بگبھی کھیلتا ہے یا ساری دہلی میں گھومتا پھرتا رہتا ہے۔ وہ یہاں کے ہر گلی کو پے سے واقف ہے۔ اس نے شہر میں رہنے والے بارہ ایسے روہیلوں کو پہچان لیا تھا جو غلام قادر کے ساتھیوں میں سے تھے۔ اس نے ان کے بارے میں بھی کئی کوئی بتایا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ گڑے مردے اکھڑیں۔ یعنی مقامی لوگوں اور روہیلوں میں فساد کھڑا ہو جائے۔ اب میں تمہیں ایک ایسی بات بتاتا ہوں کہ تم پھر چونک پڑو گے۔“

کیپٹن اسمتھ تیزی سے بولا۔ ”جو دس روپے قتل ہو چکے ہیں، وہ انہی بارہ میں سے تھے کیا؟“

کیپٹن اسٹیورٹ مسکرایا۔ ”تم ٹھیک سمجھ۔ میں تمہیں یہی بتا کر چونکا نا چاہتا تھا۔“

”گویا غلام قادر کے ان ساتھیوں میں سے دو ابھی زندہ ہیں؟“

”ہاں۔“

”تو پھر ان روہیلوں کا قاتل ان دونوں کو بھی قتل کر سکتا ہے؟“

”دونوں کو تو نہیں لیکن ایک کو ضرور قتل کر سکتا ہے۔ وجہ یہ

کہ ان دونوں میں سے ایک، مین چارماہ پہلے دہلی چھوڑ کر جا چکا ہے۔ سارجنٹ جیکب نے دادارحمان سے بات کرنے کے بعد ان دونوں روہیلوں کے بارے میں بھی پتہ چان بین کی تھی تو اسے اس کا علم ہوا تھا لیکن یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ وہ روہیلہ دہلی کیوں چھوڑ گیا۔ بس قیاس ہی کیا جاسکتا ہے کہ شاید وہ اپنے ساتھیوں کے پے درپے قتل سے ہی ڈر کر دہلی سے بھاگا ہو۔

اب دہلی میں ان میں سے صرف ایک ہی ہے۔ یہاں اسے لوگ افضال میاں کے نام سے جانتے ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ جب وہ روہیلہ سے تو اس کا نام افضال خاں ہوگا۔ وہ اپنے نام سے خاں کا لفظ اس لیے خارج کر سکتا ہے کہ لوگوں کو اس پر

روہیلہ ہونے کا شبہ نہ ہو۔
 ”یہ تو دل کے چور کی بات ہوگی ورنہ یہاں ریاست
 رام پور اور مراد آباد کے لوگ بھی آباد ہیں جن کے ناموں
 کے ساتھ خاں لگا ہوا ہے۔“
 ”تم شیک کہہ رہے ہو۔ یہ دل کے چور کی ہی بات
 ہو سکتی ہے۔“
 ”پھر تو خفیہ طور پر اس کی حفاظت کی جانی چاہیے۔
 اگر اسے بھی قتل کرنے کی کوشش کی گئی تو قاتل ہمارے ہاتھ
 لگ سکتا ہے۔“
 ”سارجنٹ جیکب سے یہ رپورٹ ملنے کے بعد ہی
 میں اس کا بندوبست کر چکا ہوں۔ اس کے علاوہ دادا رحمان
 کے پوتے فیضان علی پر بھی خفیہ طور سے نظر رکھی جائے گی۔“
 ”پوتے؟“ کیپٹن اسمتھ نے حیرت سے کہا۔
 ”ہاں۔ پہلے میں غلط معلوم ہوا تھا کہ فیضان علی اس
 کا بیٹا ہے۔“
 ”تو فیضان علی کے ماں باپ؟“
 ”وہ مر چکے ہیں مگر دادا رحمان کی بیوی زندہ ہے، وہ
 گھر میں اپنے پوتے اور پوتی کے ساتھ رہتے ہیں۔“
 ”یعنی فیضان کی بہن؟“
 ”ہاں، اس کی بہن کا نام گوہر جہاں ہے۔“
 ”بہت خوب۔“ کیپٹن اسمتھ مسکرایا۔ ”اس لڑکی کا
 نام بھی معلوم کر لیا سارجنٹ جیکب نے؟“
 ”جیکب بہت ذہین ہے۔ مجھے یہاں آنے زیادہ
 دن نہیں ہوئے لیکن میں نے اس کے بارے میں اندازہ
 لگ لیا تھا۔ اسی لیے میں نے اسی کو ہدایت کی تھی کہ وہ رحمان
 دادا سے ملے۔ وہ رحمان دادا کے نام سے اسی لیے مشہور ہوا
 ہے کہ فیضان علی اور گوہر جہاں اسے رحمان دادا کہتے ہیں۔“
 ”کیپٹن اسمتھ مسکرایا۔ ”میں فطرتاً حاسد نہیں ہوں ورنہ
 مجھے یہ بات کراں گزرتی کہ تم۔۔۔ کچھ عرصے پہلے یہاں
 آئے ہو لیکن اس سارے معاملے کی تحقیقات کا ذرہ دار نہیں
 ہی بنایا گیا ہے۔ مجھے صرف معاونت کرنا ہے تم سے۔“
 ”حقیقت یہی تھی کہ کیپٹن اسٹیورٹ عمر میں بھی کیپٹن
 اسمتھ سے چند سال بڑا تھا اور اس قسم کے معاملات میں اس
 کا تجربہ بھی بہت تھا۔
 ”کیپٹن اسمتھ سنجیدہ ہو کر بولا۔ ”کیا رحمان دادا نے
 اپنے پوتے کو ان روہیلوں کے بارے میں بتایا تھا؟“
 ”سارجنٹ جیکب نے ذہانت سے کام لیتے ہوئے یہ
 سوال براہ راست نہیں کیا تھا۔ گما پھر اگر یہ بات معلوم کی تھی

کہ دادا رحمان نے اپنے گھر میں بھی اس کا ذکر نہیں کیا تھا۔“
 ”رحمان دادا اس معاملے میں جھوٹ بھی بول سکتا ہے۔“
 ”سارجنٹ جیکب کا بیان ہے کہ اس نے رحمان دادا
 کے کلب دلچسپی میں جھوٹ کی ذرا بھی آمیزش محسوس نہیں کی۔
 جس طرح تم نے مجھے بڑے یقین سے بتایا تھا کہ
 ریڈیڈنٹ بلا کے چہرہ شناس ہیں، اسی طرح مجھے بھی
 سارجنٹ جیکب کی غیر معمولی ذہانت کا یقین ہے۔ اسی لیے
 میں سمجھتا ہوں کہ دادا رحمان کا سارا بیان بالکل سچا ہوگا۔“
 ”تو پھر فیضان علی پر نظر رکھنے کا سبب؟“
 ”وہ چونکہ شاہی سپاہ کے ایک رسالے کا سالار ہے
 اس لیے یہ شہ تو کیا جاسکتا ہے کہ اسے کسی اور ذریعے سے ان
 روہیلوں کا علم ہو گیا ہو اور وہ ان سے شاہی خاندان کا انتقام
 لے رہا ہو جس کا وہ نمک خوار ہے اور جس کا نمک خوار اس کا
 دادا بھی رہ چکا ہے۔“
 ”یہ شبہ غلط بھی ہو سکتا ہے۔“
 ”یقیناً ہو سکتا ہے لیکن جب تک کوئی زیادہ مشتبہ شخصیت
 سامنے نہیں آجاتی، اس وقت تک فیضان ہی کو شبہات کے
 دائرے میں رکھنا ہوگا۔ کام شروع تو کرنا ہوگا نا کہیں سے!۔۔۔
 اس کے علاوہ افضال میاں یا افضال خاں کی خفیہ حفاظت سے
 بھی ہم کامیابی سے ہمکنار ہو سکتے ہیں۔“
 ”رحمان دادا کے مالی حالات کیسے ہیں؟“
 ”وہ شاہی محل میں دربان تھا اس لیے اس کے مالی
 حالات اچھے نہیں ہوتے لیکن اس کے بیٹے نے کوئی کاروبار
 کر لیا تھا اور مرنے سے پہلے کاروبار خاصا جمنا بھی لیا تھا۔
 اس کی موت کے بعد وہ کاروبار دادا کے رشتے کے کسی بھائی
 نے سنبھال لیا ہے جو دادا رحمان کے مطابق بہت ایمان دار
 شخص ہے۔ اسی کاروبار کی وجہ سے ان لوگوں کی زندگی
 آسودہ حالی سے گزر رہی ہے۔ فیضان علی صرف شوق میں
 سپاہی بنا ہے۔ وہ اب ایک دستے کا سالار ضرور بن گیا ہے
 لیکن اس کی وجہ سے ان کا گھرانہ آسودہ نہیں ہو سکتا تھا۔
 شاہی خاندان کو ہماری سرکار انگلیشیہ سے بہت مناسب
 وغیرہ نہیں ملتا اس لیے۔۔۔“
 ”یہ تو میں بھی جانتا ہوں۔“ کیپٹن اسمتھ نے کیپٹن
 اسٹیورٹ کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”شاہی سپاہ کو وقت پر
 تنخواہیں نہیں ملتیں۔ بعض مہینے تو ملتی ہی نہیں ہیں۔ اسی لیے
 خاصی سپاہ ملازمت چھوڑ بھی چکی ہے لیکن جو شاہی خاندان کے
 بہت زیادہ وفادار ہیں، وہ اب بھی وفاداری نہا رہے ہیں۔“
 ”کیپٹن اسٹیورٹ کھڑا ہوا۔ ”آؤ ذرا ہم بھی اس وقت

امیر خاں کے بازار کا چکر لگالیں۔ تم میری رہنمائی کرو۔“
 ”وہاں کیوں؟“ کیپٹن اسمتھ نے کھڑے ہوئے
 ہوئے سوال کیا۔ ”اس بازار میں زیادہ تر دکانیں چڑے کا
 کاروبار کرنے والوں کی ہیں۔“
 ”افضل خاں کا چڑے ہی کا کاروبار ہے اور خاصا
 بڑا ہے۔ ایک ہی قطار کی دکانیں ملا کر اس نے ایک
 دکان بنالی ہے۔ اس بازار کے خاتمے ہی پر افضل خاں کا
 گھر بھی ہے۔“
 ”کیپٹن اسمتھ ہنسا۔ ”بہت تیز جا رہا ہے سارجنٹ
 جیکب!۔۔۔ ایک ہی دن میں اس نے یہ سب معلوم کر لیا۔“
 ”نہیں۔“ کیپٹن اسٹیورٹ نے جواب دیا۔ ”وہ کل
 سے سرگرم ہے۔“
 ”وہ دونوں باہر نکلے اور گھوڑوں پر سوار ہو کر امیر خاں
 کے بازار کی طرف روانہ ہو گئے۔
 ☆☆☆
 ”زرتاج گھر سے باہر جانے کے لیے تیار ہو چکی تھی
 جب نجم النساء نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ ”پاکلی
 منگوائی ہے تم نے؟“
 ”جی۔“ زرتاج نے کہا۔ ”میں نے آپ کو بتایا تو
 تھا۔ گوہر نے بلایا ہے مجھے۔ اس کا ملازم آیا تھا۔ دیکھا تو تھا
 آپ نے!“
 ”میں اس وقت جلدی میں تھی۔ دایہ بیگم نے بلایا تھا
 مجھے۔ تم سے کہتی ہوئی تھی کہ اب دن ڈھل رہا ہے۔ جلدی
 بھی دایہں آؤ گی تو اندر سے اچھل چکا ہوگا کل صبح چلی جانا۔“
 ”گوہر کا ملازم کہہ رہا تھا کہ کوئی بہت ضروری بات
 ہے۔ مجھے جانا ہی چاہیے۔“
 ”فیضان سے ملنے کو نہیں جاری ہو؟“
 ”کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ!“ زرتاج نے ہلکی سی
 ہنسی کے ساتھ بڑے پیار سے نجم النساء کے گردن میں ہاتھیں
 ڈالتے ہوئے کہا۔ ”اگر فیضان کی بات ہوتی تو میں آپ
 سے چھپاتی کیوں!“
 ”یہ نجم النساء کے علم میں آچکا تھا کہ زرتاج اور فیضان
 ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ اس کا علم فیضان کی
 بہن گوہر کو بھی تھا۔ ان تینوں نے ایک ہی مکتب میں تعلیم
 حاصل کی تھی۔ بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ زرتاج اور فیضان کی
 انسیت بڑھتی رہی تھی اور جوان ہوتے ہوئے وہ ایک
 دوسرے کو شہت سے چاہنے لگے تھے۔ ان کی شادی بھی
 ہو جاتی لیکن دو دو جوہ سے اب تک یہ معاملہ اس حد تک آگے

نہیں بڑھ سکا تھا۔
 زرتاج کی پاکلی جب دادا رحمان کے گھر پہنچی تو گوہر
 بڑی بے چینی سے اس کی منتظر تھی۔ اس نے حسب معمول
 زرتاج سے پٹ کر اس کا استقبال کیا۔ عمر میں وہ زرتاج
 سے تین چار سال چھوٹی تھی لیکن دونوں نہایت بے تکلف
 سہیلیوں کی طرح ملتی تھیں۔ گوہر کو زرتاج اور فیضان کی
 محبت کا علم بہت شروع ہی میں ہو گیا تھا اور تب سے تو وہ
 زرتاج کو بے حد چاہنے لگی تھی۔
 ”گوہر نے کہا۔ ”بھیاب آتے ہی ہوں گے۔“
 ”اس کا مطلب!“
 ”بہت صبح وقت پر آئیں!“ زرتاج بولی۔
 ”تمہارے ملازم نے تو بتایا تھا کہ تمہیں ہی مجھ سے کوئی
 خاص بات کرنا ہے۔ مجھے خیال آیا تھا کہ تم اپنے منگیتر کے
 بارے میں کوئی بات کرنا چاہتی ہو گی۔“
 ”گوہر کی منگنی ہو چکی تھی لیکن وہ اس معاملے میں خوش
 نہیں تھی اور کسی باعث چاہتی تھی کہ اس کی منگنی ٹوٹ جائے۔
 ”نہیں، میری کوئی بات نہیں ہے۔“ گوہر نے سنجیدگی
 سے کہا۔ ”بھیابی نے آج گھر سے جاتے وقت مجھ سے کہا تھا
 کہ تمہیں اس وقت بلوالوں۔ تو۔۔۔ شاید وہ آ ہی گئے۔“
 ”کسی گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز گھر کے قریب آ کر
 رکی تھی۔“
 ”فیضان!“ زرتاج نے تعجب سے کہا۔ ”اس
 وقت؟۔۔۔ کیا بات ہو سکتی ہے کہ۔۔۔۔۔“
 ”بات کا مجھے نہیں معلوم۔“ گوہر نے زرتاج کی
 بات کاٹتے ہوئے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ”بس اتنا اندازہ
 ہے کہ انہوں نے صرف چامت میں تمہیں دیکھنے کے لیے
 نہیں بلایا ہے، کوئی خاص بات ہے۔ وہ بہت ہی سنجیدہ اور
 فکر مند تھے آج صبح۔ انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ جب وہ تم
 سے ملیں تو میں کمرے سے چلی جاؤں۔ ویسے تو تم سے
 ملاقات کے وقت ان کی خواہش یہی ہوتی ہے کہ میں تم
 دونوں کو تنہا چھوڑ دوں لیکن ایسی خواہش کے وقت مجھ سے
 کچھ چھیننے بھی لگتے ہیں لیکن آج جب انہوں نے مجھ سے یہ
 بات کی تھی تو مجھ سے نظریں بھی نہیں چرائی ہیں۔“
 ”ایسا کیا معاملہ ہو سکتا ہے۔“ اب زرتاج بھی فکر مند ہوئی۔
 ”تم بٹھو تو!“ زرتاج ابھی تک کھڑے کھڑے
 باتیں کرتی رہی تھی۔ وہ بیٹھ گئی۔ ”بھیابی ہیں۔“ گوہر نے
 تیزی سے قریب آتے ہوئے قدموں کی آہٹ سن کر کہا۔
 ”فیضان کمرے میں بھی بہت تیزی سے آیا تھا۔ وہ سپاہ

کی وردی میں تھا۔
”بھیا!“ گوہر بولی۔ ”میں ادھر کا شربت بھجوانی ہوں ملازمہ سے۔“

زرتاج کو ادھر کا شربت بہت پسند تھا۔
فیضان کے چہرے پر ایسے تاثرات قائم رہے جیسے اس نے گوہر کی بات سنی ہی نہ ہو۔ وہ زرتاج کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”میں اس وقت سے پہلے گھر آ نہیں سکتا تھا ورنہ تمہیں دن ہی میں بلواتا۔ اچھا ہوا کہ تم آ چکی ہو۔ میں گھر آتے ہوئے سوچتا رہا تھا کہ تمہیں نہیں دیر نہ ہو جائے۔ ویسے تو اب بھی تم گھر لوگو گی تو اندھیرا ہو چکا ہوگا۔ مجھے تمہاری پاکلی کے ساتھ جانا تو ہوگا لیکن پھر بھی میں چاہتا تھا کہ زیاہ رات نہ ہو جائے۔“
گوہر کمرے سے جا چکی تھی۔

”آخر بات کیا ہے فیضان؟“ سرتاج بولی۔
”کل ایک بات میرے علم میں آئی تھی۔ دادا نے مجھے اس وقت بتایا تھا جب وہ خاصی رات کو بچھڑی کھیل کر بیٹھک سے گھر میں آئے تھے۔ انہوں نے مجھے سارا معاملہ سرسری انداز میں بتایا تھا۔ ان کا حراج تو ایسا ہی ہے۔ ان کے لیے اس کی خاص اہمیت بھی نہیں تھی اور کبھی بات یہ ہے کہ اس کی کوئی خاص اہمیت ہے بھی نہیں لیکن اچانک میرے دماغ میں ایک ایسا خیال آیا کہ میری آنکھوں سے نیند اڑ گئی۔ تجربہ کار گستاخ رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر سوکا۔ نہ جانے کیوں یہ خیال کل ہی رات میرے ذہن میں آیا۔ پہلے بھی اس طرف دھیان ہی نہیں گیا تھا۔“
”بات تو بتاؤ!“ زرتاج نے پہلو ہلا دیا۔ ”پہیلیاں سی بھجوا رہے ہو۔“

”دو دن پہلے ایک روپیہ کا قتل ہوا ہے۔“ فیضان نے سرتاج کے چہرے پر نظر سگڑتے ہوئے کہا۔ ”اس کا نام صفدر خاں تھا۔ دادا نے ہی انگریز پولیس والوں کو بتایا تھا کہ وہ لاش صفدر خاں روپیہ کی تھی۔ اسی شناخت کی وجہ سے کل صبح ایک سار جنت ان سے پوچھنے کے لیے آیا تھا کہ انہوں نے صفدر خاں کی لاش کیسے شناخت کر لی جبکہ دہلی کے لوگ جانتے ہی نہیں کہ روپیہ ابھی یہاں آباد ہیں۔“

”پھر؟“
”دادا نے انہیں سب کچھ بتا دیا۔“
”کیا بتا دیا؟“
”یہ تم بھی جانتی ہو، اور یہ بھی جانتی ہو کہ دادا انجوانی ہی سے شراب نوشی کے عادی ہیں۔ دادی کو اس کا علم شروع

ہی سے ہے لیکن میرے پیدا والی کے بعد انہوں نے شراب نوشی کم کر دی تھی۔ بس رات کو بیٹھک میں اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر پیا کرتے تھے اور رات کو خاصی دیر سے بیٹھک سے گھر کے اندرونی حصے میں آیا کرتے تھے۔ اب بھی ان کا یہی معمول ہے۔ دن میں شاذ و نادر ہی ایسا ہوتا ہے کہ وہ بیٹھک میں کسی دوست کے ساتھ بیٹھ کر بیٹھ لیں۔ غالباً سو یا ڈیڑھ سال پہلے کی بات ہے کہ انہوں نے دن میں بیٹھ کر دماغ اتارنے کا قابو ہوا تھا کہ انہوں نے احتیاط بھی نہیں برتی تھی۔ میرا مطلب ہے کہ وہ پینے کے بعد گھر کے اندرونی حصے میں بھی آ گئے تھے۔ وہ پھر کا وقت تھا اور ہم لوگ کھانا کھا رہے تھے۔ تم اس روز صبح ہی سے آئی ہوئی تھیں۔ کھانے کے وقت تم نے اپنے گھر جانے کا ارادہ کر لیا تھا لیکن گوہر کے شدید اصرار پر رک گئی تھیں۔ دادا گھر میں آنے کے بعد ہم لوگوں کے ساتھ کھانے میں شریک ہو گئے تھے۔“

زرتاج بچپن ہی سے فیضان کے گھر میں آیا کرتی تھی بلکہ کبھی کبھی اس کی والدہ اور دادی بھی آ کر رہتی تھیں۔ ذیشان اور اس کے گھر والے بھی زرتاج کے گھر آیا کرتے تھے اور اسی پرانے گھر کی قسم کے تعلقات کے باعث دونوں گھروں میں خواتین کے پردے کا اہتمام باقی نہیں رہا تھا۔ جس دن کی بات فیضان نے چھیڑی تھی، اس دن بھی دادا رحمان اندر آ کر بے تکلفی سے کھانے میں شریک ہو گئے تھے جبکہ زرتاج بھی موجود تھی۔

فیضان نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”نٹے کی وجہ سے دادا کھانے کے دوران میں مسلسل بولتے رہے تھے۔ دنیا جہان کی باتیں کر ڈالی تھیں انہوں نے۔ ان بارہ روپیوں کے بارے میں بھی بتایا تھا جو غلام قادر خاں کے ساتھی تھے اور دہلی کے مختلف محلوں میں رہ رہے تھے۔ انہوں نے دہلی میں کسی پر ظاہر نہیں کیا تھا کہ وہ روپیہ ہیں لیکن دادا نے انہیں اس لیے پہچان لیا تھا کہ غلام قادر خاں کے حملے کے وقت وہ شاہی محل میں دربان کی حیثیت سے ملازم تھے۔ انہوں نے انگریز سار جنت کو بھی یہ سب کچھ بتا دیا تھا۔“

”ظاہر ہے کہ جب سار جنت نے پوچھ چھ کی ہوگی تو انہوں نے بتایا ہی ہوگا۔“ زرتاج نے تنجید کی سے کہا۔ ”یہ میں بھی جانتی ہوں کہ وہ بھی جھوٹ نہیں بولتے۔ انہوں نے اپنی ساری زندگی میں شاید مصلحت بھی کبھی جھوٹ نہیں بولا ہوگا۔“
فیضان نے زرتاج کی بات سنی ہی کرتے ہوئے کہا۔ ”ان بارہ میں سے دس روپیوں کو گزشتہ گیارہ بیٹوں

میں قتل کیا جا چکا ہے۔ ایک چند ماہ قبل دہلی سے چلا گیا ہے لیکن بارہواں اب بھی دہلی میں ہے۔“

”تم ان باتوں سے پریشان کیوں ہو رہے ہو؟“
”سار جنت نے دادا سے پوچھا تھا کہ انہوں نے پہلے کسی بھی کو ان روپیوں کے بارے میں بتایا تھا اور دادا نے جواب دیا تھا کہ انہوں نے کبھی کسی کو نہیں بتایا۔“

زرتاج نے ایک طویل سانس لی۔ ”انہوں نے یہ جھوٹ کیسے بول دیا۔ تم نے ابھی جس دن کا ذکر کیا ہے، اس دن انہوں نے کھانے کے دوران میں ہم بھی کو بتا دیا تھا۔“
”میں جانتا ہوں کہ وہ کبھی بھی قیمت پر کسی سے جھوٹ نہیں بول سکتے۔ دراصل انہیں یاد ہی نہیں رہا ہوگا کہ وہ ہم لوگوں کو بتا چکے ہیں۔ وہ اس وقت خاصے نشے میں تھے۔ مجھے یقین ہے کہ انہیں اس دن کی کوئی اور بات بھی یاد نہیں رہی ہوگی۔ انہوں نے سار جنت سے یہ بھی کہا تھا کہ انہوں نے اپنے گھر والوں تک کو ان روپیوں کے بارے میں کبھی نہیں بتایا۔ جب انہوں نے مجھے سار جنت سے اپنی اس گفتگو کے بارے میں بتایا تو مجھے یہ کھاتا تھا کہ میں تمہیں بھی ان روپیوں کے بارے میں اب اس لیے بتا رہا ہوں کہ جب سار جنت کو بتا چکا ہوں تو تم سے کیوں چھپاؤں۔“

”میری مجھ میں اب بھی نہیں آ رہا ہے کہ مجھے یہ سب کچھ بتانے کے لیے تم اتنے بے چین کیوں تھے؟“
”اس کی اصل وجہ بتانے سے پہلے میں تم کو بھی بتا دوں کہ آج ابھی جب میں گھر آیا تھا تو ایک انگریز عورت یا لڑکی بہت دور دراز کریمہ راقبہ کر رہی تھی۔“

”کیوں؟“ زرتاج تیزی سے بولی۔
”شاید دادا کی اس بات پر یقین نہیں کیا گیا کہ انہوں نے اپنے گھر والوں کو بھی ان روپیوں کے بارے میں نہیں بتایا۔ سار جنت کی باتوں سے دادا نے اندازہ لگایا ہے کہ انگریزوں کے شے کے مطابق ان روپیوں کو قتل کروانے میں شاہی خاندان کا ہاتھ ہو سکتا ہے اور اس کام کے لیے وہ کسی کو اپنا آلہ کار بنا سکتے ہیں۔ میں کیونکہ شاہی دستے کا سالار ہوں اس لیے شاید انہیں یہ شبہ ہو گیا ہے کہ شاہی خاندان کا آلہ کار بھی میں سلنا سکوں۔ انہوں نے اپنے جھگے کی کسی عورت کو میری نگرانی پر لگا دیا ہے۔“

”اس میں بھی مجھے ایسی کوئی بات نظر نہیں آتی جو تمہاری پریشان کا سبب ہو۔ ظاہر ہے کہ ان روپیوں کو تم نے قتل نہیں کیا ہوگا لہذا کچھ عرصے تک تمہاری نگرانی کے بعد یہ فرنگی مطمئن ہو جائیں گے۔“

”بے شک میں نے ان روپیوں کو قتل نہیں کیا۔ لیکن شاید.....“ فیضان نے تذبذب کے ساتھ کہا۔ ”تم نے قتل کیا ہے ان روپیوں کو۔“

یکلخت زرتاج کا چہرہ جیسے پتھر ا گیا۔ وہ پلکیں جھپکائے بغیر فیضان کو دیکھنے لگی، پھر اس نے کھوکھلی سی آواز میں کہا۔ ”یہ عجیب خیال تمہیں کیسے آ گیا فیضان؟ میں یہ قتل کیسے کر سکتی ہوں.....؟ اور کیوں کروں گی؟“

اس سے پہلے کہ فیضان جواب میں کچھ کہتا، ایک ملازمہ دسک دے کر اندر آئی۔ گوہر نے اس کے ہاتھوں ادھر کا شربت بھجوا دیا تھا۔

جب ملازمہ چلی گئی تو فیضان نے دھیمی آواز میں کہا۔ ”یہ تو میں نہیں جانتا کہ تم یہ قتل کیسے کر سکتی ہو اور نہ یہ جانتا چاہتا ہوں کہ تم ایسا کیوں کرو گی لیکن یہ خیال مجھے اس لیے آیا کہ جب دادا نے ان روپیوں کے بارے میں ہمیں بتایا تھا، اس کے ایک یا ڈیڑھ ماہ بعد ہی تم نے مجھ سے کہا تھا کہ تمہیں پتہ چلا نا سکھاؤں، مجھے تمہاری اس خواہش پر بھی آئی تھی لیکن تم نے اپنی خواہش کا جواز یہ بتایا تھا کہ انجی تو شہر کے حالات ٹھیک ہی ہیں لیکن دہلی پر آفات کا نزول اچانک ہی ہوتا رہتا ہے اور کیونکہ اپنے والد کے انتقال کے بعد تم صرف اپنی والدہ اور نانی کے ساتھ رہتی ہو اور گھر میں کوئی مرد نہیں رہا اس لیے تم احتیاطاً پتہ چلا نا سیکھنا چاہتی ہو تاکہ اگر چانک حالات خراب ہوں اور تمہارے گھر پر کوئی مصیبت آئے تو تم اپنی حفاظت کے لیے کچھ تو کر سکو۔“

فیضان خاموش ہوا تو زرتاج بولی۔ ”اور کچھ؟“
”مجھے یہ ظاہر کرنے کی اب کوئی ضرورت نہیں کہ میں تمہیں کتنا چاہتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ تمہارے شدید اصرار کے بعد میں نے تمہاری بات مان لی تھی۔ میں تمہیں شہر سے باہر ایک ویرانے میں لے جایا کرتا تھا۔ وہاں میں نے تمہیں پتہ چلا نا بھی سکھا اور ننانو بازی کی مشق بھی کرائی۔“

”یہ سب تو میں بھی جانتی ہوں۔ کیا صرف اسی وجہ سے تمہیں یہ خیال آیا ہے کہ ان روپیوں کو میں نے مارا ہوگا؟“
”نہیں۔“ فیضان نے تنجید کی سے کہا۔ ”جب تم نے مجھ سے پتہ چلا نا سیکھنے کی خواہش ظاہر کی تھی، اس کے بعد سے اب تک کئی مرتبہ میں نے محسوس کیا کہ تم روپیوں سے شدید نفرت کرنے لگی ہو۔ اس کے علاوہ ایک بات اور..... ہمارے گھر والوں کو ہماری شادی پر کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن ابتدا میں خود ہی اس معاملے کو نالٹا رہا۔ میری خواہش تھی کہ میں جب سپاہ میں کوئی اچھا مقام حاصل

کروں، اس کے بعد ہی ہماری شادی ہو۔ پھر جب تم نے پتول چلا نکلنے کی خواہش ظاہر کی تھی تو میں ایک دستے کا سالار بن چکا تھا اور شادی کے لیے تیار تھا لیکن اس کے بعد تم نے شادی سے گریز کرنا شروع کر دیا۔ دو تین بار تم نے یہ کہا کہ سال بھر اور پھر جاؤ۔ جب بھی میں نے یہ پوچھا کہ سال بھر میں کیا ہو جائے گا تو تم نے کوئی واضح جواب نہیں دیا۔ گھما پھرا کر بات ٹال گئیں۔ اسی لیے دادا سے بات کرنے کے بعد جب سے مجھے یہ خیال آیا کہ ان روہیلوں کو مارنے والی شاید تم ہو، مجھی سے مجھے یہ خیال بھی آنے لگا کہ سال بھر کی مہلت تم شاید اس لیے چاہتی تھیں کہ اپنے خیال کے مطابق سال بھر میں تم ان روہیلوں کو ختم کر چکی ہوگی۔

”مجھے اب بھی حیرت ہو رہی ہے کہ تمہیں یہ خیال کیوں آیا۔ آخر میں ان روہیلوں کو کیوں مارنا چاہوں گی؟“

”اسی سوال کا جواب مجھے اپنے دل و دماغ سے نہیں مل رہا تھا اور نہ اب مل رہا ہے۔ میں اپنے دماغ میں آنے والے اس خیال سے خود بھی پریشان تھا۔ نہ صرف پریشان بلکہ بہت بے چین۔ اسی لیے میں نے گوہر سے کہا تھا کہ وہ تمہیں کسی طرح بھی آج ہی بلوائے۔ میں یہ باتیں کرنے کے لیے تمہارے گھر بھی آسکتا تھا لیکن وہاں شاید تمہاری والدہ بھی ہمارے ساتھ بیٹھی رہتیں۔ مجھے سکون سے یہ باتیں کرنے کا موقع شاید نہ ملتا۔ یہاں تو میں گوہر سے کہہ سکتا تھا اور میں نے اس سے کہہ بھی دیا تھا کہ وہ ہمیں تنہا چھوڑ دے۔ آج کل دادی بیمار رہنے لگی ہیں اس لیے اپنے کمرے تک محدود ہو گئی ہیں اور دادا گھر میں نلتے ہی کب ہیں۔ شہر میں گھومتے پھرتے رہتے ہیں یا اپنی بیٹھک میں شطرنج جمائے رہتے ہیں۔ اس وقت بھی وہ نہیں گئے ہوئے ہیں۔“

زرتاج کے چہرے پر سوچ بچار کے تاثرات قائم رہے۔ وہ بولی۔ ”کیا تمہیں یقین ہے کہ ان روہیلوں کو میں نے مارا ہوگا؟“

”یقین کی بات تو میں نے شروع سے اب تک نہیں کی۔ بس اپنے شبے کی وجہ سے میں بے چین رہا ہوں۔ تمہیں اسی لیے بلوایا تھا کہ تم خود ان وارداتوں سے اپنی لا تعلقی ظاہر کرو تا کہ میری بے چینی ختم ہو جائے۔ اس کا مجھے یقین ہے کہ تم مجھ سے کوئی بات چھاؤ۔ جیسے اب تک تم نے یہ نہیں بتایا کہ سال بھر سے تم نے شادی سے گریز کرنا کیوں شروع کر دیا ہے۔“

”ہاں فیضان! میں تم سے جھوٹ نہیں بول سکتی۔“

زرتاج نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔ ”ان روہیلوں کو میں نے ہی قتل کیا ہے۔“

”کیا؟“ فیضان کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وہ ہکا بکا سا نظر آنے لگا تھا۔

”کیوں؟“ زرتاج پھیکے سے انداز میں مسکرائی۔

”تم جو شبہ کر رہے تھے، اسے اب میں یقین میں بدل رہی ہوں تو حیران کیوں ہو گئے؟“

”میں..... میں.....“ فیضان جیسے ہکلا کر رہ گیا۔

”ہاں، ہاں، بولو!“

”میں تم سے..... میں تم سے..... ہاں..... میں اس جواب کی توقع نہیں کر رہا تھا۔ اپنے شبے کے باوجود میرا خیال تھا کہ تم ان وارداتوں سے اپنی لا تعلقی کا اظہار کر دو گی اور میری بے چینی ختم ہو جائے گی۔“

”میں نے ابھی کہا تھا نا..... میں تم سے جھوٹ نہیں بول سکتی۔“

”مگر کیوں؟ کیوں زرتاج.....؟ تم نے آخر ایسا کیوں کیا؟..... اور پھر یہ سب کچھ تو بہت خطرناک تھا۔ تمہاری زندگی بھی خطرے میں پڑ سکتی تھی۔ تم گرفتار بھی ہو سکتی تھیں۔“

”سب سوچ لیا تھا میں نے..... یہ فیصلہ کرتے وقت میرے دماغ میں یہ خیال یقیناً آ گیا تھا کہ اس طرح میں اپنی زندگی داؤ پر لگاؤں گی مگر ان کو تو ختم کرنے کے لیے میں اپنی جان پر کھیلنے کے لیے تیار ہو گئی تھی۔“ زرتاج کے لہجے میں شدید نفرت عود کر آئی۔ ”اب ایک افضال خاں باقی رہ گیا ہے۔ میں اسے بھی ختم کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے رنج ہے کہ ان بارہ میں سے ایک یہاں سے کہیں بھاگ گیا ہے۔ کاش مجھے ان سب روہیلوں کا پتا چل سکتا جو غلام قادر کے ساتھ تھے۔ اگر وہ سب ابھی زندہ ہوں اور مجھے ان کا پتا چل جائے تو میں انہیں ختم کرنے کے لیے دنیا کے آخری سرے تک جانے کے لیے تیار ہوں۔ چاہے اس مقصد کے لیے میری ساری زندگی ختم ہو جائے یا کوئی مجھے ہی ہلاک کر دے۔“

فیضان کے چہرے پر جرت کے تاثرات میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ”تمہیں ان سے نفرت کیوں ہے زرتاج؟“ وہ بولا۔ ”آئی نفرت تو شاہ عالم ثانی کی کسی اولاد ہی کو ہو سکتی ہے۔“

”ہاں فیضان!“ زرتاج آب دیدہ ہوئی۔ ”میں بد نصیب ایک مغل شہزادی ہی ہوں۔“

ایک بار پھر فیضان کے چہرے سے ایسا لگا جیسے وہ

دوصفات

پطرس بخاری کے کسی عزیز کا نکاح تھا۔ اس کے لیے مولوی درکار تھا۔ تلاش بسیار کے بعد ایک مولوی صاحب کو ڈھونڈ کر لایا گیا جو بہت دہلا پٹلا تھا۔ پطرس بخاری صاحب اس کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور برجستہ بولے۔

”نکاح کے لیے دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک نکاح خواں کی اور دوسرے چھوڑے کی۔ ماشا اللہ ان صاحب میں دونوں صفات موجود ہیں۔“

حاضر دماغی

شوہر گھر آیا۔ تو اپنی بیوی کے پاس زمانے بھر کی برائیاں بڑھا چڑھا کر بیان کرنے والی حاکم بی بی کو بیٹھا دیکھا۔ وہ تیوری چڑھا کر اوپر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ کچھ دیر بعد شوہر نے اوپر سے ہی بلند آواز میں پوچھا۔ ”کیا وہ چڑیل جلی کی ہے؟ یا ابھی بیٹھی ہے۔“ بیوی نے حاضر دماغی سے کام لیا اور کہا۔ ”وہ تو کب کی جا چکی ہے اس وقت میرے پاس سز صوف بیٹھی ہیں۔“

پندرہ دن بعد

تیز کار چلانے کے جرم میں ایک مالدار شخص کو جج نے پندرہ دن قید یا دو ہزار روپے جرمانے کی سزا سنائی۔ مالدار شخص نے سزا قبول کر لی۔ جب اسے کبوتی کا طعنہ دیا گیا تو اس نے وضاحت کی۔ دراصل میری بیوی نے کہا ہے کہ باورچی پندرہ دن بعد آئے گا۔

حکایت سعدی

ایک دیہاتی کو میں نے لہرہ کے جوہری بازار میں دیکھا۔ اس نے بتایا کہ ایک دن میں جنگل میں راستہ بھول گیا تھا اور میرے پاس کھانے کی کوئی چیز نہیں تھی اور مجھے اپنی موت کا یقین ہو گیا کہ اچانک میں نے ایک ٹھیلی پائی جو موتیوں سے بھری ہوئی تھی..... میں ہرگز اس خوش گوشت بھول سکتا کہ میں سمجھا اس میں بیٹھے ہوئے گندم ہیں۔ پھر میں اس ناامیدی کو نہیں بھول سکتا جب مجھے معلوم ہوا کہ اس میں تو موتی ہیں۔

مرسلہ: ریاض بٹ، حسن ابدال

ہکا بکا رہ گیا ہو۔

زرتاج کی آنکھوں سے دو آنسو ٹپک گئے۔ ”میں شاہ عالم ثانی کی چھوٹی بہن شہزادی مہرالنسا کی اولاد ہوں۔ میری ماں شہزادی مہرالنسا کی بیٹی تھیں۔“

فیضان گنگ سا ہو گیا تھا اور زرتاج کو کنگے جا رہا تھا۔

☆☆☆

جن دنوں شاہ عالم ثانی الہ آباد میں انگریزوں کی حراست میں اور انگریزوں کے بقول ان کی حفاظت میں تھا، انہی دنوں اسے یہ اطلاع تو مل چکی تھی کہ روہیلے شاہی محل پر قابض ہو گئے تھے اور روہیلوں کے سردار ضابطہ خاں نے اس کی چھوٹی بہن شہزادی مہرالنسا کو بے آبرو کر دیا تھا لیکن اس معاملے کی ساری تفصیل اسے اس وقت معلوم ہوئی تھی جب وہ مرہٹوں کی مدد سے دہلی پہنچے اور مرہٹوں ہی کی مدد سے روہیلوں کو ختم کر کے تخت شاہی پر متمکن ہو سکا تھا۔

اس معاملے کی تفصیلات اسے دایہ بیگم سے معلوم ہوئی تھیں۔ دایہ بیگم شاہی محل کی ایک کنیز تھیں۔ ان کا اصل نام تو ”کچھ اور تھا لیکن بروقت ایک دایہ نہ ملنے کے باعث ایک شہزادی کی زچگی انہوں نے ہی کرانی تھی۔ اسی باعث شاہ عالم ثانی کی بیوی نے ان کو دایہ بیگم کا لقب دیا تھا۔

دایہ بیگم نے شاہ عالم ثانی کو بتایا تھا کہ ضابطہ خاں سے بے آبرو ہونے کے بعد شہزادی مہرالنسا کتنے کی سی حالت میں چلی گئی تھیں۔ ان دنوں روہیلوں کی وجہ سے سب صرف اپنی اپنی فکر میں رہتے تھے۔ شہزادی مہرالنسا کا خیال صرف دایہ بیگم نے رکھا تھا کیونکہ ان دنوں میں وہی شہزادی مہرالنسا کی کنیز خاص تھیں۔ دو ڈھائی ماہ گزرنے کے بعد دایہ بیگم کو اس وقت پھر شدید صدمہ ہوا جب یہ بات ان کے سامنے آئی کہ ضابطہ خاں سے بے آبرو ہونے کے باعث شہزادی مہرالنسا حاملہ ہو چکی تھیں.....

خود شہزادی مہرالنسا کو تو کسی بات کا احساس اور ہوش ہی نہیں رہا تھا۔ وہ صرف ایک کمرے تک محدود بلکہ مقید ہو کر رہ گئی تھیں۔ اسی عالم میں انہوں نے ایک بچی کو جنم دیا۔ زچگی بھی دایہ بیگم نے کرانی تھی اور بعد ازاں بچی کی دیکھ بھال بھی انہیں ہی کرنا پڑی تھی۔ بچی کی پیدائش کے چند دن بعد ہی شہزادی مہرالنسا وحشت کے عالم میں کمرے سے نکل گئی تھیں۔ دایہ بیگم اس وقت بچی کی دیکھ بھال میں مصروف تھیں اگر وہ دیکھ لیں تو یقیناً بچی کو گود میں لیے لیے شہزادی مہرالنسا کے پیچھے پیچھے جاتیں۔ وہ انہیں کبھی مل بھر کے لیے بھی تنہا نہیں چھوڑتی تھیں۔ شہزادی مہرالنسا محل میں نہ جانے

کہاں کہاں بھٹکتی پھریں اور پھر انہوں نے وحشت میں کسی بلند جگہ سے نیچے چلائی لگا دی۔ ان کا سر پھٹ گیا اور وہ اس دار فانی سے کوچ کر گئیں۔

دایہ بیگم نے اس کے بعد بھی دل و جان سے اس بچی کی دیکھ بھال کی۔ وہ اسے گود میں لیے لیے پھرا کرتی تھیں۔ محل میں اسے شہزادے، شہزادیاں اور شہزادوں کی بیویاں اور ان کے بچے تھے کہ کسی نے ان سے پوچھا بھی نہیں کہ وہ کس شہزادے کی بچی کو گود میں لیے پھرا کرتی ہیں۔ شاہی خاندان کے صرف دو چار افراد اس بچی کی حقیقت کا علم تھا مگر وہ بھی اس معاملے میں خاموش رہتے تھے۔

شاہ عالم ثانی جب دہلی پہنچے تھے اور انہیں ان سب باتوں کا علم ہوا تھا تو وہ بے حد رنجیدہ خاطر ہوئے تھے۔ اس وقت بچی کی عمر دو سال ہو چکی تھی۔ شاہ عالم ثانی اپنی عزیز بہن کی اس بچی کو اپنی گود میں لے کر آئے تو بہاتے رہے۔ انہوں نے ہی اس بچی کا نام نجم النسا رکھا تھا اور دایہ بیگم کو تاکید کی تھی کہ وہ اس بچی کی پیدائش کا معاملہ ہمیشہ راز میں رکھیں اور جب بچی کچھ بھنے بھنے لگے تو وہ اس پر یہی ظاہر کریں کہ وہ انہی کی بیٹی ہے۔

خود شاہ عالم نے بھی خاندان کے کسی فرد پر یہ راز افشا نہیں ہونے دیا، اس معاملے میں اپنی زبان پر گویا قفل ڈال لیا۔

لیکن جب نجم النسا چودہ سال کی ہو گئی تو اسے اپنی حقیقت کا علم خاندان کے ان دو چار افراد کی باتیں سن کر ہوا جو اس سارے معاملے سے واقف تھے۔ نجم النسا کو خاصا ڈہنٹی جھٹکا لگا اور جب اس نے اپنے بارے میں یہ سوال دایہ بیگم کے سامنے رکھا تو وہ جیسے شکل ہو کر رہ گئیں اور ان کی نظریں جھمک گئیں۔ ان میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ شاہی خاندان کے جن افراد کی وجہ سے نجم النسا کو حقیقت کا علم ہوا تھا، انہیں جھوٹا قرار دے سکتیں۔ جب انہی کے ذریعے شاہ عالم ثانی کو سارے معاملے کا علم ہوا تو وہ خاندان کے ان لوگوں سے اتنا ناراض ہوئے کہ انہیں زندان میں ڈلوادیا تاکہ ان کی وجہ سے اس راز کا علم مزید لوگوں کو نہ ہو سکے۔

نجم النسا نے رورور کر اپنا راز حال کر لیا۔ اس سے شاہ عالم ثانی کی محبت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ جب بھی موقع ملتا تھا، وہ نجم النسا کو سمجھانے کی کوشش کرتے تھے کہ اس کی پیدائش کا سبب کچھ بھی سہی لیکن بہر حال وہ ایک مغل شہزادی ہی کے بطن سے پیدا ہوئی تھی۔

چند دن بعد نجم النسا کی آنکھوں کے آنسو خشک

ہو گئے لیکن وہ ہمہ وقت اداس رہنے لگی، بھونکی بھونکی سی اور چپ! محل میں رہنے والا ایک شہزادہ نجم النسا کو پسند کرنے لگا تھا۔ وہ فوسن مثل بادشاہ فرخ سیر کی نسل سے تھا۔ جب نجم النسا پندرہ سال کی ہوئی تو شہزادے کی پسند شدید چاہت میں بدل چکی تھی۔ اس کا علم جب شاہ عالم ثانی کو ہوا تو اس نے فیصلہ کیا کہ نجم النسا جب اور بڑی ہو جائے گی تو وہ اس کی شادی اسی شہزادے سے کرادے گا۔

شاہ عالم ثانی مرہٹوں کی مدد سے تخت شاہی پر بیٹھ کر تھا مگر نام ہی کا بادشاہ تھا۔ محض معنوں میں اس کی حکومت قصر شاہی سے باہر نہیں تھی۔ سارے شہر دہلی پر مرہٹوں کے سردار سندھیا ہی کا راج تھا۔ بعض اوقات مرہٹے شاہی محل میں بھی کھس آتے تھے اور شاہ عالم ثانی اتنا بے بس تھا کہ ان مرہٹوں کو روک ٹوک بھی نہیں سکتا تھا۔

جب نجم النسا کی عمر پندرہ سال ہو چکی تھی تو اس کے ساتھ بھی وہ حادثہ ہوتے ہوئے رہ گیا جو اس کی ماں شہزادی مہر النسا کے ساتھ ہو چکا تھا۔ ایک مرہٹے نے نجم النسا پر دست دراز کی کوشش کی تھی مگر تین وقت پر شاہ عالم ثانی وہاں پہنچ گیا تھا اور جو ان مرہٹہ گھبرا کر بھاگ کھڑا ہوا تھا۔

بعد میں شاہ عالم ثانی نے اس کی شکایت سندھیا سے بھی کی تھی لیکن نتیجے میں سندھیا نے اس مرہٹے کو معمولی سی سزائش کی تھی، اسے کوئی سخت سزا نہیں دی تھی۔ اس پر یہ پابندی بھی نہیں لگائی تھی کہ اب وہ بھی شاہی محل میں داخل نہیں ہوگا۔

اس صورت حال نے شاہ عالم ثانی کو بے حد فکر مند کر دیا تھا۔ اسے اندیشہ تھا کہ وہ مرہٹہ پھر بھی کسی موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کر سکتا تھا۔ ایسی اندوہناک صورت حال سے بچنے کے لیے شاہ عالم ثانی نے اپنے دل پر پتھر رکھ کر ایک ایسا فیصلہ کیا کہ اب دیدہ بھی ہو گیا۔ اس نے بہت خفیہ طور پر نہایت سادگی کے ساتھ نجم النسا کا نکاح اس شہزادے سے کرادیا جو اسے چاہتا تھا اور یہ ہدایت بھی کی کہ وہ دایہ بیگم کے ساتھ چوری چھپے شاہی محل سے چلے جائیں اور شہر میں عام لوگوں کی طرح زندگی گزاریں۔

شاہ عالم ثانی کو دایہ بیگم کی وفاداری پر مکمل بھروسہ تھا۔ اس نے مکمل حد تک کچھ رقم اور ہیرے جواہرات دایہ بیگم کو دیے تھے تاکہ ان تینوں کے لیے زندگی گزارنے کا سہارا ہو، اور ہیرے جواہرات بچ کر شہزادہ کوئی چھوٹا موٹا کاروبار بھی شروع کر سکتا تھا۔

نجم النسا تو اس واقعے کی وجہ سے دہشت زدہ ہو گئی تھی جو اس کے ساتھ ہوتے ہوئے رہ گیا تھا اور شہزادے کو عمل چھوڑنے میں اس لیے تامل نہیں تھا کہ شاہی محل میں رہتے ہوئے بھی اس کی زندگی شہزادوں کی طرح نہیں گزر رہی تھی۔

محل کے حالات نہایت دگرگوں تھے اور خاندان شاہی کے افراد کی تعداد کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ شاہی حرم سرا کی عورتوں کی تعداد سیکڑوں میں تھی ان کی خدمت کے لیے کینز یہ بھی مامور تھیں۔ اتنی سے زیادہ شہزادے قلعے میں نظر بند تھے۔ وہ سابقہ بادشاہوں یا ان شہزادوں کی نسل سے تھے جو بھی تخت شاہی کے دعوے دار رہے تھے لیکن اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے۔ انہیں اس لیے نظر بند کیا گیا تھا کہ وہ محل میں کوئی بغاوت نہ کھڑی کر دیں۔ وہ شہزادے بال بچے دبا رہی تھے مگر ان کے رہنے کے لیے مختصر قیام گاہیں تھیں۔ صرف ایک خواب گاہ، ایک باورچی خانہ اور اس سے ملحقہ کچھ کمرے۔ ان کو وظیفہ بھی اتنا کم ملتا تھا کہ وہ خواجہ سرا بھی ملازم نہیں رکھ سکتے تھے۔ ان کی مختصر قیام گاہوں کے دروازوں پر ایک ناظر کی سرکردگی میں سپاہی پہرا دیا کرتے تھے۔ وہ ناظر شاہ عالم ثانی کا ایک معتد خواجہ سرا تھا۔

ان نظر بند شہزادوں کے علاوہ شاہ عالم ثانی ہی کی ستائیں اولادیں تھیں۔ انہیں ملنے والا وظیفہ بھی کچھ ایسا اطمینان بخش نہیں تھا۔ ان میں سے بس چند شہزادے یا شہزادیاں ایسی تھیں جن کو ملنے والا وظیفہ کسی حد تک اطمینان بخش تھا۔ ان میں دو ایک شہزادے ایسے تھے جن پر شاہ عالم ثانی دوسروں کی یہ نسبت زیادہ مہربان تھا۔

ان حالات کی ایک وجہ تو مرہٹے ہی تھے جو بہت کچھ بڑپ کر جانا چاہتے تھے، دوسرے سلطنت کی دگرگوں حالت سے فائدہ اٹھا کر بہت سے صوبے خود مختار ہو چکے تھے جس کے باعث شاہی خاندان کی آمدنی بے حد کم ہو چکی تھی۔

نجم النسا سے محبت کرنے والا شہزادہ اس لیے نظر بند نہیں تھا کہ اس کی فطرت میں جاہ پرستی نہیں تھی اور شاہ عالم ثانی نے محسوس کر لیا تھا کہ اس کی وجہ سے محل میں کوئی بغاوت سر نہیں اٹھا سکتی تھی۔ وہ نہایت نیک اور بے ضرر شہزادہ تھا۔

جب رات کی تاریکی میں شاہ عالم ثانی نے ان تینوں کو نکل سے رخصت کیا تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس نے اپنی مہر شدہ ایک خط کا نصف حصہ پھاڑ کر اپنے پاس رکھا

سرگزشت

ماہنامہ

شہزادی

برصغیر کی اس شہزادی کا تذکرہ جس نے کئی کارہائے نمایاں انجام دیے

بابائے ادب

اس ادیب کا زندگی نامہ جسے ہولک میں احترام حاصل ہے

پیراسراپیتنا

ایک ایسی دبا جس نے یورپ کو ہلادیا تھا

جہاز بیٹی

پی آئی اے کے ایک ملازم کا دلچسپ احوال زندگی

دیس سی پیزا

ایسی سبق آموز بچ بیانی جسے پڑھنا ضروری ہے

لکھنؤ والہ

لہو کی گردش تیز کر دینے والی طویل کہانی ”سراب“ فلمی دنیا کی کئی ان کہی داستانیں ”فلمی الف لیلا“ اور بھی بہت ساری بچ بیانیاں بچے واقعات۔

اگر آپ علم و دانش بھرے مضامین، ادب، تاریخ اور سبق آموز بچ بیانیاں پسند کرتے ہیں تو آپ ہی کے لیے یہ شمارہ ترتیب دیا گیا ہے بس ایک بار پڑھ کر دیکھیں آپ خود ہی گرویدہ ہو جائیں گے

تھا اور نصف دایہ بیگم کے حوالے کیا تھا۔ اس کی آواز جذبات سے بوجھل تھی جب اس نے کہا تھا۔

”ہمیں اب امید نہیں کہ ہمارے خاندان کی شان و شوکت کبھی بحال ہو سکے گی لیکن اگر مجرمانہ طور پر ایسا ہو جائے تو تم تینوں واپس آ جانا۔ شاید ہماری زندگی میں ایسا نہ ہو اس لیے ہم نے خط کا آدھا حصہ نہیں دے دیا ہے۔ ہمارے پاس اس کا جو نصف حصہ ہے، وہ ہم مرنے سے پہلے اپنے وارث کو دے جائیں گے، ہمارا وارث جب ان دونوں حصوں کو جوڑ کر دیکھے گا تو اسے یقین آ جائے گا کہ نیم النسا واقعی شہزادی ہے۔ شاید تیوری خانوادے کا جادہ و جلال کبھی بحال ہو سکے اور ہم لوگ محل آسکو۔“

اس طرح دایہ بیگم، شہزادی نجم النسا اور اس کا شوہر قصر شاہی سے رخصت ہوئے تھے۔ وہ رات ان تینوں نے ایک سرانے میں گزاری تھی اور دوسرے دن قلعہ معلیٰ سے دور دراز کے علاقے میں ایک مکان خرید لیا تھا۔ دو تین روز اس مکان کا ساز و سامان خریدنے میں لگے تھے۔

شہزادے نے اپنا نام بدل کر ذیشان رکھ لیا تھا۔ اس کا امکان مفقود ہی تھا کہ اسے کوئی مثل شہزادے کی حیثیت سے پہچان سکتا۔ عالم گیر شاہی کے قتل کے زمانے ہی میں حالات اسے بگڑ چکے تھے کہ شہزادوں نے لال قلعے سے باہر نکلنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ اس وقت تک ذیشان پیدا بھی نہیں ہوا تھا۔ اس کی پیدائش 1763ء کی تھی۔ شاہی محل چھوڑتے وقت وہ انیس سال کا تھا۔ دہلی شہر کے گلی کوچے اس کے لیے قطعی اجنبی تھے۔ دایہ بیگم کے کہنے پر اس نے دو ڈھائی ماہ شہر سے آٹھ ہونے کے لیے گھوم پھر کر گزارے تھے۔ اس کے بعد، ایہ بیگم نے کچھ جواہرات بیچ کر ذیشان کو ایک چھوٹا سا کاروبار کر دیا تھا۔ وہ بہت دانش مند اور محتاط خاتون تھیں۔ انہیں تو تھا کہ بڑا کاروبار کرانے کی صورت میں ذیشان کی نا تجربہ کاری کے سبب سارا سرمایہ ڈوب نہ جائے لیکن ذیشان نے اپنی ذہانت سے ثابت کر دیا کہ اس میں کاروبار کرنے کی بے پناہ صلاحیت تھی۔ یہ اندازہ ہوجانے کے بعد ہی دایہ بیگم نے مزید کچھ زیورات بیچے تاکہ ذیشان اپنے چھوٹے سے کاروبار کو کچھ وسعت دے سکے۔

پھر کچھ ہی عرصے بعد دہلی میں ایک بار پھر بھوجپال آیا۔ سندھیا کی طاقت کمزور پڑتے دیکھ کر غلام قادر خاں روہیلہ نے دہلی پر یلغار کر دی تھی اور شاہی محل پر بھی قابض ہو گیا تھا۔

اس دن دایہ بیگم، ذیشان اور نجم النسا چھوٹ کر

روئے تھے جب شہر بھر میں ہی یہ بات پھیل گئی تھی کہ غلام قادر خاں نے شہر سے شاہ عالم شاہی کی دونوں آنکھیں ختم کر دی تھیں۔

اب دہلی پر مرہٹوں کے بجائے ایک بار پھر روہیلوں کا راج ہو چکا تھا لیکن کچھ عرصے بعد سندھیا نے تیاری کر کے دوبارہ حملہ کیا تھا اور دہلی پر مرہٹے قابض ہو گئے تھے۔ غلام قادر کو انہوں نے ہلاک کر کے اس کی لاش کے ٹکڑے درختوں سے لٹکا دیے تھے۔

اسی منظر سے نجم النسا اپنی وحشت زدہ اور دہلی سے اتنی وحشت زدہ ہوئی تھی کہ وہ تینوں دہلی چھوڑ کر میسور چلے گئے تھے۔ وہاں انہوں نے خاصا طویل عرصہ گزارا تھا۔ وہاں انہیں دہلی کے حالات کے بارے میں اطلاعات ملتی رہتی تھیں۔ ان حالات کی وجہ سے وہ دہلی واپس جانے اور شاہی محل کا رخ کرنے کا خیال بھی دل میں نہیں لاسکتے تھے۔

سترہ سال بعد میسور میں ہی انہوں نے شاہ عالم شاہی کے انتقال کی خبر سنی اور ایک بار پھر ان کا گھر ماتم کدہ بن گیا۔ وہ 1806ء کا زمانہ تھا۔ اسی سال شاہ عالم شاہی کا بیٹا معین الدین اکبر شاہ شاہی کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ اس زمانے میں شاہی محل کے حالات خاصی حد تک شیک ہو چکے تھے کیونکہ انگریزوں نے مرہٹوں کو وہاں سے بھگا کر شاہی محل کو تحفظ دے دیا تھا۔ شہر پر تو اس کی حکومت کم ہی تھی لیکن شاہی گل پر وہ مکمل حکمران تھا۔

اس وقت دایہ بیگم کی عمر ستر سال ہو چکی تھی۔ انہیں احساس ہونے لگا تھا کہ وہ نہ جانے کب مرجائیں۔ اس وقت انہوں نے چاہا تھا کہ دہلی واپس جا کر شاہی محل کا رخ کیا جائے لیکن نجم النسا اس کے لیے تیار نہیں ہوئی تھی۔ اس وقت بھی اسے یہ احساس شدت سے تھا کہ وہ مثل شہزادی مہر النسا کے بطن سے پیدا تو ہوئی تھی لیکن ناجائز طور پر۔ اس کا خیال تھا کہ اب تک اس کے بارے میں گل کے بہت سے لوگوں کو معلوم ہو چکا ہوگا۔ وہ ان لوگوں کے سامنے جا کر شرمندگی محسوس کرتی۔

دایہ بیگم کو خاموش ہوجانا پڑا۔ اگرچہ نجم النسا ان کی اتنی عزت کرتی تھی جیسے وہی اس کی سگی ماں ہوں اور ذیشان بھی ان کا اتنا ہی احترام کرتا تھا لیکن دایہ بیگم نے یہ فراموش نہیں کیا تھا کہ وہ بہر حال مغلیہ شاہی خاندان کی ایک بیگم تھیں اور ان کو یہ حق نہیں پہنچتا تھا کہ وہ نجم النسا پر حملہ لائیں۔ نجم النسا اگرچہ شہزادی مہر النسا کی ناجائز بیٹی تھی لیکن بہر حال ایک مثل شہزادی تھی۔

لیکن جب گیارہ سال اور گزر گئے اور میسور کا شیر دل سلطان نیپال انگریزوں سے لڑتا ہوا مارا گیا تو میسور کے حالات بھی خطرناک محسوس ہونے لگے۔ اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد نجم النسا کو دل کی بیماری ستانے لگی تھی۔ اس خبر پر دہلی واپس لوٹنے کی تیاری کی گئی۔ میسور میں ذیشان نے اچھا خاصا کاروبار چلا لیا تھا لیکن اسے وہ سب کچھ سنبھالنا پڑا۔ وہ دہلی واپس آ گئے لیکن نجم النسا اپنے اس فیصلے پر قائم رہی کہ وہ قصر شاہی کا رخ نہیں کرے گی۔ وہ مرتے دم تک بھی اپنے خاندان میں واپس نہیں جانا چاہتی تھی۔

زرتاج میسور میں ہی پیدا ہوئی تھی۔ جب وہ لوگ دہلی واپس لوٹے تو وہ تین سال کی تھی۔ اس وقت نجم النسا کی عمر پینتالیس سال تھی۔ دونوں میاں بیوی اولاد کی طرف سے مایوس ہو چکے تھے جب خدا نے زرتاج کی صورت میں انہیں خوشیوں سے نوازا تھا۔

دہلی آ کر ذیشان نے ایک نیا کاروبار چلا لیا تھا۔ نجم النسا کی خواہش پر دایہ بیگم اور ذیشان نے زرتاج پر کبھی ظاہر نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ مثل شہزادی تھی کیونکہ اس کے ماں باپ دونوں ہی مثل شہزادی اور شہزادے تھے۔ ذیشان نے ایک مرتبہ بڑے کرب سے کہا تھا۔ ”میں تو اب تقریباً بھلا چکا ہوں کہ میں کوئی مثل شہزادہ ہوں۔“

زرتاج انیس سال کی ہو چکی تھی جب ذیشان کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس کے چند ماہ بعد ہی دایہ بیگم شدید علیل ہوئی تھیں۔ انہی دنوں میں انہوں نے زرتاج کو اپنے کمرے میں بلایا تھا۔ ملازموں کو غالباً انہوں نے ہی کمرے سے رخصت کر دیا تھا لیکن نجم النسا کمرے میں موجود تھی۔ اس کے چہرے پر بخشیدگی اور فکر مندگی کے ساتھ افسردگی کے تاثرات بھی تھے جس کا سبب زرتاج کی سمجھ میں فوری طور پر نہیں آ سکا تھا۔

دایہ بیگم کے لہجے میں فطرت تھی جب انہوں نے زرتاج سے کہا۔ ”قریب آؤ..... میرے قریب..... میرے بستر پر ہی بیٹھو میری شہزادی!“

اس وقت زرتاج کے سامان گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ واقعی شہزادی تھی۔ اس انداز خطاب کو اس نے دایہ بیگم کی محبت اور پیار کے سوا کچھ نہیں سمجھا تھا۔

اپنے قریب بیٹھا کہ دایہ بیگم نے کہا تھا۔ ”آج میں زندگی میں پہلی بار تمہاری ماں کی حکم عدولی کرنے والی ہوں۔“ اس بات پر زرتاج آہستہ سے ہنس پڑی تھی۔ ”یہ کیا کہہ بیٹھیں آپ! کوئی ماں اگر اپنی بیٹی کی خواہش کے خلاف

کچھ کہنا چاہے گی تو اسے حکم عدولی کیسے کہا جاسکتا ہے۔“ ”ابھی سمجھ جاؤ گی کم، جب میں تمہیں ایک راز سے آگاہ کروں گی۔“

”راز؟“ زرتاج حیران ہوئی۔

”ہاں۔ ایک بہت گہرا راز میری شہزادی..... اب یہ بہت ضروری ہو گیا ہے کہ تمہیں اس راز سے آگاہ کر دیا جائے۔ تمہارے والد کا انتقال ہو چکا ہے۔ گھر میں اب کوئی مرد نہیں ہے۔ میری عمر بھی اب بہت ہو چکی ہے۔ خدا کی مصلحت کہ اس نے مجھے اتنے دن زندہ رکھا۔“

اس وقت دایہ بیگم سو سال سے زیادہ کی ہو چکی تھیں۔ وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولیں۔ ”تمہاری ماں کی عمر بھی اڑسٹھ سال ہو رہی ہے۔ خدا ان کی عمر میری ہی عمر کی طرح دراز کرے لیکن اس دار فانی سے کبھی کو ایک نہ ایک دن کوچ کرنا ہے۔ یہ اب بھی اس کے خلاف ہیں کہ تمہیں اس راز سے آگاہ کیا جائے اور تم بھی اس دکھ سے دوچار ہو جاؤ جس دکھ میں تمہاری ماں نے زندگی گزارا ہے۔ تم اب تک شادی سے بھی انکار کرتی رہی ہو۔ اب مناسب یہی ہوگا کہ تم دونوں اپنے خاندان میں لوٹ جاؤ۔“ زرتاج حیرت سے بولی۔ ”کیا ہمارا کوئی اور خاندان بھی ہے؟“

”ہاں۔“ دایہ بیگم ہوتے ہوئے ہنسون کی مسکراہٹ بھی مرجھاتی ہوئی تھی۔ ”اب میں تمہیں سب کچھ بتاتی ہوں۔ بظاہر وہ ایک کہانی سی لگے گی لیکن اس کا ایک ایک لفظ حقیقت پر مبنی ہے۔“

اس وقت زرتاج نے حیرت سے دیکھا کہ اس کی ماں نجم النسا کی آنکھیں بڑبڑانے لگی تھیں۔ اس کے بعد زرتاج نے دایہ بیگم سے وہ سب کچھ سنا جس کا آغاز پندرہ سالہ مثل شہزادی مہر النسا سے شروع ہوا تھا۔

☆☆☆

وہی سب کچھ فیضان نے زرتاج سے سنا۔ سکتے میں تو وہ اسی وقت آ گیا تھا جب زرتاج نے کہا تھا۔ ”میں بد نصیب ایک مثل شہزادی ہی ہوں۔“ لیکن وہ ساری کہانی سننے کے بعد تو اس کے چہرے پر ایسے تاثرات تھے جیسے وہ ہنسنے لگا ہو گیا ہو۔

زرتاج کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔ اس نے وہ بچہ پوچھتے ہوئے بھرا ہوا ہونے کی آواز میں کہا۔ ”سب کچھ بتانے کے بعد دایہ بیگم نے مجھے اس خط کا آدھا حصہ بھی دکھایا جو میری والدہ کے ماموں آنجنابی شاہ عالم شاہی نے

”ابھی نہیں کر سکی۔ اگرچہ میں تین ایسے رویلوں کو بھی قتل کر چکی ہوں جو میرے گھر سے خاصے دور تھے لیکن افضل خاں تو خاصی دور رہتا ہے۔ اسی لیے میں ابھی تک کوئی منصوبہ نہیں بناسکی ہوں۔“

”شاہی محل واپس جانے کے بارے میں کیا سوچا ہے؟“

”والدہ کسی قیمت پر تیار نہیں ہو رہی ہیں اور میں ان کی مرضی کے خلاف کوئی قدم اٹھانے کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتی۔ دایہ بیگم کو یہی پریشانی لاحق ہے تاکہ اب گھر میں کوئی مرد نہیں لیکن.....“ زرتاج نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ ”میں افضل خاں کے معاملے سے قارغ ہو جاؤں تو ہماری شادی ہو جائے گی۔ مجھے ایک مرد کا سہارا مل جائے گا۔“

”لیکن دایہ بیگم اور تمہاری والدہ؟ وہ تو بے سہارا ہی رہ جائیں گی۔“

زرتاج نے کچھ چوٹے ہوئے انداز میں فیضان کی طرف دیکھا اور پھر سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”یہ خیال تو میرے ذہن میں آیا ہی نہیں تھا۔ دادا یقیناً اس کے لیے تیار نہیں ہوں گے کہ تم گھر داماد بن کر ہمارے ساتھ رہو۔۔۔ خیر چھوڑو۔ اس معاملے پر بعد میں غور کر لیا جائے گا۔“

”اچھا ہاں.....! ایک ضروری خیال آیا۔ جب تم افضل خاں کے سلسلے میں کوئی منصوبہ بنالو تو مجھے ضرور بتانا۔“

”نہیں۔ میں تم کو اس سارے معاملے سے الگ رکھنا چاہتی ہوں۔ اسی لیے تو میں شادی سے پہلو بچاتی رہی ہوں۔“

”میں تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔“

”ہرگز نہیں۔ تم اس معاملے سے الگ ہی رہو۔“

”کیا یہ حکم ہے شہزادی صاحبہ؟“ فیضان ہنسی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

”مجھے اس طرح مخاطب کر کے میرا دل خون نہ کرو۔“ زرتاج نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ”میں تمہارے لیے صرف زرتاج ہوں اور زرتاج ہی رہوں گی۔“

آئندہ بھی مجھے شہزادی کہہ کر مخاطب نہ کرنا۔“

فیضان نے ایک طویل سانس لی، پھر تنہی سے بولا۔

”آج رات بھر تمہاری باتیں میرے ذہن میں چکراتی رہیں گی اور آئندہ بھی شاید کچھ دن تک مجھے یہی خیال رہے گا کہ تم نے مجھے خواب میں کوئی کہانی سنائی تھی اپنے بارے میں۔“

”دایہ بیگم سے سب کچھ سننے کے بعد مجھے بھی کچھ ایسا ہی لگا تھا جیسے میں نے کوئی کہانی سنی ہو۔ اگر میں نے اپنے

ایک خوں ریز جنگ کی تھی اور دشمنوں کو بھاگ نکلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ مجھے دس بارہ مثل شہزادیوں کی زندگی کے حالات معلوم ہیں۔ کہاں تک سناؤں۔ وقت بھی کم ہے۔ اندر میرا پھیلنے لگا ہے۔“

”بارہ تیرہ سال کی عمر میں سنے ہوئے وہ قصے تمہیں یاد ہیں لیکن مجھے اس پر حیرت نہیں۔ تمہاری یادداشت بہت غیر معمولی ہے۔“

”اگر ایسا نہ ہوتا تو مجھے ان رویلوں کے نام کیسے یاد رہتے جن کے نام دادا نے بتائے تھے۔ بس یہ ذرا غلط ملط ہو گیا تھا کہ ان میں سے کون کس علاقے میں رہتا ہے لیکن علاقوں کے نام یاد تھے۔ بعد میں تجوگر کے میں نے جان لیا تھا کہ ان میں سے کون کس علاقے میں رہتا ہے۔“

”ان سب کو تم نے قتل کیا کیسے؟“

”یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ پھر کسی وقت سناؤں گی۔“

مجھے اب چلنا چاہیے۔ مجھے پاکی منگوا دو۔“

فیضان نے گوبر کو آواز دے کر اس سے کہا کہ وہ کسی ملازم کے ذریعے زرتاج کے لیے پاکی منگوائے۔

”تم بہت ہوشیار رہنا فیضان!“ زرتاج نے کہا۔

”کس معاملے میں؟“

”ابھی تم مجھے بتا چکے ہو کہ کوئی فرنگین تمہارا اتفاق کر رہی تھی۔“

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ کچھ دن کی گفرانی کے بعد وہ لوگ میری طرف سے مطمئن ہو جائیں گے۔ میں تو تمہارے لیے فکر مند ہو رہا ہوں۔ آئندہ کے لیے تمہارے عزائم کیا ہیں؟“

”افضل خاں۔“ زرتاج نے دانت پر دانت جمالیے، وہ فیضان کے چہرے پر نظریں گاڑے ہوئے بولی۔ ”اس آخری روپیلے کو ختم کر کے ہی میرا کلیجہ ٹھنڈا ہوگا۔“

”بہت ہو چکا ہے، اب اس کا خیال اپنے ذہن سے نکال دو۔ اب تک قسمت نے تمہارا ساتھ دیا ہے اور پکڑی نہیں جاسکی ہو لیکن ضروری نہیں کہ قسمت ہمیشہ انسان کا ساتھ دیتی رہے۔“

”دس آدمیوں کے قتل تک قسمت نے میرا ساتھ دیا ہے تو اب بھی ساتھ دے گی اور اگر نہ دے تو اب میں خیال بھی اپنے ذہن سے نہیں نکال سکتی کہ مجھے افضل خاں کو ختم کرنا ہے۔“

”تم نے کچھ منصوبہ بندی کی ہے؟“

ان لوگوں کو محل سے رخصت کرتے وقت دایہ بیگم کو دیا تھا۔ وہ آدھا حصہ ایسا ہے کہ شاہی مہر بھی اس پر آدھی ہے۔ باقی آدھی اس خط کے دوسرے حصے پر ہوگی اگر انجمنی شاہ عالم ثانی نے وہ اپنے بیٹے اکبر ثانی کے حوالے کر دیا ہوگا۔ اعلیٰ حضرت اکبر ثانی میری والدہ کے ماموں زاد بھائی اور اسی رشتے سے میرے ماموں ہیں۔“

”یہ سب کچھ سن کر..... میرے دماغ کی چولیس بل گئی ہیں۔“ فیضان انک انک کر بولا۔

”جو حالت اس وقت تمہاری ہے فیضان، وہی حالت اس وقت میری ہوئی تھی جب دایہ بیگم نے مجھے یہ سب کچھ بتایا تھا اور میری والدہ تو اس وقت رونی ہوئی کمرے سے ہی چلی گئیں۔“

کمرے میں اندر میرا پھیلنے لگا تھا۔ فیضان نے اٹھ کر موی شعیں روشن کیں۔ وہ جب واپس زرتاج کے پاس جا کر بیٹھا تو اس کے چہرے سے یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی ہو۔ گوبر کے پیچھے ہوئے شربت کی طرف ان دونوں ہی کا دھیان نہیں گیا تھا۔

”اس رات۔“ زرتاج نے فیضان کی طرف دیکھے بغیر کھوئے کھوئے سے انداز میں کہا۔ ”مجھے ایک ہل کے لیے بھی نیند نہیں آسکتی تھی۔ مجھے ان رویلوں کا خیال بھی آیا تھا جن کے بارے میں دادا نے بتایا تھا۔ میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ ان رویلوں ہی سے اس زیادتی کا انتقام لیا جائے جو ان کے سردار نے میری ماں کی والدہ کے ساتھ کی تھی۔ صبح ہوتے ہوتے مجھ میں اتنی جرأت پیدا ہو چکی تھی کہ میں ہی ان رویلوں کو ختم کروں گی۔ میرا عزم بہت پختہ ہو چکا تھا۔“

”تم جیسی لڑکی کا اتنا جرأت مند ہو جانا حیرت انگیز ہے۔“

”پائل حیرت انگیز نہیں ہے فیضان..... آخر میں ایک مثل شہزادی ہوں، جب میں تیرہ یا بارہ سال کی تھی تو دایہ بیگم نے مجھے بہت سی مثل شہزادیوں کے قصے سنائے تھے۔ اس وقت میں نہیں جانتی تھی کہ میں کون ہوں لیکن اب تو مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ میں کون ہوں۔ میرے جد امجد عظیم تیمور کی بیوی حمیدہ بیگم بھی رزم و بزم، دونوں میں طاق تھیں۔ امیر تیمور کے پوتے میراں شاہ کی بیٹی شہزادی آغا بیگی نے بہت کم عمری میں فنون حرب سیکھ لیے تھے۔ ایک زمانہ ایسا بھی آیا تھا جب ان کے پاس سپاہ نہ تھی تو انہوں نے صرف کینز اور غلاموں کے ساتھ اپنے دشمنوں سے

اسی وقت کمرے کے باہر سے گوبر کی آواز آئی۔

”پاکی آگئی ہے بیٹا!“

”اچھا!“ فیضان نے جوابا کہا۔

پھر وہ اور زرتاج کمرے سے نکلے۔ گوبر نے غور سے ان دونوں کے چہروں کی طرف دیکھا۔ وہ یقیناً یہ اندازہ لگاتا جا رہی ہوگی کہ آج تنہائی میں ان دونوں نے کیا باتیں کی ہوں گی۔

جب زرتاج پاکی میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہوئی تو اس کے پیچھے فیضان کا گھوڑا ابھی تھا۔

گھروں میں چلتی ہوئی موی شعیں اور ان شعوں کے قانونوں کی روشنی یہ مشکل ہی درپچوں سے نکل کر راہ گزر تک آ رہی تھی۔ رات کا ابتدائی پہر تھا اس لیے شاہی یا انگریز سپاہ کی طلا یہ گروئی ابھی شروع نہیں ہوئی تھی لیکن نزدیک دور سے کچھ گھوڑوں کی ٹانگیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ لوگ اندر میرا پھیلنے کے بعد اپنے گھروں کو جا رہے ہوں گے۔ کہیں کہیں کوئی پیدل جاتا ہوا بھی نظر آ رہا تھا.....

ترکمان دروازے سے گزرتے ہوئے ایک پاکی بھی جاتی نظر آئی تھی۔ اندر میرا پھیلنے کے بعد کرائے پر چلنے والی یا لوگوں کی ذاتی پاکیاں کم ہی نظر آتی تھیں۔ وہ دہلی پر نادر شاہ افشار سے پہلے کا زمانہ تھا جب اس وقت بھی شہر بارونتی نظر آیا کرتا تھا۔

زرتاج کا گھر موم گروں کے چھتے میں داخل ہوتے ہی تھا، فیضان یہ دیکھ کر چونک گیا کہ گھر کے باہر خاصے لوگ جمع تھے۔

زرتاج جب گھر میں داخل ہوئی تو وہ بھی ہکا بکا سی ہو گئی کیونکہ وہاں آس پاس رہنے والی خاصی عورتیں اور جوان لڑکیاں موجود تھیں۔ وہ لڑکیاں لپک کر زرتاج کے قریب آئیں۔ انہیں اندازہ ہوگا کہ حقیقت جانتے ہی زرتاج کی کیا حالت ہوگی۔

گھر سے روانگی کے وقت زرتاج کو سان گمان ہی نہ تھا کہ اس کی واپسی پر ایک بہت بڑا سانحہ اس کا منتظر ہوگا۔ دایہ بیگم کا انتقال ہو چکا تھا۔ ان کی آخری چٹکی کے ساتھ انہیں بے حس و حرکت دیکھ کر ملازمہ چنے چلانے لگی تھی تو نجم النسا جو گھر کے کسی حصے میں کچھ کر رہی تھی، دوڑی دوڑی وہاں پہنچی تھی۔

ملازم جلدی سے قریب ہی رہنے والی اس طبیبہ کو بلالایا تھا جو دایہ بیگم کا علاج کر رہی تھی۔ اس کی آمد تک نجم النسا آنکھیں پھاڑے ساکت پڑی دایہ بیگم کو نگہ کر رہی تھی لیکن جب طبیبہ نے ”انٹالہ وانا لہ راجون“ پڑھتے ہوئے دایہ بیگم پر چادر ڈالی تو نجم النسا کھڑے کھڑے کسی اچانک کٹ جانے والے درخت کی طرح گر پڑی۔ طبیبہ جلدی سے اس کی طرف لپکی، کھیل وہاں بھی ختم ہو چکا تھا۔ نجم النسا کی حرکت قلب بند ہو گئی تھی۔

ملازم اور ملازمہ کی وجہ سے یہ خبر محلے میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ عورتیں جلدی جلدی زرتاج کے گھر میں پہنچیں۔ مرد گھر کے باہر جمع ہونے لگے۔

زرتاج نے اس سانحے سے باخبر ہوتے ہی اپنا سر دوڑا کر دینا چاہا تھا مگر جو لڑکیاں پہلے ہی اس کے قریب آچکی تھیں، انہوں نے ایسا نہیں ہونے دیا لیکن روتے اور پچھاڑیں کھاتے ہوئے اسے روکنا کسی کے اختیار میں نہیں تھا۔ یہ مشکل اسے سنبھالنے ہی کی کوششیں کی جاتی رہیں۔

باہر جمع ہونے والے لوگوں سے فیضان کو اس سانحے کا علم ہو گیا تھا لہذا اس نے برقی رفتاری سے اپنا گھوڑا واپس گھر کی طرف دوڑا دیا تھا۔ وہ بہت جلدی اپنی بہن کو ہر کو وہاں لے آیا۔

گوہر جب وہاں پہنچی تو زرتاج پر غشی طاری تھی اور طبیبہ اس کے حلق میں کوئی عرق اندھیلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اٹھک بار گوہر نے زرتاج کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ وہاں موجود عورتوں نے حیرت سے دیکھا کہ ایک انگریز جوان لڑکی بھی گھر میں کس آئی تھی اور ٹوٹی پھوٹی اردو میں اس سانحے کے بارے میں استفسار کر رہی تھی۔

☆☆☆

رات کا نصف پہر ہونے سے پہلے ہی کیپٹن اسٹیورٹ کو اس واقعے کی اطلاع ملی۔

سلویا اس سے کہہ رہی تھی۔ ”فیضان جب اپنے گھر واپس لوٹا تھا تو اس کے بعد بھی میں وہاں آس پاس خاصی دیر تک چکر لگاتی رہی تھی۔ میں نے اندازہ لگانا چاہا تھا کہ فیضان کے گھر کے آس پاس رہنے والے لوگ کس قسم کے ہیں اور کیا کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ مجھے سارجنٹ جیکب کا بھی انتظار تھا جو میرے بعد فیضان کے گھر کی نگرانی جاری رکھتا لیکن سارجنٹ کو کچھ دیر ہو گئی تھی۔ اندھیرا پھیلنے لگا تھا جب فیضان کے گھر سے ایک بالکی روانہ ہوئی فیضان بھی اپنے گھوڑے پر سوار اس بالکی کے پیچھے پیچھے تھا۔ میں اس صورت حال میں سارجنٹ جیکب کا انتظار تو کر نہیں سکتی تھی۔

میں نے فیضان اور اس بالکی کا تعاقب شروع کر دیا۔ یہ تو میں نے سمجھ لیا تھا کہ اس بالکی میں کوئی عورت ہوگی لیکن یہ اندازہ لگنا میرے لیے ممکن نہیں تھا کہ وہ عورت کون ہے اور فیضان اسے اس وقت کہاں لے جا رہا ہے۔“

کیپٹن اسٹیورٹ خاموشی سے سنا رہا۔ اس مختصر سے دورانیے میں اس نے شراب کا ایک پیگ بنالیا تھا۔ سلویا کہہ رہی تھی۔ ”اس تعاقب کا اختتام موسم گروں کے چھتے پر ہوا جہاں اچھے خاصے لوگ جمع تھے۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہاں کوئی خاص واقعہ ہو چکا ہے۔“

”موسم گروں کے چھتے“ کا نام سننے ہی کیپٹن اسٹیورٹ کی پیشانی پر ہلکی سی ٹھنک پڑ گئی تھی۔ کیپٹن اسٹوٹ کے ساتھ وہ چٹلی قبر کے آس پاس کا سارا علاقہ دیکھ چکا تھا اور اسے کیپٹن اسٹوٹ سے چٹلی قبر کے ارد گرد کے تمام محلوں کے نام بھی معلوم ہو چکے تھے۔ انہی میں سے ایک نام ”موسم گروں کا چھتا“ بھی تھا۔

”اس وقت میری نظر سارجنٹ جیکب پر بھی پڑی جو اپنا گھوڑا میرے گھوڑے کے قریب لے آیا تھا۔ تم تو جانتے ہی ہو کیپٹن کہ جیکب بہت شرارتی ہے اور خصوصاً مجھے تنگ کرنے میں اسے بہت مزہ آتا ہے۔ جب میں نے اس پاکو اور فیضان کا تعاقب شروع کیا تھا، اس وقت وہ وہاں آچکا تھا لیکن محض مجھے ستانے کے لیے مجھ سے دور رہا تھا لیکن میرا تعاقب کرتا رہا تھا۔ اس کی یہ شرارت اس وقت کام جو آگئی۔ میں وہاں رک کر جانا چاہتی تھی کہ وہاں کیا واقعہ پیش آیا تھا جو اتنے لوگ جمع تھے، لیکن اگر جیکب نڈل گیا ہوتا تو میں فیضان ہی کے تعاقب میں جاتی جو وہاں جمع لوگوں سے پوچھ بچھ کے بعد اپنے گھوڑے پر تیزی سے روانہ ہو گیا تھا

میں نے جیکب سے کہا کہ وہ فیضان کے تعاقب میں جائے۔ میں نے وہاں کے لوگوں کی آپس کی باتوں سے اندازہ لگالیا کہ اس گھر میں دو عورتوں کی موت واقع ہو چکی تھی۔ یہ معلوم ہونے کے بعد یہ نتیجہ تو اخذ کیا ہی جا سکتا تھا کہ جو عورت بالکی میں وہاں آئی تھی، وہ کوئی تیسری عورت ہوگی۔ میں نے اس کے بارے میں بھی جانا ضروری سمجھا اور گھر میں کھس گئی۔ وہاں میں نے عورتوں سے اس طرح باتیں کیں جیسے محض تجسس کے باعث اندر پہنچ گئی تھی، کوئی خاص مقصد نہیں تھا میرا۔ اس طرح مجھے خاصی معلومات حاصل ہو گئیں۔“

کیپٹن اسٹیورٹ نے پہلا پیگ بہت تیزی سے ختم کر ڈالا تھا اور اب دوسرا پیگ بنا رہا تھا لیکن اب بھی وہ خاموشی ہی اختیار کرے رہا۔ ابھی تک سلویا کی رپورٹ میں اسے اس کے علاوہ کوئی خاص بات محسوس نہیں ہوئی تھی کہ جس گھر میں دو عورتوں کی موت واقع ہوئی تھی، وہ گھر موم گروں کے چھتے میں تھا۔

سلویا نے دایہ بیگم، نجم النسا اور زرتاج کے بارے میں وہ سب کچھ بیان کر ڈالا جو ان تینوں کے بارے میں محلے کے لوگ جانتے تھے۔

”فیضان وہاں دوبارہ نہیں آیا؟“ کیپٹن اسٹیورٹ شراب کی ایک چٹکی لے کر کھلی مرتبہ بولا۔

”اب میں اسی طرف آرہی تھی۔“ سلویا نے جواب دیا۔ ”فیضان واپس آیا تھا تو اس کے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی۔ اس لڑکی کا نام گوہر جہاں ہے اور وہ فیضان کی بہن ہے۔“

”بہت اچھے سلویا، بہت اچھے۔“ کیپٹن اسٹیورٹ مسکرایا۔ ”مجھے تو خیر اس کا علم پہلے سے ہے کہ فیضان کی کوئی بہن گوہر جہاں بھی ہے لیکن تم نے جو اتنی معلومات کر لیں تو واقعی کمال کیا ہے۔“

”میں نے اس سے زیادہ اہم باتیں بھی معلوم کی ہیں کیپٹن!“ سلویا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”دراصل وہاں جو لڑکیاں تھیں، ان میں سے ایک نے ہماری زبان سکھی ہے اور یہ تم جانتے ہی ہو کہ یہ ہندوستانی ہمارے مقابلے میں احساس کمتری کا شکار ہو چکے ہیں۔ اس لڑکی نے انگریزی میں مجھ سے بڑے شوق سے باتیں کیں۔ اس سے مجھے معلوم ہوا کہ فیضان اور زرتاج کے گھرانوں میں کوئی رشتہ داری نہیں ہے لیکن شاید ہو جائے۔“

”کیا مطلب؟“

”دراصل فیضان، گوہر اور زرتاج نے بچپن سے ایک ہی کتب میں پڑھا ہے اور ان کی دوستی گہری ہو جانے کے

سبب دونوں گھروں کے لوگوں کا ایک دوسرے کے یہاں آنا جانا بھی ہو چکا ہے۔ اس لڑکی کو بڑی حد تک شبہ ہے کہ فیضان اور زرتاج ایک دوسرے سے محبت کرنے لگے ہیں لیکن اب تک ان دونوں کی شادی کیوں نہیں ہوئی، اس کا اندازہ اس لڑکی کو بھی نہیں تھا جس نے مجھے یہ سب کچھ بتایا۔“

کیپٹن اسٹیورٹ نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے شراب کی ایک چٹکی لی۔

”مجھے بس یہی رپورٹ دینا تھی۔“ سلویا نے کہا۔

”اس کے علاوہ کوئی بات میرے علم میں نہیں آئی۔“

”جیکب کہاں ہے؟“

”فیضان کیونکہ زرتاج ہی کے گھر پر تھا اس لیے میں جیکب کو وہیں چھوڑ کر آئی تھی۔ اب مجھے نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہوگا۔“

”وہیں ہوگا ابھی۔“ کیپٹن اسٹیورٹ نے کہا۔

”چونکہ دونوں گھروں میں قریبی تعلقات ہیں اس لیے ابھی فیضان کو بھی وہیں ہونا چاہیے۔ اب تم جا کے آرام کرو سلویا!“

”ایک بات پوچھنا چاہوں گی۔“

کیپٹن اسٹیورٹ سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ سلویا بولی۔ ”مجھے محسوس ہوا تھا کہ موم گروں کے چھتے کا نام سن کر تم جو کچھ کہتے تھے۔“

”یہ بھی سمجھ گئی!“ کیپٹن اسٹیورٹ مسکرایا۔ ”تم بہت ذہین ہو سلویا! اسی لیے میں نے فیضان کی نگرانی پر جیکب کے ساتھ تمہیں مامور کیا ہے۔ دراصل بات یہ ہے

سلویا کہ تین کے علاوہ باقی کل چٹلی قبر کے آس پاس ہی ہوئے ہیں اس لیے میرے ذہن میں ایک خیال آیا تھا کہ قاتل شاید اسی علاقے میں کہیں رہتا ہو اور موم گروں کا چھتا بھی اسی علاقے میں ہے۔“

سلویا چونک کر بولی۔ ”تو کیا اب تم یہ شبہ کرو گے کہ ان روہیلوں کو قتل کرنے والی زرتاج ہے؟“

کیپٹن اسٹیورٹ ہنس پڑا۔ ”نہیں، اس لڑکی پر قاتل ہونے کا شبہ کرنا تو بے کار بات ہے۔ ایک لڑکی یہ سب کچھ نہیں کر سکتی اور حقیقت تو یہ ہے کہ فیضان کے بارے میں مجھے کچھ نہیں ہے۔ ضروری نہیں کہ میرا شبہ درست ثابت ہو مگر

کیونکہ اس معاملے کا کوئی اور سرا ابھی ہاتھ نہیں آیا، اس لیے میں نے سوچا تھا کہ کام تو ہمیں سے شروع کرنا ہی چاہیے۔“

”تو پھر میں ایک بات کہوں!“ سلویا بولی۔ ”یہ خیال ابھی اچانک ہی میرے دماغ میں آیا ہے۔ کیا یہ شبہ

نہیں کیا جاسکتا کہ ان رویوں کے قتل میں زرتاج اور فیضان، دونوں ہی ملوث ہوں۔“
”اوہ!“ کیپٹن اسٹیورٹ یکا یک سنجیدہ ہوا اور سلویا کے چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے بولا۔ ”جب میں فیضان پر شہرہ باہوں تو پھر تمہارے دماغ میں آنے والے اس خیال کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔“
”تو پھر زرتاج.....“

”اب یہ موضوع ختم کرو۔“ کیپٹن اسٹیورٹ نے اس کی بات کاٹنے ہوئے کہا۔ ”آج میں دن بھر اتنا مصروف رہا ہوں کہ دماغ بہت تھک گیا ہے۔ میں اب آرام کرنا چاہتا ہوں۔ کل ہی سوچوں گا کہ مزید کیا اقدامات کیے جاسکتے ہیں۔“
”تو پھر میں چلتی ہوں۔“ سلویا کھڑی ہوئی۔

اسے رخصت کرنے کے بعد کیپٹن اسٹیورٹ نے اپنی خواب گاہ کا رخ کیا۔

☆☆☆

دوسرے دن عجم النساء اور دایہ بیگم کی تدفین ہوئی۔ زرتاج رات بھر جاگتی رہی تھی۔ گوہر کے علاوہ پڑوس کی دو تین لڑکیاں اور دو ایک ادیبہ عورتیں بھی اس کے ساتھ رہی تھیں ورنہ تنہائی میں تو وہ وحشت زدہ ہو کر اپنا نہ جانے کیا حال کر بیٹھتی۔ رورو کر اس کی آنکھیں اتنی سرخ ہوئی تھیں جیسے انگارے دیکھنے لگے ہوں۔ جب دایہ بیگم اور عجم النساء کے جنازے اٹھتے تھے، اس وقت بھی وہ دھاڑیں مار مار کر روئی تھی۔

جنازے میں رحمان دادا بھی شریک ہوئے تھے۔ جب وہ لوگ واپس لوٹے تو گوہر نے ذرا دیر کے لیے باہر آکر فیضان کو بتایا تھا کہ زرتاج اب بے سدھ پڑی ہوئی تھی۔ فیضان خود اسے دیکھنے اندر نہ جاسکا کیونکہ وہاں دیگر خواتین بھی موجود تھیں.....

سب لوگوں کے لیے کھانے کا بندوبست رحمان دادا نے کیا تھا۔ کھانے کے بعد لوگ آہستہ آہستہ رخصت ہونے لگے۔ زرتاج کھانا تو کیا کھاتی، اس نے پکھا تک نہیں تھا۔ ”تو پھر میں بھی کچھ نہیں کھاؤں گی۔“ گوہر نے کہا تھا۔ زرتاج کم مہم بھی رہی تھی۔ تمام لوگوں کے جانے کے بعد زرتاج کے ساتھ صرف گوہر رہی تھی۔ اس وقت فیضان کو زرتاج سے ملنے کا موقع مل سکا۔ زرتاج نے اسے دیکھا اور بس یہی کہتی رہی، کچھ بولی نہیں۔ اس کی آنکھیں اب خشک لیکن سرخ تھیں۔ چہرہ پتھرا ہوا سا لگ رہا تھا۔

”کچھ کھا لو زرتاج..... دو چار لقمے۔“ فیضان نے کہا تھا۔ ”گوہر نے بتایا تھا کہ تمہاری وجہ سے اس نے کچھ نہیں کھا یا تو پھر میرا دل بھی نہیں چاہا۔ جب تک تم نہیں کھاؤ گی، ہم دونوں بین بھائی بھی بھوکے ہی رہیں گے۔“

زرتاج اس وقت بھی خاموش ہی رہی تھی، جیسے اسے فیضان اور گوہر کے بھوکا رہنے سے بھی کوئی دلچسپی نہ ہو۔ لیکن رات کو اس نے گوہر اور آس پاس کی دو ایک لڑکیوں کے مجبور کرنے پر دو چار لقمے کھائے..... اس کے چہرے سے اب بہت زیادہ فاقہ تھما ظاہر ہونے لگی تھی۔ رات کا نصف پہر گزر جانے کے بعد اسے نیند آگئی۔ گوہر اس کے ساتھ ہی سوئی۔ فیضان کی اجازت سے وہ وہیں رہ گئی تھی۔ خود رحمان دادا بھی یہی چاہتے تھے کہ جب تک کوئی بہتر صورت حال پیدا نہ ہو سکے، گوہر وہیں رہے ورنہ زرتاج صرف ایک ملازمہ کے ساتھ رہ جاتی۔ ایک ملازم بھی تھا لیکن وہ گھر کے باہر ہی رہتا تھا۔

دن گزرتے رہے۔ دایہ بیگم اور عجم النساء کا چہلم بھی گزر گیا۔

”اب تم اپنے گھر جاؤ گوہر!“ ایک شام زرتاج نے کہا۔ ”میرا تو مقدر ہی تنہائی ہے۔ تم ہمیشہ میرے ساتھ نہیں رہ سکتیں۔“
”بھیا مجھے حکم دے چکے ہیں کہ میں یہاں سے نہیں ہوں گی۔“ گوہر نے جواب دیا۔ ”دادا چاہتے ہیں کہ تم ہمارے گھر جاؤ۔“

دایہ بیگم اور عجم النساء کے انتقال کو زیادہ دن نہیں گزرے تھے اس لیے گوہر یہ نہیں کہہ سکتی تھی کہ اب زرتاج کو اس کے بھائی سے شادی کر کے ان کے گھر آجانا چاہیے۔ لیکن زرتاج نے سنی ان سنی کر دی۔ فیضان روزانہ سر پہر کو آیا کرتا تھا اور خاصا وقت گزار کے اپنے گھر جایا کرتا تھا۔ دن میں وہاں کا ایک آدھ بکھر جان دادا بھی لگا لیتے تھے۔

ایک سر پہر فیضان آیا تو زرتاج کمرے میں اسکی ہی تھی۔ گوہر باورچی خانے میں ملازمہ کی مدد سے رات کے کھانے کی تیاری میں مصروف تھی۔ دایہ بیگم اور عجم النساء کے سوگم تک دادا رحمان کھانا لاتے رہے تھے مگر سوگم کے بعد گھر میں چولہا جلایا جاسکتا تھا اس لیے باورچی خانہ گوہر نے سنبھال لیا تھا۔ ملازمہ کو کھانا پکانا نہیں آتا تھا۔ وہ گوہر کی صرف مدد ہی کر سکتی تھی۔ اسے رکھا بھی صرف دایہ بیگم کی دیکھ بھال کے لیے کیا تھا۔

اس روز فیضان کو زرتاج سے تنہائی میں باتیں کرنے

کا موقع مل سکا۔

”یہ اتار چڑھاؤ، زندگی کا لازمی حصہ ہیں زرتاج!“ اس نے کہا۔ ”اس قسم کے حالات سے سمجھو کر تانی پڑتا ہے۔ تم تنہا اس گھر میں کب تک رہو گی۔“
”میں ابھی تمہارے گھر نہیں جاسکتی فیضان!“ زرتاج نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”میں وہاں قید ہو کر رہ جاؤں گی۔“

”تم پر کوئی قدر نہیں لگائی جائے گی۔ میں یہ وعدہ تو کر ہی سکتا ہوں۔“

”رات کے وقت تو تم مجھے نہیں نکلے دو گے۔“
”رات کو عورتیں گھر سے نکلتی ہی کب ہیں۔“
”لیکن مجھے کھانا ہے۔“
”کیوں؟“

”ایک کام کرنے کی قسم کھا چکی ہوں میں، اور ابھی وہ کام مکمل نہیں ہوا۔“ زرتاج نے کہا۔ ”اس کام کے لیے مجھے رات ہی کو نکلنا پڑے گا۔“

فیضان اس کا پہلا جملہ سنتے ہی چونک گیا تھا۔ وہ زرتاج کے خاموش ہوتے ہی بولا۔ ”افضل خاں؟“

زرتاج نے کوئی جواب دیے بغیر سر جھکا لیا۔
فیضان نے ایک طویل سانس لی، پھر کہا۔ ”اب تم اسے نہیں مار سکتی۔“

”کیوں؟“ زرتاج نے اسے غور سے دیکھا۔
”میں نے اس دوران میں اس کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کی تھیں۔ صفدر خاں کی ہلاکت نے غالباً اسے بھی خوف زدہ کر دیا تھا۔ اس نے بھی سے اپنے گھر سے باہر نکلنا بالکل چھوڑ دیا ہے۔ کاروبار اس کے ملازمین سنبھال رہے تھے۔“

”تمہیں اس کے بارے میں چھان بین نہیں کرنا چاہیے تھی۔“ زرتاج تیزی سے بولی۔ ”میں نے کہا تھا کہ تم اس معاملے میں نہیں پڑو گے۔ تم شہید بھی ہو چکے ہو۔ کوئی عورت تمہاری نگرانی کر رہی ہے۔“

”کر رہی تھی، اب نہیں کر رہی ہے۔“ فیضان نے کہا۔ ”پندرہ بیس دن بعد میری نگرانی ختم کر دی گئی تھی۔ اگر یہ مطمئن ہو گئے ہوں گے کہ رویوں کے قتل میں میرا ہاتھ نہیں ہو سکتا۔ اپنی نگرانی ختم ہونے کے بعد ہی میں نے افضل خاں کے بارے میں چھان بین کی تھی۔ اس نے نہ صرف گھر سے نکلنا چھوڑ دیا تھا بلکہ ملازمین ہی کے ذریعے اپنا کاروبار بھی سنبھالنا شروع کر دیا تھا۔ میری کل کی معلومات

کے مطابق آج رات تک.... وہ اپنا کام مکمل کر لے گا۔ میرا خیال ہے کہ وہ دہلی سے چلا جانا چاہتا ہے اور اگر میرا خیال درست ہے تو وہ کل یا پرسوں دہلی سے چلا جائے گا۔“
یہ سب کچھ جانتے ہی زرتاج کے خون کی روانی بہت تیز ہو گئی۔ وہ چاہتی تھی کہ افضل خاں زندہ بچ کر ہرگز نہ جا سکے۔

”لہذا اب اسے بھول جاؤ زرتاج!“ فیضان نے بات جاری رکھی۔ ”ان میں سے ایک تو بچ کر نکل ہی چکا ہے۔ ایک اور نکل جائے گا تو کیا ہے۔ تم دس رویوں سے تو انتقام لے لی چکی ہو اور خدا کا شکر ہے کہ محفوظ بھی رہی ہو۔“
اسی وقت کمرے کے باہر سے آواز آئی۔ ”بھیا!“
”آ جاؤ گوہر!“ فیضان نے کہا۔

گوہر دروازہ کھول کر اندر آئی۔ ”تجودہ بیوی کی زرتاج؟“

”نہیں۔ میرا دل نہیں چاہ رہا ہے۔“
”آپ، بھیا؟“

”نہیں، میں بس اب چلتا ہوں۔“ فیضان نے کہا۔ ”آج زیادہ نہیں رک سکوں گا۔ دادا تو آج گھر سے نکل ہی نہیں ہوں گے۔ صبح جب میں گھر سے روانہ ہوا تھا تو دادی کی طبیعت زیادہ خراب تھی۔“

”زیادہ خراب تھی؟“ زرتاج تیزی سے بولی۔
”ہاں۔“ فیضان نے جواب دیا۔ ”پندرہ دن پہلے بھی ایسا ہو چکا ہے لیکن پھر وہ سنبھل گئی تھیں۔ اب اس عمر میں یہ اونچ نیچ تو چلتی ہی ہے۔ دادا کی تو ماشاء اللہ اب بھی صحت بہت اچھی ہے لیکن دادی خاصی بوڑھی گئے گی ہیں۔ وہ دادا سے زیادہ عمر کی معلوم ہوتی ہیں اب۔“

فیضان جانے کے ارادے سے کھڑا ہوا۔
”گوہر!“ زرتاج بولی۔ ”دادی کی طبیعت زیادہ خراب ہے تو تمہیں بھی انہیں دیکھنے کے لیے جانا چاہیے۔“
”نہیں۔“ فیضان نے زرتاج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں اکیلا نہیں چھوڑا جاسکتا۔“

”میں پڑوس سے فرزانہ اور سلطانہ کو بلا لیتی ہوں۔“ زرتاج نے کہا۔ ”دونوں بہنیں مجھ سے بہت ملتی جلتی ہوتی ہیں۔ ان دنوں میں تو وہ گوہر سے بھی بے تکلف ہو گئی ہیں۔“
”نہیں لڑکیاں ہیں؟“ اس مرتبہ فیضان نے گوہر کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”دونوں بہنیں بہت ہمدرد اور ملنسار ہیں بھیا!“
”ان کے گھر والے بھی بہت اچھے ہیں۔“ زرتاج

بول پڑی۔ ”اگر میں ان دونوں کو رات بھر کے لیے بھی روکوں تو ان کے والدین کو اعتراض نہیں ہوگا۔“

”گوہر کو پاکی میں لے جاؤں گا تو گھر پہنچنے میں خاصا وقت لگے گا۔“ فیضان سوچتے ہوئے بولا۔ ”پھر اسے واپس یہاں چھوڑنے بھی آؤں گا۔ گھر پر بھی یہ کچھ دیر تو رکے گی۔“

یہاں اسے واپس لاتے لاتے اندھیرا پھیل جائے گا۔ اتنی دیر تک رکی رہیں گی وہ دونوں.....؟“

”میں نے ابھی کہا تو ہے کہ میں انہیں رات بھر بھی روک سکتی ہوں۔“ زرتاج نے کہا اور پھر آواز دے کر ملازمہ کو بلا یا، اس کو ہدایت کی کہ وہ سلطانہ کے گھر جا کے اس کی والدہ سے کہے کہ میں نے رات تک کے لیے فرزانہ اور سلطانہ کو بلا یا ہے۔ دوسری ہدایت اس نے یہ بھی کی کہ وہ کوئی پاکی لے آئے۔

فاضل خاں کے بارے میں فیضان سے معلومات حاصل ہوتے ہی زرتاج کے دماغ میں یہ خیال آیا تھا کہ فاضل خاں کو کسی طرح آج ہی قسم کیا جانا چاہیے۔ اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا کہ وہ پرسوں کے بجائے کل ہی دہلی سے کہیں چلا جاتا۔

فیضان کی دادی کی طبیعت کا علم ہوتے ہی اس کے دماغ نے بڑی تیزی سے کام کیا تھا۔ اپنے اس ارادے پر وہ اسی صورت میں عمل پیرا ہو سکتی تھی جب گوہر اس کے ساتھ نہ ہو۔ وہ اسے گھر سے نہیں جانے دیتی جبکہ سلطانہ اور فرزانہ کو وہ بے وقوف بنانے میں کامیاب ہو سکتی تھی۔

دایہ بیگم اور نجم النساء کی موت کے صدمے کے باوجود زرتاج کا انتقامی جذبہ نہ صرف یہ کہ ختم نہیں ہوا تھا بلکہ اور شدید ہو گیا تھا۔ اس کے دل و دماغ میں رہ رہ کر یہ ٹیس اٹھتی رہی تھی کہ اس کی ماں اپنے خاندان میں واپس جانے سے پہلے ہی دنیا سے کوچ کر گئی تھی۔

☆☆☆

فرزانہ اور سلطانہ کے آنے کے بعد فیضان اور گوہر چلے گئے۔ جاتے جاتے بھی فیضان شکر نظر آ رہا تھا۔ نہ جانے اس کے دماغ میں کیا خیالات گردش کرتے رہے تھے۔

فرزانہ اور سلطانہ نے ایسی باتیں پھینک دیں کہ زرتاج کا دھیان بٹا رہا۔ اسے دایہ بیگم اور نجم النساء کی موت کا زیادہ خیال نہ آئے لیکن وہ دونوں اگر اس قسم کی باتیں نہ کرتیں تو بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس وقت زرتاج کے دماغ میں صرف یہ خیال گردش کر رہا تھا کہ اسے آج ہی گوہر کی واپسی سے پہلے اپنا کام ختم کرنا ہے۔

اس سے پہلے زرتاج نے جو قتل کیے تھے، وہ رات پھیلنے کے خاصی دیر بعد کیے تھے۔ ان تمام دلوں میں اس کا معمول یہ رہا تھا کہ وہ نجم النساء کے سونے کے بعد ہی بہت خاموشی کے ساتھ گھر سے نکل جایا کرتی تھی۔ نجم النساء کی نیند بہت گہری تھی۔ ایک آدھ پارہ ایسا ہوا تھا کہ سونے کے بعد صبح سے پہلے اس کی آنکھ کھلی ہو۔ زرتاج اسی بات سے فائدہ اٹھاتی رہی تھی۔ نجم النساء کے سونے کے کچھ ہی دیر بعد بہت خاموشی کے ساتھ گھر سے نکل جایا کرتی تھی اور دے قدموں ان علاقوں میں گھومتی رہتی تھی جہاں وہ روپیلا رہتے تھے۔ ستانے اور اندر سے میں گلی کو چھ اس کو اپنی پناہ میں لے رہے تھے۔ اگر بھی اسے غلابہ گردوں کی آہٹ یا ان کے گھوڑوں کی ٹانگیں سنائی دے جاتی تھیں تو وہ خود کو کسی بہت ہی اندر سے گوشے میں چھپایا کرتی تھی۔ اس پر بھی ابھی اسے خود بھی تعجب ہوتا تھا کہ وہ اتنی دیر کسے ہوئی تھی۔

لے دے کر اسے بس یہی خیال آتا تھا کہ اس کی رگوں میں اس مغل شاہی خاندان کا خون دوڑ رہا تھا جس کی بہت سی شہزادیوں نے بہت نڈر ہو کر بڑی جرأت سے ناساہد حالات کا مقابلہ کیا تھا۔ اس کے علاوہ انتقام کا جذبہ بھی انسان کو جرأت آزا اور نڈر بنا دیتا ہے۔ وہی جذبہ زرتاج کے خون میں بھی سرایت کیے ہوئے تھا۔

ہر روپیلا کو قتل کرنے کے لیے زرتاج کو اس کے گھر کے آس پاس منڈلاتے ہوئے پندرہ پندرہ، تیس تیس دن گزرے تھے۔ اسے اس وقت کا انتظار کرنا پڑا تھا کہ جب وہ روپیلا اپنے گھر سے نکلے تو وہ اسے گولی کا نشانہ بنائے۔

تین روپیلوں کے لیے تو اسے اپنے گھر سے خاصی دور بھی جانا پڑا تھا۔ انہیں بھی وہ رات ہی کے کسی حصے میں گولی کا نشانہ بناسکی تھی لیکن فاضل خاں کو قتل کرنے کے لیے وہ زیادہ رات نہیں گزار سکتی تھی۔ اسے یہ کام رات کا آغاز ہوتے ہی کرنا تھا لہذا یہ بھی ضروری تھا کہ وہ رات ہونے سے پہلے ہی اپنے گھر سے روانہ ہو جائے۔ گوہر کے آجانے کے بعد اس کا گھر سے نکلنا ممکن نہیں ہوتا۔ سلطانہ اور فرزانہ کو چمکے دینے کے لیے تو اس نے ایک ترکیب سوچ لی تھی۔

اس نے کچھ دیر بعد سلطانہ کو تھوہہ بنانے کے لیے باورچی خانے میں اور فرزانہ کو مچھن کی لکڑی سے کچھ پڑے اتار کر لانے کے لیے بھیجا۔

ان دونوں کے جاتے ہی اس نے وہ الماری کھولی جس میں وہ اپنے کپڑے اور اپنے استعمال کی متفرق چیزیں رکھتی تھی۔ نجم النساء کا اس الماری میں بالکل غل دخل نہیں تھا۔

الماری کے ایک خانے میں دو پستول رکھے ہوئے تھے۔ اس نے ان میں سے ایک پستول اور اس کی گولیاں فیضان سے لی تھیں۔ دوسرا پستول اس کے والد کا تھا۔ اسی پستول سے وہ روپیلوں کو ہلاک کر چکی تھی۔ وہ پستول اس کے والد کا تھا۔ اس پستول کے دستے پر ”تاج“ کی شکل بھی ابھری ہوئی تھی۔ والد کے انتقال کے بعد جب اس نے وہ پستول دیکھا تھا تو اس تاج کے نشان کی وجہ اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی لیکن اپنے بارے میں حقائق جاننے کے بعد اسے شبہ ہوا تھا کہ شاید مغل شاہی خاندان کا نشان ہو۔

ایک مرتبہ اس نے سرسری انداز میں نجم النساء سے اس نشان کے بارے میں پوچھا تو اس کے شہبے کی تصدیق ہو گئی تھی۔ اس کا باپ چونکہ مغل شاہزادہ تھا اس لیے کل چھوڑتے وقت وہ اپنے ساتھ وہ پستول لے آیا تھا۔

وہ پستول زرتاج ہمیشہ بھرا ہوا رکھتی تھی۔ ہر روپیلا کو قتل کرنے کے بعد وہ دم ہوجانے والی گولی کی جگہ دوسری گولی بھر دیتی تھی۔

فرزانہ جب مچھن سے کپڑے لے کر واپس آئی تو زرتاج اپنا کام مکمل کر چکی تھی اور الماری بند کر کے اپنی جگہ واپس جا بیٹھی تھی۔

سلطانہ تھوہہ بنا لائی۔ تھوہہ پیتے ہوئے زرتاج ان سے باتیں تو کرتی رہی لیکن ذہنی طور پر غیر حاضری رہی۔ اس کا دماغ اس کام میں الجھا رہا تھا جو وہ ہر قیمت پر آج ہی کر ڈالنا چاہتی تھی۔

وقت کا اندازہ لگنے کے بعد اس نے اچانک کہا۔

”مجھے کچھ گھبراہٹ سی ہو رہی ہے سلطانہ!“

”اس کا اندازہ تو مجھے ہو رہا ہے۔“ سلطانہ نے کہا۔

”ابھی باتیں کرتے ہوئے کئی بار ایسا محسوس ہوا جیسے تمہارا دھیان نہیں ہو رہا۔“

”ہاں۔“ زرتاج نے فوراً کہا۔ ”مجھے گوہر کی دادی کا خیال آتا رہا ہے۔ مجھ سے بڑی غلطی ہوئی۔ گوہر کے ساتھ مجھے بھی دادی کو دیکھنے جانا چاہیے تھا۔ کتنا خیال رکھا ہے ان لوگوں نے میرا۔ کتنی بری بات ہوئی کہ میں گوہر کی دادی کو دیکھنے نہیں گئی۔“

”ہاں یہ بری بات تو ہے مگر اب کیا ہو سکتا ہے۔ گوہر کے ساتھ چلی جاتیں تو شیک تھا۔“

”اب چلی جاتی ہوں میں۔“

”نہیں نہیں۔“ فرزانہ جلدی سے بول پڑی۔

”اکیلے جانا شیک نہیں رہے گا اس وقت۔“

”کیوں؟ ابھی رات تو نہیں ہوئی۔ میں ابھی پاکی دنگا کر روانہ ہو جاؤں تو اندھیرا پھیلنے سے پہلے پہنچ جاؤں گی گوہر کے گھر۔“

فرزانہ اور سلطانہ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ وہ حذب نظر آنے لگی تھیں۔ اس سے پہلے کہ ان دونوں میں سے کوئی پھر کچھ کہتی، زرتاج نے آواز دے کر ملازمہ کو بلا یا اور اس کے ذریعے ملازم کو کھلایا کہ وہ جلدی سے کرائے کی پاکی لے آئے۔ پھر اس نے سلطانہ اور فرزانہ سے کہا۔

”تم دونوں چاہو تو میری اور گوہر کی واپسی تک یہیں روک یا اپنے گھر چلی جاؤ۔ میں قتل لگا جاؤں گی گھر میں!“

”ہو سکتا ہے کہ تم گوہر کے گھر پہنچو اور وہ وہاں سے روانہ ہو چکی ہو۔“ سلطانہ نے کہا۔ ”یہاں انہیں قتل لگا ہوا ملے گا تو.....“

”تو پھر تم دونوں یہیں روک میری پیاری!“ زرتاج نے محبت آمیز لہجے میں کہا۔ ”گوہر کو بتا دینا کہ میں اسی کے گھر گئی ہوں۔ وہ فیضان کو واپس بھیج دے گی۔ مجھے لے کر اسے دوبارہ آنا پڑے گا۔“

”تو پھر تم یہیں رکنا چاہیے۔“

”ہاں مناسب تو یہی ہوگا۔“

اس طرح زرتاج انہیں چمکے دینے میں کامیاب ہو گئی اور پاکی میں بیٹھ کر فاضل خاں کے گھر کی طرف روانہ ہوئی۔

اس مرتبہ اس نے ایک ایسا فیصلہ کیا تھا کہ کسی خطرے میں پڑ جانے کا خاصا امکان تھا لیکن وہ افضل خاں کو قتل کرنے کے لیے اپنی جان پر کھیلنے کے لیے تیار تھی۔

پاکی میں اسے کچھ خیال آیا تو وہ آبدیدہ ہو گئی۔ اس نے دل ہی دل میں کہا۔ ”اگر مجھے کچھ ہو جائے فیضان تو مجھیں میری محبت کی قسم، خود کو سنہال لینا۔ تم نے ایک بار مجھ سے کہا تھا کہ انسان کو حالات سے مجبور کرنا پڑتا ہے۔ اس پر تم بھی عمل کرنا۔ انتہائی کوشش کرنا کہ مجھ بد نصیب کو بچا دو۔“

اس کی آنکھوں سے دو آنسو بھی ٹپک گئے۔ اس نے وہ پونچھے اور افضل خاں کے بارے میں سوچنے لگی لیکن خیالات کی لہر اس فیضان سے بھی ٹکرائی رہیں۔ اسے اندازہ تھا کہ اگر اسے کچھ ہو گیا تو خود کو سنہالنا فیضان کے لیے آسان نہیں ہوگا۔ وہ اسے بہت شدت سے چاہتا تھا۔ وہ خود بھی فیضان کو اتنی ہی شدت سے چاہتی تھی لیکن انتقام کی آگ نے اس کی محبت پر ترجیح پائی تھی۔

پاکی جب اس علاقے میں پہنچی تو ہلاک اندھیرا پھیلنے

لگا تھا۔ اس نے پاکی سے اتر کر رہا ادا کیا۔ آنکھوں کے نیچے اس کے چہرے پر نقاب تھی اور جسم ایک چادر میں چھپا ہوا تھا۔ وہ تیزی سے چلتی ہوئی ایک گلی میں داخل ہوئی۔ اسے وہاں سے ایک لمبا چکر لگا کر افضال خاں کے گھر کے سامنے پہنچنا پڑا۔ یہ چکر لگانے سے ایک بہتر صورت یہ پیدا ہوئی کہ اتنی دیر میں رات کی تاریکی پوری طرح زمین پر اتر چکی تھی۔ افضال خاں کے گھر کے دروازے پر پہنچ کر زرتاج نے مختار انداز میں ادھر ادھر دیکھا۔

بالکل ابتدائی رات میں شہر گہرے سناٹے میں نہیں ڈوبتا تھا۔ اکادکاراہ گہرا آتے جاتے نظر آتے تھے۔ کسی کے گھوڑے کی ٹانگیں بھی سناٹی دے جاتی تھیں لیکن یہ زرتاج کی خوش قسمتی تھی کہ اسے آس پاس کوئی نہیں دکھائی دیا اور اگر کوئی نظر آجاتا تو بھی زرتاج کو اس کی پروا نہ ہوتی۔ وہ گھر سے سوچ کر چلی گئی کہ اسے کسی بھی صورت حال سے دوچار ہونا پڑسکتا ہے۔ اس نے ارد گرد نظر دوڑانے کے بعد دروازے پر دستک دلی۔ یہ پہلا موقع تھا جب اس نے کسی درویش کو اس کے گھر میں گھس کر گول کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس کے لیے اب اس کے علاوہ راستہ نہیں بچا تھا۔ فیضان کے بیان کے مطابق افضال خاں کل یا پرسوں دہلی سے چلا جاتا اور زرتاج کو حیرت رہ جاتی کہ اس کا آخری شکار ہاتھ سے نکل گیا۔

دستک دیتے وقت اسے اندازہ تھا کہ دروازہ کھولنے والا کوئی ملازم یا ملازمہ ہوگی۔ وہ جو بھی ہوتا، زرتاج اندر گھس پڑتی اور پستول دکھا کر ملازم یا ملازمہ کو مجبور کر دیتی کہ وہ اسے افضال خاں کے کمرے تک پہنچائے۔

دستک دینے کے بعد جب کچھ درتک اندر سے دروازہ نہیں کھلا تو زرتاج کو خیال آیا کہ افضال خاں نے کیا دہلی چھوڑنے سے پہلے ہی اپنے ملازمین کی بھی چھٹی کر دی تھی؟

دوسری مرتبہ اس نے کچھ زور سے دستک دی۔ اس بار چند لمحوں کے توقف سے اندرونی جانب قدموں کی آہٹ ہوئی۔ کوئی دروازے کی طرف آ رہا تھا۔ آہٹ ہماری قدموں کی تھی جس سے اندازہ لگا یا جاسکتا تھا کہ دروازے کی طرف آنے والی کوئی ملازمہ نہیں تھی۔ وہ کوئی مرد ہی تھا جس نے دروازے کے قریب آ کر پوچھا۔

”کون ہے؟“

زرتاج کے اعصابی تناؤ میں اضافہ ہو گیا۔ اس نے افضال خاں کی آواز پہچان لی تھی۔ بالکل ابتدا میں اس نے اپنے مطلوبہ رہوہیلوں کے محلوں کے چکر لگائے

تھے، تو انہیں نہ صرف دیکھ لیا تھا بلکہ ان میں سے کئی کی آوازیں بھی سن لی تھیں۔

”دروازہ تو کھولے افضال میاں جی!“ زرتاج نے دھڑکتے دل کے ساتھ کہا۔ ”میں پڑوس میں رہتی ہوں۔ ایک مشکل میں پڑ گئی ہوں۔ آپ کی مدد چاہتی ہوں۔“

زرتاج کو خیال تھا کہ نسوانی آواز سن کر افضال خاں کسی اندیشے کا شکار نہیں ہوگا۔ یہ اس کے خواب و خیال میں بھی نہیں ہونا چاہیے تھا کہ اس کے ساتھیوں کو قتل کرنے والا کوئی مرد نہیں بلکہ عورت ہوگی۔

زرتاج کا خیال درست ثابت ہوا۔ اندر سے دروازہ کھول دیا گیا۔ گھر میں جو روشنی تھی، وہ زرتاج کے چہرے پر بھی پڑی اور زرتاج نے بھی اس روشنی میں افضال خاں کا چہرہ دیکھ لیا جس پر کچھ الجھن کے تاثرات تھے۔ اسے الجھن یہی ہو سکتی تھی کہ پڑوس کی کوئی عورت رات کے وقت اس سے قسم کی مدد چاہتی ہوگی۔

زرتاج نے بڑی تیزی سے اوڑھی ہوئی چادر سے اپنا وہ ہاتھ نکالا جس میں وہ پستول دپائے ہوئے تھی۔ کسی گھوڑے کی ٹانگیں قریب آتی جاری تھیں لیکن اگر ایسا نہ ہوتا تو بھی زرتاج اپنا کام کرنے میں تاخیر بالکل نہیں ہونے دیتی۔

پستول دیکھ کر افضال خاں چونکا لیکن اسے کسی اور رد عمل کی مہلت نہیں ملی۔ زرتاج کے پستول نے شعلہ اگل دیا تھا۔ گولی چلنے کے دھماکے کی آواز سنانے میں یقیناً دو رتک پہیلی ہوئی لہذا زرتاج تیزی سے مڑ کر بھاگی۔ کسی پریشان کن صورت حال سے دوچار ہونا اس کی بے وقوفی ہی ہوتی۔ وہ اتنا بھی نہیں رکھی تھی کہ افضال خاں کو گرتے اور مرتے ہوئے دیکھ سکے۔ اس نے افضال خاں کی پیشانی پر گولی چلائی تھی اور اسے ذرا بھی خیال نہیں تھا کہ اس کا نشانہ خطا گیا ہوگا۔

گھوڑے کی ٹانگیں اب اتنی قریب آچکی تھیں جیسے سر پر آچکی ہوں۔ اس کے ساتھ ہی کسی کے دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز بھی تیزی سے قریب آتی جارہی تھی۔ بھاگتے ہوئے زرتاج نے دیکھا کہ گھڑسوار اس کے بہت قریب آ گیا تھا۔ زرتاج نے اپنے پستول کا رخ اس کی طرف کیا۔ اس گھڑسوار تھا، مگر اس سے پہلے کہ وہ پستول چلا دیتی، اس نے گھڑسوار کی پہنچی ہوئی آواز پہچان لی۔

”میں فیضان ہوں زرتاج!“

زرتاج خشک کر رکی۔ وہ گولی چلا کر ایک گلی میں

داخل ہو جاتا جہاں تھی۔ اس کا دماغ چکر گیا کہ فیضان اس وقت وہاں کیسے آ گیا۔

اسی وقت ایک پہنچی ہوئی نسوانی آواز بھی سناٹی دی۔ وہ کوئی انگریزی تھی جس نے زرتاج کا نام لے کر اسے لگا رہا تھا کہ اگر اس نے بھاگنے کی کوشش کی تو اس پر گولی چلا دی جائے گی۔

لیکن گولی چلانے کی دھمکی سے پہلے ہی فیضان نے زرتاج کو گھوڑے پر اپنے آگے بٹھالیا تھا۔

”گھوڑے کی گردن سے لپٹ جاؤ۔“ فیضان تیزی سے بولا۔

زرتاج نے پلک جھپکتے میں اس کی ہدایت پر عمل کیا تھا اور اس کے ساتھ ہی فیضان بھی اس پر چبک گیا تھا۔ گولی چلنے کی آواز تو سناٹی دی تھی لیکن وہ دونوں محفوظ رہے تھے۔ پھر دوسری گولی بھی چلی لیکن اس وقت فیضان اپنے گھوڑے کو دائیں جانب کے ایک راستے پر موڑ چکا تھا۔

”تم..... تم یہاں کیسے آ گئے؟“ زرتاج کے منہ سے نکلا۔ اس وقت اس کے مختص کی رفتار خاصی بڑھ چکی تھی جس کا سبب وہ غیر معمولی صورت حال تھی۔ زرتاج کے سان گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس خطرناک موقع پر فیضان اس کی مدد کے لیے وہاں پہنچ جائے گا۔

فیضان نے اس کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

”تمہیں پہچان لیا گیا ہے اس لیے اب تم اپنے گھر نہیں جا سکتیں اور اگر میں تمہیں اپنے گھر لے گیا تو بھی ہم گرفتار کر لیے جائیں گے۔“

گھوڑا پوری رفتار سے دوڑ رہا تھا۔

”کیا شہر سے ہی بھاگنا ہوگا؟“ زرتاج نے پوچھا۔

”جب تمہیں پہچان لیا گیا ہے تو مجھے بھی پہچانا جا چکا ہوگا۔ شہر سے بھاگ کر بھی ہم کم تک اور کہاں تک چھپتے پھریں گے؟“ فیضان نے جواب دیا۔ گھوڑے کی برقی رفتار کے باعث اس کی آواز بھی جھٹکے کھا رہی تھی۔ اتنی تیز رفتار سے گھوڑا دوڑاتے ہوئے باتیں کرنا آسان نہیں تھا۔ فیضان پر مشکل ہی بنا۔ کہ وہ زرتاج کی طرف سے شکرت تھا اس لیے گویا کو دادی سے ملا کر وہاں ذرا دیر بھی رکے بغیر واپس لوٹا تھا۔ زرتاج اس وقت گھر سے جا چکی تھی۔

اس نے فرزانہ اور سلطانہ کو بے وقوف بنا دیا تھا لیکن فیضان کو یقین نہیں آیا تھا کہ زرتاج اس کی داوی کو دیکھنے گئی ہوگی۔ اسے فوراً صرف یہ خیال آیا تھا کہ زرتاج فاضل خاں کے گھر کی طرف گئی ہوگی چنانچہ وہ گویا چھوڑ کر نہایت تیز

رفتاری سے اسی طرف آیا تھا اور یہ غالباً زرتاج کی خوش قسمتی تھی کہ وہ عین وقت پر اس کی مدد کے لیے پہنچ گیا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو زرتاج گرفتار کر لی جاتی یا ان گولیوں سے زخمی یا ہلاک ہو جاتی جو ان پر کسی انگریز عورت نے چلائی تھیں۔

فیضان کو یہ خیال بھی آیا تھا کہ گولیاں برسائے والی شاید وہی لڑکی ہو جو کچھ دن پہلے تک اس کی نگرانی کرتی رہی تھی۔ اس کا خیال زرتاج کو بھی آچکا تھا۔ اسے یہ بات فیضان ہی سے معلوم ہوئی تھی کہ انگریزوں نے ایک لڑکی کو اس کی نگرانی پر مقرر کیا تھا۔

لیکن اس وقت، سرپٹ دوڑتے ہوئے گھوڑے پر، زرتاج اس لڑکی کے بارے میں زیادہ نہیں سوچ رہی تھی۔ اس کے رگ و پے میں اس تجسس کی لہریں دوڑ رہی تھیں کہ فیضان اسے کہاں لے جا رہا تھا۔ وہ اس وقت خاصی چونک گئی جب اس نے دیکھا کہ گھوڑا لال قلعے میں داخل ہو رہا تھا۔ اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”یہ..... یہ.....“

کہاں..... فیضان!“

”اب۔“ فیضان نے جواب دیا۔ ”تمہیں صرف اپنے خاندان میں ہی پناہ مل سکتی ہے زرتاج!“

☆☆☆

عین اسی وقت شاہی محل میں شہزادہ جہانگیر مرزا، شہزادہ سراج الدین کے کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ اس کے چہرے سے اس کا تلکد صاف ظاہر ہو رہا تھا۔ اس نے کمرے میں قدم رکھتے ہی شہزادہ سراج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”آپ نے مجھے طلب فرمایا برادر معظم؟ بلکہ اب تو مجھے چاہیے کہ آپ کو برادر معظم کے بجائے ولی عہد سلطنت کہہ کر مخاطب کروں۔“

شہزادہ سراج نے شہنشاہی سانس لی اور تنہید کی کہا۔

”ہم نے تمہیں طلب نہیں کیا ہے برادر عزیز! صرف بلایا ہے اور بلایا بھی خود نہیں ہے۔ اعلیٰ حضرت ہی نے ہمیں ہدایت کی تھی کہ ہم اپنے تمام بھائیوں کو ایک ایک کر کے سمجھائیں۔ ان کے علم میں آچکا ہے کہ ہمارے تمام بھائی ان سے اور ہم سے ناراض ہیں اور تم سب سے زیادہ مشتعل ہو۔“

”یہ سارا معاملہ ہی ایسا ہے۔“ جہانگیر مرزا نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”آپ بڑھائے کی حدود میں داخل ہو چکے ہیں جبکہ میں ابھی نو جوان تو نہیں مگر جوانی کی حدود سے آگے نہیں نکلا۔ میں سلطنت کے معاملات میں جتنا حرکت رہ سکتا ہوں، آپ نہیں رہ سکتے۔ پھر ایک بہت اہم بات یہ کہ میں اعلیٰ

حضرت کی سب سے جیتی ممتاز بیگم کا بیٹا ہوں جبکہ آپ ایک راجپوت خاتون کے بطن سے ہیں۔“

جہانگیر مرزا نے شہزادہ سراج کی بڑی دھمکی رگ پر ہاتھ مارا تھا لیکن شہزادہ سراج نے اپنے دل پر چوٹ لگنے کے باوجود محل میں جاتی کا دامن اپنے ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ بس قدرے رک کر کہا۔ ”یہ تم نے کس سلطنت کی بات کی ہے برادر عزیز! اس سلطنت کی جو فردوس مکانی ظہیر الدین بابر نے قائم کی تھی؟ اس سلطنت کی جس کا جہاں و جلال عرش آشیانی جلال الدین اکبر کا مرہون منت تھا؟ میرے عزیز بھائی! وہ سلطنت تو غلہ مکانی محی الدین اورنگ زیب کی وفات کے ساتھ ہی شدت سے رو بہ زوال ہو گئی تھی، اور اب!۔۔۔“ سراج الدین کی آواز میں کسک پیدا ہوئی۔ ”اب تو وہ سلطنت صرف اس بد نصیب شہر دہلی میں بھی رسماً قائم رہ گئی ہے۔ فرنگیوں کے بیدار اس شہر میں بھی پھیل چکے ہیں۔ اب صرف قلعہ معلیٰ ہی رہ گیا ہے جہاں مغل سلطنت قائم ہے۔ یقین کرو کہ اس سکڑی سٹی ہوئی نام نہاد سلطنت کا ولی عہد بن کر ہمیں شتمہ برابر خوشی نہیں ہوئی۔ دوسرے یہ کہ اہم بات وہ نہیں جس کی طرف تم نے ابھی اشارہ کیا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ ہمیں اپنا ولی عہد اعلیٰ حضرت نے اپنی خوشی سے یا اپنی خواہش کے مطابق نہیں بنایا ہے۔ یہ فیصلہ فرنگیوں نے کیا ہے اور اب اس سلطنت کے تخت نشین، یعنی ہمارے والد بزرگوار میں یہ ہمت اور یہ سکت نہیں رہی کہ وہ فرنگیوں کے فیصلے کی مخالفت کر سکیں۔“

”فرنگیوں نے یہ فیصلہ آپ کے حق میں کیوں کیا ہے؟“ شہزادہ جہانگیر مرزا جیسے لہجے میں بولا۔ ”کیا انہوں نے محسوس کر لیا ہے کہ آپ ہی ان کے زیادہ بڑی خواہ ہیں۔“

”اگر انہوں نے ایسا سمجھا ہے تو خدا گواہ ہے کہ ایسا ہرگز نہیں ہم۔۔۔“

جہانگیر مرزا نے تیزی سے سراج الدین کی بات کا منہ بولے ہوئے کہا۔ ”آپ کی لمبی چوڑی تقریر میں نے بڑے محل سے سن لی۔ اب مزید کچھ نہیں سنتا جانتا۔ بس یہ فرمایا کہ آپ نے مجھے کیوں طلب کیا ہے، یا یہ قول آپ کے بلا یا ہے۔“

”ہم نے تمہیں اس لیے۔۔۔ یعنی یہ سمجھانے کے لیے بلا یا ہے کہ اب جبکہ مغل شہنشاہیت کا زوال انتہا کو چھو رہا ہے تو ہم بھائیوں میں کوئی رنجش نہیں ہونا چاہیے۔“

”میرا خیال ہے، میں عمر کے اعتبار سے بھی اور ذہنی طور پر بھی اتنا بالغ ہو چکا ہوں کہ خود ہی سب کچھ سمجھ سکتا

ہوں۔ اس کی ضرورت نہیں ہے کہ مجھے سمجھا یا جائے۔“

”ہم تمہارے اس جواب پر اظہارِ نفوس ہی کر سکتے ہیں۔ بے شک تم عمر کے اعتبار سے بالغ ہو چکے ہو لیکن۔۔۔“

جہانگیر مرزا نے پھر بڑی تیزی سے اس کی بات کاٹی۔ ”اب میں اجازت چاہوں گا۔“

اس سے پہلے کہ شہزادہ سراج الدین مزید کچھ کہتا، جہانگیر مرزا امرا اور تیزی سے چلتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

شہزادہ سراج الدین نے اپنا سر تھام لیا۔ اب وہ سوچ رہا تھا کہ اپنے باقی بھائیوں کو بھی سمجھانے کی کوشش کرے یا نہ کرے۔ اس کا اندازہ تھا کہ اس کے تیرہ بھائیوں میں سے کم از کم مرزا بابر، مرزا سلیم، مرزا غلام اور مرزا جہاں شاہ کا رد عمل تقریباً وہی ہوتا جس کا مظاہرہ جہانگیر مرزا کر رہا تھا۔ تنگ مزاج وہ بھی تھے، ان کا رد عمل جہانگیر مرزا کے رد عمل کی طرح اتنا شدید نہ ہوتا لیکن ہوتا ضرور!

جہانگیر مرزا اسے فرنگیوں کی یہی خواہی کا طعنہ دے کر چاچا کا تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ اس کی اصل وجوہ کیا تھیں۔ جب سے اکبر جانی کی بیماری بڑھنا شروع ہوئی تھی، فرنگیوں نے بھی سے سوچنا اور سمجھنا شروع کر دیا تھا کہ کس شہزادے کو ولی عہد بنوانا ان کے لیے مفید ہو سکتا ہے یا مستقبل میں ان کے لیے مشکلات پیدا نہیں کر سکتا۔

فرنگیوں سے نفرت شہزادہ سراج الدین کے دل میں بھی تھی لیکن وہ نہایت محل مزاج تھا اور اپنے جذبات پر قابو رکھنے پر قادر تھا۔ اس کے برخلاف اس کے بھائی نہیں نہ کہیں، بھی نہ کبھی، کسی نہ کسی سے ایسی باتیں کہہ جایا کرتے تھے جن سے ان کے مزاج کی سرکشی ظاہر ہو جاتی تھی۔

حتیٰ فیصلہ فرنگیوں نے کچھ دن پہلے اس رات کیا تھا جب نیا صدی سال شروع ہونے والا تھا۔ انیسویں صدی کے چھتیسویں سال کی آمد پر یہ یڈنٹ نے رات کو اپنے گھر پر جشن کیا تھا جس میں اس نے تمام مغل شہزادوں کو بھی مدعو کیا تھا۔ شراب کا دور چل رہا تھا اور اسی دوران میں اس نے تمام شہزادوں سے الگ الگ بیڈ کر باتیں کیں، دوسرے شہزادوں نے نشے میں کچھ نہ کچھ ایسی باتیں کہہ ڈالی تھیں جن سے ان کا خاندانی غرور صاف ظاہر ہو گیا تھا لیکن شہزادہ سراج کی عادت نشے کے باوجود برقرار رہی تھی۔ اس کی زبان سے کوئی ایسا فقرہ نہ نکلا، ایک لفظ بھی ایسا نہیں نکلا تھا جو فرنگیوں کو گراں گزرتا۔

پھر تیسرے دن ریڈ یڈنٹ نے اکبر شاہ ثانی سے ملاقات کی تھی اور اس کے اگلے ہی دن اکبر جانی نے شہزادے

سراج الدین کی ولی عہدی کا حکم نامہ جاری کر دیا تھا۔

اس کے بعد محل کی جو فیضان تھی، اس نے شہزادہ سراج الدین کو دلی تکلیف پہنچائی تھی اور اس وقت جہانگیر مرزا سے باتیں کرنے کے بعد وہ اور زیادہ افسردہ ہو گیا تھا۔ وہ انہی خیالات میں ڈوبا ہوا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

”آ جاؤ۔“ وہ دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے مخصوص نرم لہجے میں بولا۔

دروازہ کھول کر اندر آنے والا، شاعی محل کا انتظام و اصرام سنبھالنے والا ناظم اور اکبر جانی کا نہایت مستعد خواجہ سراج تھا۔

”شہزادہ والا تیار!“ وہ کورٹس بجالانے کے بعد بولا۔ ”ابھی زادیر پہلے ایک ایسا واقعہ ظہور پذیر ہو چکا ہے جس کی اطلاع مجھے اعلیٰ حضرت ہی کو دینا چاہیے تھی مگر ان کی ناسازی طبع کے باعث میں نے مناسب سمجھا کہ آپ ہی کو اس سے آگاہ کروں۔“

”ایسا کیا واقعہ ہو گیا؟“ محل کے ناظر کے لب و لہجے کے باوجود شہزادہ سراج الدین نے پرسکون لہجے میں پوچھا۔

”ایک گھڑسوار ایک لڑکی کو گھوڑے پر اپنے ساتھ بٹھائے قلعے میں داخل ہوا تھا۔ جب اس کا گھوڑا محل کے قریب پہنچا تو محافظ دستے کے سواروں نے اسے اپنے گھیرے میں لے کر گرفتار کر لیا۔ ان دونوں سے پوچھ گچھ کے دوران معلوم ہوا کہ اس لڑکی کا نام فیضان علی ہے اور وہ ہماری ہی سیاہ کے ایک دستے کا سالار ہے۔ محافظ دستے کے بعض سپاہیوں نے اسے شناخت بھی کر لیا۔ اس کے ساتھ جو لڑکی ہے، اس کا نام زرتاج ہے۔ ان سے پوچھ گچھ کی جاری ہے لیکن وہ اپنے ناموں کے علاوہ کچھ بتانے کے لیے تیار ہی نہیں ہیں۔ نہ یہ بتا رہے ہیں کہ وہ محل کی طرف کیوں آئے تھے۔ ان کا اور خصوصاً اس لڑکی کا کہنا ہے کہ وہ صرف اعلیٰ حضرت ہی کو اپنے بارے میں سب کچھ بتانے گی۔ محافظ دستے کے سپاہیوں نے فیضان علی کی تلاشی لی تھی اور لڑکی کی تلاشی کے لیے تا تار کی نیزوں سے کام لیا گیا تھا۔ ایک بہتول فیضان علی کے پاس سے اور ایک بہتول اس لڑکی کے پاس سے ناظر طلب کچھ تفصیل سے بتاتا چلا گیا۔“ حیرت انگیز اور عجیب خیز بات یہ ہے شہزادہ والا تیار کہ اس لڑکی کے بہتول کے دستے پر مغل شاعی خاندان کا نشان بنا ہوا ہے۔“

شہزادہ سراج الدین جو خاموشی اور سنجیدگی سے سب کچھ سن رہا تھا، یکا یک چوکا۔ ”شاعی نشان؟“

”جی۔“

شہزادہ کچھ مضطرب نظر آیا۔ وہ کھڑا ہوا اور پھر کچھ سوچتے ہوئے ٹھٹھکا۔ محل کا ناظر ادب سے حکم کا منتظر رہا۔

”وہ اس وقت کہاں ہیں؟“ شہزادے نے پوچھا۔

”محل کے اسی کمرے میں جہاں اسے لے پوچھ گچھ کرنا ہوتی ہے۔“ ناظر نے جواب دیا، پھر بولا۔ ”فیضان علی کیونکہ ہماری سیاہ کے ایک دستے کا سالار ہے اس لیے ابھی تک پوچھ گچھ کے لیے ان پر کوئی سختی نہیں کی گئی۔“

”اعلیٰ حضرت کی طبیعت خاصی ناساز ہے آج۔۔۔! ان دونوں کو ہمارے ہی پاس لاؤ۔ رازداری لازم ہے۔ ابھی کسی کو ان کے بارے میں علم نہیں ہوتا چاہیے۔“

ناظر مودبانہ انداز میں جھکا اور چلا گیا۔

جتنی دیر میں دونوں قیدیوں کو اس کے کمرے میں لایا گیا، وہ ٹھٹھکا رہا تھا اور اس کے چہرے پر غور و فکر کا تاثر قائم رہا تھا۔

”ہم تحلیلہ چاہتے ہیں۔“ شہزادہ سراج الدین نے غور سے زرتاج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

محافظ دستے کے دونوں سپاہی، ان کا سالار اور ناظر کمرے سے رخصت ہو گئے۔

”اب ہمیں بتاؤ!“ شہزادہ سراج الدین نے زرتاج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اعلیٰ حضرت کی طبیعت ناساز ہے۔ فی الحال تم ان سے نہیں مل سکتیں۔“

زرتاج نے فیضان کی طرف دیکھا۔

فیضان بولا۔ ”ہم ولی عہد سلطنت کے حضور میں ہیں۔ تم انہیں بتا سکتی ہو۔ یہ شہزادہ سراج الدین ہیں۔“

زرتاج نے شہزادہ سراج الدین کی طرف دیکھا، وہ کچھ جذباتی نظر آنے لگی تھی۔ وہ ڈنڈ بانی ہوئی آنکھوں کے ساتھ بولی۔ ”کیا آپ یقین کریں گے؟ میری والدہ نجمہ النسا آپ کی چھوٹی بیٹی ہیں اور آپ میرے ماموں زاد بھائی ہیں؟“

شہزادہ سراج الدین کے اضطراب میں اضافہ ہوا۔

”ثبوت؟“

”میرے پاس جو پستول، اور جواب مجھ سے لیا جا چکا ہے، اس کے دستے پر ایک نشان ہے اور میرا خیال ہے کہ شاعی خاندان کا نشان ہے۔ وہ آنجنابی شاہ عالم ثانی نے میری والدہ کو دیا تھا۔“

شہزادہ سراج الدین نے تالی بجائی۔ دروازے کے باہر موجود ناظر فوراً اندر آیا۔

”وہ پتول کہاں ہے جس کے بارے میں تم نے ہمیں بتایا تھا کہ اس پر شاہی خاندان کا نشان ہے۔“
”وہ محافظ دتے کے سالار کے پاس ہے۔“
”فوراً لے کر آؤ۔“

ناظر چلا گیا۔

”کوئی اور ثبوت بھی ہے تمہارے پاس؟“ شہزادہ سراج الدین نے زرتاج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، پھر جواب کا انتظار کیے بغیر بولا۔ ”جب ہمیں ولی عہد بتایا گیا تھا تو اعلیٰ حضرت نے ہمیں ایک چیز بھی دی تھی۔ اس کی وجہ سے ہمیں یقین ہے کہ اگر تم سچ بول رہی ہو تو اس پتول کے علاوہ بھی تمہارے پاس ایک اہم ثبوت ہونا چاہیے۔“
”میرے پاس آنجنہائی شاہ عالم ثانی کے ایک خط کا نصف حصہ ہے لیکن وہ اس وقت میرے پاس نہیں، میرے گھر پر ہے۔“

”وہ میرے پاس ہے۔“ فیضان نے جلدی سے کہا اور اپنے لباس سے نیلے رنگ کی ایک چھوٹی سی ٹیٹھی نکالی۔ زرتاج نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ یقیناً اس کی سمجھ میں نہیں آ سکا ہوگا کہ وہ چھٹی فیضان کے پاس کیسے آئی۔ ”شہزادہ حضور!“ فیضان نے فیضان سے ایک بوسیدہ اور پھٹا ہوا کاغذ نکالتے ہوئے کہا۔ ”اگرچہ میری تلاشی کی گئی تھی لیکن یہ چھٹی مجھے اس لیے واپس کر دی گئی کہ اس میں کچھ ایسے کاغذ بھی ہیں جن پر گھر کیلئے حساب کتاب لکھا ہوا ہے۔ اس خط پر ان لوگوں کی نظر نہیں پڑی تھی جنہوں نے میری تلاشی کی تھی۔“ پھر آگے بڑھ کر اس نے وہ بوسیدہ اور پھٹا ہوا کاغذ شہزادہ سراج الدین کو پیش کیا۔ ”ابھی آپ فرما چکے ہیں کہ ولی عہد بننے کے بعد آپ کو اعلیٰ حضرت سے کوئی خاص چیز ملی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اسی خط کا نصف حصہ ہوگا۔“

شہزادہ سراج الدین کا اضطراب بڑھتا جا رہا تھا۔ اس نے اپنے کمرے کا ایک خفیہ خانہ کھولا۔ اس میں سے اس نے ایک بوسیدہ خط ہی نکالا تھا۔ وہ اسے اور فیضان سے ملے ہوئے کاغذ کو ایک دوسرے سے ملا کر دیکھنے لگا۔

اسی دوران میں فیضان نے وہی آواز میں بتا دیا کہ چھٹی چھٹی فرزانہ کو زرتاج کی الماری کے پاس پڑی ہوئی ملی تھی جو اس نے گوبر کو دے دی تھی۔ گوبر نے وہ چھٹی فیضان کو دے دی تھی اور فیضان کو اس میں رکھے ہوئے کاغذات میں وہ خط نظر آ گیا تھا۔

زرتاج سمجھ گئی تھی کہ جب اس نے الماری کھول کر

اس میں سے پتول نکالا تھا تو وہ چھٹی الماری سے گرمی ہوئی۔ پریشانی اور بے چارگی میں زرتاج اسے دیکھنے لگی تھی۔ شہزادہ سراج الدین نے دونوں کاغذ خفیہ خانے میں رکھے اور لوٹا۔

”تمہاری ماں کا نام نجم النسا تھا؟“ اس نے زرتاج سے پوچھا۔

”جی؟“

”اور ان کی والدہ کا نام؟“

”وہ آنجنہائی شاہ عالم ثانی کی چھوٹی بہن تھیں۔ ان کا نام شہزادی مہر النسا تھا۔“

شہزادہ سراج الدین، زرتاج کے قریب پہنچا۔ اس نے بڑے جذباتی انداز میں دونوں ہاتھ زرتاج کے شانے پر رکھ دیے۔ ”میری عزیز بہن! مبارک ہو، تم اپنے محل اور اپنے خاندان میں واپس آ گئی ہو۔“ زرتاج کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

”اب رہیں۔“ شہزادہ سراج الدین نے اس کی پیشانی چومی۔ ”یہ تو خوشی کا مقام ہے کہ تم اپنے خاندان میں لوٹ آئی ہو۔“

”یہ خوشی کے آنسو ہیں برادر معظم!“ زرتاج نے جذباتی اور لرزرتی ہوئی آواز میں کہا۔

اس وقت فیضان بھی خاصا جذباتی نظر آ رہا تھا۔ ”ادھر سے خط کی تحریر تو تم نے پڑھ ہی لی ہوگی۔“

شہزادہ بولا۔

”جی نہیں۔ وہ فارسی میں ہے۔ میں فارسی نہیں جانتی۔ میری والدہ فارسی جانتی تھیں۔ انہوں نے مجھے اس خط کے بارے میں مختصر آنتایا تھا۔“

”ہم تمہیں اس کے بارے میں تفصیل سے بتائیں گے لیکن پہلے ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ تم ہماری سپاہ کے ایک دستے کے سالار کے ساتھ یہاں کیوں آئیں؟“

”ہم کتب میں ساتھ پڑھ چکے ہیں۔“ زرتاج نے نظریں جھکا کر کہا۔ ”اور اس وقت ہمارے یہاں آنے کا سبب ایک غیر معمولی صورت حال تھی۔ میں آپ سے کچھ بھی نہیں چھپاؤں گی برادر معظم! بد بخت غلام قادر نے آنجنہائی شاہ عالم ثانی کی آنکھیں نکال لی تھیں۔ میں اس کے گیارہ ساتھیوں سے اس کا انتقام لے چکی ہوں۔ جب میں نے گیارہ بوسوں کو گولی ماری تو۔۔۔۔۔“

زرتاج نے مختصر طور پر شہزادہ سراج کو اس صورت حال سے آگاہ کیا۔

”خوب!“ شہزادہ سراج الدین ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ”تم نے بہادر مثل شہزادوں کے خون کی لاج رکھ لی مگر یہ صورت حال شاہی خاندان کے لیے کبھی بھی ثابت ہو سکتی ہے، اگر اس سارے معاملے کو راز میں نہیں رکھا جا سکا۔“

”شہزادہ حضور!“ فیضان بولا۔ ”کیا اب آپ مجھے جانے کی اجازت دیں گے؟ میں اپنے گھر والوں کی طرف سے بہت فکرمند ہوں۔ انگریزوں کو خشک مجھ پر بھی ہے۔ شہزادی زرتاج اس وقت ان کے ہاتھ نہیں لگ سکیں اور کیونکہ اس وقت میں بھی غائب ہوں اس لیے انگریزوں کی طرف سے نہ جانے کیا قدم اٹھایا جائے۔“

”تم پر انہیں کیا شبہ ہے۔۔۔۔۔؟ اور کیوں؟“

اگرچہ فیضان کو اپنے گھر جانے کی جلدی تھی لیکن اسے اجمالی طور پر سراج الدین کو حالات سے آگاہ کرنا پڑا۔

شہزادہ سراج الدین کے چہرے پر تشویش کے آثار پیدا ہوئے۔ وہ بولا۔ ”جب تم ہماری عزیز بہن کو لے کر وہاں سے بھاگے تھے، تو کیا یہ امکان نہیں کہ تمہیں بھی پہچان لیا گیا ہو۔“

”اس کا خدشہ تو ہے شہزادہ حضور!“

”تو پھر تمہیں ابھی اپنے گھر کا رخ نہیں کرنا چاہیے۔ تمہیں گھر رفتار کیا جا سکتا ہے، ابھی تم یہیں روک۔ ہم معلومات کروا رہے ہیں کہ تمہارے گھر پر کیا صورت حال ہے۔“

”کوئی بھی صورت حال ہو، میں اپنے گھر والوں کے لیے بہت پریشان ہوں اور وہاں جانے کے لیے بہت بے چین ہوں۔“

”تمہیں فیضان!“ زرتاج بول پڑی۔ ”برادر معظم ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ پہلے معلومات حاصل کرنا ضروری ہے۔ تم فوراً وہاں نہیں جاؤ۔“

فیضان کے چہرے پر بے چینی اور پریشانی کے تاثرات میں اضافہ ہو گیا۔

شہزادہ سراج الدین نے ناظر کو بلا کر اسے حکم دیا کہ فیضان کے محل اور لباس کی تبدیلی کے ساتھ ہی اس کے آرام کے لیے ایک کمرے کا بندوبست کیا جائے۔

جب یہ سب کچھ کیا جا رہا تھا تو اپنے گھر والوں کے سلسلے میں فیضان کی بے چینی کم نہیں ہوئی تھی۔ زرتاج کو شہزادہ سراج الدین نے اپنے پاس روک لیا تھا کیونکہ وہ اسے خاندان کے دوسرے لوگوں سے متعارف کروانا چاہتا تھا۔

جب اسے آرام کرنے کے لیے ایک کمرہ دیا گیا اس

وقت زرتاج اکبر شاہ ثانی کے کمرے میں تھی۔

☆☆☆

بہار اکبر شاہ ثانی ہسپر پر لینا ہوا تھا۔ اس کی حالت اب ایسی تھی کہ وہ خنم دروازہ نہیں رہ سکتا تھا۔ اس نے زرتاج کو اپنے اوپر بٹھا کر اس کی پیشانی چومی اور پھر اس کا سر اپنے سینے پر رکھ لیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک تھی۔ خود زرتاج بھی جذباتی ہو چکی تھی اور اس کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو اکبر شاہ ثانی کے سینے کے کپڑے میں جذب ہو رہے تھے۔ وہیں شہزادہ سراج الدین بھی خاموش اور سنجیدہ ایک طرف بیٹھا ہوا تھا۔

ذرا دیر بعد خاندان کے خاص خاص لوگ کمرے میں جمع ہونا شروع ہوئے۔ وہاں آنے کا حکم انہیں اکبر شاہ ثانی ہی کی طرف سے ملا تھا۔ جو بھی وہاں آ رہا تھا، اس کی نظریں جب زرتاج پر پڑتی تھیں تو اس کے چہرے پر انہیں کے تاثرات پیدا ہو جاتے تھے۔ ظاہر ہے، ان کی سمجھ میں نہیں آتا ہوگا کہ اس ”انجینی لری“ کا اکبر شاہ ثانی کے کمرے میں کیا کام!

جب مطلوبہ لوگ جمع ہو گئے تو سراج الدین نے وہ خط نکالا جس کے دونوں حصے اس نے ایک بڑے کاغذ پر اس طرح جوڑ لیے تھے کہ دونوں حصوں کے کٹے ہوئے الفاظ ایک دوسرے سے جڑ گئے تھے۔

”یہ خط۔“ شہزادہ سراج الدین نے کہا۔ ”یہ خط جواب میں پڑھوں گا، یہ ہمارے دادا آنجنہائی شاہ عالم ثانی کا خط ہے، اس پر ان کی مہر بھی موجود ہے۔“

سب لوگ حیرت سے شہزادہ سراج الدین کی طرف دیکھنے لگے جس نے کسی کی طرف دیکھے بغیر خط پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ ”اس وقت جبکہ ہم یہ خط لکھ رہے ہیں، ہماری سلطنت زوال پذیر ہو چکی ہے۔ فرنگی تو ہمارا درمدر ہیں ہی لیکن تخت دہلی حاصل کرنے کے لیے ہمیں مرہٹوں سے مصالحت کرنا پڑی ہے لیکن ہم تخت نہیں ہونے کے باوجود خود کو حاکم نہیں سمجھتے۔ مرہٹے ہی بڑی حد تک دہلی پر قابض ہیں اور قصر شاہی بھی ان کی دسترس میں رہتا ہے۔ ہماری چھوٹی بہن شہزادی مہر النسا، جس کی شادی خاندان کے ایک شہزادے سے ہو چکی تھی۔“

خط فارسی میں تھا اور زرتاج فارسی نہیں جانتی تھی ورنہ سمجھ لیتی کہ یہ بات آنجنہائی شاہ عالم ثانی نے جھوٹ لکھی تھی۔ غالباً وہ یہ حقیقت اپنے خاندان سے چھپاتا چاہتے تھے کہ ان کی بہن روتیلوں کے سردار ضابطہ خاں کی زبردستی کا

شکار ہوئی تھی۔

شہزادہ سراج الدین نے خط کا پڑھنا جاری رکھا۔
 ”میری وہ عزیز بہن ایک بچی کو جنم دیتے ہوئے خدا کو
 پیاری ہوئی تھی۔ اس بچی کی ہم نے بڑے پیار اور محبت سے
 پرورش کی۔ جب وہ پندرہ سال کی ہوئی تو بہت ہی خوب
 صورت تھی۔ ایک مہینہ اسے اچھی نظروں سے نہیں دیکھتا
 تھا۔ ہماری اس بھانجی کا نام نجم النساء تھا۔ آنجنابی فرخ سیر کی
 نسل سے ایک شہزادہ ہماری عزیز بھانجی شہزادی نجم النساء
 سے محبت کرتا تھا۔ حالات بہت خراب تھے۔ ہمیں ڈر تھا کہ
 وہ مہینہ کسی وقت موقع پا کر شہزادی نجم النساء کے ساتھ
 زیادتی کر سکتا تھا اس لیے ہم نے شہزادی نجم النساء کی شادی
 بہت خفیہ طور پر اور بڑی سادگی کے ساتھ اس شہزادے سے
 کر دی جو شہزادی نجم النساء سے محبت کرتا تھا۔ ہمیں اس کے
 بعد بھی مرنے سے خدشہ لاحق تھا اس لیے ہم نے دل پر پتھر
 رکھ کر شہزادی نجم النساء کو خود سے جدا کرنا گوارہ کر لیا۔ ہم نے
 شہزادے کو سارے حالات بتائے۔ ان حالات سے
 ہماری ایک بہت مستعد کنیز دایہ بیگم واقف تھیں۔ شہزادی نجم
 النساء کو وہ جدہ چاہتی تھیں چنانچہ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ آج
 رات ہم نہایت رازداری کے ساتھ ان تینوں کو محل سے
 رخصت کر دیں گے۔ ہم نے انہیں ہدایت کی ہے کہ یہ کہیں
 دور دراز جا کر زندگی گزاریں اور اگر بھی ہمارے خاندان کی
 شان و شوکت بحال ہو جائے تو یہ محل واپس آجائیں۔ ہمیں
 اس کی امید برائے نام ہی ہے کہ ہماری زندگی میں بھی ایسا
 دور آگے لگے۔ شاید ہمارے بعد ہمارے کسی وارث یا اس کے
 وارث یا اس کے وارث کی زندگی میں ایسا ہو۔ اسی لیے ہم
 نے اس خط میں کسی کو مخاطب نہیں کیا ہے۔ خدا ہی بہتر جانتا
 ہے کہ یہ خط بھی ہمارے خاندان میں پہنچ سکے گا یا نہیں۔ ہم
 نے اس خط کو درمیان سے پھاڑ کر اس کے دو حصے کر دیے
 ہیں۔ ایک حصہ ہمارے پاس ہے اور دوسرا ہم نے دایہ بیگم کو
 دے دیا ہے۔ ہمارے پاس جو حصہ ہے، وہ ہم مرنے سے
 پہلے اپنے ولی عہد کو اس ہدایت کے ساتھ دے جائیں گے
 کہ جب اس کا آخری وقت آئے تو وہ ہماری ہی طرح اس
 عمل کو جاری رکھے۔ دایہ بیگم بھی وفات سے قبل وہ خط
 شہزادی نجم النساء کی تحویل میں دے دیں گی اور شہزادی نجم
 النساء کے خاندان میں بھی یہ خط اسی طرح منتقل ہوتا رہے گا،
 تا آنکہ یہ خط بھی ہمارے خاندان میں پہنچے یا شاید بھی نہ
 پہنچے۔ بہر حال ایک موبہم سی امید پر ہم یہ خط لکھ رہے ہیں۔
 ہم نے اپنا پستول جس پر شاہی خاندان کا نشان ہے،

شہزادے کو دے دیا ہے۔ یہ پستول بھی خط کے نصف حصے
 کے ساتھ نسل بعد نسل شہزادی نجم النساء کے خاندان میں منتقل
 ہوتا رہے گا۔ جب بھی کوئی وہ پستول اور خط کا وہ نصف حصہ
 لے کر ہمارے خاندان میں آئے تو ان دونوں چیزوں کی
 وجہ سے کوئی بھی اس کو اپنے خاندان کا فرد سمجھنے میں تامل نہ
 کرے اور اسے بھی وہی عزت اور مقام دیا جائے جو دیگر
 شہزادگان مغلیہ کا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ہمارے وارثوں
 میں سے کوئی بھی ہماری اس ہدایت یا نصیحت کے خلاف عمل
 نہیں کرے گا۔“

شہزادہ سراج الدین نے خاموش ہو کر خاندان کے
 لوگوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ابھی میں یہ خط آپ
 سب کو بھی دوں گا۔ سب اسے باری باری پڑھ لیں لیکن اس
 سے پہلے میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اس خط کا نصف حصہ اعلیٰ
 حضرت نے مجھے اس دن دیا تھا جب ہماری ولی عہدی کا
 اعلان کیا تھا۔ اس خط کا باقی حصہ ہمیں کچھ دیر قبل ملا ہے اور
 اس کے ساتھ ہی یہ پستول بھی۔“ شہزادہ سراج الدین نے
 پستول نکال کر دکھایا۔ ”ابھی آپ لوگ اس خط کے ساتھ اس
 پستول پر لگا ہوا شاہی نشان بھی دیکھ لیجئے گا۔ یہ بتاتے ہوئے
 ہمیں اسس ہور ہا ہے کہ شہزادی نجم النساء کا انتقال ہو چکا
 ہے۔ ان کی حرکت قلب اس لیے بند ہوئی تھی کہ دایہ بیگم کا
 انتقال ہوا تھا۔ دو سال قبل شہزادی نجم النساء کے شوہر کا بھی
 انتقال ہو چکا ہے۔ آج یہ خط اور پستول ہمارے پاس
 شہزادی نجم النساء کی بیٹی کے ذریعے پہنچا ہے۔ یہ ان کی بیٹی
 ہیں۔“ شہزادہ سراج الدین نے زرتاج کی طرف اشارہ
 کرتے ہوئے بڑی محبت سے کہا۔ ”شہزادی زرتاج۔“
 کمرے میں چند لمحوں کے لیے بھنبھناہٹ سی ہوئی۔
 زیادہ تر افراد ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرنے لگے تھے
 اور ان کی نظریں زرتاج کی طرف اٹھ رہی تھیں۔
 اکبر شاہ ثانی کے سینے سے الگ ہونے کے بعد
 زرتاج کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ حقیقتاً اسے اس وقت بھی کوئی
 خوشی نہیں ہوئی تھی جب اسے دایہ بیگم سے معلوم ہوا تھا کہ وہ
 ایک مثل شہزادی ہے اور اب اسے شاہی محل میں آکر بھی
 کوئی مسرت نہیں ہوئی تھی۔ نجم النساء اور دایہ بیگم کی موت کے
 بعد اسے ساری دنیا خالی خالی سی لگنے لگی تھی۔ اس کے لیے
 اگر اپنا کوئی رہ گیا تھا، وہ صرف فیضان تھا۔
 ”اب۔“ شہزادہ سراج الدین نے کہا۔ ”میں یہ بتانا
 چاہتا ہوں کہ شہزادی نجم النساء کی زندگی کیسے گزری۔“
 اس نے وہ سب کچھ دہرایا جو اسے ذرا دیر قبل

خو روں جیسا حسن...

Hoor

Beauty Soap



شہزادی زرتاج سے معلوم ہوا تھا۔ اس نے بس یہ نہیں بتایا کہ شہزادی زرتاج نے گیارہ روپیوں کو قتل کیا تھا۔ وہ سب کچھ بیان کرنے کے بعد اس نے کہا۔ ”ذاتیہ بیگم کے انتقال سے پہلے ہماری عزیز بہن شہزادی زرتاج کو ان سب باتوں کا علم نہیں تھا۔ ایک عام لڑکی سمجھا تھا ہماری شہزادی نے خود کو اور اسی لیے اسے محبت بھی ایک عام نوجوان سے ہوئی ہے۔ فیضان ہماری سپاہ کے ایک دے کا سالار ہے۔ خوب صورت، شجاع اور نہایت ذہین ہے۔ اگرچہ وہ کسی شاہی خاندان سے نہیں ہے لیکن ہمارا خاندان بھی تو اب محض رسماً شاہی خاندان رہ گیا ہے۔ اسی لیے ہم نے اعلیٰ حضرت کے مشورے سے فیصلہ کیا ہے کہ فیضان اور شہزادی زرتاج کی شادی کر دی جائے گی۔ ہمیں امید ہے کہ آپ سب ان دونوں کو بہت خوش دلی اور وسیع القلبی سے قبول کریں گے، اور اب آپ لوگ یہ خط اور یہ پستول دیکھ سکتے ہیں۔“

شہزادہ سراج الدین نے دونوں چیزیں سب سے پہلے ممتاز بیگم کی طرف بڑھائیں اس کی یہ سوتیلی والدہ اگرچہ اپنے بیٹے جہانگیر مرزا کو دلی عہد بنانے کے لیے انگریزوں سے بھی ساز باز کی سنی تاکہ امر چلے جائے لیکن شہزادہ سراج سب کچھ نظر انداز کر کے ابھی ان کا احترام کرتا تھا۔

کمرے میں موجود لوگوں میں سے سب سے پہلے شہزادہ سراج الدین کی چینی بیوی زینت محل آگے بڑھ کر زرتاج کے قریب گئی۔ زرتاج احتراماً کھڑی ہو گئی۔ زینت محل نے اسے بڑی محبت کے ساتھ اپنے سینے سے لگالیا۔ ”تم اب میرے ساتھ چلو!“ اس نے زرتاج سے کہا۔ ”اب خاندان مغلیہ کی شان و شوکت پہلے جیسی تو نہیں رہی لیکن جیسی بھی رہی ہے، اسی اعتبار سے اب تمہاری وضع قطع شہزادیوں ہی کی سی ہونا چاہیے۔ دو کنیزیں بھی تمہارے لیے مخصوص کی جائیں گی۔“

☆☆☆

جن لوگوں کو فیضان کے گھر کی صورت حال جاننے کے لیے بھیجا گیا تھا، انہوں نے واپس آکر کل کے ناظر کو ان حالات سے آگاہ کیا اور ناظر نے نہایت پریشانی کے عالم میں شہزادہ سراج الدین کے پاس جا کر اسے وہ سب کچھ بتایا۔ وہ سب کچھ جان کر شہزادے کے دماغ کو جھٹکا سا لگا۔ اس کے چہرے سے صاف ظاہر ہو گیا تھا کہ اسے پریشانی تو لاحق ہوئی تھی لیکن صدمہ بھی پہنچا تھا۔

فیضان کے گھر پر قیامت گزر چکی تھی۔ شہزادہ سراج

الدین فوری طور پر فیصلہ نہیں کر سکا کہ فیضان کو وہ سب کچھ کس طرح بتایا جائے۔ اس کے لیے فیضان اب صرف شاہی سپاہ کے ایک لشکر کا سالار نہیں، اس کی بہن کا ہونے والا شوہر بھی تھا۔ مغل خاندان کا ہونے والا داماد.....! شہزادہ سراج الدین نے یہ تو سوچ لیا تھا کہ اپنے والد سے بات کرنے کے بعد فیضان کو کوئی خاص منصب دیا جائے گا لیکن فی الحال اس کے سامنے وہ عکین صورت حال آئی تھی جو فیضان کے علم میں لانا آسان نہیں تھا۔

ناظر کو رخصت کر کے شہزادہ سراج الدین ٹھٹھا ہوا اس بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ زینت محل آگئی۔ اس کے ساتھ زرتاج بھی تھی جس کا حلیہ نمایاں طور پر تبدیل ہو چکا تھا۔ وضع قطع سے وہ محل کی دوسری شہزادیوں ہی کی طرح نظر آ رہی تھی۔

”دیکھیں اب آپ اپنی بہن کو۔“ زینت محل نے شہزادے سے کہا۔

شہزادہ سراج الدین، زرتاج کی طرف دیکھتے ہوئے خفیف سا مسکرایا۔ ”تم کیسا محسوس کر رہی ہو میری عزیز بہن!“

”برادر معظم!“ زرتاج نے پشیمانی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”اگر میری والدہ کا انتقال نہ ہوا ہوتا اور وہ بھی میرے ساتھ ہوتیں تو میں اپنے خاندان میں آکر یقیناً بہت زیادہ خوش ہوتی، تاہم اب بھی خوش ہی ہوں۔“

شہزادہ سراج الدین نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”ہمیں بھی اس کا رنج ہے کہ وہ اس محل سے ایسی نکلیں کہ پھر واپس نہیں آسکیں۔“

”میں اسے اس کے کمرے میں پہنچا دیتی ہوں۔“ زینت محل نے کہا۔ ”میں نے دو کنیزیں اس کی خدمت کے لیے مامور کر دی ہیں۔“

”ابھی یہیں رکو۔“ شہزادہ سراج الدین نے سنجیدگی سے کہا اور کمرے کے باہر موجود خواجہ سراؤں میں سے ایک کو بلا کر اس کے ذریعے محل کے ناظر کو بلوایا۔

”آپ.....“ زینت محل نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ”میں محسوس کر رہی ہوں جیسے آپ اپنی کوئی پریشانی چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں۔“

”بیٹھ جاؤ تم دونو! ابھی بتاتے ہیں ہم!“ وہ دونوں فکر مند سی بیٹھ گئیں..... ناظر کی آمد تک کمرے میں سکوت رہا۔ شہزادہ سراج الدین نے اسے علم دیا کہ وہ فیضان کو وہاں لائے۔

ناظر بولا۔ ”انہوں نے محافظوں کو خاصا پریشان کر دیا ہے۔ آپ کے حکم کے مطابق دو محافظ ان کے کمرے پر مامور کر دیے گئے تھے۔ ایک کنیز اور ایک خواجہ سرا کو بھی ان کی خدمت کے لیے وقف کر دیا گیا تھا لیکن وہ کمرے سے نکلنے کے لیے بے چین تھے۔ ان سے کہا گیا کہ وہ آپ سے ملنے کے بعد ہی نکلیں جاسکتے ہیں تو انہوں نے آپ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ میں ابھی آپ کو یہ اطلاع دینے کے لیے آئی ہوں والا تھا۔“

شہزادہ سراج الدین نے اس کی باتیں نظر انداز کر دیں اور اپنا حکم دہرایا کہ وہ فیضان کو لے کر آئے۔

ناظر کے جانے کے بعد شہزادہ سراج الدین نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔ ”وہ اپنے گھر جانے یا اپنے گھر والوں کی خیریت جاننے کے لیے بے چین تو ہو گا ہی۔“ ”برادر معظم!“ زرتاج نے پہلو بدل کر کہا۔ ”آپ نے کچھ لوگوں کو اس کے گھر بھیجا تھا۔“

”وہ لوگ واپس آچکے ہیں؟“

”سب خیریت تو ہے نا؟“ زرتاج نے پوچھا، مگر اس کے لیے سے ظاہر ہوا تھا جیسے وہ سمجھ رہی تھی کہ شاید خیریت نہیں ہوگی۔

”فیضان کو آجانے دو۔ اس کے سامنے ہی بتائیں گے۔“ شہزادے نے جواب دیا۔ زرتاج کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔

”گھبراؤ نہیں۔“ زینت محل نے محبت سے اس کی پیٹھ تھپکی۔ ”انشاء اللہ سب خیریت ہی ہوگی۔“

لیکن خیریت نہیں تھی۔ انگریز افسران فیضان کے گھر پہنچے تھے اور رحمان دادا سے اس کے بارے میں بڑی سختی سے پوچھتے رہے۔ کہہ کہاں ہے لیکن رحمان دادا کو کچھ معلوم ہی نہیں تھا۔ اسی دوران میں گوہر وہاں پہنچ گئی۔

گوہر کے وہاں پہنچنے کے بارے میں زرتاج قیاس کر سکتی تھی کہ وہ کیونکہ دیر تک گھر واپس نہیں پہنچی تھی اور فیضان بھی نہیں لوٹا تھا اس لیے وہ پریشان ہو رہے تھے گھر پہنچی ہوگی۔

اس کا وہاں پہنچنا اس کے لیے بھی اندوہناک ثابت ہوا تھا۔ اس وقت انگریزوں نے دادا رحمان کی زبان کھلانے کے لیے ان پر تشدد شروع کر دیا تھا۔ وہ لوگ یہ ماننے کے لیے تیار نہیں تھے کہ دادا رحمان کے علم میں کچھ نہیں ہوگا۔ جب وہ اس پر تشدد کر رہے تھے تو شور مچا کر اس کی پیار بیوی داویلا کرنی ہوئی وہاں پہنچ گئی تھی۔ وہ قریب

پہنچی تو ایک انگریز نے اسے اتنی زور سے دھکا دیا کہ وہ بے چاری دیوار سے اس طرح ٹکرائی کہ اس کا سر پھٹ گیا اور خون بہنے لگا۔ انگریزوں نے اس کی پروا ہی نہیں کی اور جب گوہر وہاں پہنچی تو اسے بھی پکڑ لیا گیا۔ دادا رحمان کو جسکی دی گئی کہ اگر اس نے زبانی نہیں کھولی تو اس کی پوتی کو اس کی نظروں کے سامنے بے آبرو کیا جائے گا۔ دادا رحمان چیخے ہی رہ گئے اور ایک انگریز نے اپنے افسر کے سامنے گوہر کا لباس پھاڑنا شروع کر دیا۔ گھر میں ملازمین موجود تھے مگر ان میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ انگریزوں کے سامنے بھی قسم کا احتجاج کر سکتے۔ جب گوہر کا لباس پھاڑا جا رہا تھا تو صدمے سے دادا رحمان کی حرکت قلب بند ہو گئی۔ گوہر کی طرح خود کو چھڑا کر گرنے کی طرف بھاگی۔ اس کا پیچھا کیا گیا لیکن وہ ہاتھ نہیں آئی اور اس نے محن میں بنے ہوئے کنویں میں چھلانگ لگا دی۔ کنواں بہت گہرا تھا۔ انگریزوں نے کسی طرح اسے کنویں سے نکال لیا مگر اس وقت تک گوہر کی روح اس کے جسم کا ساتھ چھوڑ چکی تھی۔ اس نے اپنی جان دے کر خود کو بے عزت ہونے سے بچالیا تھا۔ دوسری طرف اس کی دادی جو پہلے ہی بیمار تھی۔ سرے زیادہ خون بہہ جانے کے باعث جانبر نہ ہو سکی۔ اس کے بعد انگریز وہاں سے چلے گئے۔

یہ سب کچھ زرتاج کو پھوٹ پھوٹ کر دلانے کے لیے کافی تھا اور فیضان کی حالت ایسی نظر آتی رہی تھی جیسے اسے سکتہ ہو گیا ہو۔ جسم پر ایسی لرزش طاری ہو گئی تھی جیسے شدید تپ چڑھ گئی ہو۔

زینت محل نے زرتاج کو اپنے سینے سے لگالیا تھا۔ وہ بھی اس وقت مغموم نظر آنے لگی تھیں۔ شہزادہ سراج الدین کا چہرہ پتھرا ہوا ہوا سا نظر آ رہا تھا۔ یکا یک فیضان بڑے بھیاں بھیاں انداز میں چیخا۔ ”میں ان کو تو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ لیکن اس کی یہ لکار قطعی بے معنی تھی۔ وہ انگریزوں کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا تھا مگر وہ چیخا ہوا وحیانیہ انداز میں دروازے کی طرف لپکا۔

”فیضان!“ زرتاج جیسے بللاتی ہوئی، فیضان کو روکنے کے لیے ابھی مگر اس سے پہلے ہی شہزادہ سراج الدین کے اشارے پر ناظر نے اسے پکڑ لیا تھا۔ اسے شہزادہ سراج الدین نے پہلے ہی روکنے کا اشارہ کر دیا تھا۔ اسے یقیناً توقع ہو گئی کہ اس قسم کی صورت حال پیدا ہو سکتی ہے۔

زرتاج بھول ہی گئی تھی کہ وہاں کوئی اور بھی موجود تھا۔ وہ روتی ہوئی فیضان سے لپٹ گئی تھی لیکن فیضان اس وقت

انتہا پھر ہوا تھا کہ ان دونوں ہی کے قابو میں نہیں آ رہا تھا۔
شہزادہ سراج الدین کے آواز دینے پر باہر موجود
دونوں خواجہ سرا بھی اندر آ گئے تھے۔ انہوں نے ناظر سے
مل کر فیضان کو کسی طرح بے بس کیا۔

”تمہارا یہ غصہ، تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکے گا
بیٹے!“ شہزادہ سراج الدین نے انفرودہ لہجے میں کہا۔ ”ہم تو
بادشاہ کے ولی عہد ہیں۔ اس کے لہجے میں بھی آگئی۔ مگر
ہم بھی ان فرنگیوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ ہماری ساری
سلطنت میں وہ بد بخت، یہی مظالم ڈھاتے پھر رہے ہیں۔“

فیضان کو ایک جگہ بٹھا دیا گیا تھا۔ دونوں خواجہ سرا
اب بھی اسے پکڑے ہوئے تھے۔ زرتاج فرش پر بیٹھ کر
اس کے قدموں سے لپٹ گئی تھی اور رونے جاری تھی۔

”ہم صبر کرنے کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتے بیٹے!“
شہزادہ سراج الدین نے مزید کہا۔ ”تمہیں بھی صبر کرنا ہوگا
میرے عزیز!“

ابھی تک فیضان آب دیدہ بھی نہیں ہوا تھا لیکن اب
وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

لیک ایک زرتاج نے اپنے سینے پر دو ہتھو چلایا۔ ”یہ
سب میری وجہ سے ہوا ہے۔“

وہ اپنے سینے پر دو ہتھو چلاتی ہی چلی جاتی لیکن
زینت محل نے اس کے قریب آ کر اسے سنبھالا۔

”خود کو سنبھالو فیضان بیٹے!“ شہزادہ سراج الدین
پھر بولا۔ ”اس طرح تم خود کو بھی پکان کر دو گے اور اپنی
ہونے والی بیوی کو بھی..... حاصل نہ تمہیں کچھ ہوگا، نہ ہماری
اس بد نصیب بہن کو جو اپنے خاندان میں آئی تو اندوہناک
حالات اس کے تعاقب میں رہے۔“

آنسو بہاتے ہوئے فیضان، زرتاج کی طرف دیکھنے
لگا جو زینت محل کی آغوش میں ساکت ہو چکی تھی۔

”یہ مدد سے صرف بے ہوش ہوئی ہے۔“
زینت محل نے جلدی سے کہا۔ اسے ڈر ہوگا کہ زرتاج کے
بارے میں کچھ اور سمجھ کر فیضان پھر بے قابو نہ ہونے لگے۔

جب زرتاج کو ہوش آیا تو وہ بستر پر اور اسی کمرے
میں تھی جو اس کے لیے مخصوص کیا گیا تھا۔ اسے ہوش میں
لانے والی محل کی ایک طبیہ تھی۔ زرتاج کے پاس بھی فیضان

بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں سے اب بھی آنسو بہہ رہے
تھے۔ کمرے میں زینت محل کے علاوہ دو شہزادیاں بھی
تھیں۔ وہ شہزادہ سراج الدین کی بیٹیاں تھیں۔ وہ زرتاج
کے سر ہانے داہیں بائیں جانب بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان کے

چہروں پر اپنائیت اور ہمدردی تھی۔

”اب تمہارے علاوہ میرا کوئی نہیں رہا زرتاج!“
فیضان بولا تو اس کی آواز میں جیسے آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی تھی۔
زرتاج کے ہونٹ کچپکپائے۔ ”میرا بھی تمہارے
علاوہ کون ہے فیضان!“

”تم تو اپنے خاندان میں آگئی ہو۔“

”بیٹے!“ زینت محل نے فیضان کے شانے پر ہاتھ
رکھ دیا۔ ”اس خاندان کو اب تم اپنی خاندان سمجھو۔“

شہزادہ سراج الدین اس وقت اپنے کمرے میں
ناظر کو سمجھا رہا تھا۔ ”ان سارے معاملات کی ہوا بھی محل کے
باہر کی کوئیں لگنا چاہیے۔ فرنگیوں کو معلوم ہو گیا تو وہ بہت کچھ
سمجھ لیں گے۔ محل کے محافظ دستے کے تمام لوگوں کو نظر بند کر
دیا جائے۔ کسی کے سامنے بھی ان کی زبان سے کچھ نکل سکا
ہے۔ نظر بندی کے باوجود ان سب کا پوری طرح خیال رکھا
جائے۔ انہیں یہ یقین دلانا بھی ضروری ہے کہ ان کی
نظر بندی وقتی ہے۔ جب بھی ہمیں اطمینان ہو گیا کہ اب کوئی
اندیشہ نہیں، ان کی نظر بندی ختم کر دی جائے گی۔ محل کے
محافظ دستے کے لیے دوسرے سپاہیوں کا بندوبست کیا
جائے۔ محل میں کنیزوں اور خواجہ سراؤں کو بھی اس کا علم نہیں
ہے کہ وہ دونوں کب اور کن حالات میں یہاں آئے ہیں اور
اگر تمہارے خیال کے مطابق ان میں سے بھی کسی کو کچھ
معلوم ہو گیا ہو تو اسے بھی نظر بند کر دو۔“

”آپ کے حکم کی تعمیل ہوگی شہزادہ والا تبار!“

”ہم تم سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔“ شہزادہ
سراج الدین نے کہا۔ ”فیضان کے گھر والوں کی لاشوں کا
کیا ہوا؟“

”انگریز محلے کے لوگوں سے کہتے ہوئے چلے گئے
تھے کہ گاڑ دو ان لاشوں کو۔“ ناظر نے جواب دیا۔ ”وہ
لوگ ان کی تدفین کر دیں گے۔“

”اب تم جانتے ہو۔ ہم ایک بار پھر کہہ دیں کہ
نظر بندوں کو کسی قسم کی تکلیف نہیں ہونا چاہیے۔ ان بے
چاروں کا کوئی قصور نہیں ہے۔ یہ ہماری مجبوری ہے کہ انہیں
نظر بند کیا جائے۔“

”میں سمجھ رہا ہوں شہزادہ والا تبار!“

ناظر کے جانے کے بعد شہزادہ سراج الدین اپنے
کمرے سے نکل کر اس کمرے کی طرف چل پڑا جو زرتاج
کے لیے مخصوص کیا گیا تھا۔ اسے زرتاج اور فیضان، دونوں
ہی کی فکر لاحق تھی۔

دونوں خواجہ سرا اس کے پیچھے چلتے رہے۔ وہ اس
کے محافظ بھی تھے۔

زرتاج اور فیضان کے معاملے کو راز میں رکھنے کے
لیے شہزادہ سراج الدین نے ہر ممکن کوشش کی تھی۔ شاہ عالم
ثانی کا خط سناتے وقت بھی اس نے خاندان کے صرف
قریبی لوگوں کو اکبر شاہ ثانی کے کمرے میں بلایا تھا۔ صرف
چھائیکر مرزا اور اس کی ماں ممتاز بیگم پر اسے کچھ زیادہ اعتماد
نہیں تھا لیکن ان دونوں کو بلانا اس کی مجبوری تھی ورنہ اگر ان
دونوں کے کان میں اس کی پینک بھی پڑ جاتی کہ کسی خاص
معاملے میں ان دونوں کو نظر انداز کیا گیا تھا تو پتی بڑھ جاتی
جو چائیکر مرزا کے ولی عہد نہ بننے کی وجہ سے پہلے ہی بڑی
ہوئی تھی۔

وہ جب زرتاج کے کمرے میں پہنچا تو زرتاج کو
ہوش آچکا تھا۔ اس نے فیضان کو بتایا کہ اس کے گھر والوں
کی تدفین پڑوس کے لوگ کر رہے ہیں لیکن وہ ان کی تدفین
میں بھی شریک نہیں ہو سکتا۔

”فرنگیوں کو جانے ہی ہوتا!“ شہزادہ سراج الدین
نے کہا۔ ”وہ کتوں کی طرح تمہاری بوسہ کھینچتے پھر رہے ہوں
گے۔ اگر تم ان کی تدفین میں گئے تو تمہیں گرفتار ہوتے دیر
نہیں لگے گی۔“

فیضان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اسے اپنی
بے بسی اور بد نصیبی کا احساس یقیناً بڑی شدت سے ہوا ہوگا۔
وہ اپنے دادا دادی اور سگی بہن کی تدفین میں بھی شرکت نہیں
کر سکتا تھا۔

اسی وقت محل کا ناظر کچھ پریشان سا ہوا آیا۔
”شہزادہ والا تبار!“ اس نے کہا۔ ”اعلیٰ حضرت کی
طبیعت اچانک بہت زیادہ بگڑ گئی ہے۔“

شہزادہ سراج الدین تیزی سے جانے کے لیے مڑا۔
فوراً ہی اس کے پیچھے زینت محل نے بھی قدم اٹھائے۔
دونوں شہزادیاں بھی زرتاج کے سر ہانے سے اٹھی تھیں۔

”نہیں۔“ زینت محل نے ان سے کہا۔ ”تم دونوں
بیکل رکو۔ اپنی پھوپھی کے پاس۔“

وہ دونوں شہزادیاں نہ صرف عمر میں زرتاج سے
چھوٹی تھیں بلکہ رشتے میں بھی چھوٹی تھیں۔ زرتاج شہزادہ
سراج الدین کی ماموں زاد بہن تھی۔ اس رشتے سے وہ ان
دونوں شہزادیوں کی پھوپھی تھی۔

شہزادہ سراج الدین اور زینت محل اکبر شاہ ثانی کے
کمرے میں پہنچے۔ اکبر شاہ ثانی پر فطرتی طاری تھی۔ دو

طیب اس کی طبیعت سنبھالنے کے لیے کوشاں تھے۔ جلد ہی
خاندان کے کچھ اور لوگ بھی وہاں پہنچ گئے۔ اکبر شاہ ثانی پر
رات بھر فطرتی طاری رہی اور صبح ہوتے ہوئے وہ اس دار فانی
سے کوچ کر چکا تھا۔

جب یہ اطلاع فیضان اور زرتاج کو ملی تو زرتاج نے
دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ اس طرح چھپا لیا جیسے اپنی
آنکھوں میں آنے والے آنسوؤں کو ہاتھوں ہی میں جذب
کر لیتا جا رہی ہو۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”بد نصیبی
مسلک پیچھے کی ہوئی ہے۔ میں اپنے ایک اور بزرگ کے
سامنے سے جی محروم ہو گئی۔“

فیضان سر جھکائے بیٹھا رہا۔ اس کے تصور میں اس وقت
صرف تین لاشیں ہوں گی۔ دادا، دادی، اور گوہر کی لاشیں!

☆☆☆

اکبر شاہ ثانی کا تیس سالہ دور بادشاہت انگریزوں
ہی کی حکمرانی میں گزرا تھا۔ اس کے باپ عالم گیر ثانی کو
1803ء میں جب مرہٹہ سردار مادوجی سندھیا نے
انگریزوں سے شکست کھائی تھی تو شاہ عالم گیر ثانی کی عمرانی
انگریزوں کو تسلیم ہوئی تھی۔ انہوں نے شاہی خاندان کے
لیے وظائف مقرر کر دیے تھے۔ یہ اجازت بھی دے دی
گئی تھی کہ شہر دہلی میں بادشاہ ہی کے نام سے احکام جاری
ہوں لیکن اصل نظام حکومت انگریز ریڈنٹ کے ہاتھ
میں رہا تھا۔

باپ کی وفات کے بعد اکبر شاہ ثانی 1806ء میں
دہلی کے تخت پر بیٹھا تھا۔ اس کی زندگی اسی نظام حکومت کے
تحت گزری تھی۔ دل ہی دل میں فرنگیوں سے نفرت کرنے
کے باوجود وہ بے بسی کا شکار رہا تھا۔ خزانہ خالی ہو جانے کے
باعث اس کی عسکری طاقت اتنی کم ہو چکی تھی کہ انجلی طرح
قدم جما لینے والے انگریزوں سے مقابلہ کرنے کا خواب
دیکھنا بھی اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ اس کے سپاہیوں کی
اکثریت نے اسے چھوڑ کر انگریزی لشکر میں ملازمتیں حاصل
کر لی تھیں مگر وہ بے چارے بھی اپنے بال بچوں کا پیٹ آخر
کیسے پالتے۔ جن وفاداروں نے بادشاہ کا ساتھ نہیں چھوڑا
تھا، ان کی زندگی بہ مشکل ہی گزرتی تھی اور اب بھی بہ مشکل
گزر رہی تھی۔

اکبر شاہ ثانی کی بے بسی وقت گزارنے کے ساتھ
ساتھ بتدریج بے بسی کا شکار ہوئی چلی گئی تھی اور اس نے خود
کو تیشات میں غرق کر لیا تھا۔ متعدد دیوبند اور کنیزوں سے
اس کی اولادوں کا کوئی شمار نہیں تھا۔ جب اس کا انتقال ہوا تو

سپینس ڈائجسٹ 55 مارج 2014ء

سپینس ڈائجسٹ 54 مارج 2014ء

اس کی اولادوں کی اولادیں بھی نہ صرف جوان بلکہ صاحب اولاد ہو چکی تھیں۔ اس کے انتقال کے وقت شاہی خاندان کے افراد کی تعداد دو ہزار سے زیادہ تھی جن میں پہلے گزرے ہوئے بادشاہوں کی اولادیں بھی شامل تھیں۔

شہزادہ سراج الدین 1836ء میں بہادر شاہ ثانی کے لقب سے تخت نشین ہوا تھا مگر کچھ ہی دن بعد اس نے اپنے لقب سے "ثانی" کا لاحقہ ہٹا کر اس کی جگہ اپنا خلع "ظفر" لگا لیا تھا۔ اسی لیے سلطنت دہلی میں وہ بہادر شاہ ظفر کہلایا گیا۔

فقط یہ صحیح، زرتاج نے سنا تھا کہ لقب میں اپنے خلع "ظفر" کا لاحقہ بہادر شاہ نے اپنے استاد ابراہیم ذوق کے مشورے سے لگا لیا تھا۔ کل میں زرتاج بھی شہزادی کہلانے لگی۔ اس کا طرز زندگی وہی بن گیا جو دوسری شہزادیوں کا تھا مگر فیضان کے لیے وہ وہی عام لڑکی بنی رہی جو عتب میں اس کے ساتھ پڑھی تھی۔ گزرتے ہوئے وقت کا مرہم فیضان کے دل پر لگنے والے زخم مندمل کرتا رہا۔ اس کا صدمہ بھلائے میں زرتاج نے بھی اس کے دل جوئی کی تھی۔

سال بھر بعد ان کی شادی ہو گئی۔ اس عرصے میں فیضان نے بہادر شاہ ظفر کے کہنے سے نہ صرف ڈانٹیں رکھ لی تھیں بلکہ بال بھی بڑے رکھ لیے تھے۔ اس کے جسم پر لباس بھی اب دربار کے ایک منصب دار کا ہوتا تھا اس لیے اب اسے اس فیضان کی حیثیت سے شناخت کرنا بہت مشکل تھا جس کی تلاش انگریزوں کو عرصے تک رہی تھی لیکن سال بھر بعد اب امکان یہی تھا کہ انہوں نے فراموش ہی کر دیا ہوگا کہ وہ بیلیوں کو قتل کرنے والی لڑکی کو فرار کر اکر لے جانے والا فیضان اب کہاں ہوگا۔ بہادر شاہ ظفر ہی کی ہدایت پر فیضان لال قلعے سے باہر نکلا بھی نہیں تھا کہ مبادا اسے پھانسیا لیا جائے۔ ایک سال بعد اسے اتنی اجازت مل گئی کہ اگر بہت ہی ضروری ہو تو وہ قلعے سے باہر نکلے۔ فیضان کو کہیں جانے کی خواہش بھی نہیں رہی تھی۔ اس کا دل چاہتا تھا تو صرف اتنا کہ کم از کم ایک مرتبہ اپنے دادا دادی اور بہن کو ہر کی قبروں پر فاتحہ پڑھ آئے لیکن اسے علم نہیں تھا کہ ان کی قبریں کہاں تھیں۔

بہادر شاہ ظفر نے اس کی خواہش جاننے کے بعد کہا تھا۔ "تمہارے پڑوں میں رہنے والے لوگوں ہی سے ان تینوں کی قبر کا پتا لگ سکتا ہے لیکن اس قسم کی پوچھ گچھ کرنے سے لوگ مشتبہ ہو سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہمارے ذہن میں ایک بات اور بھی ہے۔ امکان تو یہی ہے کہ انگریز اب

تمہاری اور زرتاج کی طرف سے مایوس ہو چکے ہوں گے لیکن شاید ابھی مکمل مایوس نہ ہوئے ہوں۔ ممکن ہے کہ اس خیال سے ان قبروں کی نگرانی کی جارہی ہو کہ شاید تم بھی ان قبروں پر فاتحہ پڑھنے آؤ اور وہ تمہیں گرفتار کر لیں اور شاید زرتاج بھی اس وقت تمہارے ساتھ ہوں اس لیے بہتر ہوگا کہ ابھی اور صبر کرو۔ چنانچہ فیضان وقت گزارتا رہا۔ اس نے اپنے اس کاروبار پر بھی صبر کر لیا تھا جو اس کے دادا نے اپنے کسی عزیز کے سپرد کیا تھا۔ وہ عزیز بھی خاصہ دور دراز کا تھا اس لیے فیضان کو اس سے ملنے کی بھی کوئی خواہش نہیں تھی۔

زرتاج کے بعد اب اسے کچھ اور نہیں چاہیے تھا۔ دربار میں اسے ایک اہم منصب بھی ملا تھا اور اسے ایک خطاب سے بھی نوازا جا چکا تھا۔ اسے کوئی خطاب دینا بہادر شاہ نے اس لیے ضروری سمجھا تھا کہ اس کی شادی ایک مغل شہزادی سے ہوتی تھی۔ اسے وہ خطاب شادی سے پہلے ہی مل گیا تھا لیکن فیضان کو اس خطاب سے بھی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ بس کل میں اس خطاب کے باعث اس کی عزت میں اضافہ ہوا تھا اور زرتاج سے شادی کے بعد اس کی توقیر و عزت مزید بڑھی تھی کیونکہ وہ شاہی خاندان کا دادا بن گیا تھا۔

ڈھائی سال بعد کچھ متعدد افراد کے ذریعے سے فیضان کے دادا، دادی اور گوہر کی قبروں کا سراغ مل گیا تو فیضان ان کی قبروں پر فاتحہ پڑھنے گیا۔ بہادر شاہ ظفر نے اس وقت بھی یہ احتیاط برتی تھی کہ سپاہیوں کے ایک دستے کو خفیہ طور پر فیضان کی حفاظت کے لیے مقرر کر دیا تھا کہ اگر انگریز اب بھی ان قبروں کی نگرانی کر رہے ہوں اور ان کی وجہ سے فیضان کسی خطرے میں پڑے تو وہ سپاہی اس کی حفاظت کر سکیں اور اسے بچا کر محل واپس لائیں۔

مگر ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی، انگریزوں نے اس معاملے کو اب فراموش ہی کر دیا تھا۔ وہ بیلیوں کے قتل سے انہیں کوئی دلچسپی ابتدا میں بھی نہیں ہوگی۔ وہ قتل ہو گئے تھے تو ان کی پلا سے۔ وہ تھلائے تو صرف اس وجہ سے ہوں گے کہ وہ انہیں قتل کرنے والی جاس لڑکی کو گرفتار کرنا چاہتے تھے، وہ اپنے محبوب کے ساتھ ان کے ہاتھ سے قتل ہو گئی تھی لیکن اب ساڑھے تین سال بعد ان کا مایوس ہو جانا فطری امر تھا۔ ایک امکان یہ بھی تھا کہ جو لوگ اس معاملے کی تحقیقات کر رہے تھے، ان کا تبادلہ دہلی سے کہیں اور کیا جا چکا ہو لہذا اب ایسی صورت میں فیضان کے شناخت کیے جانے کے اندیشہ کو بھی دل سے نکالا جاسکتا تھا۔

زرتاج اب ایک مغل شہزادی تھی لہذا یہ ممکن ہی نہیں

تھا کہ وہ عام شہریوں کی طرح قلعے سے باہر نکلتی۔ شاہی محل میں جو لوگ زرتاج اور فیضان کے شاہی محل میں آنے کے قصبے سے واقف تھے، ان میں وہی ہستیاں ایسی تھیں جن کی طرف سے بہادر شاہ ظفر کو یہ اندیشہ لاحق رہا تھا کہ وہ اس واقعے کی اطلاع انگریزوں کو نہ دے دیں۔۔۔۔۔ وہ جہانگیر مرزا اور اس کی ماں ممتاز بیگم کی شخصیات تھیں۔

اس معاملے کو فراموش کر دینے کے باوجود انگریزوں کے پاس اس معاملے کی دستاویز تو ہونا ہی چاہیے تھیں۔ یہ اطلاع ان کے لیے خاصی ممتی خیز ہوئی کہ جس روز زرتاج اور فیضان فرار ہوئے تھے، اسی رات ایک نو جوان مرد اور ایک نو جوان لڑکی گھوڑے پر شاہی محل پہنچے تھے۔ یہ اطلاع فرنگیوں کے دماغ میں شکوک و شبہات پیدا کر سکتی تھی اور انہیں شاہی خاندان، خصوصاً بہادر شاہ ظفر کو پریشان کرنے کے لیے جوازل جاتا اس لیے بہادر شاہ ظفر نے جو سخت نشیں ہوتے ہی مکمل طور سے با اختیار ہو چکا تھا، کچھ مستند لوگوں کو ان دونوں کی نگرانی پر مقرر کر دیا تھا۔

کیونکہ ممتاز بیگم اپنے بیٹے کی ولی عہدی کے سلسلے میں انگریزوں سے ساز باز کرنے کی سعی کا کام کر چکی تھی اس لیے بہادر شاہ ظفر کا خدشہ ایک فطری امر تھا۔ اب ساڑھے تین سال گزر جانے کے باوجود اس قسم کا کوئی خطرہ سامنے نہیں آیا تھا لیکن بہادر شاہ ظفر کی دانست میں یہ امکان بھی تھا کہ ان دونوں کو اپنی نگرانی کا شہ ہو گیا ہو جس کے باعث وہ محتاط ہو گئے ہوں اور مناسب وقت اور موقع کی تلاش میں ہوں۔ وہ یہ تو سمجھ ہی سکتے ہوں گے کہ اگر بات محل گئی تو بہادر شاہ ظفر کو اس کا جوازل جانے کا کہہ وہ ان ماں بیٹے کو زنداں میں ڈلوادے۔ خود زرتاج اور فیضان کو بھی اندازہ تھا کہ وہ دونوں ماں بیٹے ان دونوں کو پسند نہیں کرتے تھے۔ "ان دونوں کی وجہ سے بھی ہمارے لیے خطرہ پیدا ہو سکتا ہے۔" زرتاج نے ایک مرتبہ فیضان سے کہا تھا۔

"خطرے کا بروقت سرچل دیا جائے گا۔" فیضان کا جواب تھا۔ "ان کی نگرانی ساری زندگی کی جائے گی۔ یہ مجھے اعلیٰ حضرت نے خود بتایا ہے۔"

اکبر شاہ ثانی کے بعد اب بہادر شاہ ظفر کو "اعلیٰ حضرت" کہا جانے لگا تھا۔ "اعلیٰ حضرت۔" زرتاج نے ٹھنڈی سانس لی تھی۔

"ایک زمانہ تھا جب ہمارے اجداد کو کل بھائی، عالی جاہ اور عالم پناہ جیسے الفاظ کے ساتھ یاد کیا جاتا تھا۔"

"بھول جاؤ وہ۔ اب سب کچھ خواب ہو چکا۔"

وہ سب کچھ واقعی خواب ہو چکا تھا۔ دہلی میں بھی انگریزوں نے بھٹل بادشاہت صرف اس لیے کو آ کر لی تھی کہ عوام میں اب بھی کچھ طبقات ایسے تھے جن کے دلوں میں آزادی حاصل کرنے کے شعلے تو اب دم بدم پڑ چکے تھے لیکن چنگاریاں ابھی باقی تھیں۔ انگریز مزید کچھ سال انتظار اس لیے کرنا چاہتے تھے کہ وہ چنگاریاں بھی ٹھنڈی ہو جائیں گی۔

کچھ زیادہ ہاتھ بیر انہوں نے بہر حال نکالا شروع کر دیے تھے۔ انہوں نے شاہ عالم ثانی سے جو کچھ ملے کیا تھا، اس پر وہ پوری طرح قائم نہیں رہے تھے۔ انہوں نے طے تو یہی کیا تھا کہ وہ شاہی محل کی حدود میں قطعاً مداخلت نہیں کریں گے لیکن اکبر شاہ ثانی ہی کے عہد میں ان کے ریڈینٹ نے محل میں آنا جانا شروع کر دیا تھا اور اب بہادر شاہ ظفر کے زمانے میں تو ریڈینٹ اس طرح آنے لگا تھا جیسے وہ مکمل بادشاہ کے مساوی ہو۔ سکوں پر سے بادشاہ کا نام بھی ہٹایا جا چکا تھا۔

سکوں پر سے نام ہٹ جانے کے بعد تو بہادر شاہ ظفر کے دل میں آگ بہت بری طرح بجھ چکی تھی لیکن اپنی عادت کے مطابق اس نے حسب معمول اپنے چہرے سے اپنے جذبات کا اظہار نہیں ہونے دیا تھا۔

دل میں کرشمے لیتے ہوئے درد کے ساتھ بہادر شاہ ظفر نے سخت تنگی کے بعد میں سال سے زیادہ کا عرصہ شراب و شعر میں گزار دیا۔ شاعری کی محفلیں تو اس کی زندگی کا لازمی حصہ بنی رہیں۔ اس کے استاد ابراہیم ذوق کے علاوہ مرزا غالب اور اس دور کے دیگر مشاہیر شعر ابھی ان محفلیں میں شریک ہوا کرتے تھے۔ 1854ء میں ابراہیم ذوق کے انتقال کے بعد بہادر شاہ ظفر نے اپنا کلام مرزا غالب کو دکھانا شروع کر دیا تھا۔

فیضان اب پینتالیس سال کا اور زرتاج اکتالیس سال کی ہو چکی تھی لیکن ماں نہیں بن سکی تھی۔

"تو کیا ہوا؟" فیضان اس کی دل جوئی کیا کرتا۔ "تم بھی تو اس وقت پیدا ہوئی تھیں جب تمہاری والدہ کی عمر پینتالیس سال ہو چکی تھی۔ تم بھی اسی عمر میں مجھے ایک چاند سا بیٹا دو گئی۔"

یہ کہہ کر جب وہ ہنسنے لگا تو زرتاج کے ہونٹوں پر بھی ہنسکی سی مسکراہٹ آ جاتی۔

لیکن وہ ہنسنے کا جو فیضان نے کہا تھا۔ ایک سال بعد ہی تاریخ نے خود کو ایک بار پھر دہرایا۔ نادر شاہ افشار اور احمد

شاہ ابدالی کے دہلی پر حملوں کے بعد ایک بار پھر اس شہر کے گلی کوچوں میں آگ کے شعلے لہرائے۔ گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے فضا کو گھٹی۔ لاشوں پر لاشیں گریں۔ خون، پانی کی طرح بہا اور اس ہنگامہ دار و گریں فیضان، زرتاج سے پھرتا گیا۔

☆☆☆

بہادر شاہ ظفر کبھی کبھی فیضان ہے کسی اہم معاملے میں مشاورت یا باتیں کر لیا کرتا تھا۔ ”بھئی بھی تم سوچتے تو ہو گے عزیزین! کہ ہم نے سلطنت اور تاج و تخت، سب کچھ بھلا کر خود کو شراب و شباب میں غرق کر لیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ حالات نے ہمیں بہت بے بس کر دیا ہے۔ اس کے باوجود ہم میں پردہ کچھ نہ کچھ کرتے رہے ہیں۔ تم جانتے تو ہو گے کہ ہندو ہندو، مسلمان سپاہی بھی ہمیں چھوڑ کر فرنگی سپاہ کی ملازمت میں جا چکے ہیں۔ ہم نے خفیہ طور پر اپنے بہت سے مستعد افراد کے دود و مختلف شہروں میں بھیجے۔ ان لوگوں نے کوشش کی کہ ان سپاہیوں کے دل میں حب وطن کا جذبہ بیدار کر سکیں مگر اس مقصد میں کامیابی نہیں ہو سکی۔ یہ اندازہ تو ہوا کہ ان سپاہیوں کے دلوں میں وطن کی محبت کا جذبہ ابھی یکسر ختم نہیں ہوا ہے مگر پیٹ کی آگ بھی ان کے ساتھ ہے۔ انہیں اندازہ ہے کہ مغل خزانے کا اب کوئی وجود نہیں رہا اور ہم اس کی ضمانت دینے کے قابل نہیں رہے کہ ان کے بال بچوں کی سائیں بحال رہیں گی۔ علاوہ اس کے ان کے دلوں میں یہ بھی جاگزیں ہو چکا ہے کہ فرنگیوں کے پیر اب ہماری سرزمین پر بڑی مضبوطی سے جم چکے ہیں جنہیں اکھاڑنا اب ممکن نہیں ہوگا۔“

”حضور والا!“ فیضان نے کہا۔ ”کیا مملکت ایران سے مدد کی درخواست نہیں کی جاسکتی؟ مجھے معلوم ہے کہ ایران کے شاہ طہاسب نے آنجنابی بابر فردوس مکانی کی مدد دل و جان سے کی تھی۔ کیا اب وہ مملکت ہماری مدد نہیں کر سکتی؟“

بہادر شاہ ظفر نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”کیا تمہیں اس کا علم نہیں کہ شاہ طہاسب کے خاندان کی حکومت نادر شاہ افشار نے ختم کر دی تھی۔ پھر اس کے اہل چائینوں کے بعد وہاں کریم خاں زند کی حکومت قائم ہوئی تھی جو اس کے چائینوں کی وجہ سے ختم ہوئی۔ اس کے بعد وہاں قاجار حکمران رہے ہیں جن کا شاہ طہاسب کے خاندان سے گہرا تعلق رہا ہے۔ آج کل وہاں ناصر الدین شاہ کی حکومت ہے۔ اسے برسر اقتدار آنے غالباً آٹھ نو سال گزر چکے ہیں

لیکن وہاں بھی حالات اچھے نہیں ہیں۔ بابیر تحریک کی سرگرمیاں عروج پر پہنچ رہی ہیں جو اسلامی عقائد کے خلاف ہے۔“

فیضان بولا۔ ”یہ سب میرے علم میں ہے اعلیٰ حضرت.....! میں نے یہ بھی سنا ہے کہ قرۃ العین طاہرہ نامی کوئی خاتون بھی اس تحریک کی روح رواں ہے۔ وہ بہت اچھی شاعرہ بھی ہے۔“

”ہاں۔“ بہادر شاہ ظفر نے جواب دیا، پھر کہا۔ ”اس کے علاوہ وہاں خوارزم کے حکمرانوں اور روسیوں کی پیش قدمی بھی جاری ہے۔ فرنگیوں نے وہاں بھی اعلان جنگ کر دیا ہے۔ ان خراب حالات میں ناصر الدین شاہ اپنی حکومت دیکھ گایا ہماری مدد کرے گا لیکن اب تم نے یہ بات چھیڑی ہے تو ہم بتائیں کہ بڑی موہومی امید پر ہم نے ناصر الدین شاہ کو دو سال پہلے ایک خط لکھا تھا جس کا جواب ہمیں آج تک نہیں ملا۔“

یہ اتفاق تھا کہ جس روز ان دونوں میں یہ گفتگو ہوئی۔ اس کے دوسرے ہی دن دہلی کی جامع مسجد پر ایک اشتہار چسپاں دیکھا گیا۔ اس اشتہار کی تحریر کا متن تھا کہ ایرانی افواج نے ہندستان کا رخ کر لیا ہے اور درۂ بولان عبور کر کے دہلی میں وارد ہونے والی ہے لہذا ہندوستان کے مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ ایران کی فوج کے شانہ بشانہ لڑ کر فرنگیوں کو ہندوستان سے بھگا دیں۔

لیکن کچھ ہی دن بعد معلوم ہو گیا کہ جو کچھ اس اشتہار میں لکھا گیا تھا، اس میں ذرا بھی حقیقت نہیں تھی۔ یہ سب کچھ نہیں معلوم ہو سکا کہ وہ حرکت کس کی تھی اور کیوں کی تھی لیکن اس کی وجہ سے دہلی کے لوگوں میں ٹھوڑا سا جوش ضرور پیدا ہو گیا۔ اسی جوش کی فضا میں ایک واقعہ ایسا ہوا کہ فرنگیوں کے خلاف نفرت کا جولاوا، کسی نہ کسی وجہ سے دبا ہوا تھا، اچانک پھٹ پڑا جس کا سبب ایک انگریز کرنل اسمتھ کی بے وفائی تھی۔

اپریل میں وہ واقعہ میرٹھ جھاؤنی میں پیش آیا تھا جو دہلی سے پینتیس چالیس میل کے فاصلے پر تھی۔ اس کا محیط پانچ میل کے گنگ جھگ تھا۔ ٹھنڈی سڑک نے اسے دو حصوں میں تقسیم کیا تھا۔ ایک جانب توپ خانے کی بیکریں تھیں اور دوسری جانب رسالے کی پینچ میں پیادہ فوج رہتی تھی۔ چند روز پہلے کارا لنگھینے وہاں سے کارٹوسوں کی ایک کھپ بھیجی تھی۔ کرنل اسمتھ کو جانے کیا سوچھی کہ اس نے اچانک پریڈ کا حکم صادر کر دیا تاکہ سپاہیوں کو نئے کارٹوسوں

کے استعمال کا طریقہ سکھایا جائے۔

ان کارٹوسوں میں سواری چربی کا استعمال کیا گیا تھا، اس لیے پانچ غیر مسلم ہندوستانی سپاہیوں کے علاوہ باقی نے وہ کارٹوس استعمال کرنے سے انکار کر دیا۔ کرنل اسمتھ سے یہ تاثر مانی برداشت نہیں ہو سکی اور اس نے کارٹوس استعمال نہ کرنے والے سپاہیوں کو گرفتار کر کے جھاؤنی کی جیل میں ڈالوا دیا۔ اس سے جھاؤنی کے ان سپاہیوں میں غصے کی لہر دوڑ گئی جنہیں اس پریڈ میں شریک نہیں کیا گیا تھا۔

فرنگیوں نے یہ فیصلہ بھی کیا کہ نافرمان قیدیوں پر مقدمہ چلا کر انہیں ایسی سزائیں دی جائیں جو دوسرے سپاہیوں کے لیے عبرت ناک ثابت ہوں۔

مسلمان سپاہیوں کی طرف سے اس کی اطلاع دہلی، بہادر شاہ ظفر کو بھجوائی گئی۔ اطلاع کے ساتھ خط میں یہ بھی لکھا گیا تھا کہ اگر بادشاہ سلامت قیادت کے لیے تیار ہو جائیں تو اب وہ ان فرنگیوں سے لڑ سکیں گے۔

بہادر شاہ ظفر یہ سب کچھ معلوم ہونے کے بعد فوری طور پر کوئی فیصلہ نہ کر سکا لیکن خاصے تہذیب کے بعد اس نے تنہائی میں فیضان سے کہا۔ ”تم کو یہ تو علم ہے کہ میرٹھ جھاؤنی سے کیا اطلاع اور کیا درخواست آئی تھی۔ اب ہم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ جو ہو، سو ہو، اب مزید ذلت برداشت نہیں کی جاسکتی۔ ہم نے بخت خاں کے نام ایک خط لکھا ہے۔ وہ اس وقت میرٹھ میں ہی ہوگا۔ ہم چاہتے ہیں کہ یہ خط تم ہی اسے پہنچاؤ۔ ہم اس ناکذ معاملے میں تمہارے علاوہ کسی پر اعتماد نہیں کرنا چاہتے۔ تم نے بخت خاں کا نام تو سنا ہی ہوگا۔“

”ان کا چہرہ شناس نہیں مگر ان کا نام بہت سنا ہے۔ میں کسی نہ کسی طرح ان تک پہنچ ہی جاؤں گا۔“

بہادر شاہ ظفر نے خط اس کے حوالے کیا اور کہا۔ ”اس پر ہماری مہر لگی ہوئی ہے۔ ہم نے لکھا ہے کہ بخت خاں قیادت کے لیے ہماری آمادگی کا اعلان کر دے۔“

”آپ نے یہ فیصلہ کرنے میں دیر کیوں لگائی اعلیٰ حضرت؟“

”بس یہ اندیشہ لاحق رہا کہ اگر نتیجہ کچھ نہ نکلا تو ہمارا نام اس طرح سامنے آجائے کہ باعث فرنگی ہمارے لیے عذاب بن جائیں گے۔“

”کیا یہ اندیشہ اب نہیں ہے۔“ بہادر شاہ ظفر سے اتنی جھٹ، فیضان کے علاوہ کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ بہادر شاہ ظفر نے جواب دیا۔

”اگر کوئی نتیجہ نہ نکلا تو ہم ریڈیڈنٹ سے مصطفیٰ یہ جھوٹ بولنے پر مجبور ہوں گے کہ ہم نے ایسا کوئی اعلان نہیں کیا اور یہ شخص افواہ ہے جو کسی نے پھیلائی ہے۔ اگر صرف میرٹھ ہی میں کچھ ہو کر رہ گیا تو ہم بخت خاں کا نام بھی لے سکتے ہیں۔ یہ تو ممکن نہیں کہ فرنگیوں کو بخت خاں سے ہمارا یہ خط مل جائے جو ہمارے خلاف ناقابل تردید ثبوت ہوگا۔ ہمیں علم ہو چکا ہے کہ فرنگیوں کی فوج میں ہونے کے باوجود اب بخت خاں میں خاصی تبدیلی آچکی ہے، ہم نے سنا ہے کہ اس کے خیالات میں انقلاب کی مولوی سر فراز علی نے پیدا کیا ہے۔ بس اب تم جلد از جلد روانہ ہو جاؤ۔“

فیضان فوراً روانگی کے لیے تیار ہوا۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ زرتاج اس سے بے خبر رہ جاتی۔ اس کا چہرہ حق پڑ گیا۔

”میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔ کیا معلوم، جب تم وہاں پہنچو تو شعلے بجھ کر چکے ہوں۔“

”میرے ساتھ تمہارا جانا مناسب نہیں ہوگا زرتاج! اس معاملے میں ضد نہ کرو۔ یہ خیال دل میں نہ لاؤ کہ اگر میں ان شعلوں کی نذر ہو گیا تو کیا ہوگا۔ اگر میں وہاں سے غازی بن کر لوٹا تو یہ تمہارے لیے باعث فخر ہوگا اور اگر شہید ہو گیا تو بھی۔“

زرتاج نے فوراً اس کی بات کاٹی۔ ”تو میں بھی تمہارے ساتھ شہید ہونا چاہوں گی۔ پستول چلانا تو تم سے سیکھا تھا لیکن میں سال محل میں گزرا کر میں نے شیرازی اور تیراگنی بھی سیکھ لی ہے۔“

”یہ تم مجھے بتا چکی ہو لیکن۔۔۔۔۔۔“

جب اس بحث و تکرار کا علم بہادر شاہ ظفر کو ہوا تو اس نے حکماً زرتاج کو فیضان کے ساتھ جانے سے روک دیا۔ زرتاج بے بسی سے آنسو بہاتی رہ گئی۔ فیضان کا ٹھوڑا جب سر پٹ دوڑنا ہوا تو قلعے سے نکلا تو زرتاج کا آنسوؤں میں ڈوبا ہوا چہرہ اس کے تصور میں تھا لیکن اس نے اپنی توجہ اپنے فرض کی طرف مبذول کرنے میں زیادہ وقت نہیں لگایا۔ تیس سال بعد وہ خود کو ایک بار پھر سپاہی محسوس کرنے لگا تھا جس پر لازم تھا کہ وہ اپنے کمان دار، یعنی بہادر شاہ ظفر کے حکم کی تعمیل کے علاوہ کچھ نہ سوچے۔

اس نے سنا تھا کہ بخت خاں پہلے شاہی لشکر میں تھا لیکن اکبر شاہ ثانی کے انتقال سے چند ماہ قبل ہی شاہی لشکر چھوڑ کر فرنگیوں کے ”برلی بریگیڈ“ کے آٹھویں پیڈل توپ خانے میں صوبے دار کی حیثیت سے ملازم ہو گیا تھا۔ اب اس کی صلاحیتیں اسے میدان توپ خانے کا سالار بنا چکی تھیں۔

میرٹھ چھاؤنی میں بخت خاں تک پہنچنا فیضان کے لیے مشکل ثابت نہیں ہوا اور بہادر شاہ ظفر کا خط پڑھ کر بخت خاں کے چہرے پر مسرت کی سرخی دوڑ گئی۔ اس نے ایسا بندوبست کیا کہ یہ آخر تمام سپاہیوں تک جلد از جلد پہنچ جائے جس میں ناکامی نہیں ہوئی۔

جن سپاہیوں نے کاتوس استعمال کرنے سے انکار کیا تھا، ان پر مقدمہ چلا کر انہیں دس دس سال قید با مشقت کی سزا سنائی کر تیل میں ڈال دیا گیا تھا۔ اس سے دوسرے سپاہی بہت مشتعل تھے۔ جب انہیں یہ اطلاع ملی کہ بہادر شاہ ظفر ان کی قیادت کے لیے تیار ہو گیا ہے تو ان کا اشتعال، بغاوت کے بھڑکنے ہوئے شعلوں میں تبدیل ہو گیا۔ انہوں نے سب سے پہلے جیل پر دھاوا کھول کر سزا پانے والے سپاہیوں کے علاوہ ان سات سو زائد قیدیوں کو بھی چھڑا لیا جو پہلے ہی سے کسی باعث قید تھے۔

اس کے بعد میرٹھ چھاؤنی میں آگ اور خون کا مکمل شروع ہوا۔ فرنگی افسران کو نہ صرف قتل کیا گیا بلکہ ان کی بیروں میں آگ بھی لگائی گئی۔ عام فرنگی سپاہ ہندوستانی سپاہ کے سامنے جم نہ سکی اور بھاگ کھڑی ہوئی۔ ان کا تعاقب کر کے ان کی اکثریت کو ہلاک کیا گیا۔ اس معرکے میں فیضان نے بھی حصہ لیا تھا۔ اس کی تلوار بھی خون میں ڈوبی تھی۔ چھوٹے موٹے زخم اسے بھی آئے تھے جن کے لیے معمولی مرہم پٹی کافی تھی۔

میرٹھ سے انگریزوں کا صفایا ہو چکا تھا۔ اس معرکے کی اطلاع دہیرے دھیرے دوسرے شہروں میں بھی پہنچ رہی تھی۔ جب بریلی سے اطلاع آئی کہ وہاں کی ہندوستانی سپاہ نے بھی انگریزوں سے بغاوت کا اعلان کر دیا تھا تو بخت خاں نے فوراً وہاں کا رخ کیا۔ فیضان اس کے ساتھ رہا۔ تیس سال سے اس کے اندر کا سپاہی اب پوری طرح بیدار ہو چکا تھا۔

بریلی پہنچ کر بخت خاں نے وہاں کی سپاہ کی قیادت سنبھالی اور بریلی کو بھی انگریزی تسلط سے آزاد کرالیا۔ اس کے بعد اس نے رام پور، مراد آباد اور جب پور سے ہوتے ہوئے دہلی کا رخ کیا۔

کچھ دوسرے شہروں سے بھی انگریزوں کے خلاف علم بغاوت بلند ہونے کی اطلاعات موصول ہوتی رہی تھیں۔ ادھر ادھر سے بہت سے سپاہی آ آ کر بخت خاں کے لشکر میں شامل ہو رہے تھے۔

دہلی میں فرنگیوں کی سپاہ اتنی نہ تھی کہ وہ بخت خاں

کے لشکر کا مقابلہ کر سکتی۔ دہلی میں موجود ہندوستانی سپاہ نے بھی ان کے خلاف اپنی تلواریں بے نیام کر دیں تھیں اس لیے انہیں بھاگنے ہی پڑی۔

بخت خاں شاہی محل میں داخل ہوا تو بہادر شاہ ظفر نے اسے سنبے سے لگایا۔

زرتاج نے جب فیضان کے واپس آنے کی اطلاع سنی تو دوڑتی ہوئی اپنے کمرے سے نکلی اور فیضان سے ٹکرا گئی جو کمرے میں داخل ہونے والا تھا۔ زرتاج اس کے سینے سے لگ کر سسک پڑی۔

فیضان سسکراتے ہوئے بولا۔ ”مجھے یقین تھا زرتاج کہ میں غازی بن کر لوٹوں گا۔“

زرتاج نے پوچھا۔ ”کیا اب ہمیں ان مکاروں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نجات مل چکی ہے؟“

”بہت سے شہروں میں شعلے بھڑک رہے ہیں۔ نتیجہ ہمارے حق میں لگنا چاہیے۔“ فیضان نے جواب دیا۔

اس وقت بہادر شاہ کو اطلاعات مل رہی تھیں کہ اب انگریز سپاہ دہلی کے باہر ایک پہاڑی پر خیمہ زن تھی۔ جنگ آزادی کے سپاہیوں نے اپنا مستقر دہلی کو بنالیا تھا اور ان کی کمان بخت خاں ہی کے ہاتھوں میں تھی۔ بہادر شاہ ظفر نے اسے جنگ آزادی کے لشکر کا سپہ سالار اعلیٰ اور ایک شہزادے کو اس کا نائب مقرر کر دیا تھا۔ بخت خاں نے دہلی کے باہر پہاڑی پر خیمہ زن فرنگی فوج پر اتنی زبردست گولہ باری کروائی کہ دشمن کے دانت کھنکھنے ہو گئے لیکن مختلف شہروں سے ان کے لیے کمک مستقل آتی رہی اور پھر ان کی تعداد اتنی بڑھ گئی کہ انہوں نے دہلی پر یلغار کر دی۔ دہلی کی تفصیل پر شدید ترین گولہ باری کی گئی۔ وسط شہر میں انگریزوں کو فسیل کے شیریں گیت کی طرف رخنہ ڈالنے میں کامیابی ہو گئی۔

پھر چارہی دن بعد سارے شہر میں جنگ آزادی کے سپاہیوں اور انگریزی فوج کی دست بہ دست لڑائی شروع ہوئی۔ قصر شاہی کی فضا میں اب شدید بے چینی پھیل چکی تھی۔ بہادر شاہ ظفر کو پل پل کی اطلاعات مل رہی تھیں۔ جنگ آزادی کے سپاہی مغلوب ہوتے جا رہے تھے۔ بہادر شاہ ظفر نے مشاورت کے لیے کچھ لوگوں کو جمع کیا۔ ان لوگوں میں بخت خاں کے علاوہ فیضان بھی تھا۔

”دہلی میں اب ہم یہ جنگ جیت نہیں سکیں گے اعلیٰ حضرت!“ بخت خاں نے بہادر شاہ ظفر کے استفسار پر کہا۔

”میں ایک فیصلہ کر چکا ہوں اعلیٰ حضرت! اگر آپ نے مجھے طلب نہ فرمایا ہوتا تو مجی میں آپ کی خدمت میں حاضر ہونے ہی والا تھا۔“

”کیا انگریزوں سے پناہ طلب کرنے کا فیصلہ کیا ہے؟“ بہادر شاہ ظفر کے مقررین خاص میں سے مرزا الہی بخش کچھ طنزیہ انداز میں بول پڑا۔

فیضان نے اسے بڑی سنجیدگی سے دیکھا۔ اسے بہت دن سے شبہ تھا کہ مرزا الہی بخش کے علاوہ ایک مقرب شاہ، حکیم احسن اللہ بھی انگریزوں سے ملا ہوا تھا۔ دودر باری منشی رجب علی اور ایک ہندو، جاٹ مل ان دونوں اور انگریزوں کے درمیان رابطے کا ذریعہ تھے۔ انہی کے ذریعے قصر شاہی کی خبریں انگریزوں کو پہنچائی جاتی تھیں۔ کچھ مواقع ایسے آئے تھے جب فیضان کو ان چاروں کے بارے میں یہ شبہ ہوا تھا لیکن اس کے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا۔ اس نے دو ایک مرتبہ بہادر شاہ ظفر کو اشاروں کنایوں میں حکیم احسن اللہ اور مرزا الہی بخش کی غداری کے بارے میں بتایا تھا لیکن مصدوم دل رکھنے والے اس فعل بادشاہ کو ان دونوں پر کامل اعتماد تھا۔ فیضان ان دونوں اور ان کے ہر کاروں کے خلاف ثبوت حاصل کرنے کے لیے کچھ تدابیر پر غور کر رہا تھا کہ بہادر شاہ ظفر نے اسے بخت خاں سے ملنے بھیج دیا تھا۔

مشاورت کے کمرے میں بخت خاں، مرزا الہی بخش کا طنزیہ جملہ بیگیا اور اس پر ایک اچھٹی سی نظر ڈالنے کے بعد بہادر شاہ ظفر کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اب یہ جنگ جاری رکھنے کے لیے مجھے اپنی سپاہ کے ساتھ کسی اور شہر کو مستقر بنانا چاہیے۔ اس سے پہلے کہ مکمل پسپائی اختیار کرنا پڑے، بہتر ہوگا کہ میں اپنی سپاہ کے ساتھ دہلی سے نکل جاؤں اور آپ بھی میرے ساتھ یہاں سے نکل چلیں۔“

اس وقت حکیم احسن اللہ بول پڑا۔ ”اب بزدلی دکھانے کا مشورہ اعلیٰ حضرت کو بھی دیا جائے گا؟“

”یہ بزدلی نہیں، مصلحت ہوگی۔“ بخت خاں نے کہا۔ ”خوشی کرنے کے بجائے انسان کو زندہ رہنے کے دوسرے راستے بھی اختیار کرنے چاہئیں۔“

اس وقت فیضان نے بھی بخت خاں کی تائید کی۔

مغل بادشاہ پر اب یہ وقت آ گیا تھا کہ اس کے سامنے اس کے مقررین بول رہے تھے اور وہ بس ایک ایک کا منہ تک رہا تھا۔

مرزا الہی بخش نے شہد سے اصرار شروع کیا کہ بہادر شاہ ظفر کو شاہی محل نہیں چھوڑنا چاہیے۔ وہ بولا۔ ”جامع مسجد پر جوا شہنشاہ چسپاں ملا تھا، اسے وہاں لگانے والا ایران کا کوئی قاصد ہو سکتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایرانی فوج کو یہاں پہنچنے میں کسی وجہ سے دیر ہو گئی ہے لیکن وہ آئے گی ضرور اور ان فرنگیوں کو خاک چاٹنا پڑے گی۔“

”ہوسکتا ہے کہ ایرانی فوج آجائے لیکن بروقت نہ آ سکے۔“ بخت خاں نے مرزا الہی بخش کی طرف توجہ دے کر بغیر بہادر شاہ ظفر سے کہا۔ ”اور..... خاتم یہ دہن، اگر ایرانی فوج بروقت نہ آسکی تو یہ فرنگی آپ کو گرفتار کر لیں گے اعلیٰ حضرت، اور پھر یہ شاہی خاندان کو کسی قسم کی چھوٹ دینے کے لیے بھی تیار نہیں ہوں گے۔“

”ایرانی فوج کے آنے تک ہم کوئی بندوبست کر لیں گے۔“ حکیم احسن اللہ بول پڑا۔

بہادر شاہ ظفر اس وقت نظریں جھپکائے بیٹھا تھا، اس کے انداز سے یہ بات صاف ظاہر ہو رہی تھی کہ وہ بخت خاں کے بجائے اپنے مقررین کے مشورے پر عمل کرنا چاہتا ہے۔ یہ بات بخت خاں نے بھی محسوس کر لی۔ اس کے چہرے پر مایوسی کا تاثر ابھر ا اور پھر اس نے بہادر شاہ ظفر سے رخصت کی اجازت چاہی۔

بہادر شاہ ظفر نے صرف سر ہلانے پر اکتفا کی تھی۔ بخت خاں کے جانے کے بعد حکیم احسن اللہ بولا۔ ”اعلیٰ حضرت! ہم شاہی محل چھوڑ کر حضرت نصیر الدین ہمایوں جنت آشیانی کے مقبرے میں بھی چھپ سکتے ہیں۔ فرنگی سمجھیں گے کہ ہم سب بھی بخت خاں کے ساتھ ملے گئے۔“

”یقیناً۔“ مرزا الہی بخش نے لقمہ دیا۔ ”فرنگیوں کو شبہ بھی نہیں ہو سکتا کہ ہم وہاں جا چھپے ہیں۔ یہاں تک کہ ایرانی فوج ہماری مدد کے لیے آجائے گی۔“

”مگر کتنے عرصے؟“ بہادر شاہ ظفر بہت دیر بعد بولا۔

”کئی مہینے بھی گزرا رہے جاسکتے ہیں۔“ مرزا الہی بخش نے کہا۔ ”اب بھی آپ کے ایسے وفادار اور جاں نثاریے ہیں کہ بہت خفیہ طور پر کئی ماہ کا سامان رسد وہاں پہنچا سکتے ہیں۔“

”اچھا!“ بہادر شاہ ظفر نے طویل سانس لی۔ ”تو پھر ایسا ہی کیا جائے۔ اس کا بندوبست تم کرو۔“ اس نے آخری فقرہ فیضان سے کہا۔

”بہتر اعلیٰ حضرت!“ فیضان کو کہنا پڑا لیکن اس کا خون کھول رہا تھا۔ اس کے خیال میں بخت خاں کی رائے بہت صائب تھی۔ ہمایوں کے مقبرے میں چند دن چھپنا بھی

ممکن نہ ہوتا۔ وہ دونوں غدار ہی اس کی اطلاع انگریزوں کو دے دیتے۔

مشاورت پر خاست ہوئی۔
کچھ دیر بعد فیضان بہادر شاہ ظفر کے کمرے میں پہنچا جہاں مثل بادشاہ لکھنؤ مندی سے ٹہل رہا تھا۔
”مجھے کچھ عرض کرنا ہے اعلیٰ حضرت!“ فیضان بولا۔
”کہو!“

”بخت خاں کو اپنی سپاہ کے ساتھ یہاں سے جانے میں دو تین روز تو لگیں گے۔ اتنے دن میں سامان رسد بھی وہاں پہنچ جائے گا لیکن میں چاہتا ہوں کہ ایک احتیاط اور کی جائے!“

”مگر چہ بخت خاں سپہ سالار اعلیٰ ہیں لیکن اب بھی ایسے سپاہیوں کی تعداد خاصی ہے جو صرف آپ ہی کا حکم مانیں گے۔ ان تک آپ کی یہ ہدایت پہنچانی جاسکتی ہے کہ وہ دھیرے دھیرے مقبرے کے احاطے میں جا کر چھپتے رہیں۔ اس کا علم کسی اور کو..... آپ کے مقررین کو بھی نہ ہو۔“
بہادر شاہ ظفر کے ہونٹوں پر ہنسی سی سکر اہٹ ابھری۔ ”تمہارے دماغ سے یہ خیال جا نہیں سکا کہ حکیم احسن اللہ اور مرزا الہی بخش ہمارے وفادار نہیں ہیں، لیکن خیر! اگر تم چاہتے ہو تو اس بارے میں ہم کسی کو کچھ نہیں بتائیں گے لیکن یہ ہماری سمجھ میں نہیں آسکا کہ تم ایسا کیوں چاہتے ہو۔“

”احتیاط کے طور پر اعلیٰ حضرت! اگر ایرانی فوج کو یہاں پہنچنے میں مرزا الہی بخش کی توجہ سے دو چار چھ دن زیادہ بھی لگ جائیں تو مقبرے کے احاطے میں موجود سپاہ اتنے دن تک شاہی خاندان کی حفاظت کر سکے گی۔“

”ٹھیک ہے۔ ہم تمام تر اختیارات تمہیں دیتے ہیں، جو چاہو کرو۔ ہمارے دماغ نے تو شاید کام نہ کرنا ہی چھوڑ دیا ہے۔“
فیضان اجازت لے کر کمرے سے نکلا اور فوراً اپنے کمرے میں جا کر زرتاج کو ان تمام حالات سے آگاہ کیا۔
زرتاج لکھنؤ مندی سے بولی۔ ”مقبرے میں جمع ہونے والی سپاہ آخر تپتی ہوگی۔ وہ کب تک ان فرنگیوں کا مقابلہ کر سکے گی جبکہ تمہارے خیال کے مطابق ایرانی فوج کے آنے کا کوئی امکان نہیں۔“

فیضان نے غصٹی سی سانس لے کر کہا۔ ”شاہی محل میں تو اعلیٰ حضرت بڑی بے بسی کے عالم میں گرفتار ہو جائیں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ ایسا نہ ہو، اس سے پہلے فرنگیوں کو لوہے کے چتے چھوڑ دیے جائیں۔“

زرتاج سر جھکا کر کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی ☆☆☆

اسی رات سے منصوبے پر عمل شروع ہو گیا۔ نہ صرف تھوڑے تھوڑے سپاہی بلکہ بہادر شاہ ظفر کے قریبی اعزاء بھی ہمایوں کے مقبرے میں منتقل ہونا شروع ہو گئے۔ رات کی تاریکی میں یہ عمل بہت خفیہ طریقے سے شروع کیا گیا۔ بس دو دو، چار چار افراد کی ٹولیاں مناسب وقت سے لال قلعے سے نکلتیں اور ہمایوں کے مقبرے کی طرف بڑھتی چلی جاتیں۔

منصوبے میں یہ بات شامل تھی کہ شاہی خاندان کے سارے افراد منتقل نہیں ہوں گے۔ مقبرے میں اتنی کھجائیں نہیں تھیں کہ وہ کثیر تعداد وہاں چھپ سکتی۔ نیز بہادر شاہ ظفر کا خیال یہ بھی تھا کہ اس کے قریبی لوگوں کے علاوہ، خاندان کے باقی لوگوں کے ساتھ انگریزوں کا رویہ بہت زیادہ جارحانہ نہیں ہوگا۔

تیسری شب کے نصف پہر تک وہ سب افراد مقبرے میں منتقل ہو گئے جن کے علاوہ کسی کو منتقل نہیں ہونا تھا۔ احاطے میں بہادر شاہ ظفر کی جاں شمار و وقادار سپاہ موجود تھی جس کا علم فیضان، زرتاج اور بہادر شاہ ظفر کے علاوہ کسی کو نہیں تھا۔
مرزا الہی بخش، حکیم احسن اللہ، حاجت مل اور شعی رجب علی کو بھی خاندان شاہی کے ساتھ مقبرے میں منتقل ہونا تھا۔

یہ فیضان ہی نے سوچا تھا کہ بادشاہ کے مقررین میں سے یہ چاروں ضرور منتقل ہوں۔ فیضان کو ان کی طرف سے خدشات لاحق تھے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ان میں سے کسی کی غداری کے باعث انگریزوں کو گورواہی معلوم ہو جائے کہ بہادر شاہ ظفر اور اس کے قریبی اعزاء کہاں روپوش ہوئے تھے۔

اس طرح کچھ زیادہ دن تک خطرہ مٹا رہتا اور ابتدائی دنوں میں فیضان ایک بار پھر بہادر شاہ ظفر کو سمجھانے کی کوشش کرتا کہ کم از کم وہ اور کچھ بہت ہی قریبی لوگ وہاں سے نکل کر اس طرف روانہ ہو جائیں جدرہ جانے کا فیصلہ بخت خاں نے کیا تھا۔

منقلی کے بعد فیضان کے علم میں جب یہ بات آئی کہ شعی رجب علی وہاں آتے تو تھا لیکن پھر کب اور کس طرح کہیں غائب ہو گیا، اس کا علم کسی کو نہیں تھا۔ فیضان کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ اسے یقین تھا کہ اب انگریزوں کو اس کا علم بہت جلد ہو جائے گا کہ بہادر شاہ ظفر کہاں روپوش ہوا تھا۔

فیضان نے باقی رات انگریزی سپاہ کا مقابلہ کرنے کی تیاری میں گزاری، لیکن اس کا اسے یقین تھا کہ یہ

مداقت زیادہ عرصے تک جاری نہیں رہ سکے گی۔ بس اتنا ہوتا کہ اس کے ذہن میں آنے والی تدبیر پر عمل کرنے سے انگریزوں کو بہت زیادہ جانی نقصان اٹھانے کے بعد ہی مقبرے میں داخل ہونے کا موقع ملتا۔

ان دنوں مقبرے کے احاطے کی تفصیل نہ صرف بہت اونچی بلکہ مضبوط بھی تھی۔ احاطے میں داخلے کے دو چھانک تھے۔ فیضان نے سپاہیوں کو تفصیل کے ساتھ ساتھ پھیلا یا مگر ان کی کثیر تعداد کو چھانکوں کے سامنے مورچہ زن کیا۔

چھانک سے انگریزی سپاہ اندر داخل ہوئی تو چھانک کی چوڑائی کے سبب یہ یک وقت میں جائیں سے زیادہ سپاہی اندر داخل ہونے کی کوشش نہیں کر سکتے تھے اس لیے چھانک کے سامنے مورچہ زن شاہی سپاہ بہ یک وقت کئی سو گولیاں چلاتی تو وہ کبھی بچوں کر رکھ دیے جاتے۔ ان کے بہت کم سپاہیوں کو اندر آنے کا موقع مل سکتا تھا جن کو دست بہ دست لڑائی میں ختم کیا جاسکتا تھا۔

اس صورت حال کو دیکھ کر انگریزی سپاہ کا جو بھی سربراہ ہوتا، وہ جانی نقصان سے بچنے کے لیے اپنی سپاہ کو اندر جانے سے روک کر کوئی اور تدبیر سوچتا۔ دوسری تدبیر یہ ہو سکتی تھی کہ انگریزی سپاہ سیزھیاں لگا کر تفصیل پر چڑھنے کی کوشش کرتی لیکن جیسے ہی ان کے سر فیصل کے اوپر نظر آتے، شاہی سپاہ کی طرف سے ان پر گولیاں برسائے کے ساتھ ساتھ تیر اندازی اور برقی انداز کی شروع کر دی جاتی۔

اگلی صبح کا سورج طلوع ہوا تو بخت خاں اپنی سپاہ کے ساتھ وہاں سے چلا گیا تھا اور شاہ کی وقادار سپاہ جو مقبرے میں منتقل نہیں ہوئی تھی، وہ بہت کم تھی۔ ان کو فیضان یہ ہدایت کر آیا تھا کہ وہ ہتھیار ڈال کر اپنی جان بچانے کی کوشش کریں لیکن فرنگیوں کی سفاکی کے پیش نظر اس کا امکان کم ہی تھا کہ اتنی ہتھیاروں کی جنگ اور اپنی جانوں کا نقصان اٹھانے والے فرنگی ان کی جان بخشی کر دیتے۔

دوسرے دن دوپہر ہونے سے خاصا پہلے فیضان کو اطلاع مل گئی کہ انگریزی سپاہ بہت تیزی سے مقبرے کی طرف بڑھتی چلی آ رہی تھی مگر بہت زیادہ تعداد کو اس طرف بھیجنا ضروری نہیں سمجھا گیا تھا۔ فیضان کی رازداری کی وجہ سے انگریزوں کے علم میں یہ نہیں آیا ہوگا کہ بادشاہ کی وقادار سپاہ ان کا مقابلہ کرنے کے لیے مقبرے کے احاطے میں ہوگی۔

مکئی سبب تھا کہ انگریزی سپاہ کا ایک گھڑ سوار دستہ بے تحاشا چھانک میں داخل ہوا۔ اس دستے کی کمان میجر ہڈن کا ایک ماتحت کر رہا تھا۔ اس دستے پر گولیوں کی پھوڑا شروع

ہو گئی۔ یہ ان لوگوں کے لیے اتنا غیر متوقع تھا کہ اس دستے کے سارے آدمیوں کی لاشیں بکھر گئیں۔ ایک بھی زندہ بچ کر نہ لوٹ سکا۔ ان کا اسلحہ بھی شاہی سپاہ کے ہاتھ لگا۔

اس کے بعد ہی میجر ہڈن کی سمجھ میں آیا ہوگا کہ مقبرے کے احاطے میں شاہی سپاہ بھی موجود تھی جس کے بارے میں شعی رجب علی کو علم نہیں تھا ورنہ وہ میجر ہڈن کو اس بارے میں بھی بتا دیتا۔

اس کے بعد انگریزی سپاہ نے مقبرے میں داخل ہونے کی کوشش نہیں کی۔ مقبرے کو چاروں طرف سے محاصرے میں لینے کے باوجود کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا۔

مقبرے میں جب مرزا الہی بخش کو اس صورت حال کا علم ہوا اور حکم احسن اللہ نے بھی بہادر شاہ ظفر سے اس بارے میں بات کی تو انہیں علم ہوا کہ یہ سارا بندوبست فیضان نے کیا تھا۔ یہ معلوم ہونے پر یقیناً ان دونوں کی جان نکل گئی ہوگی کہ اس بارے میں اطلاع نہ ملنے پر وہ میجر ہڈن کے عتاب کا نشانہ بن سکتے تھے۔

اس کے بعد شام کا اندھیرا پھیلنے سے کچھ پہلے تک سکون رہا۔ انگریزوں کی طرف سے کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا۔ فیضان نے سمجھ لیا کہ میجر ہڈن نے ملک طلب کی ہوئی تاکہ مقبرے پر زوردار حملہ کیا جاسکے۔

فیضان نے دونوں چھانک بند کرادیے۔ اسے یقین تھا کہ سپاہیوں کی ملک کے ساتھ میجر ہڈن نے تو پیش اور دوسرا سامان بھی منگوا یا ہوگا۔ اس کا یہ خیال درست ثابت ہوا۔ شام ہوتے ہوئے انگریزی سپاہ کا ایک لشکر ہزاروں پہنچ گیا تھا اور توپوں کے علاوہ اونچی بیڑھیاں بھی لائی گئی تھیں۔

توپوں سے دونوں چھانکوں پر گولے برسنے لگے۔ سیزھیاں لگا کر انگریزی سپاہ اوپر چڑھی تو ان پر گولیوں، تیروں اور آگ کی بارش کی گئی۔ ان کی بیڑھیاں اور توپوں کی ٹھن کر ج سے فضا تھرانی لگی۔

فیضان گھوڑے پر سوار تیزی سے تفصیل کے ساتھ ساتھ چکر لگا رہا تھا اور سپاہیوں کے لیے ہدایات جاری کر رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ گولہ باری سے چھانک منہدم ہو جائیں گے اور پھر وہاں سے احاطے میں گولہ باری کر دوائی جائے گی اس لیے اس نے دوبارہ مورچہ بندی اس طرح کرانی کہ کوئی مورچہ چھانک کے عین سامنے نہ رہے، سب آڑ میں رہیں تاکہ گولوں کی زبرد نہ آسکیں۔ اسے یہ بھی یقین تھا کہ گولہ باری کے ساتھ سپاہیوں کی کثیر تعداد کے ساتھ اندر داخل ہونے کی کوشش کی جائے گی اس لیے اس نے مورچوں میں

موجودہ سپاہیوں کے پچاس پچاس کے دستے بنائے اور انہیں ہدایت کی کہ ایک دستہ بیک وقت فائر کرے۔ اس کے بعد دوسرا دستہ فائر کرنے میں دیر نہ لگائے۔ اس کے بعد تیسرا دستہ، پھر چوتھا، پھر پانچواں اور گولیاں کیونکہ بہت زیادہ نہیں تھیں اس لیے جیسے، ساتویں اور آٹھویں دستے کو تیرا فنی اور شعلہ افکنی کرنی تھی۔

دونوں پچانگوں پر یہی بندوبست کیا گیا تھا۔ سپاہیوں سے انگریز سپاہ نے اوپر چڑھ کر احاطے میں آنا چاہا مگر ان پر اپنی آگ برسی، اتنے تیر برے، اتنی گولیاں چلیں کہ وہ اس مقصد میں بھی کامیاب نہیں ہو سکے۔ گولہ باری سے دونوں پچانگ منہدم ہو گئے تو انگریز سپاہ نے بہت کثیر تعداد کے ساتھ حملہ کیا لیکن فیضان کی ہدایت کے مطابق جوانی کارروائی بھی بہت شدید تھی۔ مسلسل ہونے والی فائرنگ اور تیر اندازی کے باعث انگریزوں کا وہ حملہ بھی ناکام رہا۔ پچانگ کے اندر احاطے میں اور پچانگ کے باہر بھی فرنگیوں کی لاشیں بکھر گئیں۔ دونوں پچانگوں پر ایسا ہی ہوا تھا۔ فیضان کے اندازے کے مطابق فرنگیوں کے کئی سو سپاہی ختم ہو گئے تھے۔

اس کے بعد دونوں ہی پچانگوں کی طرف سے کوئی پلٹا نہیں کی گئی لیکن توپوں کے گولے وہاں سے اندر آ کر پھٹ رہے تھے۔ گوکہ فیضان کی تدبیر کے باعث ان سے وہ نقصان نہیں ہوا جو فرنگیوں نے سوچا ہوگا لیکن پچاس ساٹھ سپاہی زخمی ضرور ہوئے تھے جن کی مرہم پٹی احاطے میں ہی لگی تھی۔ مقبرے میں اتنی گنجائش نہیں تھی کہ انہیں اندر لا جا سکتا۔

مقبرے میں زرتاج بہت بے چین تھی۔ بہادر شاہ ظفر کے حکم سے کسی عورت کو مقبرے سے نکلنے کی اجازت نہیں تھی۔

”جنگ ہم جیت تو نہیں سکے۔“ فیضان نے زرتاج سے کہا۔ ”لیکن جب تک ہمارے خون کا آخری قطرہ نہ بہ جائے فرنگیوں کے منوں ہاتھ اٹکی حضرت تک نہیں ہٹ سکتے۔“ فیضان کی یہ بات زرتاج کے دماغ میں مسلسل گونج رہی تھی۔ آخر وہ خود کو قابو میں نہیں رکھ سکی۔ اس نے بہادر شاہ ظفر کی حکم عدولی کی اور مویج پاکر مقبرے سے نکل آئی۔ اسے ایک خالی گھوڑا بھی مل گیا جس پر سوار ہو کر اس نے فیضان کی تلاش شروع کر دی۔ اسے علم تھا کہ فیضان احاطے میں سپاہیوں کو ہدایات دیتا پھر رہا ہوگا۔ آخر ایک جگہ فیضان اسے مل ہی گیا۔ وہ بھی اسے دیکھ کر چونک گیا تھا۔

”تم باہر کیوں نکلیں؟“ وہ تیزی سے بولا۔ ”احقر حضرت کا حکم تھا کہ۔۔۔۔۔“

”میں اب کسی کا کوئی حکم نہیں مانوں گی۔“ زرتاج نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ”اگر مرنا ہی ہے تو میں بھی تمہارے ساتھ مروں گی۔“

اس وقت احاطے کی صورت حال اس اعتبار سے سنگین ہو چکی تھی کہ باہر سے فرنگیوں نے بھی تیرا فنی اور آتش افکنی شروع کر دی تھی۔ آتش افکنی کی وجہ سے کہیں آگ لگی اور اسے بجھانے کے لیے سپاہیوں کو حرکت میں آنا پڑتا۔ اس وقت احاطے میں آکر گرنے والے تیر ان سپاہیوں کو زخمی کر رہے تھے۔ کئی سپاہیوں کو ایسے زخم بھی لگے کہ وہ جانبر نہ ہو سکے۔ قیامت کی وہ رات نصف پہر میں داخل ہوئی۔ اس وقت مقبرے میں ایک سازش جنم لے رہی تھی۔

”یہ سلسلہ تک جاری رہ سکتا ہے اعلیٰ حضرت! مرزا الہی بخش نے بہادر شاہ ظفر سے کہا۔ ”ابھی انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ وہ باری نہیں شروع کی ہے۔ غالباً وہ دن کی روشنی میں ایسا کرنا چاہتے ہیں۔“ فیصلہ میں رہنے پڑ جائیں گے ان لوگوں کو اندر داخل ہونے سے روکنا ممکن نہ ہوگا۔“

بہادر شاہ ظفر نے جواب میں کچھ نہیں کیا۔ اس کا چہرہ سنا ہوا تھا۔ اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ مقبرے میں شاہی خاندان کی روپوشی کا علم انگریزوں کو اتنی جلدی کیسے ہو گیا تھا۔

”ایک خطرہ اور بھی ہو سکتا ہے۔“ حکیم احسن اللہ بولا۔ بہادر شاہ ظفر نے مستفردانہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

مرزا الہی بخش اور حکیم احسن اللہ آپس میں پہلے ہی مشورہ کر چکے تھے۔

احسن اللہ نے کہا۔ ”ممکن ہے کہ فرنگی جانی نقصان سے بچنے کے لیے فیصلہ کے رخوں کے قریب لے آئیں تو میں اور پھر مقبرے ہی پر گولے برساتا شروع کر دیں۔ اس طرح ہم لوگ تمہارے جاں گیس کے ہی لیکن مقبرہ بھی تباہ ہو جائے گا۔“

”ہم کر کیا سکتے ہیں احسن اللہ!“ بہادر شاہ کے لیے میں بے بسی تھی۔

”فرنگیوں سے رابطہ کر کے صلح کی بات کی جا سکتی ہے۔“ مرزا الہی بخش نے کہا۔ ”اپنے جانی نقصان سے رو بھی بچنا چاہتے ہوں گے اس لیے ان سے یہ معاہدہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ ہمیں یہاں سے اور دہلی سے نکل جانے دیں تو یہ

جنگ ختم کی جا سکتی ہے۔ میں کسی طرح باہر جا کر ان لوگوں سے بات کرنے کے لیے تیار ہوں۔ میں ان سے یہ جھوٹ بھی بول سکتا ہوں کہ ایرانی فوج کا قاصد آیا تھا۔ ایرانی فوج کل دوپہر تک ہماری مدد کے لیے یہاں پہنچ جائے گی۔ خصوصاً ایرانی فوج کے حوالے سے میں ممکن ہے کہ یہ فرنگی ہم سے یہ معاہدہ کرنے ہی میں اپنی بھڑی سمجھیں۔“

”ہمارا دماغ پتھر کیا ہے احسن اللہ!“ بہادر شاہ ظفر نے کہا۔ ”ہم کچھ نہیں سوچ سکتے، کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے۔“

مرزا الہی بخش نے مصنوعی طور پر پشیمانی سانس لے کر کہا۔ ”تاریخ ہمیں اس وجہ سے بھی معاف نہیں کرے گی کہ ہم نے نصیر الدین ہمایوں جنت آشیانی کی آخری نشانی بھی تباہ کر دادی۔“

”ہم نے کہا نا، ہمارا دماغ پتھر کیا ہے۔ تم دونوں اس وقت ہمیں تمہا چھوڑ دو۔“

مرزا الہی بخش اور حکیم احسن اللہ کے چہرے پر مایوسی کے تاثرات پھیل گئے۔ انہیں اس حکم کی تعمیل کرنا ہی پڑی کہ بہادر شاہ ظفر کو تباہ چھوڑ دیں۔

احاطے میں صبح کر جاری تھا۔ انگریزوں کی توپیں برابر گرج رہی تھیں۔ تیر اور آگ احاطے میں آ کر گر رہی تھیں۔ سپاہی زخمی بھی ہو رہے تھے، وہ سامان بھی ختم ہو گیا جس سے زخمیوں کی مرہم پٹی کی جاسکتی تھی اس لیے زخمی بھی زیادہ خون بہہ جانے کے باعث مر گئے۔

سیدہ سحر پھوٹ رہا تھا جب انگریزوں نے گولہ باری اور تیر اندازی اچانک روک دی۔ اس کے ساتھ ہی فیصلہ پر سفید پھریرا بھی لہرایا گیا تھا۔ سپاہیوں کو اچانک بہادر شاہ ظفر کا یہ حکم ملا تھا کہ وہ ہتھیار ڈال دیں۔

رات ہی کے کسی حصے میں بہادر شاہ ظفر کے دل میں یہ کک اٹھی تھی کہ جنت آشیانی نصیر الدین ہمایوں کا مقبرہ تو محفوظ رہ جائے۔ اس نے مرزا الہی بخش کو اجازت دے دی تھی کہ وہ کسی طرح باہر جا کر انگریزوں سے صلح کی بات چیت کر لے۔

اور بات چیت ہو گئی تھی۔ انگریزوں نے بہادر شاہ ظفر کو امان دینے کا عہد کر لیا تھا لیکن یہ اور بات ہے کہ ان مکاروں نے اس عہد کی پاسداری نہیں کی۔ وہ دندناتے ہوئے مقبرے میں داخل ہوئے تھے اور بہادر شاہ سمیت سب کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔

☆☆☆

یہ بات ایک دن پہلے ہی شہر کے ہر فرد کو معلوم ہو چکی

تھی کہ شاہی سپاہ شکست کھا چکی تھی اور اب دہلی پر انگریزوں کا مکمل راج تھا۔ بہت سے لوگ سبے ہوئے اپنے گھروں میں بیٹھے تھے لیکن اس وقت راستوں پر خاصی بھیڑ لگ گئی جب پایہ جولان بہادر شاہ ظفر اور شاہی خاندان کے دیگر افراد کو ہمایوں کے مقبرے سے شہر کی طرف لایا جا رہا تھا۔ اپنے بادشاہ کی یہ حالت دیکھ کر بہت سے لوگ اٹک بار ہو گئے۔

مبصر ہڈن فاتحانہ انداز میں آگے آگے چل رہا تھا۔ اچانک اس نے مڑ کر اپنے پشتوں سے بہادر شاہ ظفر کے دو بیٹوں اور ایک پوتے کو گولیاں کا نشانہ بنادیا۔ ملکہ زینت محل نے تڑپ کر لاشوں کی طرف جانا چاہا لیکن اسے دھکیل کر ایک تیل گاڑی میں ڈال دیا گیا۔ اس مقام پر خاصی تیل گاڑیاں جمع کی گئی تھیں جن میں گرفتار شدگان کو تیل لے جایا جاتا۔

مقبرے میں جن لوگوں نے ہتھیار ڈالے تھے، انہیں جان کی امان نہیں ملی تھی۔ انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا اور بہادر شاہ کی تین بیاری ہستیوں کو مبصر ہڈن نے اس لیے گولیاں ماری تھیں کہ جہنم دہشت زدہ ہو جائے اور اپنے بادشاہ کی حالت سے متعلق ہو کر کوئی شورش برپا نہ کر دے۔ سارے شاہی خاندان کو زندان میں ڈال دیا گیا اور پھر دہلی میں ایک اور قیامت برپا ہوئی۔ جو لوگ فرنگیوں سے ملے ہوئے تھے۔ ان کے مکانوں پر نشانات لگا دیے گئے تھے۔ ان نشانات زدہ مکانوں کو چھوڑ کر یہ شہر گھروں میں آگ لگتی گئی اور لوگوں کا مکمل عام کیا گیا۔ جن لوگوں کو زندان میں ڈالا گیا، ان میں فیضان بھی تھا اور اس پر فوراً تشدد شروع کر دیا گیا تھا۔ کئی سپاہی اس پر گھونسلوں اور لاتوں کی بارش کر رہے تھے۔ بندوٹوں کی بیشیں برساتی جا رہی تھیں۔ وہ زنجیروں میں بندھا بے بسی سے مار کھاتا رہا اور زخمی ہوتا رہا۔

”اب بس کرو!“ ایک افسر نے سپاہیوں کو حکم دیا۔ ”اتنا بھی نہیں کرے یہ فوراً مر جائے۔ اسے تو مسک مسک کر مرنے دوگا۔ اسی نے مقبرے میں سپاہ جمع کی تھی۔ اسی کی وجہ سے ہمارے سیکڑوں ساتھی اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ اس کی یہ سزا کافی نہیں کہ یہ فوراً مر جائے۔ اسے کھانا پینا دیتے رہو۔ اسے زندہ رہنا چاہیے۔ جب اس کے زخم ٹھیک ہو جائیں تو پھر اس کی درگت بناؤ۔ اس وقت کا انتظار کرو جب یہ خود موت کی خواہش کرنے لگے۔“

زندان میں فیضان کو زخموں سے چور چھوڑا گیا لیکن

تکلیف کے اس عالم بھی اسے زرتاج یاد آتی رہی۔ نہ جانے وہ زندہ بھی ہوگی یا نہیں.....
وقت گزرتا رہا۔ دن گزرتے رہے۔ اسے پہرے دار سپاہیوں کی باتوں سے معلوم ہوا کہ بہادر شاہ ظفر پر مقدمہ چلا جا رہا تھا لیکن فیضان کے خیال میں یہ صرف دنیا دکھاوے کی بات تھی۔ آخر کار بہادر شاہ کو ختم کرنا ہی انگریزوں کا رخ نظر ہو سکتا تھا۔

فیضان پر تشدد کا سلسلہ جاری رہا۔ پھر ایک دن اسے معلوم ہوا کہ بہادر شاہ ظفر کو موت کی سزا دینے کے بجائے جلاوطنی کی سزا دی گئی تھی اور اسے رنگون بھیجنے کی تیاریاں کی جا رہی تھیں۔ ملکہ زینت محل اور کچھ شہزادوں کو بھی اس کے ساتھ بھیجا جاتا۔ کچھ دوسرے لوگوں نے بھی یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ انہیں بھی رنگون بھیج دیا جائے۔ نہ جانے کیوں انگریزوں نے ان کی یہ درخواست منظور کر لی تھی اس لیے فیضان نے بھی یہ درخواست کر ڈالی اور اس کی درخواست بھی منظور کر لی گئی۔

تشدد کے باعث فیضان کا بیشتر وقت کراچے ہوئے گزرتا تھا۔ کبھی اسے کچھ وقت کے لیے غنڈ آتی تھی تو وہ خواب میں زرتاج کو ضرور دیکھتا تھا۔ اسی لیے اسے اس کا دل یقین دلانا رہتا تھا کہ وہ زندہ ہوگی۔
مقبّرے سے روانگی کے وقت بہادر شاہ ظفر کے ساتھ صرف ملکہ زینت محل تھی۔ باقی تمام گرفتار عورتوں کو مردوں سے الگ رکھا گیا تھا۔ اسی لیے فیضان کا خیال تھا کہ زرتاج انہی عورتوں میں ہوگی۔

بہادر شاہ ظفر کے ساتھ جن لوگوں کو رنگون لے جا کر قید خانے میں رکھا گیا، ان کے علاوہ باقی سب دہلی کے زندان میں قید رہے تھے۔ فیصلہ یہ کیا گیا تھا کہ جب حالات مکمل طور سے معمول پر آجائیں گے تب انہیں رہا کر دیا جائے گا۔ بہادر شاہ ظفر کو صرف جلاوطنی کی سزا نہیں سنائی گئی تھی بلکہ اسے تادم مرگ قید میں بھی رہنا تھا۔ فیضان اسے پھر بھی نہیں دیکھ سکا۔ اسے علم بھی نہیں تھا کہ قید خانے میں بہادر شاہ ظفر کو کہاں رکھا گیا تھا۔ اسی لیے اسے یہ بات بھی معلوم نہیں ہو سکی کہ ایک روز بہادر شاہ کو پکڑوں سے ڈٹکے ہوئے دو

خون اس طرح پیش کیے گئے تھے جیسے اس کے لیے وہ جسم کا کھانا لایا گیا ہو۔ پھر جب پکڑے ہوئے گئے تھے ان خونوں میں کھانے کے بجائے بہادر شاہ ظفر کے بیٹوں کے کٹے ہوئے سر رکھے تھے۔ بہادر شاہ ظفر بہترانی ہوئی آنکھوں سے ان کی طرف دیکھتا رہا اور پھر اس کے سر سے جیسی آواز لگی تھی۔ ”شہید بیٹوں کو سرخ رو ہو کر باپ کے سامنے آنا چاہیے۔“

صرف اسی بات سے کیا، فیضان ہر بات سے بے خبر تھا۔ اس کے علاوہ بھی بعض قیدیوں پر تشدد کیا جا رہا تھا۔ لوگ بیمار پڑ جاتے تھے، ان کا علاج بھی نہیں کیا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ مر جاتے تھے۔ کچھ قیدیوں کو اس کی اجازت دے دی جاتی تھی کہ وہ مرنے والے کو شہر کے کسی دیران علاقے میں لے جا کر دفن کر دیں۔ ان کی تدفین فرما سناہیوں کے پہرے میں ہوتی تھی۔
اسی زندان میں ملکہ زینت محل کا اور اس کے بیوہ 1862ء میں بہادر شاہ ظفر کا انتقال ہوا۔ وہ آخری مغلیہ بادشاہ تھا۔

انہی دنوں میں رنگون کے لوگ ملے کچلے پکڑوں میں بیویں ایک عورت کو دیکھتے تھے جو ایک قبر کے پاس بیٹھی رہتی تھی۔ بھڑے ہوئے بالوں اور اپنی فینٹ کے باعث ہاگل معلوم ہوتی تھی۔ اسے نہ کھانے کا ہوش تھا، نہ پینے کا اگر کوئی قریب جاتا تھا اور اسے کھانے کے لیے کچھ دیتا تھا تو وہ کھا لیتی تھی۔ کوئی پینے کے لیے کچھ دیتا تھا تو لی لیتی تھی کسی سے کچھ بولتی نہیں تھی۔ جب کوئی قریب جاتا تھا تو اپنی ایک میلی سی چادر قبر پر پھیلا دیتی تھی۔

سارے شہر میں اس کا چہرہ گواہ کیا لیکن کوئی کسی کو نہ سکا کہ وہ عورت کون سی اور کسی کی قبر پر کیوں بیٹھی رہتی تھی۔ کبھی کبھی لوگ یہ بھی دیکھتے کہ وہ عورت اپنے دام باندھ کر ایک انگی قبر پر پھیرتی۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ مٹی پر لکیریں کھینچ رہی ہو۔ چند ماہ کے بعد اس عورت کے پاس مردہ پایا گیا۔ لوگوں نے یہ بھی دیکھا کہ قبر پر جگہ ”فیضان..... فیضان..... فیضان“ لکھا ہوا تھا۔ زندان میں وہ عورت قبر پر انگی پھیر کر یہی نام لکھا کرتی تھی۔

جنگ آزادی کی تلخ یادداشتیں، ایڈورڈ تھامپسن۔ آخری عہد مغلیہ کا ہندوستان، ڈاکٹر مبارک علی۔ ہندوستانی کے تمدنی جلوے، صباح الدین عبدالرحمن۔ شاہ عالم ثانی کے عہد کا دہلی دربار، پولیسر، دولیس۔ نامہ خیران، مقبول بیک بدخشانی۔ مغل دربار، ڈاکٹر مبارک علی

ماخذات

جارج تیل اٹلاناٹاشی ایرینا کی طرف بڑھ رہا تھا۔ آسمان سے تیز ہواؤں کے ساتھ بارش کی بوندیں برس رہی تھیں۔ ایرینا کی جگہ گائی روشنیاں آنے والے ہری لین کے ابتدائی اثرات کے سامنے ماند پڑ رہی تھیں۔ ایک طرف ایک ٹی وی کی رپورٹر آنے والی فائٹ سے جاری موسم کے بارے میں رواں تبصرہ کر رہی تھی۔ جارج تقریباً چالیس برس کا طویل قامت اور اسارٹ جسامت والا خوش شکل مرد تھا۔ آج اس کے لیے بہت خاص دن تھا اس لیے اس نے اپنا بہترین سوٹ زیب تن کر رکھا تھا۔ وہ ایرینا میں داخل ہوا، اس وقت وہاں ایک عام مقابلہ جاری تھا۔ دو مقامی باکسر تماشائیوں کی توجہ حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے پر گھونے برسا رہے تھے مگر کوئی ان کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ جارج جانتا تھا اس قسم کے مقابلے اصل فائٹ سے پہلے تماشائیوں کا خون گرم کرنے کے لیے کیے جاتے ہیں اور ان کے نتیجے سے کسی پر کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ تماشائی بھی اس حقیقت سے واقف تھے اس لیے وہ اپنی دلچسپی کے لیے

کاشف زبیر

اصل کھیل

بھرا گلاس لے کر چلنے کا مطلب بہت احتیاط سے قدم بڑھانے کا اشارہ ہوتا ہے مگر... یہ سب عقلمندوں کی باتیں ہیں... ورنہ اکثر جام چھلک جاتا ہے اور دامن داغدار ہو جاتا ہے... کچھ ایسا ہی حال اس کا بھی تھا جس کے پاس اتنا علم تھا کہ دامن تنگ پڑنے لگا... بہر حال جنہیں پیاس تھی اس کے تعاقب میں سرگرداں رہے اور بالآخر اپنی تشنگی رفع کرنے کے تمام ہتھکنڈے آزما ڈالے اور یہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔

طاقتور لوگوں کے درمیان دریافت اور ایجادات کی

لرزدہ خیروداد



ساتھ وقت گزاری کرتے ہوئے جاسٹ ڈیمن کی فائٹ کا اظہار کر رہے تھے۔ چوبیس سالہ جاسٹ ڈیمن دو سال پہلے منظر عام پر آیا پہلے اس نے اٹلانٹائی کی باسنگ چیمپئن شپ جیتی اور پھر جارجیا ریاست کے ہیوی ویٹ چیمپئن ہونے کا اعزاز حاصل کیا۔ ایک سال پہلے اس نے امریکا ہیوی ویٹ چیمپئن کا ٹائٹل جیتا اور بالآخر وہ چار دوسرے باکسروں کو ناک آؤٹ کرتا ہوا موجودہ چیمپئن گیری گرزی کے مد مقابل آگیا تھا۔ رات کے ساڑھے نو بج رہے تھے اور اب سے ٹھیک آدھے گھنٹے بعد دونوں باکسر رنگ میں مد مقابل ہوتے۔

جاسٹ جارج کا پندرہ ترین باکسر تھا اور وہ آج خاص طور سے اس کی فائٹ دیکھنے آیا تھا۔ جارج اسے اس وقت سے جانتا تھا جب وہ پندرہ سولہ سال کی عمر میں سولو اسٹریٹ سیاہ فام ٹیکسٹر کے ساتھ چھوٹی موٹی وارداتیں کرتا تھا اور جارج نے اسے ایسی ہی ایک واردات کے دوران پکڑا بھی تھا۔ اس وقت اسے اس لڑکے سے ہمدردی ہوگئی تھی، قانونی کارروائی کرتے ہوئے اس نے جاسٹ کو عدالت میں تو پیش کیا لیکن جب وہ وہیں پہنچا تو جارج نے اسے خود جیل سے لے کر بلی شپ کے جتنا زیم میں جمع کر دیا تھا۔ بلی شپ سابق باکسر، سابق عادی شرابی عادی اور سابق مجرم تھا، اب وہ اپنے جیسے بھگے ہوئے لوگوں کی مدد کر رہا تھا۔ اس نے جاسٹ کی ذمہ داری لے لی۔ چند دن بعد جارج بھول گیا تھا۔ پھر وہ پیٹرولنگ پولیس سے ہوی سائڈ میں آگیا۔ دو سال پہلے بلی شپ نے اسے فائٹ کا دعوت نامہ بھیجا۔ وہ خاص مہمانوں میں شامل تھا اور جب اسے پتا چلا کہ جاسٹ ڈیمن کیا بن گیا ہے۔ اس نے اپنے پہلے پیشہ ور مقابلے میں مد مقابل کو صرف تین رازڈنیں وصول چٹا دی اور بہ آسانی مقابلہ جیت لیا اسی وقت وہ جارج کا فیورٹ ہو گیا اور اسے یقین ہو گیا کہ اگر وہ پٹری سے نہیں اترتا تو اسے عالمی ہیوی ویٹ چیمپئن بننے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔

آج وہ وقت آگیا تھا۔ جارج نے سامنے کا ٹکٹ لیا تھا۔ یہ اگرچہ اسے خاصا مہنگا پڑا تھا مگر اس نے پروا نہیں کی۔ وہ چاہتا تو اعزازی پاس بھی لے سکتا تھا مگر اعزازی پاس لینا اسے اپنے شوق کی ٹوہین لگس اس لیے اس نے ڈھائی ہزار ڈالرز کا ٹکٹ لیا۔ اس کی تنخواہ اچھی خاصی تھی اور اخراجات بہت کم تھے۔ ایرینا خاصا بڑا تھا، اس میں کم و بیش چالیس ہزار افراد کی محاش بھی لیکن یہاں اس سے کچھ زیادہ ہی افراد موجود تھے۔ سٹی ایرینا اور کیسینو مشہور صنعت کار

اور ارب پتی جان والٹر کی ملکیت تھا۔ وہ ایرینا کے ساتھ ایک بہت بڑی اسکاٹی اسکرپٹر کی تعمیر بھی شروع کر چکا تھا جو ٹینیل کے بعد اٹلانٹائی کی سب سے بلند عمارت کا اعزاز حاصل کر لیتی۔ یہ بہت بڑا منصوبہ تھا جس میں کی ہوٹل اور دفاتر کے ساتھ رہائشی پینس بھی شامل تھے۔ جان والٹر صرف اس ایرینا اور کیسینو کا ہی نہیں بلکہ ایک بہت بڑی ہتھیار ساز کمپنی کا مالک بھی تھا۔ اس کی کمپنی کو بہت سارے دفاعی ٹھیکے ملے ہوئے تھے اور آئندہ بھی ملنے والے تھے۔ جان والٹر کا شمار ان لوگوں میں کیا جاتا تھا جنہوں نے ملک کے دفاع کو مضبوط بنانے میں اپنا کردار ادا کیا تھا۔

جارج عام راستے سے اندر آیا تھا لیکن جب وہ وہی آئی بی افراد کے لیے مخصوص راستے سے گزر رہا تھا تو اس نے بیکری ڈیفنس جم کرشن کو اپنے حائلوں کے ساتھ اندر آتے دیکھا۔ صحافی اور میڈیا مین اسے دیکھتے ہی لپکے تھے۔ وہ جانے کے لیے بے تاب تھے کہ جان والٹر کی کمپنی کا بنایا ہوا بیل میزائل امریکی دفاعی سسٹم کا حصہ بننے والا تھا۔ جان کے جم سے ذاتی تعلقات تھے وہ کالج کے زمانے میں دوست رہے تھے اور یہ تاثر عام تھا کہ جم کے ہوتے ہوئے بیل میزائل مسٹر دہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ دفاعی ماہرین کے مطابق بیل یا ٹیچر نیسل کا جدید ترین میزائل شکن میزائل تھا جو کسی بھی قسم کے حملہ آور میزائل کو روکنے اور نشانے پر پہنچنے سے پہلے تباہ کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا مگر ساتھ ہی اسے بہت مہنگا میزائل بھی قرار دیا جاتا تھا۔ اگر فوج اس کی منظوری دے دیتی تو یہ میزائل پروگرام کا چالیس فیصد بجٹ کھا جاتا اور اسی وجہ سے کئی حلقوں سے اس کی مخالفت کی جا رہی تھی۔

جارج جان والٹر کے ساتھ جم کرشن کو بھی پسند کرتا تھا اس کے خیال میں وہ اصول پسند شخص تھا جو وہی کرتا اس کے نزدیک جو جی ہوتا تھا۔ وہ کڑی شہ سات سال سے اس عہدے پر کام کر رہا تھا۔ جارج اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ آگے آیا اور جارج کو دیکھ کر چونکا۔ جارج نے مسکرا کر اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ”تم کو دوبارہ دیکھ کر خوشی ہوئی مسٹر بیکری۔“ ”جارج بیکل۔“ جم نے گرم جوشی سے اس سے ہاتھ ملا لیا تھا۔ ”میں تمہیں بھولا نہیں ہوں۔“ ”حالانکہ اب بات کو چار سال گزر چکے ہیں۔“ جارج نے کہا۔ ”بہر حال تمہیں دیکھ کر خوشی ہوئی ہے۔“ ”مسٹر بیکل اس وقت تم نے جو کیا تھا وہ بھولنے والی چیز نہیں ہے۔“

چار سال پہلے جم کرشن کی اکلوتی بیٹی ٹینا کرشن کار حادثے میں دریا میں جا کر بھی اور جارج بیکل نے جان پر کھیل کر اسے دریا میں گری کار سے نکالا تھا۔ اگر اسے دریا سے نکالنے میں چند لمحوں کی اور تاخیر ہوتی تو اس کا بچنا ممکن نہیں تھا۔ جم مسکرا کر آگے بڑھ گیا۔ اسی لمحے کی نے جارج کے شانے پر ہاتھ رکھا اور جب اس نے مڑ کر دیکھا تو اس کے چہرے پر بے یقینی کا تاثر در آیا۔ ”لن... تم یہ وہ دن ٹیل... میرے خدا آج مجھے کتنے پرانے پرانے لوگ مل رہے ہیں۔“

پولیس آفسر کی وردی میں لمبوس لن ٹیل مسکرا رہا تھا۔ وہ جارج کا اکیڈمی کے زمانے کا ساتھی اور بہترین دوست تھا۔ دو سال پہلے وہ واشنگٹن چلا گیا تھا۔ تب سے جارج اسے آج دیکھ رہا تھا۔ اس کے سینے پر لگے بچ پر واشنگٹن پولیس کے الفاظ درج تھے۔ جارج نے غور کیا۔ ”میں تو سمجھا کہ تم واپس آگئے ہو؟“

”صرف اس ڈیوٹی کے لیے آیا ہوں۔“ اس نے جم کرشن کی طرف دیکھا۔ ”اس کی جرنل کیسورٹی میرے سپرد ہے۔ یوں سمجھ لو میں اس وقت یہاں کا کیسورٹی انچارج ہوں۔“ ”دوست تم سے اتنے عرصے بعد مل کر خوشی ہوئی ہے۔“ فون اور نیٹ پر دونوں کا بھی کئی آپس میں رابطہ رہتا تھا مگر اتفاق سے لن کا دوبارہ اٹلانٹا آنا نہیں ہوا اور یہی جارج کا واشنگٹن جانا ہوا۔ لن نے سر ہلایا۔ ”جونی کیسی ہے اور مالکو کیسی؟“

”ٹھیک ہے۔“ جارج نے سرسری سے انداز میں کہا۔ ”میری اور اس کی طلاق ہوگئی ہے۔ مالکو اسی کے ساتھ ہوتا ہے۔“

لن کو چونکا لگا۔ اس نے بے یقینی سے جارج کو دیکھا۔ ”طلاق مگر کیوں؟“

جارج نے شانے اچکائے۔ ”اسے ایک دولت مند مل گیا اور جو اسے وہ سب دے سکتا تھا جس کی اسے خواہش تھی۔“

اس لیے اس نے مجھ سے کہا کہ ہم الگ ہو جاتے ہیں۔“ ”اور تم مان گئے؟“ لن کو اب تک یقین نہیں آ رہا تھا۔ ”کالج کے زمانے میں تم اس کے لیے پاگل تھے۔“

”کالج میں انسان بہت سی چیزوں کے لیے پاگل ہوتا ہے۔ بہر حال میں ناخوش نہیں ہوں۔ اب میں تمہاری کو انجوائے کر رہا ہوں۔ جاب کرتا ہوں اور کچھ اسپورٹس سے دلچسپی ہے۔ میرا وقت اچھا گزر جاتا ہے۔“

لن کچھ دیر اسے دیکھا رہا پھر اس نے جارج کے

شانے پر ہاتھ مارا۔ ”ٹھیک ہے تم انجوائے کرو میں ڈراپنا کام دیکھ لوں۔“

وی آئی بی راستے سے آگے جاتے ہوئے جارج نے دیکھا۔ جان والٹر بھی آگیا تھا اور وہ لن کے ساتھ جم کرشن کی طرف جا رہا تھا۔ جارج جانتا تھا کہ لن ٹیل بہت اچھا پولیس آفسر ہے۔ اسی وجہ سے اس کی تبدیلی فیڈرل میں ہوئی تھی اور وی آئی بی کیسورٹی سے ظاہر تھا کہ اسے فیڈرل والوں کا مکمل اعتماد حاصل تھا۔ جارج ایرینا کے ریزرو حصے میں آیا۔ یہاں ڈریسنگ روم اور میننگ روم تھے یہیں کلینک تھا اور کیسورٹی کنٹرول سینٹر بھی یہیں تھا۔ اس سے متصل کیسینو تھا جس میں کئی منزلہ ہوٹل بھی تھا۔ جہاں ایرینا اور کیسینو میں آنے والے بیرون شہر کے لوگ ٹھہرتے تھے۔ ایرینا کا کیسورٹی انچارج پال اسے اسی فلور پر مل گیا۔ وہ جاسٹ کے ڈریسنگ روم کے باہر تھا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا اور جاسٹ نظر آیا۔ جارج اس کی طرف بڑھا تھا کہ باہر موجود ایک خومند سیاہ فام نے اسے روک لیا، اس کے گلے میں سونے کی کم سے کم ایک کلو گرام وزنی زنجیر پڑی تھی اور اس نے شوخ پیلے رنگ کا کوٹ پہن رکھا تھا وہ جاسٹ کا بڑی گاڑ تھا۔ اسی جیسے چند نمونے اور بھی باہر موجود تھے۔ اس نے غرا کر کہا۔

”اندر جانے کی اجازت نہیں ہے۔“

جارج پلٹ کر پال کی طرف آیا وہ سابق پولیس آفسر تھا اور جارج کو اچھی طرح جانتا تھا۔ ”یہ کیا ہے؟ مجھے اپنے بیٹے کے لیے جاسٹ کا آؤ کراف چاہیے میں اس سے وعدہ کر کے آیا ہوں۔“ جارج نے پوچھا۔

پال نے بے بسی سے شانے ہلائے۔ ”میں صرف اسی وقت با اختیار کیسورٹی انچارج ہوتا ہوں جب ایرینا میں کسی کو کیسورٹی کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔“

”آج کی کیا رپورٹ ہے؟“

”کوئی خاص نہیں سب معمول کے مطابق ہے۔“ پال نے کہا۔ اسے وائی ٹاکی پر کال آئی تو وہ معذرت کرتا ہوا سیڑھیوں سے نیچے چلا گیا، شاید ایرینا میں اس کی طبی ہوئی تھی۔ اسی لمحے ڈریسنگ روم کا دروازہ کھلا اور اسے روڈ کی صورت دکھائی دی۔ جارج اس کی طرف بڑھا تو وہ پلٹ کر بھاگا۔ اس بار پہلے کوٹ والا جارج کو نہیں روک سکا تھا۔ وہ اندر گھسا تو روڈی اسے کیسینو کی طرف جانے والی سیڑھیوں سے اترتا نظر آیا مگر اس کی بد قسمتی کہ تعمیراتی کام جاری ہونے سے یہ راستہ بند کر دیا گیا تھا اور وہ گھر گیا

تھا۔ روڈی دوسرے درجے کا بدعاش اور ایک نمبر کا لفظ تھا۔ موقع ملنے پر وہ اپنی ماں کو دھوکا دینے سے بھی نہ چوکتا۔ وہ ملا تھا، اس کی رگوں میں سیاہ قام اور اسپیش خون تھا۔ جارج نیچے آیا تو وہ گھٹکیا لگے۔

”پلیز میری بات سنو... دیکھو میں نے دھوکا نہیں کیا... مجھے خود بھی معلومات نہیں ملی تھیں، میں تمہیں کہاں سے بتاتا۔“

”ہاں تم بہت ایمان دار شخص ہو۔ تم نے معلومات حاصل کر لی ہیں لیکن مجھے دینے کے بجائے درست آدمی سے ان کا سودا کر لیا۔“ جارج نے نرم لہجے میں کہتے ہوئے اس کے کوٹ کا کارڈ درست کیا اور پوچھا۔ ”تم نے اس سے کیا لیا دوست؟“ کہتے ہوئے جارج نے اچانک ہی پوری قوت سے اس کے پیٹ میں مکا مارا۔ روڈی کے حلق سے اوک کی آواز نکلی اور وہ نیچے گر گیا۔ جارج نے اسے چند ٹھوکریں ماریں اور پھر جھک کر اس کی تلاش لی تو اس کے پاس سے نوٹوں کا ایک بٹل برآمد ہوا یہ تقریباً دو ہزار ڈالر کی رقم تھی۔ روڈی نے یہ مشکل کہا۔

”پلیز یہ سچ کو دینی ہے۔“

”کیوں نہیں... اسے یہ رقم میں پہنچا دوں گا۔“ جارج نے اسے ٹھوکر اور رسید کی تودہ کراہنے لگا تھا۔ روڈی پولیس کا خبر بھی تھا۔ اس نے ایک کیس کے سلسلے میں جارج کو دھوکا دیا اور اس کے بعد سے غائب تھا۔ جارج سیزھیاں چڑھ کر اوپر آیا اور جارج پر نکل آیا۔ سچ کیسینو میں پہرہ اڑ رہا تھا۔ اس کی کوئی خاص جاب نہیں تھی۔ اس کا کام کیسینو میں گھوم پھر کر یہ دیکھنا تھا کہ سب ٹھیک چل رہا ہے کوئی مسئلہ تو نہیں ہے۔ اتفاق سے وہ جارج کو ڈرینگ روم کے باہر مل گیا۔ وہ گول چہرے اور سامنے سے صاف سروالا ویل ڈریڈ شخص تھا۔ جارج نے اسے نوٹوں کا بٹل تمھایا تو وہ چونکا۔

”یہ کیا؟“

”روڈی نے کہا تھا تمہیں دیدوں۔“

سچ گہری سانس لے کر رہ گیا۔ اتنا تو جارج بھی سمجھتا تھا روڈی جیسے بدعاش کی طرف سے سچ کو یہ ادائیگی کسی شرفیافتہ معاملے میں نہیں ہوگی۔ لیکن یہ اس کا مسئلہ نہیں تھا۔ واپسی میں اسے جاس کے ذاتی سوٹ کا دروازہ بند ملا تھا۔ اب وہ اس سے فائنٹ کے بعد ہی آٹو گراف لے سکتا تھا یہ شرط کہ وہ آٹو گراف دینے کی پوزیشن میں ہوا تو۔ گیری کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ ایک بار اپنے حریف پر حاوی ہو جاتا تو جان بوجھ کر اسے ٹاک آؤٹ کرنے کے بجائے اس

کی حرمت لگاتا تھا۔ جاس کا لومڑی جیسی صورت ملا۔ نمبر کیلون بہت فکر مند نہ انداز میں کھل رہا تھا لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں تھی جاس کی ہر فائنٹ پر اس کی یہی حالت ہوتی تھی۔ جارج ایرینا میں آیا تو فائنٹ ختم ہو چکی تھی اور اب لوگ رنگ کی طرف زیادہ متوجہ تھے۔ جارج سے آگے ایک خوش بدن ماڈل کارڈ ڈھانچے جا رہی تھی۔ اس کا کام ہر راؤنڈ کے آغاز سے پہلے اس کے نمبر کا کارڈ اٹھا کر رنگ میں چاروں طرف دکھانا تھا۔ حالانکہ اس کی ضرورت نہیں تھی البتہ راؤنڈ کے وقفے میں تماشا کی پور نہیں ہوتے تھے انہیں دیکھنے کو کچھ اچھا مل جاتا تھا۔ مستقل نشستوں سے آگے خالی جگہ پر متعدد فولڈنگ چیئرز لگائی ہوئی تھیں اور سب سے مہنگا ٹکٹ لینے والے ان پر ہی براجمان تھے۔ جارج کو دلن کے ساتھ والی سیٹ خالی ملی اور وہ اسی پر بیٹھ گیا۔

جم کرشنن اور اس کا خنومند گاڑڈ پیچھے بیٹھے تھے۔ اچانک ایرینا میں شور بلند ہوا۔ گیری گزنی اپنے حامیوں کے جھرمٹ میں ہوا میں کھلے چلاتا اور لوگوں کے نعروں اور آوازوں کا جواب دیتا ہوا رنگ کی طرف آ رہا تھا۔ اس نے نیلا گاؤن پہن رکھا تھا جب کہ جاس کو سرخ گاؤن ملا تھا۔ جارج گیری کو پسند کرتا تھا لیکن اس کا بہرہ و جاس تھا اس لیے اس نے صرف تالیاں بجاہیں۔ جیسے ہی گیری رنگ میں داخل ہوا اوپر سے جاس اپنے ساتھیوں کے ہمراہ نمودار ہوا اور ایرینا میں اس سے منسوب گانا گونجنے لگا۔ اس بار شور واضح طور پر کہیں زیادہ تھا مگر گیری کے برعکس جاس بے تاثر انداز میں آ رہا تھا۔ اس کے بازو سائڈوں میں لٹک رہے تھے اور وہ سر جھکا کر تیز قدموں سے رنگ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ جارج کے قریب آیا تو وہ بھی اس کا استقبال کرنے والوں میں شامل ہو گیا۔ اس نے چلا کر کہا۔

”جاس آج تمہیں پیچھے بٹاتا ہے۔“

جاس اس کے سامنے سے گھومتا ہوا اپنے حصے کی طرف گیا اور وہاں سے رنگ میں داخل ہو گیا۔ اسی لمحے دلن اپنی کرسی سے اٹھا اور ایک طرف بڑھا۔ جارج نے چند لمحے کے لیے اتنا دیکھا کہ وہ سرخ بالوں والی ایک عورت سے بات کر رہا تھا اور عورت اچانک اٹھ کر اوپر کی طرف روانہ ہوئی تھی۔ دلن اسے روکتا ہوا اس کے پیچھے گیا تھا۔ پھر جارج کی توجہ دلن کی خالی کرسی پر آ کر بیٹھ جانے والی ایک خوب صورت لڑکی کی طرف ہوئی۔ اس کے سنہری بال شائون تک آ رہے تھے۔ اس کی دور کی نظر یقیناً کمزور تھی کیونکہ اس کی نازک آنی فریم میں گلے شیشے دور کی نظر کے

لیے تھے۔ اس نے مسکرا کر جارج کی طرف دیکھا اور یوں۔

”سواری میں کھڑے کھڑے تھک گئی تھی۔“

”کوئی بات نہیں۔“ جارج نے کہا اور رنگ کی طرف متوجہ ہوا جہاں مقابلہ شروع ہو گیا تھا۔ گیری نے آغاز میں ہی جاس پر تاثر توڑ کے برساتے تھے۔ ریلری نے جاس کو الگ کر دیا اور مقابلہ روکنے کے لیے کھڑا ہوا تھا۔ جارج بے اختیار کھڑا ہوا اور چلانے لگا وہ جاس کی حوصلہ افزائی کر رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ سنہری بالوں والی لڑکی اچانک مڑ کر جم کرشنن سے کچھ کہہ رہی تھی پھر اس نے ایک لفافہ جم کی طرف بڑھایا اور جم نے لے کر اپنے کوٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ جاس دوبارہ گیری کی طرف بڑھا تھا اور دونوں ایک دوسرے پر کئے چلانے لگے اسی لمحے کوئی چیز زن سے جارج کے پاس سے گزری اور کسی مائع کے پھینٹنے اڑ کر جارج کے چہرے تک آئے تھے۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ جم کرشنن نیم کھڑی پوزیشن میں پیچھے گر رہا تھا اور اس کی گردن سے خون کا فوارہ ابل رہا تھا۔

سنہری بالوں والی لڑکی کی سفید شرٹ پر بہت زیادہ خون آیا تھا۔ اسی لمحے دوسری زن کی آواز آئی اور لڑکی چیخ مار کر نیچے گری گئی۔ جارج اپنی جبلت کے زیر اثر خود کار انداز میں گرا۔ اس نے اپنا پتول نکال لیا تھا۔ ایرینا میں شور بے پناہ تھا، اس لیے کسی نے فائر کی آواز نہیں سنی۔ جھکی پوزیشن میں جارج کی توجہ رنگ کی طرف گئی اور اس نے جاس کو گرے ہوئے پایا۔ اس کی آنکھوں میں دھندلاہٹ تھی اور پھر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ گیری دونوں ہاتھ بلند کیے فاتحانہ انداز میں چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ اس وقت جم کرشنن کے آس پاس افراتفری پھیلنا شروع ہو گئی تھی لوگوں نے محسوس کر لیا تھا کہ کوئی گڑبڑ ہوئی ہے۔ جارج اٹھا تو اس نے سنہری بالوں والی لڑکی کو غائب پایا۔ اس نے پلٹ کر جم کرشنن کی طرف دیکھا۔ اس کا گاڑڈ اور کچھ دوسرے لوگ اسے ابتدائی طبی امداد دے رہے تھے۔ گولی نے اس کا حلق چھید دیا تھا۔ یہ دیکھ کر لوگوں نے دہشت زدہ ہو کر بھاگنا شروع کر دیا تھا۔ جارج چاروں طرف دلن کو تلاش کر رہا تھا۔ وہ لوگوں کو دھکیلتا ہوا نیچے آ رہا تھا۔ جارج نے محسوس کیا وہ جس طرف سے آ رہا تھا وہاں کچھ ہوا تھا کیونکہ وہاں الگ سے جھکڑ بچی ہوئی تھی اور لوگ بھاگ رہے تھے۔ جارج دلن کی طرف بڑھا وہ شاگ کی کیفیت میں تھا۔

”دروازے بند کر دو۔“ جارج نے اس کا بازو پکڑ کر کہا۔

”یہ ساری میری غلطی ہے۔“ وہ بولا۔

”ہوش میں آؤ دروازے بند کر دو ورنہ سارے گواہ اور ممکنہ طور پر قاتل بھی نکل جائے گا۔“

”قاتل کو میں نے شوٹ کر دیا ہے۔“ دلن نے کہا اور اپنے واک ٹاک پر ایرینا کے دروازے بند کرنے کا حکم دینے لگا۔ جارج کو سنہری بالوں والی لڑکی کا خیال آیا مگر وہ اب وہاں نہیں تھی۔ جارج نے آس پاس دیکھتے ہوئے دلن کو اس کے بارے میں بتایا اور اس نے اپنے آدمیوں کو اس کے بارے میں بھی خبردار کر دیا۔ اس دوران میں ایرینا سے توڑے فیصد افراد جا چکے تھے اور باقی جا رہے تھے وہ یقیناً بال ٹکٹنے والے ہال میں جمع ہو رہے تھے جہاں درجنوں دروازے تھے۔ دلن نے واضح حکم دیا تھا کہ کسی بھی فرد کو چیک کیے بغیر باہر جانے کی اجازت نہ دی جائے۔ جم کرشنن کے لیے ایرینا کا طبی عملہ اوڑٹا کمر آگیا تھا۔ وہ اس کی جان بچانے کی کوشش کر رہے تھے۔ جارج نے رومال سے خون صاف کرتے ہوئے کہا۔

”مشکل ہے گولی نے عین حلق میں سوراخ کیا ہے۔“

”یہ سارا میرا قصور ہے۔“ دلن نے سر تھام لیا تھا۔

جارج اسے پیچ کر ایک طرف لے گیا اور سرکشی میں بولا۔ ”حقانہ باتیں مت کرو... تم نے کچھ نہیں کیا ہے... ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں اور ذمے داروں کا تعین کرنا اور پولوں کا کام ہے تم کس لیے ذمے داری لے کر ان کا کام آسان کر رہے ہو۔ تم کوئی حقانہ بیان نہیں دو گے۔“

”میں نے قاتل کو شوٹ کر دیا تھا۔“ دلن نے ڈوبتے لہجے میں کہا۔ ”حالانکہ اسے زندہ گرفتار کرنا چاہیے تھا۔“

”یہ تمہاری ڈیوٹی کا حصہ تھا تم اسے گولیاں چلانے کے لیے آؤ انہیں چھوڑ سکتے تھے۔“

اسی لمحے دو اور کوٹ والے حضرات پیچھے اور انہوں نے پولیس اور انتظامیہ سے بات شروع کر دی۔ ایک پولیس والے نے دلن کی طرف اشارہ کیا اور وہ اوپر آئے۔ انہوں نے اپنے کارڈ دکھائے۔ ایک بولا۔ ”میں فیڈرل ایجنٹ کرس ولیم ہوں اور یہ میرا سٹی جان سین ہے۔“

”تم لوگ کوئی بھی ہو۔“ جارج نے خراب لہجے میں کہا۔ ”یہاں کیا کر رہے ہو؟“

”ہم اس کیس کی تفتیش کرنے آئے ہیں۔“

”تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے تفتیش کے لیے پولیس یہاں موجود ہے اور فی الحال کسی فیڈرل ایجنٹ کی ضرورت نہیں ہے۔“

کرس نے ولسن کی طرف دیکھا۔ ”یہ واضح نہیں ہے
آیا ہے اور صرف کسی کی سیڑھی کی انچارج ہے۔“
”میں ولسن کی نہیں اپنی بات کر رہا ہوں۔“ جارج نے
اسے اپنا ہنچ دکھایا۔ ”میرا تعلق ہوئی سائنس ہے اور یہ میرا
کیس ہے۔ اس لیے تم جتنی جلد ہو سکے یہاں سے نکل جاؤ۔“
دونوں فیڈرل ایجنٹس نے بجز سامنے بنایا اور وہاں
سے روانہ ہو گئے۔ ولسن ابھی تک مضطرب تھا۔ اس نے
دوبارہ اپنے آدمیوں سے رابطہ کر کے رپورٹ لی۔ کوئی فرد
ایرینا سے نکلے میں کامیاب نہیں ہوا تھا پولیس نے سارے
راستے بند کر دیے تھے۔ ایرینا کے باہر بھی پولیس آچکی تھی
اور اسے چاروں طرف سے گھیرا جا رہا تھا۔ جارج پلٹ کر آیا
اور اس نے جم کر مشن کا معائنہ کیا جیسی عملے نے اسے اسٹریچر
پر رکھ دیا تھا اور اب اسے اسپتال لے جانے کے لیے ایرینا
کی چھت پر لے جایا جا رہا تھا جہاں پہلی کا پڑا کیا تھا۔ اس
کے جانے کے بعد ولسن نے جارج سے کہا۔ ”تم نے غلط
بیانی سے کیوں کام لیا؟“

”کی ایمل یہ پولیس کیس ہی ہے۔ ان فیڈرل والوں
کو ہر معاملے میں ٹانگ اڑانے کا شوق ہے۔“ جارج نے
کہا۔ ”تم کہاں چلے گئے تھے؟“

”پولیس طرف ایک سرخ بالوں والی لڑکی مجھے
مٹھو لگی تھی میں نے اس کے پاس جا کر کٹ مائٹا تو وہ
پرس ٹوٹنے لگی اور اچانک تماشائی ٹھہرے ہوئے تو وہ موقع
سے فائدہ اٹھا کر اوپر بھاگی۔ میں اس کے پیچھے تھا۔ میں
نے اسے اوپر جالیا۔“ ولسن نے ایک کنٹری بوتھ کی طرف
اشارہ کیا وہاں ایک خلا سے آنکھ نما غبارہ نظر آ رہا تھا۔ وہ
ایرینا کے باہر چلی جگہ تھا اور طوفانی ہوا کی وجہ سے مسلسل
ڈول رہا تھا۔ اس طرف گیلری کے ساتھ جگہ جگہ شیشے کے
مٹھش ڈیزائن والے بوتھ تھے۔ لڑکی نے تسلیم کیا کہ اس
کے پاس ایرینا کے اس حصے کا ٹکٹ نہیں تھا اور ابھی میں اس
سے بات کر رہا تھا کہ قریبی بوتھ سے شیشے ٹوٹنے کی آواز آئی
اور پھر دو فائر ہوئے میں نے خود کار انداز میں اپنا پستول
نکالا اور بوتھ پر کم سے کم فائر کیے فوراً ہی ایک رائفل
بردوار شخص کی لاش باہر گرئی تھی۔ وہ اپنی صورت سے مشرقی
یورپ کا باشندہ لگ رہا تھا۔

”ایک لڑکی اور...“ جارج نے خود سے کہا۔ ولسن
نے اسے دیکھا۔
”تمہیں یقین ہے سہرے بالوں والی لڑکی جم کر مشن
سے بات کر رہی تھی؟“

”ہاں مجھے یقین ہے وہ صرف جم کے لیے یہاں آئی
تھی اور اسے کوئی نئے ہی وہ غائب ہوئی۔ دوسری کوئی شاید
اسے لگی تھی۔ دوسرے جم کر مشن کا خون اس پر بھی آیا ہوگا جب
میرے چہرے تک خون آیا تھا تو وہ بالکل سامنے تھی۔“
”میرے آدمی اسے تلاش کر رہے ہیں۔“ ولسن نے
کہا تھا۔

☆☆☆

اسی وقت داخلی گیلری میں ایک سرخی مائل سیاہ بالوں
والی لڑکی نے ڈسٹ بن کے پاس سے گزرتے ہوئے
سنہری بالوں کی وگ اس میں ڈال دی مگر اس کی سفید لینن کی
شرٹ پر خون کی سرخی نمایاں تھی۔ وہاں باہر جانے والوں کا
بے پناہ جھوم تھا ہر دروازے پر پولیس والے ان لوگوں سے
بحث کر رہے تھے۔ لڑکی چاروں طرف دیکھ رہی تھی
اور اسے سب دھندلا نظر آ رہا تھا کیونکہ ایرینا میں گرتے
ہوئے اس کی ٹیک گرتی تھی اور پھر اس کے ہاتھ نہیں آئی
اچانک اس کی نظر ایک طرف میز پر رکھی سیاہ لیڈر جیکٹ
پر گئی اس نے اس پاس دیکھا اور کسی کو متوجہ نہ پا کر اس نے
جیکٹ اٹھائی اور جلدی سے لیڈر ٹائلٹ کی طرف بڑھ
گئی۔ اندر آ کر اس نے دروازہ بند کیا اور اپنی شرٹ اتار کر
سب سے پہلے اسے دھویا خون حمل کیا مگر اس کی سرخی نہیں
گئی تھی۔ پھر اس نے اپنے بازو کا زخم دیکھا۔ گولی بس چھو کر
گئی تھی ایک لمبا سارخ بن گیا تھا جس پر خون بہہ رہا تھا۔ اس
نے پرس سے رد مال نکال کر اسے زخم پر باندھ لیا پھر نشو سے
چہرے اور گردن پر آنے والا خون صاف کیا۔ آخر میں اس
نے اپنا منہ دھویا تھا۔

وہ سسکیاں لے رہی تھی اور بہت ڈری ہوئی تھی۔ جسم
صاف کر کے اس نے پیٹ ڈرائر سے شرٹ خشک کی اور
اسے پہن کر اوپر سے سیاہ جیکٹ پہن لی۔ پھر اس نے بال
پونی ٹیل کی صورت میں باندھ لیے۔ اب اسے دیکھ کر کہنا
مشکل تھا کہ وہ کچھ دیر پہلے جم کر مشن کے پاس تھی۔ لیکن
ایک بات یقینی تھی وہ چھپ نہیں سکتی تھی۔ متحور کسروں نے
اسے جم کر مشن کے ساتھ رکھا رکھا ہوا جلد اس کے
نقوش سے اسے پہچان لیا جاتا۔ اس کی بچت اسی میں تھی کہ
کسی طرح پولیس کے ہاتھ آنے سے پہلے یہاں سے نکل
جائے۔ یہاں سے نکلے گا ایک ہی طریقہ تھا کہ وہ کسی طرح
ایرینا کے دوسری طرف پہنچ جائے جہاں یسینو میں جانے کا
راستہ تھا اور اس کے لیے ایرینا سے گزرتا لازمی تھا۔ وہ
ہمت کر کے وہاں ایرینا میں آئی جہاں اب سوائے پولیس

والوں، پیرامیڈک اور لیب کے عملے کے کوئی نہیں تھا۔ وہ
سیڑھیاں اتر کر نیچے آئی اور رنگ کے ایک طرف سے ہوتی
ہوئی یسینو کی طرف جانے والی سیڑھیوں کی طرف بڑھی
تھی۔ ایک پولیس والے نے اسے دیکھا اور آواز دی۔
”اے مس رکھو۔“

اس نے رفتار تیزی کی سیڑھیاں چڑھ کر یسینو جانے
والی راہداری میں آگئی۔ جتنی دیر پیش پولیس والا اس کے
پیچھے آتا وہ یسینو میں داخل ہو چکی تھی۔ وہاں عوام کا بے
تجاشا جھوم تھا۔ پولیس والا اب واک ٹی پر ولسن کو بتا رہا
تھا۔ لڑکی یسینو میں داخل ہوئی اور سلاٹ مشینوں والی لائن
میں آگئی۔ اسے پناہ کی ضرورت تھی۔ اسے لگا کہ اس نے
غلطی کی ہے اور اب پولیس صرف اسی کے لیے یہاں آئے
گی۔ وہ ہراساں انداز میں چاروں طرف دیکھ رہی تھی کہ
اچانک کسی نے اس کے پاس آ کر کہا۔ ”میں تمہاری کیا
مدد کر سکتا ہوں؟“

وہ بیچ تھا۔ لڑکی نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ”پلیز میری
طبیعت ٹھیک نہیں ہے کیا یہاں کوئی ایسی جگہ ہے جہاں میں
کچھ دیر آرام کر سکوں۔“ اس نے کہتے ہوئے جیکٹ کی
زپ نیچے کی بشرٹ کے اوپر کی بٹن پہلے ہی کھلے ہوئے
تھے۔ بیچ نے غور سے دیکھا اور مسکرانے لگا۔ ”کیوں نہیں
یہاں میرے پاس ایک کمرہ ہے تم وہاں آرام کر سکتی ہو۔“

☆☆☆

ولسن ٹیلر اس وقت ایرینا کے تہ خانے میں تھا یہ
پارکنگ کے ساتھ تھا۔ وہاں ایک مرد اور ایک عورت موجود
تھے۔ وہ سیڑھیوں سے نیچے آیا تو وہ چونک گئے۔ مرد نے
اضطراب سے کہا۔ ”کیا ہوا ہم یہاں جھنسن گئے ہیں۔“
”ایک پولیس والے نے مسئلہ کر دیا۔“ ولسن نے
کہا۔ ”اس نے قتل از وقت دروازے بند کرادیے۔“

”تب کیا ہوگا؟“ لڑکی بولی اس کے اصل بال سرخی رنگ
کے تھے اور اس نے کچھ دیر پہلے بالوں کی وگ لٹا رکھی تھی۔
”فکرم نہ کرو ایک راستہ ہے تم دونوں کو یہاں سے
نکلانے کا۔“ ولسن نے کہا۔ ”اس طرف چلو۔“

مرد اور لڑکی اس طرف جانے لگے۔ ولسن ان سے
ذرا پیچھے تھا اس لیے وہ اسے سائنلر لگا ہوا پستول نکالتے
دیکھ نہیں سکے تھے۔ اس نے پہلا فائر لڑکی پر کیا اور وہ ہلکی سی
چٹ کے ساتھ نیچے گر گئی۔ مرد نے چونک کر اس کی طرف دیکھا
تھا کہ دوسری گولی نے اسے بھی گرا دیا۔ دونوں گولیاں
نشانے پر لگی تھیں اور ایک منٹ سے بھی پہلے وہ دونوں مر

چکے تھے۔ اپنا اطمینان کر کے ولسن اوپر جا رہا تھا کہ اسے
واکی ٹاکی پر رپورٹ ملی کہ مٹھو لڑکی ایرینا سے یسینو میں
داخل ہو چکی تھی۔ ولسن درمیان سے ہی یسینو کی طرف مڑ گیا
تھا۔ اسے ہر قیمت پر اس لڑکی کو اپنے قبضے میں لے کر دنیا
سے رخصت کرنا تھا۔

☆☆☆

جارج ایرینا کے کنٹرول روم میں تھا یہاں بیک وقت
ایرینا اور یسینو پر نظر رکھنے والے کسروں کو مانیٹر کیا جاتا
تھا۔ پال اسے ایک کمرے کی ویڈیو دکھا رہا تھا جس میں جم
کر مشن کو کوئی لگی تھی اور سنہری بالوں والی لڑکی وہاں موجود
تھی۔ جارج نے اس کے نقوش دیکھے اور بولا۔ ”اس نے
وگ لگائی ہے دیکھو اس کے رخسار پر جو چند بال نظر آ رہے
ہیں وہ گہرے رنگ کے ہیں۔“

پال کا واک ٹاکی پولیس کے واک ٹاکی سے ملا ہوا تھا
اس لیے ایک سیاہ کوٹ والی لڑکی کے ایرینا سے یسینو میں
گھسنے کی خبر اسے بھی مل گئی۔ جارج نے یسینو کے کمرے
دیکھنے کو کہا۔ پال مختلف کسروں کی ویڈیو دکھانے لگا جلد ایک
کمرے نے سیاہ کوٹ والی لڑکی کو یسینو انٹینٹ کے
ساتھ دکھایا۔ پال نے اسے زوم کیا انٹینٹ کی پشت تھی
لیکن لڑکی کی صورت صاف دکھائی دے رہی تھی۔ جارج
نے سر ہلایا۔ ”یہی لڑکی ہے۔ مجھے ایک واک ٹاکی دواور
مجھے گاؤ کر رہو۔“

پال نے اسے ایک واک ٹاکی دیا اور جارج کنٹرول
روم سے نکل آیا۔ یسینو کے اندر آئے ہی اس نے سلاٹ
مشینوں کا رخ کیا جہاں لڑکی انٹینٹ کے ساتھ تھی۔ پال
نے اسے واک ٹاکی پر بتایا۔ ”لڑکی انٹینٹ کے ساتھ لفٹس
کی طرف جا رہی ہے۔“

جارج تیزی سے لپکا تھا لیکن جب تک وہ لفٹوں
والی لائی تک پہنچا سیاہ جیکٹ والی لڑکی بیچ کے ساتھ لفٹ
میں جا چکی تھی اور اس کا دروازہ بند ہو رہا تھا۔ جارج لڑکی
کی صرف ایک جھلک دیکھ سکا تھا۔ اس نے پال سے
کہا۔ ”وہ نکل گئی ہے۔“

”لفٹ میں ولسن ٹیلر بھی ہے۔“ پال نے انکشاف
کیا۔ ”میں نے اسے واک ٹاکی پر پیغام دیا ہے لیکن اس کی
طرف سے جواب نہیں آ رہا ہے۔“
”تم دیکھتے رہو وہ کس طور پر اتر رہے ہیں۔“ جارج
نے برابر والی لفٹ میں گھستے ہوئے کہا۔ وہی سترہ منزلہ
تھا۔ پال دیکھ رہا تھا اس نے بتایا۔

1987ء سے خدمت میں مصروف

LEUCODERMA-VITILIGO

تمام جلدی بیماریوں کا موثر اور بے ضرر علاج

پھل بہری

قابل علاج مرض ہے

STERIODS FREE MOST PROGRESSIVE TREATMENT

اصل زیدی کے دور میں پاکستان کے ممتاز ترین دوا ساز



اسلام آباد

مکان نمبر 62، سید محمد علی شاہ روڈ، لاہور
0300-8566188
2261636

9- اپریل 30 تا مئی
9- اگست 30 تا ستمبر
9- دسمبر 30 تا جنوری

ASIAN EXCELLENCE
PERFORMANCE AWARD



AWARD
PILLAR OF LEUCODERMA

لاہور

پشاور

گلف سینٹر

14- فروری تا 27 فروری

آفس نمبر 16

14- جون تا 27 جون

آفس نمبر 16

14- اکتوبر تا 27 اکتوبر

0300-8566188

پیشانی

کیم فروری 11 تا فروری

کیم جون 11 تا جون

کیم اکتوبر 11 تا اکتوبر

0300-8566188

ملتان

کراچی

پیشانی

28 مارچ تا 6 اپریل

آفس نمبر 16

28 جولائی تا 6 اگست

آفس نمبر 16

28 نومبر تا 7 دسمبر

0300-8566188

پیشانی

13 مارچ تا 27 مارچ

آفس نمبر 16

13 جولائی تا 27 جولائی

آفس نمبر 16

13 نومبر تا 27 نومبر

0300-8566188

E-mail: syedajmalzaidi@hotmail.com - syedajmalzaidi@yahoo.co.uk

”لوکی اور اٹینڈنٹ ساتویں فلور پر اتر گئے ہیں۔“

”پال کہاں ہے؟“

”وہ لفٹ میں ہے۔“

”اس فلور کے کمرے دیکھو۔“ جارج نے حکم دیا۔ ”پتا

لگاؤ کہ وہ کہاں جاتے ہیں۔“

جارج والی لفٹ ساتویں فلور پر کی تو پال دیکھ رہا تھا۔

اس نے جارج سے کہا۔ ”یہ فلور کیسے بناوا اور ایرینا کے ملازمین

کے لیے مخصوص ہے۔ وہ کمر انمبر سات سو بارہ یا تیرہ میں

گئے۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کیونکہ یہاں کیسرا رادھاری

کے کونے میں ہے۔“

”میں تلاش کر لوں گا، تمہاری مدد کا شکریہ۔“ جارج

نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

بیج کا کمرہ تھا اور وہ لوکی سے فری ہونے کی کوشش

کر رہا تھا مگر اب وہ اس سے گریزاں تھی جب کہ یہاں

آنے کے لیے اس نے خود کو تقریباً پیش کر دیا تھا۔ بیج نے

پوچھا۔ ”کیا بات ہے؟“

لوکی نے ہولکا کر کہا۔ ”وہ میں چاہتی ہوں کچھ دیر

کے لیے مجھے اکیلا چھوڑ دیا جائے۔“

بیج نے نفی میں سر ہلایا۔ ”یہ ناممکن ہے۔ یہ میرا کمرہ

ہے اور میں تمہیں یہاں اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔“

”شیک ہے۔“ لوکی نے کہا اور اپنا پرس اٹھا کر

دروازے کی طرف بڑھی۔ لیکن بیج نے اس کا رستہ روک لیا۔

”تم ایسے نہیں جانتیں... کیا میں پاگل ہوں جو اپنی

ڈیوٹی چھوڑ کر تمہارے ساتھ یہاں آیا ہوں۔“ اس نے لوکی

کا رخ بازو پکڑا تو وہ چلا اٹھی تھی۔

”چھوڑ دیجئے۔“

اسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی۔ بیج نے اس

کا بازو چھوڑ کر جیسے ہی لاک کھولا جارج اندر کھس آیا۔ بیج

نے کہا۔ ”ہے... یہ میرا کمرہ ہے۔“

”ضرور ہو گا۔“ جارج نے اسے گریبان سے پکڑا

اور باہر کی طرف دھکا دیا۔ ”مگر ابھی تم اپنے... سمیت

یہاں سے دفع ہو جاؤ۔“

بیج کو باہر دھکیلتے ہی جارج نے دروازہ بند کر کے اندر

سے لاک کر دیا۔ لوکی خوفزدہ ہوئی تھی۔ جارج نے اس کی

طرف دیکھا اور نرم لہجے میں بولا۔ ”تم جہ کرشن سے ملی تھیں

جب اسے شوٹ کیا گیا؟“

”ہاں؟“ لوکی نے اعتراف کیا۔

”تمہارا نام کیا ہے؟“ جارج بولا۔

”میرا نام این بورن ہے۔ میں کلکٹر دفاع میں

ڈیفنس اینالسٹ کے طور پر جاب کرتی ہوں۔“

”تو میں بورن نے... تم یہاں کیا کر رہی تھیں؟“

”میں بتا دوں گی لیکن پلیز یہاں سے چلو، تم پولیس

والے ہو نا؟“

”تم نے کیسے اندازہ لگا لیا؟“

”تمہاری زبان سے...“

☆☆☆

ولسن ٹیلا اگلے فلور پر لفٹ سے اتر ا تھا۔ وہ لفٹ میں

کچھ نہیں کر سکتا تھا کیونکہ یہاں کیسرا رادھاری تھا، ورنہ لوکی اس

کے ساتھ تھی۔ وہ سچ جیوں سے واپس نکلے فلور پر آیا۔ یہاں

بے شمار رادھاریاں تھیں۔ وہ یہاں گھومنے لگا اس کے کان

آوازوں پر تلے ہوئے تھے اور مختلف کمروں سے الگ

الگ آوازیں آرہی تھیں۔ رادھاریاں سنسن تھیں کہیں کہیں

کوئی ویٹریا مہمان آ جا رہا تھا مگر لوکی اور اس کے ساتھ آنے

والا اٹینڈنٹ غائب تھے۔ ولسن جانتا تھا یہ فلور ملازمین کے

لیے مخصوص تھا اس لیے وہ لازمی کسی کمرے میں موجود

تھے۔ وہ رادھاریوں میں کن کن لیتا ہوا چل رہا تھا۔ اچانک

ایک طرف سے بیج نمودار ہوا وہ غصے میں تھا۔ ولسن اسے دیکھ

کر تیزی سے آگے آیا اور اس نے پوچھا۔ ”کیا ہوا؟“

”وہ نام نہاد پولیس آفیسر میرے کمرے میں کھس آیا

ہے۔“ بیج نے ولسن کو دیکھ کر شکایتی انداز میں کہا۔

”لوکی کہاں ہے؟“

”وہ بھی وہیں ہے۔“ بیج نے کہا۔ ”یہ میرا کمرہ ہے

اسے کیا اختیار ہے کہ وہ مجھے وہاں سے نکال دے۔“

”تم نے کسی کو بتایا تو نہیں ہے؟“

”ابھی تو نہیں بتایا لیکن میں اسے...“

”میرے ساتھ آؤ۔“ ولسن اسے لے کر اس کے

کمرے تک آیا۔ کارڈ کی مدد سے دروازہ کھول کر بیج آگے

آیا، ولسن اس کے پیچھے تھا۔ اس نے سائنلٹر والا پستول

نکال لیا اور اندر آتے ہیں واش روم کا دروازہ... کھول کر

دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا جب کہ کمرے میں پہلے ہی کوئی

نہیں تھا۔ بیج کھڑا تھا۔

”وہ یہیں تھے۔“ کہتے ہوئے وہ گھوما اور اس کی نظر

سائنلٹر لگے پستول پر پڑی اور وہ رک گیا۔ ”یہ سائنلٹر ہے نا؟“

”ہاں۔“ کہتے ہوئے ولسن نے پستول کا رخ اس کی

طرف کر دیا۔

جارج اور این زیر تعمیر اسکاٹی اسکرپ کے آخری فلور کی سیڑھیوں پر بیٹھے تھے۔ این جارج کو بتا رہی تھی۔ ”مجھے ایک سال سے ہمارے پاس بیل میزائل کی ٹیسٹنگ کی رپورٹس چیک ہو رہی ہیں۔ مجھے شبہ تھا کہ اس میزائل کے بارے میں جو بتایا جا رہا ہے اس میں صداقت نہیں ہے۔ خاص طور سے اس کے آخری دو ٹیسٹ ناکام رہے لیکن جان والٹر کی کمپنی کی طرف سے دعویٰ کیا جا رہا ہے کہ یہ دونوں ٹیسٹ کامیاب رہے۔ میں نے اس ٹیسٹ کی ویڈیوز کا جب الٹرا وائٹ چیک کیا تو اس میں صاف پتا چل رہا ہے کہ میزائل نشانے کو ہٹانے سے پہلے تباہ ہو گیا تھا اور نشانہ خود بھی بلاست ہوا تھا۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟“

”سمجھ رہا ہوں۔“ جارج نے بد مزگی سے کہا۔ ”میں نہیں سمجھتا کہ جان والٹر بے ایمان شخص ہے۔“

”لیکن حالات ثابت کر رہے ہیں کہ اس کی کمپنی ایک بہت بڑے دفاعی معاہدے میں دھوکے سے کام لے رہی ہے۔ تم اس بارے میں کیا کہو گے۔ میں یہاں جم کر کسٹن کو اسی دھوکے کے ثبوت دینے آئی تھی اور اسے قتل کر دیا گیا۔“

جارج نے گہری سانس لی۔ ”تم میرا دماغ خراب کر رہی ہو۔“

”ایک بات اور ہے میں نے پولیس ویکوریٹی انچارج ولسن ٹیکر کو جان والٹر کے ساتھ دیکھا تھا۔“

”یہ کوئی اہم بات نہیں ہے جان والٹر اس جگہ کا مالک ہے اور ولسن ویکوریٹی انچارج ہے۔“

”میں نے ان دونوں کو اس جگہ دیکھا تھا جہاں سے قاتل نے چھپ کر جہ پر گولیاں چلائی تھیں۔ میں نے خود قاتل کو بوتھ کا شیشہ توڑ کر باہر کرتے دیکھا تھا۔“

”اسے ولسن نے شوٹ کر دیا تھا۔“ جارج نے کہا۔

”سنو میں کسی چکر میں نہیں پڑنا چاہتی مجھے یقین ہے قاتل اب میری تلاش میں ہوں گے جب انہیں یہ پتا تھا کہ میں جم کر کسٹن سے ملنے آ رہی ہوں تو انہوں نے اسے قتل کر دیا۔ انہوں نے امریکا کے ڈیفنس سیکریٹری کو قتل کر دیا اور اب وہ یقیناً مجھے بھی مارنا چاہتے ہوں گے پلیز کسی طریقے سے مجھے یہاں سے نکال دو۔“

”ایسا نہیں ہو سکتا تم معنی گواہ ہو۔“ جارج نے کہا۔

”میرے ساتھ آؤ میں تمہیں ایک جگہ محفوظ کر دیتا ہوں۔“

جارج این کو ایک زیر تعمیر کمرے تک لایا اور دروازہ

کھول کر اسے اندر کھینک دیا۔ ”اسے اندر سے بند کر لو میری آواز سننے بغیر مت کھولنا۔“

”میری بات سنو۔۔۔“ این نے کہنا چاہا لیکن جارج نے دروازہ بند کر کے اسے باہر سے بند کر دیا اور ایرینا کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

کچھ ہی دور جان والٹر کے دفتر میں جان کے ساتھ ولسن موجود تھا۔ جان والٹر غصے میں تھا، اس نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ”یہ تھا تمہارا فول پروف پلان۔۔۔ اس میں دو غیر متعلقہ افراد مر چکے ہیں اور تم مزید ایک لڑکی کے قتل کی بات کر رہے ہو جو کلین دفاع کی ملازم ہے۔“

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“ ولسن نے کہا۔ ”اصل کام ہو گیا ہے۔ ایرینا اور ٹیسٹو سے باہر جانے کے تمام راستے بند ہیں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ لڑکی کس کے ساتھ ہے بس یہ معلوم کرنا ہے کہ وہ کہاں ہے؟“

”لڑکی کس کے ساتھ ہے؟“

”ہوئی سائڈ پولیس آفیسر جارج نیل کے ساتھ۔۔۔ وہ میرا اکیڈمی کے زمانے کا دوست ہے۔“

جان والٹر نے سر ہاتھ لیا۔ ”ایک قتل اور وہ بھی پولیس آفیسر کا۔۔۔ تم مجھے کس دلدل میں پھنسا رہے ہو۔ تم جانتے ہو اگر بیل میزائل کا شیکا مجھے نہ ملتا تو یہ اسکاٹی اسکرپ کی تعمیر نہیں ہو سکتے گا اور اس میں جو تمہارے شیئرز ہیں وہ بھی کار آمد نہیں ہوں گے۔“

”ایسا نہیں ہو گا میں یہ سب اسی لیے تو کر رہا ہوں۔“

ولسن نے باہر جاتے ہوئے کہا۔ ”میں صرف تمہیں تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کرنے آیا تھا۔“

☆☆☆

پال نے سلوموشن میں چلا یا اور اس بار صاف دکھائی دیا۔ جس کے نے جانس کو ناک آؤٹ کیا تھا وہ اس کے منہ پر لگا ہی نہیں تھا بلکہ پاس سے گزر گیا تھا۔ پال نے بھی نوٹ کیا۔ ”یہ رکاوٹ اسے لگا ہی نہیں۔“

”اور یہ ناک آؤٹ ہو گیا۔“ جارج دم بہ خود تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ جانس اسکی حرکت کرے گا۔ یہ تو صاف بے ایمانی اور دھوکے بازی تھی وہ جان بوجھ کر ہارا تھا۔ پال نے رنگ کے سین اوپر لگے کیرے کی ویڈیو چلائی اور اس سے مزید صاف ہو گیا کہ گیری کا ہاتھ جانس کے چہرے سے کم سے کم دو انچ کے فاصلے سے گزرا تھا۔ وہ لڑکھڑا کر گرا اور بے ہوش ہو گیا۔ جب کہ وہ بھونچاڑنے والے کے پرچی بے ہوش نہیں ہوا تھا۔

☆☆☆

جارج تیز قدموں سے ڈریسنگ روم ایریا میں داخل ہوا۔ گیری کے ڈریسنگ روم سے ہاؤ ہوئی آوازیں آ رہی تھیں۔ نیم وادروازے سے جارج نے دیکھا کہ کم سے کم نصف درجن چھپناؤں نے گیری کو گھیر رکھا تھا اور اس کے ساتھی اپنے اور قرض کرنے میں مصروف تھے۔ یہ فاتح کا ڈریسنگ روم تھا۔ اس کے برعکس جانس کے ڈریسنگ روم میں قبرستان کا سا ساٹنا تھا۔ اس بار بھی پیلی کوٹ والے نے اسے زکوٹا چاہا تو جارج نے اسے کاٹ دار نظروں سے دیکھا اور اپنا بیج دکھاتے ہوئے بولا۔ ”ہاتھ ہٹا لو یہ پولیس کا معاملہ ہے۔“

پیلی کوٹ والا شرافت سے پیچھے ہو گیا۔ اندر جانس بار کے کاؤنٹر پر بیٹھا ہوا بی رہا تھا گویا غلط کر رہا تھا۔ نیچر کیون حسب معمول پریشان انداز میں ٹہل رہا تھا۔ چار پانچ ساتھی ادھر ادھر پڑے تھے۔ جانس نے اسے دیکھا اور گہری سانس لی۔ ”جارج تم کس لیے آئے ہو؟“

”میں تمہاری ہمت اور بہادری کی داد دینے آیا ہوں۔“ وہ اس کے برابر والے اسٹول پر آگیا۔ اس نے دوسرا گلاس کھینچا اور اس میں براؤنی انڈی۔ ”تم نے بہت خوبی سے گیری کا مقابلہ کیا۔۔۔ اس نے تمہاری بھونچاڑ دی لیکن تم نہیں گرے اور جانس تم اس وقت گر گئے جب اس کا گھونٹا تمہیں لگا ہی نہیں تھا۔۔۔ نہیں۔۔۔ نہیں میری طرف ایسے مت دیکھو مجھے نہیں ڈنٹا ہوا ہے۔۔۔ چلو میں نشتے میں ہوں لیکن یہ منظر ریکارڈ کرنے والے کی کیرے تو نشتے میں نہیں تھے۔“

کیون تیزی سے آگے آیا۔ ”جانس تم خاموش رہو

گے۔۔۔ اگر یہ معاملہ اٹھا تو ہم دیکھ لیں گے۔“

”مجھے اس سے کوئی غرض نہیں ہے کہ کون یہ معاملہ دیکھے گا اور جانس کے خلاف کیا ایکشن لیا جائے گا۔“ جارج نے کہا۔ ”بات اس سے کہیں زیادہ سنگین ہے۔۔۔ سیکریٹری دفاع پر قاتلانہ حملہ ہوا ہے۔“

”وہ مر گیا ہے؟“ جانس نے سوال کیا۔

”اگر وہ نہیں مرے تب بھی اس سے معاملے کی سنگینی میں کوئی کمی نہیں آئے گی۔“

”میرے سوال کا جواب دو کیا وہ مر گیا ہے؟“

جارج نے سر ہلایا۔ ”اسے تقریباً پانچ بجھو۔۔۔ قاتل نے بالکل درست جگہ گولی ماری تھی۔“

”جانس تم چپ رہو گے ہمارا وکیل بات کرے گا۔“ کیون نے پھر ناک آؤٹ کیا۔

”مجھے بات کرنے دو۔“ جانس نے دھاڑ کر کہا۔ ”تم سب یہاں سے دفع ہو جاؤ۔۔۔ سب کے سب اور فوراً۔“

کیون اور دوسرے جانتے تھے کہ جانس کس لہجے میں بات کر رہا ہے تو اس کی بات پر فوراً عمل کرنا چاہیے۔ سب ایک ایک کر کے کمرے سے نکل گئے۔ جارج نے جانس کی طرف دیکھا۔ ”اب تم کل جاؤ۔۔۔ یہ کیا چکر ہے؟“

”چکر میں نہیں جانتا۔“ جانس نے اپنا زخم چھوا۔ ”لیکن مجھے کہا گیا کہ میں پہلے رائڈ میں ناک آؤٹ ہو جاؤں۔“

”تم یہ بات ماننے پر کیوں آمادہ ہوئے؟“

جانس پچھلایا پھر اس نے کہا۔ ”مجھے دس ملین ڈالرز، اگلی چیلنج فائٹ اور اس میں ٹائٹل ملے گا۔“

”ایسے ہی جیسے تم ہمارے ہو؟“ جارج کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کھیل میں اتنے اونچے پیمانے پر دھاندلی ہوتی ہے۔

”بالکل۔۔۔ اور کیسے یقین دلایا جا سکتا ہے۔“

”یہ پیشکش کس نے کی؟“

جانس نے بد مزگی سے اسے دیکھا۔ ”تم بچوں کی سی بات کر رہے ہو اس فائٹ کا پروموشن کون ہے؟“

”جان والٹر۔“ جارج نے کہا۔ ”کیا تمہیں معلوم تھا کہ ایسا کوئی واقعہ پیش آنے والا ہے؟“

”تم پھر احمقانہ باتیں کر رہے ہو بھلا مجھے کون بتائے گا اور کیوں بتائے گا۔“

جارج ڈریسنگ روم سے باہر نکل رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ آج وہ مسلسل بے وقوف بن رہا ہے۔ اس کے تمام

بہرہ و زور پسندیدہ افراد بالآخر یوں ثابت ہو رہے تھے۔ وہ ایرینا کی سیزھیوں پر آیا تب اس نے دوسری طرف اسی آنکھ نما غبارے کو دیکھا۔ وہ دوبارہ کنٹرول روم میں آیا۔ اس نے پال سے آنکھ نما غبارے کے بارے میں پوچھا۔ ”یہ کیا بلا ہے؟“

”یہ وی جیٹل کا کبیرا ہے۔ اس میں ہیلیکس بھری ہے اور اس کی آنکھ کی پتلی میں ایک وائڈ اینگل کیمرہ نصب ہے۔ کبھی کبھی پورا ایرینا دکھانا ہوتا ہے تو اس کی مدد لی جاتی ہے۔“

”اس کی ویڈیو کہاں ہوگی؟“

”وہ کوریج کرنے والے ٹی وی چینل کے آفس میں ہوگی مگر جہیں شاید ہی کوئی مدلل سکے کیونکہ باہر طوفان آیا ہوا تھا اور اس کیمرے نے مشکل سے ہی کوئی کام کی چیز ریکارڈ کی ہوگی۔“

”اس کا دفتر کہاں ہے؟“

”زیر تعمیر اسکاٹی اسکرپچر میں ہے۔ شاید دوسرے فلور پر ہے۔“

جارج زیر تعمیر اسکاٹی اسکرپچر کے دوسرے فلور پر آیا۔ یہاں ٹی وی جیٹل کا دفتر کچھ اس طرح تھا کہ وہ تھا تو پہلے فلور پر مگر اس کا راستہ دوسرے فلور سے تھا اور بیڑھیاں اتر کر نیچے آتا پڑتا تھا۔ اس وقت وہاں ایک لمبے بالور والا نوجوان شیشوں کے ساتھ مصروف عمل تھا۔ جارج نے اسے اپنا چنگ دکھایا اور بولا۔ ”مجھے تمہارے آنکھ نما کیمرے کی ریکارڈنگ دکرا رہے۔ اس وقت کی جب ایرینا میں شوٹنگ کا واقعہ پیش آیا۔“

نوجوان نے بھی وہی بات کی۔ ”اس کی ریکارڈنگ استعمال ہی نہیں کی گئی کیونکہ تمام وقت کیمرہ ڈولتا رہا تھا۔ بہر حال ریکارڈنگ موجود ہے۔“

اس وقت اسی ٹی وی جیٹل سے لائیو جان والٹر کا اظہار دکھ رہا تھا جو وہ اپنے بہترین دوست جم کرشن کی موت پر گر رہا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ ٹیل امریکا کے دفاعی پروگرام کے خلاف ایک سازش تھی۔ اس کا مقصد بیل میوزل کو دفاعی نظام میں شامل ہونے سے روکنا تھا۔ کیونکہ جم کرشن اس میوزل کا زبردست حامی تھا، اس لیے اسے قتل کر دیا گیا۔ جان والٹر نے عزم ظاہر کیا کہ جم کرشن کی قربانی رائگاں نہیں جائے گی اور یہ میوزل ضرور دفاعی نظام کا حصہ بنے گا۔ جارج ٹی وی دیکھ رہا تھا اتنی دیر میں نوجوان نے ویڈیو کا مذکورہ حصہ نکال لیا تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا ٹی وی سسٹم تھا

جس پر ویڈیو دکھائی جا سکتی تھی۔ اس نے ویڈیو چلا کر جارج کو متوجہ کیا اور اسے ریموٹ تھما دیا۔ جارج نے ریموٹ سے ویڈیو روک دی اور نوجوان سے کہا۔

”میں اسے اکیلے میں دیکھنا چاہتا ہوں۔“

نوجوان نے شانے اچکائے اور سیزھیاں چڑھ کر دروازے سے باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد جارج نے ویڈیو دوبارہ چلائی۔ یہ ذرا مشکل ویڈیو تھی کیونکہ وائڈ اینگل کی وجہ سے منظر واضح نہیں تھا۔ مگر وہ سیزھیاں نظر آ رہی تھیں جن کے ذرا اوپر چڑھنے سے شیشے کے بوتھ آ جاتے تھے۔ کیمرہ مستقل حرکت میں تھا۔ کنٹرول کی دو پتلی دیواروں کے درمیان خلا تھا جس کے آخری حصے کو زمین شیشے لگا کر بند کیا گیا تھا مگر نیچے سے یہ کھلے ہوئے تھے۔ قاتل نیچے سے اندر گھسا اور اس نے ایک شیشہ توڑ کر دو فائر کیے۔ ایک باریکراجم کر اس طرف آیا تو ویڈیو میں ولسن ایک سرخ بالوں والی عورت کے ساتھ نظر آ رہا تھا مگر عورت کا چہرہ واضح نہیں تھا پھر چانک ولسن پتھول نکال کر اوپر بڑھا اور اس نے بوتھ پر فائرنگ کی، آگے سے سارے شیشے چھٹکے سے ٹوٹے اور مردہ حملہ آور داخل سمیت سامنے گرا۔ یہ بس اتنا سنیں تھا اس کے بعد آئی کیمرہ وہاں سے ہٹ گیا تھا۔ جارج نے ویڈیو کو روکنا دیکھا وہ اس منظر کو پھر دیکھنا چاہتا تھا۔ چانک اسے لگا کوئی عقب میں ہے اس نے مڑ کر دیکھا۔ سیزھیوں کے ساتھ ولسن کھڑا تھا۔

”مجھے اندازہ نہیں تھا۔“ اس نے سرد لہجے میں کہا۔ ”تم اتنے تیز نکلو گے۔“

”ولسن سب کیا ہے؟“

”جو تم دیکھ رہے ہو اور جو تم سمجھ رہے ہو۔“ وہ آگے آیا اور اس نے ریموٹ سے ٹی وی آن کر دیا جس پر ایک بار پھر جان والٹر کا تعزیتی بیان آ رہا تھا۔ جارج نے ڈوبتے لہجے میں کہا۔

”اس کا مطلب ہے تم جم کرشن کے قتل میں ملوث ہو۔“

”میرے دوست یہ ضروری تھا کیونکہ وہ بیل میوزل پر وجہیت میں رکاوٹ بننے والا تھا۔“

”اس کا مطلب ہے کہ یہ بھی درست ہے بیل میوزل اتنا باصلاحیت نہیں ہے جتنا ظاہر کیا جا رہا ہے۔“

”لازمی بات ہے۔“ ولسن نے شانے اچکائے۔

”لیکن مسئلہ یہ ہے اس پر جان والٹر کی کمپنی بہت بھاری سرمایہ کاری کر چکی ہے اور اگر یہ میوزل فروخت نہیں ہوا تو جان والٹر دیوالیہ ہو جائے گا۔“

”تم اس کے ساتھ کیوں...؟“

”دولت کے لیے۔“ ولسن نے کہا۔ ”میں تیس چالیس سال ملازمت کروں اور اس کے بعد مجھے کیا ملے گا بس چند لاکھ ڈالرز اور میں گھر بیچ دیا جاؤں گا اس وقت یہ چند لاکھ ڈالرز میرے کس کام کے ہوں گے۔ مجھے ابھی دولت چاہیے اور چند لاکھ ڈالرز سے کہیں زیادہ چاہیے۔“ ولسن بولنے کے ساتھ ریکارڈنگ بھی ضائع کر رہا تھا۔ جارج نے اسے روکنا چاہا تو اس نے پتھول اس پر تان لیا۔ ”تمہیں دوست مجھے مجبور نہ کرو کہ میں دوستی بھول جاؤں۔“

جارج رک گیا ولسن نے ساری ریکارڈنگ ضائع کر دی اور پھر اسے باہر چلنے کا اشارہ کیا۔ کچھ دیر بعد وہ زیر تعمیر اسکاٹی اسکرپچر کے ایک حصے میں تھے۔ ولسن نے کہا۔ ”جارج یہ بہت اونچے درجے کا معاملہ ہے اس میں، میں اور تم چھوٹے لوگ ہیں۔ ہم ان کے خلاف نہیں جاسکتے ہیں۔“

”تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟“

”میں تمہارا دوست ہوں اور میں چاہتا ہوں تم زندہ رہو۔ اس کی صرف ایک صورت ہے کہ تم ہم سے مل جاؤ۔ اس کے بدلے تم جو چاہو گے وہ تمہیں ملے گا۔“

”مثلاً؟“

”لاکھ ڈالرز... پانچ لاکھ ڈالرز... دس لاکھ ڈالرز... جو تم مانگو۔“

”اور اس کے بدلے مجھے کیا کرنا ہوگا منہ بند رکھنا ہوگا؟“

”وہ ہلکی این خطرہ ہے اسے ختم کرنا ہے۔“

جارج نے ٹی وی سر ہلایا۔ ”میں نے آج تک کسی کو قتل نہیں کیا ہے۔“

”تمہیں قتل نہیں کرنا ہے تم صرف اتنا بتا دو کہ وہ کہاں ہے؟“

جارج نے چونک کر اسے دیکھا، اس کے ماتھے پر شکنیں نمودار ہوئی تھیں اس نے کہا۔ ”ولسن اگر تمہیں اس لڑکی کی تلاش نہ ہو تو کیا تم تب بھی مجھے لالچ دے کر اپنے ساتھ شامل کرنے کی بات کرتے؟“

ولسن کی آنکھوں میں چمک نمودار ہوئی۔ ”جارج تم سچ سچ بہت ذہین ہو۔ اوکے میں ایسی پیشکش نہیں کرتا لیکن اس وقت میں سنجیدہ ہوں۔ اگر تم ہمارا ساتھ دو گے تو زندہ رہو گے اور دولت مندی بن جاؤ گے۔ تمہاری بیوی صرف اس لیے تمہیں چھوڑی کہ تمہارے پاس دولت نہیں تھی۔“

جارج کے چہرے پر پرچھائیاں آئی تھیں۔ مگر وہ خاموش رہا۔ ولسن نے اسے دیکھا اور گہری سانس لی۔ ”تو تم اس طرح نہیں مانو گے۔“

حضور اکرمؐ نے فرمایا

حضرت اسامہؓ اپنی بکری سے روایت ہے کہ وہ آپؐ کے پاس آئیں آپؐ نے فرمایا۔

”روپیہ پیسہ تھیلیوں میں بند کر کے مت رکھو۔ ورنہ اللہ تیرا بھی رزق بند کر کے رکھ لے گا جہاں تک ہو سکے، خیرات کرنی رہ۔“

مرسلہ: ریاض بہت، حسن ابدال

ولسن کے واک ٹاکی سے آواز آئی۔ ”سر یہاں میں منٹ میں دو لاشیں موجود ہیں۔ ایک مرد اور ایک عورت ہے۔“

”لغت ہو۔“ ولسن نے زیر لب کہا اور واک ٹاکی کا ٹین ویا کر بولا۔ ”میں آ رہا ہوں۔“

”دو لاشیں۔“ جارج نے پر خیال انداز میں کہا۔ ”ایک مرد اور ایک عورت... میرا خیال ہے عورت وہی سرخ بالوں والی ہوگی۔“

ولسن نے دانت پیسے۔ ”تمہارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔“

چند منٹ بعد وہاں جانس اور ولسن کے کچھ ساتھی آگئے جو اس ٹھیل میں شامل تھے۔ ولسن نے جارج کو جانس کے سپرد کیا۔ ”جب تک میں وہاں آؤں اس سے لڑکی کا پتا اگلاؤ۔ میں ناکامی کا سننے کو موڈ میں نہیں ہوں۔“

ولسن نیچے درخانے میں آیا جہاں اس کے دونوں شکاروں کی لاشیں دریافت ہو گئی تھیں مگر وہ مطمئن تھا کوئی ان لاشوں سے اس کا تعلق ثابت نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے جو پتھول استعمال کیا تھا اس کا کہیں ریکارڈ نہیں تھا۔ اس نے ضروری کادروائی کے بعد لاشیں اٹھوانے کی ہدایت کی اور خود ایرینا میں آیا۔ یہ بھی اس کی ذمہ داری تھی۔ جارج کے ایک نائب نے اس سے جارج کے بارے میں پوچھا تو ولسن نے درشت لہجے میں کہا۔ ”میں نہیں جانتا۔“

وہ وہاں جارج کی طرف آیا۔ اس کا خیال تھا کہ اب تک جارج زبان کھول چکا ہوگا۔ جب وہ اندر آیا جانس اسے پیٹ میں کے رسید کر رہا تھا اور جارج کا حلیہ بگڑ چکا تھا۔ اس کی ایک آنکھ سوچ کر بند ہو گئی تھی۔ دائیں طرف سے شاید جیڑا بھی ٹوٹ گیا تھا۔ اس لیے جارج سے ٹھیک

سے بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔ ورنہ کوئی کہہ کر جاس نے جارج کو آخری مکار مار کر چھوڑ دیا اور وہ لڑکھڑاتا ہوا پیچھے رکھی سینٹ کی پوریوں پر جا کر ا۔ جاس نے ورن سے کہا۔ ”یہ مجھ سے کیا کر رہے ہو؟ اسپورٹس میں ہوں جلا نہیں ہوں۔“

”کیا اس مت کرو۔“ ورن نے سرد لہجے میں کہا۔ ”اس وقت جان والٹر کی ساتھ اور زندگی، میری ملازمت اور تمہاری اسپورٹس سب داؤ پر لگی ہوئی ہے اگر وہ لڑکی نہ ملی تو ہم سب مارے جائیں گے۔ تم اب تک اس کی زبان نہیں کھلا سکتے ہو۔“

جاس نے ہنسا کر کہا۔ ”اس کا حال دیکھ رہے ہو؟ اس کا جیزہ اور تین پلسٹاں ٹوٹ چکی ہیں۔“

جارج بڑی مشکل سے لڑکھڑاتا ہوا اٹھا اور اس نے عجیب سی آواز میں ہنستے ہوئے جاس کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ اسپورٹس میں... جیسے تم پولیس میں...“

”نہا کے لیے میں پہلے ہی بہت مشکل میں ہوں۔“ جاس نے کہا اور ایک گھونسا اور مارا تو جارج پلٹ کر گر اور سانس نہ ہو گیا۔ ورن نے اس کی طرف دیکھا اور بولا۔

”یہ اس طرح زبان نہیں کھولے گا چاہے تم اس کی ساری ہڈیاں کیوں نہ توڑ دو... مجھے کچھ اور کرنا پڑے گا۔“

☆☆☆

جارج کو ہوش آیا تو وہ تکلف سے بلبل اٹھا تھا۔ منہ پیٹ اور پلسٹاں ایسی دکھ رہی تھیں کہ اس کے لیے سانس لینا بھی عذاب سے کم نہیں تھا۔ اس نے کھلنے والی واحد آنکھ کھولی اور اس پاس دیکھا۔ وہ وہیں پڑا تھا جہاں آخری بار گرا تھا لیکن اس وقت یہاں کوئی نہیں تھا البتہ کچھ دور ایک پلیٹ فلور پر کھڑے ورن کے گمرے رسید کی مدد سے کوئی چیز اوپر چڑھ رہے تھے۔ جارج بڑی مشکل سے اٹھا اور اس کے منہ سے بے ساختہ کراہیں نکلی تھیں مگر باہر شور تھا اس لیے وہ لوگ اس کی طرف متوجہ نہیں ہو سکے تھے۔ وہ سیدھا ہوا تو اس سے کھڑا نہیں ہوا جا رہا تھا۔ وہ جھکے جھکے ہی چل پڑا۔ اس کا رخ اس کی اسکرپ کے اس حصے کی طرف تھا جہاں اس نے اپنا کچھوڑا تھا۔ اس کے خیال میں یہ سونچ اچھا تھا، اگر وہ اپنا گواہ کر دیتا تو وہ پولیس سے رابطہ کر سکتی تھی۔ وہ اس ہال سے باہر آیا تو ایک طرف پردے کے پیچھے موجود ورن باہر آ گیا اور وہ اب جارج کا تقاب کر رہا تھا۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ وہ اس طرح نہیں بتائے گا۔ جارج بہت مشکل سے رک رک کر چل رہا تھا اور اس کے منہ سے بے ساختہ کراہیں اور چیخیں نکل رہی تھیں۔

جارج ایک راہداری میں آیا۔ چند لمبے تک وہ سوچتا رہا۔ کیا یہی وہ راہداری تھی جو اس حصے تک جاتی تھی۔ شاید تکلیف سے اس کی یادداشت کو بھی متاثر کیا تھا، کچھ دیر سوچنے کے بعد وہ پھر آگے بڑھنے لگا۔ زیرِ قیور ہونے کی وجہ سے اور کوئی نشان دہی نہ ہونے کی وجہ سے سب سے ایک جیسے لگ رہے تھے۔ ویسے بھی وہ این کے ساتھ ہوٹل سے نکل کر عقیبی سڑکیوں سے بچے آئے تھے، اس لیے اسے براہ راست وہاں تک پہنچنے میں دشواری محسوس ہو رہی تھی۔ وہ دیواروں کا سہارا لے رہا تھا۔ چند منٹ بعد وہ اس حصے میں آ نکلا جس کے ایک کمرے میں اپنی قیدی۔ یہاں نیم تاریکی تھی اور عقب میں کھلی جگہ تھی جہاں سے رات کی تاریکی جھلک رہی تھی۔ موسم خراب تھا۔ ہری لین کی آمد تھی اور بہت تیز ہوا میں چل رہی تھی۔ اچانک بجلی چمکی اور راہداری روشن ہوئی اور تب جارج نے دیکھا سانسے دیوار پر اس کے ساتھ ایک سایا اور بنا تھا۔ ابھی تک وہ این کو آوازیں دے رہا تھا۔ گرد و سراسیمہ دیکھتے ہی وہ خاموش ہو گیا۔ پھر اس نے پلٹ کر دیکھا۔ ورن کچھ فاصلے پر کھڑا ہوا تھا اور اس کے ہاتھ میں سنلنسر والا ہتھیار تھا۔ وہ مسکرایا۔

”جارج لڑکی نہیں ہے؟“

”لیکن تم اس تک نہیں پہنچ سکتے۔“ جارج نے بلند آواز اور گڑے لہجے میں کہا۔

”میں پہنچ گیا ہوں وہ یقیناً نہیں ہے۔“

جارج اگلے قدموں پیچھے ہٹ رہا تھا اور اس دروازے کے قریب ہو رہا تھا جس کے پیچھے اپنا موجود تھی مگر وہ ورن کو متاثر دے رہا تھا جیسے وہ اس سے ڈر کر پیچھے ہٹ رہا ہے۔ ”اگر وہ... ہے تو اسے... تلاش کر لو۔“

”جارج اب بھی وقت ہے تم نام جاؤ... میں جان سے منہ ہانک کر قیمت منظور کروا لوں گا۔“

”اب بہت دیر ہو گئی ہے دوست۔“ جارج پیچھے ہٹا رہا۔ ”ہمارے راستے اسی وقت الگ ہو گئے تھے جب تم نے اپنے پیٹے کو فروخت کیا تھا۔“

”تب خدا حافظ جارج۔“ ورن نے ہتھول سیدھا کیا۔ ”لڑکی کو میں خود تلاش کر لوں گا۔“

”وہ یہاں نہیں ہے؟ وہ اس طرف ہے۔“ جارج نے سر سے دائیں طرف پیچھے اشارہ کیا تو ورن نے بے ساختہ عقب میں دیکھا اور جارج نے دروازے کا ہینڈل ٹھمایا۔ دروازے کے ساتھ ہی وہ اندر گیا تھا اور جب تک ورن اس کی طرف متوجہ ہوا تو وہ اندر سے بند کر کے اسے لاک کر چکا

تھا۔ ورن نے لگا تار کئی فائر کے اور گولیاں دروازے میں سوراخ کرتی ہوئی جارج کے آس پاس سے گزری تھیں۔ این جو ایک کونے میں دبی ہوئی تھی اس نے بیچ ماری۔ پھر وہ تیزی سے جارج کی طرف آئی۔

”یہاں سے نکلو وہ آگیا تو ہم دونوں مارے جائیں گے۔“ جارج نے یہ مشکل کہا۔

”کہاں جاؤ گی؟“ این ہر اسال تھی۔ وہ کبھی ایسے حالات سے نہیں گزری تھی۔ یہ بہت بڑا کرا تھا۔ اس کے ایک طرف دیوار کے ساتھ ایک پائپس کھڑے تھے۔ بجلی چمکی تو ان کے عقب سے چمک زیادہ ہی آگئی تھی۔ جارج اس طرف بڑھا اس نے دھکے دے کر پائپ گرائنا شروع کر دیے۔ ذرا دیر میں پائپوں کے پیچھے چھپا ہوا دروازہ نمودار ہوا اس کے اوپر ہی حصے میں جالی تھی۔ اس دوران میں ورن دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جارج کی حالت دیکھتے ہوئے این نے خود دروازہ کھولنے کی کوشش شروع کر دی۔ عرصے سے بند پڑے رہنے کی وجہ سے وہ جام ہو رہا تھا۔ ورن لاک کھولنے میں ناکامی کے بعد اب اسے فائر کر کے توڑ رہا تھا۔ این سسکیاں لے رہی تھی اور اپنی پوری جسمانی توانائی لگا رہی تھی۔ جارج نے بھی اس کا ساتھ دیا اور ایک دھماکے سے دروازہ کھلا۔ تیز ہوا کے ساتھ پانی کی بوچھاڑ بھی اندر آئی تھی۔ اسی لمحے ورن لاک توڑنے میں کامیاب رہا۔

جیسے ہی ورن اندر داخل ہوا جارج این کو دیکھتا ہوا باہر نکل گیا اور ورن کی چلائی گولی دروازے پر لگی تھی۔ جارج اور این باہر سڑک پر گرے تھے۔ یہ اصل میں اسکاٹی اسکرپ کا کھڑا تھا لیکن فی الحال اسے سڑک کی صورت دی گئی تھی تاکہ تعمیراتی سامان لایا جاسکے اور وہاں ایک پولیس ٹرک موجود تھا۔ اس کے ڈرائیونگ کے خانے میں دو پولیس والے موجود تھے اور کھائی رہے تھے۔ ایک مرد اور عورت کو اس طرح باہر آتے دیکھ کر وہ مستعد ہو گئے اور جیسے ہی ورن ہتھیار بدست باہر آیا تو ان دونوں نے اپنے ہتھول نکال لیے تھے اور چلا کر ورن کو ہتھول پھینکنے کا کہنے لگے۔ ایک نے کہا۔ ”اپنا ہتھیار پیچیدہ دوور نہ ہو شرم کر دیں گے؟“

ورن نے بے ساختہ ہاتھ بلند کر لیے مگر اس نے ہتھول نہیں پھینکا تھا۔ اس نے اٹھا دے کہا۔ ”تم سرکاری کام میں مداخلت کر رہے ہو... یہ دونوں مجرم ہیں... یہ لڑکی... یہ قاتل ہے اور بہت بڑا خطرہ ہے۔“

”تم ہتھول پیچیدہ دو۔“ ٹرک والے نے متاثر ہوئے بغیر کہا۔ جارج زمین پر پڑا ہوا تھا اس نے این کو کور کر لیا تھا جو اس کے سینے میں خود کو چھپائے چڑیا کی طرح کانپ رہی تھی۔ اچانک جارج نے عقب میں دیکھا اسے آئی سراسرک پر نظر آیا۔ تیز ہواؤں نے اسے گرا دیا تھا اور اس کی آنکھ یعنی کیرے کا رخ ان کی طرف تھا۔ اس نے ورن سے کہا۔

”اب کوئی فائدہ نہیں ہے سب ریکارڈ ہو گیا ذرا پلٹ کر دیکھو۔“

ورن نے پلٹ کر آئی کیرے کی طرف دیکھا اور گہری سانس لے کر رہ گیا۔ پولیس والے یہ دستور چلا رہے تھے کہ وہ ہتھیار پیچیدہ دے مگر وہ دروازے کی طرف پلٹ گیا جیسے وہیں اندر جانا چاہ رہا ہو مگر اچانک اس نے خود کو شوٹ کر لیا۔ گولی اس کے سینے میں سوراخ کرتی اس کی پشت سے نکل گئی تھی اور وہ زمین پر گر کر سانس نہ ہوا تھا۔ دونوں پولیس والے ٹرک سے باہر آ گئے تھے۔ انہوں نے ورن کو چیک کیا مگر اس نے دم توڑ دیا تھا۔ جارج نے اپنا بیج دکھایا تو وہ تیزی سے حرکت میں آئے تھے۔ آدھے گھنٹے میں پولیس نے جان والٹر کو جم کر سٹن کر کے لے کر اس کی سازش کرنے کے الزام میں گرفتار کر لیا تھا۔ ورن مریکا تھا مگر اس کے ساتھی اور جاس بھی مع اپنے نیچر کیلون کے گرفتار ہوا تھا۔ وہ دونوں اس سازش میں پوری طرح شامل تھے۔ وہ فوری طور پر وعدہ معاف گواہ بن گئے تھے اور انہوں نے پوری کہانی اگل دی تھی۔

اگلے روز میڈیا نے پوری کہانی شائع کی تھی۔ جم کر سٹن ہٹھوک ہو گیا تھا اور وہ اپنے طور پر بھی بیل میزائل کے خلاف تحقیق کر رہا تھا۔ اگر این اسے رابطہ کر کے ثبوت نہ دیتی تب بھی وہ معاملے کی تک پہنچ جاتا مگر اس سے پہلے اسے قتل کر دیا گیا۔ جان والٹر کے بیل میزائل کے پروسیجر کو بلیک لسٹ کرتے ہوئے وفاقی حکومت نے وسیع پیمانے پر اس کی تحقیقات شروع کرنے کا اعلان کیا تھا۔ جارج کو دو دن اسپتال میں گزارنا پڑے اور پھر اسے گھر جانے کی اجازت ملی تھی۔ اس کا جیزہ اور ذمہ ٹھیک ہونے میں ایک ہفتے سے زیادہ لگا تھا۔ ایک مہینے بعد جب جان والٹر اور دوسرے مجرم عدالت میں پیش کیے جا چکے تھے تو جارج کے اعزاز میں ایک تقریب کا انعقاد ہوا جس میں اسے خصوصی شیلڈ سے نوازا گیا تھا۔

عکس منظر کا ہوا یا پس منظر کا، بعض اوقات اتنا پرکشش ہوتا ہے کہ سوچ کے انداز بدل جاتے ہیں مگر... یہ بھی حقیقت ہے کہ عکس بن کر تعاقب کرنے والے کبھی سائے کی ٹھنڈک نہیں دیتے۔ ان سے تنہائی دور ہوتی ہے اور نہ ہی انہیں میں کمی آتی ہے۔ ایسے میں جب ہجر کا موسم طاری ہو اور پلہ دل پر بھاری ہو تو ان بھید بھرے لمحات میں کوئی دریافت کرتا ہے یا کسی کو یاد کرتا ہے۔ لیکن اس کا شمار دریافت کرنے اور تسخیر کرنے والوں میں ہوتا تھا کیونکہ اسے کٹھن کام کا چنوں تھا جبکہ کسی انسان کو سمجھنا شاید دنیا کا مشکل ترین کام ہے اور اگر وہ انسان عورت ہو جو پیلی بن کر جستجو بھڑکاتی ہے اور جو لفظوں میں بند ہو کر کتاب کی صورت کسی کے من میں گھر کر جائے تو کیسے ورق ورق کر کے لفظ بہ لفظ اسے کھوجنے کی لگن اس میں پیدا نہ ہو... مگر ایسا اسی وقت ممکن ہوتا ہے جب آپ کی سوچ کے زندان میں کوئی قید ہو جائے... وہ بھی منظر اور پس منظر کے درمیان الجھ گیا تھا... جو کچھ اس نے دیکھا اس کی تہ میں اترنا چاہتا تھا مگر... حدود و قیود کا حامي آگے بڑھنے سے قاصر تھا۔ ایسے میں بے بسی نے اسے آنسوؤں کے سمندر میں دھکیل دیا جہاں وہ تنکا تنکا بہتا رہا اور وحشتوں کے طوفان اسے اپنے گھیرے میں لیتے رہے لیکن یہ کسے معلوم تھا کہ چڑھنے والا سورج اپنے دامن میں کیا کچھ سمیٹ لایا ہے۔ بالآخر پتھر سے ٹکراتے ٹکراتے اسے یہ ادراک ہوا کہ جہاں عمل ہے وہاں کہیں رکو عمل بھی چھپا ہوا ہے... بس اسی فراست نے اسے مطمئن کر دیا... یہ اور بات کہ اس اطمینان نے بہت سوں کا چین برباد کر ڈالا تھا۔

دیارِ غیر میں انہوں سے دور کی اپنے کی
حلاش میں سرگرداں محبتوں کی کرم
فرمائیاں اور قیوبوں کی
عنایتوں کی
داستان



بار پاکستان جا چکی ہے۔ پاکستان کے بارے میں جتنا جانتی ہے شاید ہم بھی نہیں جانتے۔ یہاں ہوتی تو آپ کو لاہور کی گلیوں کے نام بھی بتا دیتی اور یہ بھی بتا دیتی کہ کوئی گلی میں کون سی پنچارے دارشہ بنتی ہے۔

”پھر تو ان سے ملنا چاہیے تھا۔ مجھے بھی کبھی چٹ پٹی چیزوں کا شوق چراتا ہے۔“ ہادی نے بات بتائی۔

”ویسے چار پانچ دن میں اسے آنا تو ہے۔ اگر آپ جب تک ہیں تو پھر ملاقات ہو سکتی ہے۔“ ظہیر نے عام سے لہجے میں کہا۔

اسی دوران میں ملازم شریفان تیزی سے اندر آئی۔ اس کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ اس نے ظہیر سے کہا۔ ”بھائی جان آپ کو بلا رہے ہیں۔“

ظہیر تیزی سے شریفان کے ساتھ چلا گیا۔ دونوں تیز تیز قدم اٹھاتے رہا کی جھے کی باز کے پیچھے اوجھل ہو گئے۔ دو تین منٹ بعد ہادی نے دیکھا کہ ایک بڑی کار تیزی سے پورچ کی طرف سے آئی اور مین گیٹ سے باہر نکل گئی۔ اندر جھرے میں ہادی صرف اتنا ہی دیکھ سکا کہ فرنٹ سیٹ پر ظہیر موجود تھا۔

”کہیں حجاب کی طبیعت پھر تو خراب نہیں ہو گئی۔“ ہادی نے سوچا۔

اس بات کا جواب اسے قریباً پندرہ منٹ بعد ملا جب شریفان واپس آنکی میں آئی۔ ”کیا بات تھی شریفان؟“ ہادی نے پوچھا۔

”بڑی باجی کی طبیعت پھر خراب ہو گئی ہے۔ انہیں پھر اسپتال لے کر گئے ہیں۔“ وہ روہانی آواز میں بولی۔

”کیا ہوا ہے؟“

”کچھ پتا نہیں جی۔ بس دعا کریں۔ اس ویلے تو بے ہوش ہیں وہ۔“ شریفان نے گول مول بات کی۔ وہ باقاعدہ آنسو بہا رہی تھی۔

یہ موقع اچھا تھا۔ ہادی، حجاب کے بارے میں اس سے مزید پوچھ سکتا تھا۔ اس نے ایک دو سوال کیے جن کے جواب میں شریفان نے بتایا۔ ”وڈی باجی بہت چٹکی ہیں جی۔ اتنی چٹکی جتنا کوئی سوچ سکتا ہے۔ پر اس گھر میں ان سے سلوک چنگا نہیں ہے۔ خاص طور سے وڈے بھائی جان تو ان پر ہر ویلے بہت غصے میں رہتے ہیں۔“

”وڈے بھائی جان یعنی حجاب کے میاں؟“

”آہ جی..... دراصل.....“ وہ کہتے کہتے جھجک کر خاموش ہو گئی۔

تھوہری کی طرف بھی جا رہا تھا جو یہاں ایک کمرے میں آویزاں تھی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ کسی ایسی لڑکی کی تصویر ہے جو اب اس دنیا میں نہیں یا پھر اتنی دور ہے کہ اس سے ملاقات ممکن نہیں۔ وہ حجاب کی بہن تو ہرگز نہیں لگتی تھی۔ بہر حال ہادی نے اس سلسلے میں فیاض صاحب سے کوئی سوال نہیں پوچھا۔

شام کے وقت بارش میں وقفہ آیا اور ہادی ان لوگوں سے رخصت ہو کر اپنی قیام گاہ پر واپس آ گیا۔ راستے میں اس نے ایک جگہ سے اپنی کلائی کی مرہم پٹی بھی کر دائی اور ڈاکٹری نسخے پر دوا بھی لے لی۔

ظہیر بھی اپنے کام سے واپس آ چکا تھا۔ اس کا موڈ آج کچھ زیادہ خوشگوار نہیں تھا۔ بہر حال وہ دیر تک ہادی کے پاس بیٹھا رہا اور باتیں کرتا رہا۔ ہادی نے اسے بتایا کہ اس نے کلائی کی پیسٹج کر دوائی ہے۔ اسپتال کی بد انتظامی کا نقشہ بھی اس نے ظہیر کے سامنے کھینچا۔ ظہیر نے اقرار کیا کہ یہاں کے کسی سرکاری اسپتالوں کی صورت حال مایوس کن ہے۔

گفتگو کے دوران میں ہادی نے بار بار کوشش کی کہ کسی طرح علیر کا کوئی کھونچا ہوا آئینہ اس گھر میں کل چھ افراد رہتے تھے۔ ظہیر، اس کی بیوی فوزیہ، اس کے بڑے بھائی جلال، بھائی حجاب، والدہ واجدہ بیگم اور ظہیر کی ایک سالی ارم۔ ارم بھی آج کل ہاسٹل میں رہ رہی تھی۔

ہادی نے دخل در مستحولات کرتے ہوئے ظہیر سے پوچھا۔ ”آپ کی سسران لا (ارم) آپ کے ساتھ کیوں نہیں رہتیں؟“

”وہ اکاؤنٹنٹی کر رہی ہے۔ اسے وینس کی یونیورسٹی میں داخلہ ملا تھا، اس لیے وہیں رہنا پڑ رہا ہے۔“

وینس کے نام پر ہادی کا دل دھڑکا۔ کہیں علیر ا دراصل ارم ہی تو نہیں تھی؟ یقین ممکن تھا کہ اس نے اپنا نام غلط بتایا ہو۔ ہادی نے صاف دیکھا تھا کہ جلال کے مقابلے میں اس کا چھوٹا بھائی ظہیر زیادہ کمزور ذہن کا نہیں ہے۔ وہ مذہبی معاملات پر زیادہ سخت رائے نہیں رکھتا تھا۔ اس کی بیوی فوزیہ بھی یوں تو پردہ کرتی تھی مگر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ جلال کی بیٹی کی یہ نسبت قدرے روشن خیال ہے۔ علیر اکو بھی ہادی نے خاصے ایڈوائس روپ میں دیکھا تھا۔ تو کیا علیر ارمی دراصل ارم ہے؟

”بڑی خوش مزاج ہے۔“ ظہیر نے اس کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔ ”میر سپائے کی بھی شوقین ہے۔ دو تین

کہ یہ لوگ حجاب کے سسرالیوں سے کتنے سبے رہتے ہیں۔ ایک دن پہلے وہ اپنی آنکھوں سے بھی خالہ صوفیہ کی سیاہ چارگی کا منظر دیکھ چکا تھا۔ گھر میں حجاب کی ساس کے آنے کے تھوڑی ہی دیر بعد خالہ صوفیہ گھبرائی ہوئی سی گھر سے نکل گئی تھیں۔ ان کے جانے کے کچھ ہی دیر بعد کسی نے وہ پھل بھی باہر پیکیج دیا تھا جو وہ بڑی چاہت سے نئی کے لیے لے کر گئی ہوں گی۔

دوسرے کمرے میں خالہ صوفیہ، حجاب کی ساس کو فون کر رہی تھیں۔ یہاں کمرے میں فیاض صاحب اور فیصل چہروں پر تناؤ لے بیٹھے تھے۔ خالہ صوفیہ بڑی منتہائی ہوئی عاجزانہ آواز میں بول رہی تھیں۔ الفاظ ہادی تک نہیں پہنچ رہے تھے۔

چند منٹ بعد وہ واپس آئیں۔ ان کے چہرے پر مایوسی کا سایا تھا۔ ”کیا کہا واجدہ ہے؟“ فیاض صاحب نے پوچھا۔

”واجدہ سے نہیں، جلال سے بات ہوئی ہے۔ وہ آگیا ہے واپس۔“

”کیا کہتا ہے؟“

”کہتا ہے، اب وہ ٹھیک ہے۔ کہیں جانے کی ضرورت نہیں اور کہتا ہے کہ ہم کوئی ایسی بات نہ کریں جس سے حجاب شش و پنج میں پڑے۔“

”حجاب نے بات کی؟“

”نہیں، جلال بتا رہا تھا کہ وہ سو رہی ہے۔“

”وہ تو جب بھی فون کریں، یہی بتاتے ہیں کہ سو رہی ہیں، ہاتھ روم میں ہیں۔ دس دفعہ فون کریں تو ایک دفعہ بات ہوئی ہے۔“ فیصل نے برا سامنے بنا کر کہا اور اٹھ کر باہر چلا گیا۔

”ہمیں جانا چاہیے؟“ فیاض صاحب نے بیوی سے پوچھا۔

”جانا تو چاہیے، لیکن پتا نہیں، وہ برا نہ مانیں۔ یا پھر..... پہلے ایک بار فون پر حجاب سے بات ہو جائے۔“

”چلو، انتظار کر لو۔“ فیاض صاحب نے کہا۔ شاید وہ کچھ اور بھی کہنا چاہا رہے تھے۔ مگر ہادی کی موجودگی کا خیال کر کے موضوع بدل دیا۔ گفتگو کا رخ مسلسل برسنے والی بارش کی طرف مڑ گیا۔

ہادی اس گھر کی صورت حال دیکھ رہا تھا اور حیران ہو رہا تھا۔ یہ لوگ حجاب کے سسرالیوں کے حوالے سے بہت دباؤ میں تھے۔ ہادی کا دھیان بار بار اس دیوار گیر

فیاض صاحب اپنے موبائل پر کسی کے نمبر ڈائل کرنے لگے، لیکن پھر کرتے کرتے رک گئے۔ سامنے تپائی پر مٹھائی کا ڈبا پڑا تھا۔ اب یہ بات ہادی کی سمجھ میں آرہی تھی کہ تھوڑی دیر پہلے کھائی جانے والی مٹھائی اسی ”خوشی“ کے سلسلے میں جس کسی کا ذکر ابھی فیاض صاحب نے کیا تھا۔

دو چار منٹ بعد خالہ صوفیہ اور فیصل کمرے میں واپس آ گئے۔ دونوں ابھی تک پریشان تھے۔ خالہ صوفیہ نے کہا۔ ”حجاب کی سسلی عیسہ کا فون تھا۔ بتا رہی تھی کہ حجاب کی طبیعت زیادہ خراب ہوئی تھی۔ لی بی بہت کم ہو گیا تھا۔“

فیاض صاحب بولے۔ ”ان لوگوں کو کم از کم بتانا تو چاہیے تھا نہیں۔ ایک فون ہی کر دیتے۔“

”جلال خود تو شہر سے باہر ہے اور واجدہ کا آپ کو پتا ہی ہے۔“ خالہ صوفیہ نے کہا۔

فیصل گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے بولا۔ ”ناڈو اسپتال لے کر گئے تھے۔ وہاں کے اسٹینڈرڈ کا تو پتا ہی ہے سب کو، میرا تو مشورہ ہے کہ باجی کو چند دن کے لیے یہاں لے آئیں، ڈاکٹر انکل بڑی اچھی طرح سمجھتے ہیں ہم سب کی طبیعت کو۔ باجی کو تو ہمیشہ آرام ہی ان سے آتا ہے۔“

”لیکن جلال کی ماں مان جانے کی؟“ فیاض صاحب بولے۔

”آ..... آپ فون کر کے دیکھ لیں۔“

”نہیں بیٹی، میں تو نہیں کروں گا۔ ایوں کوئی سخت بات نہ ہو جائے اس سے یا سمجھ ہے۔“

”میں کر لیتا ہوں۔“ فیصل نے کہا۔

”نہیں، تم تو بالکل نہیں کرو گے۔“ خالہ صوفیہ بولیں۔

”تو پھر کون کرے گا انی؟“

”چلیں، میں کر کے دیتی ہوں۔“ خالہ صوفیہ نے کہا۔

”کیا کہو گی؟“ فیاض صاحب نے پوچھا۔

”آپ بتائیں۔“ خالہ صوفیہ نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

”اس سے کہو کہ دو تین دن کے لیے بھیج دیں حجاب کو..... عطا ہمارا جیملی ڈاکٹر ہے، ڈرا جزل چیک اپ کر لے گا حجاب کا۔“

”اچھا میں کرتی ہوں بات۔“ خالہ صوفیہ نے کہا اور پھر ڈگمگاتی ہوئی سی فون کرنے چلی گئیں۔

ہادی بے ظاہر لا تعلقی سے ایک انگشٹ میگزین دیکھ رہا تھا مگر اس کی توجہ گفتگو کی طرف ہی تھی۔ اسے اندازہ ہو رہا تھا

”کہو کہوشریاں۔ جو کہوگی صرف میرے تک ہی رہے گا۔“

ضرورت ہی کیا تھی۔ ایک بوتل مقصود نے دی ہے، ایک یا دو کی ضرورت مزید پرستی ہے۔“

ہادی نے آگے بڑھ کر کہا۔ ”ظہیر بھائی! امیر اگر وہ بھی اسے بی عیثو ہے، آپ مجھے ساتھ لے چلیں، اللہ نے چاہا تو بیچنگ بھی ہو جائے گی۔“

”یہ تو بڑا اچھا ہوا۔ بجا ہی اس وقت مشکل میں ہیں۔ ان کا بچہ تو نہیں بچ سکا، اب اللہ کرے وہ صحیح سلامت گھر آجائیں۔“

وہ گاڑی میں بیٹھنے اور روم کی سڑکوں پر فرارے بھرتے تیزی سے ناڈو اسپتال کی طرف روانہ ہو گئے۔ یہ سفید "لان سیا" گاڑی ظہیر خودرو رائیگر ہا تھا..... جواب کی ابابارن کا سن کر ہادی کو ہڈی افسوس ہوا تھا۔ اب تک ہادی کو کچھ معلومات حاصل ہوئی تھیں۔ ان کے مطابق وہ کافی تعلیم یافتہ اور پتاس پر آن پڑی تھی۔ اسپتال پہنچنے ہی ہادی کے خون کا نمونہ لیا گیا۔ اس سے پتہ چل گیا کہ ہادی نے خون کا ایک بیگ دے دیا۔ جب وہ بیگ دے کر باہر چل رہا تھا اس کی نگاہ اچانک حمام کی والدہ اور

بھائی فیصل پر پڑی۔ وہ تیزی سے آئی سی یو کی طرف
جبارہ تھے۔ ہادی ایک ستون کی اوٹ میں ہو گیا۔ اس
نے خالہ صوفیہ اور فیصل وغیرہ کو ابھی تک نہیں بتایا تھا کہ وہ
یہاں جلال صاحب کے گھر میں ٹھہرا ہوا ہے اور وہ ابھی اس
تعلق کو پوشیدہ ہی رکھنا چاہتا تھا۔ جلال آئی سی یو سے کچھ
فاصلے پر برآمدہ میں موجود تھا۔ اس کے چہرے پر ویسے
بھی برقت گہری سنجیدگی رہتی تھی اور اب تصویر حال بھی
بھیر گئی۔ خالہ صوفیہ ڈرے ڈرے انداز میں دادا کے
اس بچپن کے اس سے دو چار باتیں کہیں۔ دور سے بھی ہادی
کو اندازہ ہو رہا تھا کہ خالہ صوفیہ اور فیصل کو سردہری سے
جواب دیے گئے ہیں۔ پھر جلال اپنی سیاہ ڈائری میں
لکھ لیاں چلاتا ایک ڈاکٹر کے ساتھ ایک کوہ پڑ میں اوصل
ہو گیا۔ خالہ صوفیہ وہاں موجود ایک پردہ پوش خاتون سے
تیس کر نے لگیں۔ یہ خاتون یقیناً ظہیر کی دانت فو ز یہ تھی
تھی۔ شرفاں بھی شکر چہرے کے ساتھ یہیں موجود تھی۔

اتنے میں ہادی نے ظہیر اور جلال کی والدہ آپا خانم کو
بیزی سے آتے دیکھا۔ وہ آنی سی یو کی طرف سے آرہی
تھیں۔ خالہ صوفیہ سے آپا خانم کی سلام دعا ہوئی..... چند
تس ہوئیں، پھر ایک دم نجانے کیا ہوا کہ غیدہ صورت آپا
خانم بھڑک اٹھیں۔ بلند آواز میں بولیں ”سب تمہارا ہی

”آہو جی، ظہیر بھائی جان اور ان کی بیوی بھی سمجھتے ہیں کہ اس گھروچ ڈوڑی پانچی کے ساتھ برا سلوک ہو رہا ہے۔ پر میں نے آپ کو بتایا ہے کہ ڈوڑے بھائی جان کے سامنے کسی کی نہیں جاتی۔“

..... ہادی اس گھر میں ظہیر کی ٹوہ لگاتے آیا تھا

لیکن اب اسے اس دوسرے کردار میں بھی دلچسپی محسوس ہو رہی تھی۔

شریالوں کے ساتھ گفتگو کے دوران میں ہادی نے
توں کا رخ ایک بار پھر اپنے پس منظر موضوع کی طرف موڑ
یا۔ چنانچہ کیوں اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ عزیز اہو
م نامی لڑکی ہے جو رشتے میں فطیر کی سالی ہے اور جو
کاوشنیں پڑھنے کے لیے آج کل ویش میں مقیم ہے۔ کاش
ہر کسی طرح ارم کی تصویر دیکھ سکتا۔ لیکن تصویر والی بات
شریال سے کرنے کی ہمت اسے نہیں ہوئی۔

کوئی ایک گھنٹے بعد اسپتال ہی سے ظہیر کا فون آیا۔
ظہیر آواز میں بول رہا تھا۔ اس نے ہادی سے پوچھا کہ
ہادی نے کھانا وغیرہ کھالیا ہے اور اسے کسی چیز کی ضرورت تو
نہیں ہے۔

ہادی نے پوچھا۔ ”ظہیر بھائی! تمہاری بھابی کی بیعت اب کیسی ہے؟“

”طبیعت ابھی ٹھیک نہیں ہے۔ اگلے ایک دو گھنٹے کافی اہم ہیں۔“ ظہیر نے مختصر اجواب دیا۔ ہادی نے بھی زیادہ تفصیل میں جاننا مناسب نہیں سمجھا۔

نوح ہادی جلدی بیدار ہو گیا۔ یہی کوئی سات
 ٹاٹ سے سات کا وقت ہوگا۔ وہ کھٹ پٹ کی آوازوں سے
 اٹھ اگا تھا۔ اس نے دیکھا۔ ظہیر بڑی پریشان صورت کے
 ماتھے کا سن روم میں موجود تھا۔ وہ کسی کوفن کر رہا تھا۔
 لازم لڑکا مقصود بھی فکرمندی کے تاثرات لیے اس کے
 س کی کھڑا تھا۔ ظہیر اپنے کسی رشتے دار سے باتیں کر رہا
 تھا۔ اس کی گفتگو سے ہادی پر یہ انکشاف ہوا کہ ظہیر کی بھابی
 اب تشریف ناک حالت میں ہے۔ اس کا ابا رشن ہو گیا
 ہے اور ابا رشن کے دوران میں ہی کوئی پیچیدہ صورت حال
 پیدا ہوئی ہے جس کی وجہ سے حجاب کے لیے خون کی
 رورت پڑ گئی ہے۔ ظہیر اسی سلسلے میں بات کر رہا تھا۔ اس
 نے جب بلڈ گروپ کا نام لیا تو ہادی چونک گیا۔ یہ گروپ
 سے طور سے مشکل سے ملتا ہے۔ ہادی اٹھ کر ہاتھ روم میں
 گیا اور منہ ہاتھ دھو کر باہر آ گیا۔ ظہیر پریشانی کے عالم میں
 بصر ہاتھ۔ بلڈ بینک میں مل جاتا تو پھر اپنی بھاگ دوڑ کی

یاجی احتجاج کیوں نہیں کرتیں۔“
”وہ تو بالکل اللہ میاں کی گائے ہیں جی۔ اگر ان میں
تھوڑی بہت ہمت بھی تھی تو اب ختم ہو چکی ہے۔ شروع
شروع مزید دو چار مہینے وہ شاید ڈے بھائی جان کے سامنے
بولی ہوں گی لیکن اب تو انہوں نے اپنی زبان بالکل بند کر لی
ہے۔ ”جی جی“ کے سوا کچھ کہتی ہی نہیں۔ پھر بھی ان کی
شامت آتی رہتی ہے۔ بڑی لمبی ہیں، بھجدار ہیں، پر
وڈے بھائی جان کے سامنے ایسے ہوتی ہیں جیسے کوئی
ترترہ کرنا ہنسی، اسکول کی لڑکی ہو۔ خدا واسطے کی کل کی جائے
تو انہوں نے اپنے بندے کے لیے خود کو بالکل مار لیا ہوا
ہے۔ اپنی کوئی رقمی رکھی ہی نہیں ہے۔ وڈے بھائی جان
کے کہنے پر گھر میں بھی پورا پردہ کرتی ہیں۔ میرا مطلب ہے
کہ چھوٹے بھائی جان پتھر وغیرہ کے سامنے بھی نہیں آتیں۔
اپنی کسی شکھی سبیلی سے نعلن واسطہ نہیں رکھا ہوا، پناٹلی فون
نہیں رکھا ہوا۔ ماں بچہ کے گھر آنا جانا نہ ہونے کے برابر
کر دیا ہوا ہے۔ مطلب یہ کہ کوئی ایسا کام نہ ہو جو وڈے بھائی
جان کو برا لگتا ہو۔ پھر بھی پتا نہیں کیا بات ہے، وڈے بھائی
جان کو بولنے کا کوئی نہ کوئی بہانہ مل ہی جاتا ہے۔“

”ہوسکتا ہے کہ بھائی صاحب ہاتھ ویرہ بھی اٹھائے ہوں اس پر؟“ ہادی نے خیال ظاہر کیا۔

”ابھی تک تو نہیں جی۔ لیکن جس قسم کے معاملے چل رہے ہیں، کسی دن یہ بھی ہوسکتا ہے۔ مجھے بڑا ڈر لگتا ہے جی۔ اب دیکھیں۔ پیٹاری والی گل بھی بھلا کسی کے بس کی ہوتی ہے۔ آپا خانم (جلال کی والدہ) کہتی ہیں کہ وہ بیمار اس لیے ہوئی ہیں کہ انہوں نے اپنی ماں کے گھر سے آئی ہوئی انجیر ک کھائی ہیں۔ میں قسم کھاسکتی ہوں کہ وڈی باجی نے انجیر چھٹی بھی نہیں دی۔ بس ایسے ہی بے کار باتیں بناتے ہیں۔“ ہادی کو وہ پھل یاد آیا جو باڑ سے باہر پھینک دیا گیا تھا۔

”ظہیر اور جلال صاحب کی والدہ کا سلوک کیا ہے تمہاری وڈی باجی کے ساتھ؟“ ہادی نے پوچھا۔

”آپا خانم زیادہ تر بیٹے کا ساتھ ہی دیتی ہیں۔ جی۔ پڑے بھائی جان غصے کے تیز ہیں۔ کبھی کبھار آپا خانم سے بھی لڑ پڑتے ہیں۔ جب بھی ایسا ہوتا ہے، ان دنوں انہی سے آپا خانم کا سلوک کچھ چمکا ہو جاتا ہے۔ پر یہ وقتی بات ہی ہوتی ہے جی۔“

”میرے خیال میں ظہیر صاحب تو تھوڑی بہت بھابی کی حمایت کرتے ہوں گے؟“

”کہو کہو شریاں۔ جو کہو گی صرف میرے تنگ ہی رہے گا۔“

وہ آنسو پونچھ کر بولی۔ ”کسی سے گل نہ کرنا ہی آپ۔ پہلے ہی سارے کہتے ہیں شریاں بڑا پلٹی ہے۔“

بادی نے ایک بار پھر اسے تسلی دی۔ وہ بولی۔

”دراصل وڈے بھائی جان اور وڈی باجی میں شادی سے پہلے ہی ناچانی ہوئی تھی۔ وڈی باجی کیہ یوٹر پڑھی ہوئی ہیں۔ کائی لائق ہیں۔ وڈے بھائی جان کا رو بادی ٹائپ کے ہیں۔ مٹکئی کے بعد وڈی باجی نے کہیں وڈے بھائی جان سے کہہ دیا کہ میرا دل چاہندا ہے کہ میں اپنے چاچا جی کے دفتر میں تین چار گھنٹے کی نوکری کروں۔ بس اسی گل کا بہت بڑا جھگڑا بن گیا۔ مٹکئی ٹوٹے ٹوٹے پچی۔ بعد میں وڈی باجی مان بھی گئیں کہ وہ نوکری نہیں کر سکی۔ شادی بھی ہوئی۔ وہ اس گھر میں بھی آئیں۔ پر وہ نوکری والی گل وڈے بھائی جان کے دل میں ہی رہی۔ شادی کے مہینے ڈیڑھ مہینے بعد ہی دونوں میں جھگڑے شروع ہو گئے تھے۔ ساری دنیا جانتی ہے، شادی کے بعد تو کڑی وچاری لاچار ہی ہو جاتی ہے۔ بندے کا پالا ایک دم بھارا ہو جاتا ہے۔ باجی وچاری نے جھگڑا کیا کرنا تھا..... بھائی جان کی طرف سے ہی ہوتا تھا۔ بھائی جان ویسے بھی عروج باجی سے چھ ست سال وڈے ہیں ان کا رعب بھی کافی ہے۔ بس وہ ہر ویلے باجی کو تنگ کر رکھتے ہیں۔“

”باجی کے میکے والے کوئی مل جل نہیں دیتے؟“
ہادی نے پوچھا۔

”نہیں جی، بڑے شریف لوگ ہیں۔ ان کے تو ہر
 ویلے ساہ (سائنس) کو سکے رہتے ہیں۔ باجی سے ملنے بھی
 آتے ہیں تو ڈرڈر کر کہیں بھائی جان ناراض نہ ہو جا سیں۔
 باجی کی طبیعت پرسوں سے خراب تھی۔ پر ان وچاروں کی
 ہمت نہیں ہوئی آنے کی۔ کل رات نو بجے آئے تھے بس
 تھوڑی دیر کے لیے۔ کسی نے چائے تک نہیں پوچھی ان کو۔
 بعد میں وڈے بھائی جان آئے تو میں نے ان سے پوچھ کر
 جانے بٹائی۔“

شریفاں کوچھ بتا رہی تھی۔ اس کی تصدیق ہادی کے سامنے ہو چکی تھی۔ آج اکل فیاض کے گھر میں اس نے وہ سارا تباہ اور خوف اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا جو بیٹی کے سر رال کے حوالے سے ان لوگوں کے دل میں موجود تھا۔ ہادی نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا: ”میں نے کہتے ہیں، ظلم سہنا اور مسلسل سہتہ رہنا بھی ظلم ہے۔ تمہاری وڈی



ہاشمی عرقِ گلاب

آنکھیں Sparkling
چہرہ Glowing



گلاب کی تازہ پتیوں سے کشید کردہ ہاشمی عرقِ گلاب
کا روزانہ استعمال آنکھوں اور چہرے کو
شدید موسمی حالات، گرد و جھول، دھوئیں وغیرہ سے
نجات دلا کر خشک، تڑپنازی اور ماحول کے
مضر ہونے کا احساس عطا کرتا ہے۔



Mohammad Hashim Tajir Surma
E-mail: a.hashmi@cyber.net.pk Web: www.hashmisurma.com
All logos and typography of Hashmi are internationally registered trademarks & Copyright protected.



معلومات حاصل ہوئی تھیں، ان سے یہی شک پڑتا تھا کہ
یہی وہ سیلابی لڑکی ہے جس نے ویش میں اسے طیزا کے نام
سے بے وقوف بنایا اور پھر گدھے کے سیٹگوں کی طرح غائب
ہو گئی۔ اس نے ایسا کیوں کیا تھا؟ یہ سوال ایک گمراہ کی طرح
ہادی کے دل میں بیٹھ گیا تھا۔ اگر وہ اپنے بارے میں کچھ
بتانا نہیں چاہتی تھی تو صاف کہہ دیتی۔ ہادی بھی اس کے لیے
اصرار نہ کرتا مگر یوں اچانک بیٹھے بٹھائے اٹھ کر اوجھل
ہو جانا..... بلاشبہ بد اخلاقی بلکہ سنگدلی کے زمرے میں آتا
تھا۔ وہ جاتے جاتے پارک لیم کا سیٹ بھی ہادی کو دے گئی
تھی۔ وہ اسی طرح ہادی کے بیگ میں پڑا تھا۔ اس کی دید
ہادی کے دل میں خواہ مخواہ کی کک چگائی تھی۔

☆☆☆

تیسرے روز جلال کی بیوی حجاب اسپتال سے گھر
آگئی۔ گھر کا ماحول جو پہلے ہی سنجیدہ تھا اب اور بھی سنجیدہ اور
تناؤ بھرا ہو گیا تھا۔ اسی سہ پہر ظہیر اپنے ایک دوست کو
ملانے لے آیا۔ یہ وہی گلوکار تھا جسے ہادی سے ملنے کا بڑا
اشتیاق تھا۔ نوجوان ہی تھا مگر بال پیشانی سے اڑے ہوئے
تھے۔ وہ ہادی کے لیے کچھ کتابیں اور چاکلیٹیں وغیرہ لے کر
آیا تھا۔ ہادی کو ڈیڑھ دو گھنٹے اس کے پاس بیٹھنا پڑا اور
”سٹائش باہمی“ کے دور سے گزرتا پڑا۔ امان شیر وانی نامی
یہ نوجوان کیا تو ظہیر نے ہادی کو بتایا کہ ارم نو بچے کی فحاشی
سے یہاں پہنچ رہی ہے۔ وہ اسے لینے کے لیے انٹرپورٹ
جار ہے ہیں۔ واپسی پر ملاقات ہوگی۔
اس خبر کا ہادی سچ سے ہی شہر تھا۔ بہر حال اس نے
چہرے کے تاثرات سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔ وہ بے
تابی سے ظہیر کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔ جو گاڑیاں گھر
میں آتی تھیں وہ گارڈنیا کی باز کی دوسری جانب پورج میں
جا کر رکتی تھیں، لہذا ہادی کو امید نہیں تھی کہ وہ ارم کو نو راد کیجے
سکے گا۔ بلکہ ابھی تک تو اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ یہ ارم گھر
کی دیگر خواتین کی طرح مکمل پردے میں ہوگی یا نہیں۔
خدا خدا کر کے ساڑھے دس بجے اور ظہیر کی گاڑی کا
بارن سناں دیا۔ ہادی کھڑکی سے لگ کر بیٹھ گیا۔ گاڑی کو
کھڑکی کے سامنے سے گزرتا تھا۔ وہاں روشنی بھی تھی، مین
ممکن تھا کہ ”گارڈن لائٹ“ کی اس دودھیا روشنی میں وہ
ارم کی ایک جھلک دیکھ سکتا۔ اسے ہرگز معلوم نہیں تھا کہ وہ
اس کی جھلک ہی نہیں، اس کو بڑی وضاحت سے دیکھ سکے گا
اور اس کی آواز بھی سن سکے گا۔
سفید ”لان سیا“ گاڑی اندر داخل ہوئی لیکن رہائی

کیا دھرا ہے، اچھی بھلی سیانی ہوتی۔ بال بچے پیدا کیے ہوئے
ہیں تم نے۔ تمہیں پتا نہیں تھا کہ اس حالت میں بیٹی کو کیا کھلانا
ہے اور کیا نہیں۔“
”کُل..... لیکن واجدہ! وہ تو تمہارے سامنے ہی بتا
رہی تھی کہ اس نے اسے دیکھا بھی نہیں ہے۔“
”واہ، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اس کے میکے گھر سے کوئی
چیز آئے اور وہ اسے کھائے نہ۔ وہاں سے تو سڑے ہوئے
آلو بھی آجائیں گے تو وہ انہیں تبرک سمجھے گی۔ برجیا بنا کر
پیٹ میں ٹھونس لے گی ان کو۔“
خالہ صوفی روہاسی آواز میں یولیں۔ ”لیکن واجدہ!
تم کسی بھی ڈاکٹر تکیم سے پوچھ لو..... انجیر کا پھل تو کسی طرح
بھی نقصان دہ نہیں ہوتا۔“

”ہاں، سب سے زیادہ ڈاکٹری اور حکمت تو
تمہارے ہی خاندان میں ہے۔ لوگ پوچھ پوچھ کر چلتے ہیں
تم سے۔“ واجدہ نے جلی کی آواز میں کہا۔ وہ اتنے بلند
آہنگ میں بات کر رہی تھی کہ پچاس ساٹھ فٹ دور ہادی
کے کانوں تک صاف پہنچ رہی تھی۔
خالہ صوفی نے جواب میں کچھ کہنا چاہا لیکن پھر کہتے
کہتے رہ گئیں۔ تو خمند واجدہ بڑبڑاتی ہوئی واپس اندرونی
حصے کی طرف چلی گئی۔ ماں پٹنا وہیں کھڑے رہے۔ کچھ دیر
بعد جلال ان کے پاس سے گزرا لیکن ان کی طرف دیکھا
نک نہیں۔ پھر فیمل نے ماں کو کندھوں سے تھا اور اپنے
ساتھ لے کر بیرونی برآمدے کے چوبلی بیچوں پر جا بیٹھا۔
ہادی دور سے بھی دیکھ سکتا تھا کہ خالہ صوفی، بیٹی کی اس
مصیبت پر مسلسل رورہی تھیں۔

ہادی نے ریفریجیٹ کے بہانے ظہیر سے اجازت
لی اور باہر چلا گیا۔ وہ خالہ صوفی اور فیمل کے سامنے آنا نہیں
چاہتا تھا۔ پتا نہیں کیوں ہادی اپنے سینے میں گھٹن کی محسوس کر
رہا تھا۔ اسے حجاب کی والدہ پر بے تحاشا ترس آ رہا تھا۔ وہ
ہر لحاظ سے ایک باوقار اور قابل احترام خاتون تھیں لیکن بیٹی
کے لیے خوار ہو رہی تھیں۔ خود بیٹی بھی جیسے ایک بچہ سے میں
پچھ پچھ رہی تھی۔

ہادی یہاں سیر و تفریح کے لیے آیا تھا۔ کسی فیملی کے
اندرونی مسائل کے لیے دل جلانے کی خاطر نہیں۔ اب وہ
یہاں سے جانا چاہتا تھا۔ بس ایک چیز اسے روکے ہوئے
تھی ظہیر کے بیان کے مطابق پرسوں ارم ویش سے یہاں
آ رہی تھی۔ اسے دیکھے بغیر ہادی کے جانے کا کوئی سوال ہی
پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اسے ارم کے حوالے سے اب تک جو

حصے کی طرف جانے کے بجائے انہی کے سامنے رک گئی۔
در اصل ظہیر یہاں اتر کر ہادی کی طرف آنا چاہتا تھا۔ ہادی کا
دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اس کی نگاہیں گاڑی کے اندر
دیکھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ گاڑی کو ڈرائیور چلا کر لایا تھا۔
اس کے ساتھ والی نشست پر دو خواتین موجود تھیں۔ ایک کو تو
اس کی سرخیز چادر سے ہادی نے فوراً پہچان لیا۔ یہ ظہیر کی
بیوی فوزیہ تھی۔ دوسری نے پردہ نہیں کیا ہوا تھا۔ اس کے سر
پر فقط دوپٹا تھا۔ ہادی کی حیات سٹ کر آنکھوں میں
آئیں۔ وہ یقیناً ارم ہی تھی جسے وہ لوگ اتر پورٹ سے لے
کر آئے تھے۔ ہادی اس کی صورت دیکھنا چاہتا تھا۔
درمیان میں دوپٹا حائل تھا۔ پھر صورت حال بدل گئی۔
دوپٹے والی لڑکی نے رخ پھیرا، کھڑی کھولی اور ظہیر کی طرف
ہاتھ ہلا کر چلی۔ ”جلدی آئیے گا جیجی جی۔“ اس کا پورا چہرہ
ہادی کے سامنے تھا۔

ہادی دیکھتا رہ گیا۔ یہ ظہیر انہیں تھی۔ پھر بے ہوش
گالوں اور پچھلے دار بالوں والی یہ کوئی اور لڑکی تھی۔ ہادی کے
اندر جیسے کوئی تیز روشنی بجھ گئی۔ وہ گہری سانس لے کر کھڑکی
کے سامنے سے ہٹ آیا۔ صوفے پر نیم دراز ہو کر سوچنے
لگا۔ وہ کچھ دھڑکنے میں پھنس گیا ہے۔
اسی دوران میں دروازہ کھلا اور ظہیر جھومتا ہوا سا اندر
آ گیا۔ ”دیکھو، نام پر پہنچ گیا نا۔“ اس نے بے تکلفی سے کہا۔
”کس چیز کا نام؟“ ہادی مسکرایا۔

”ہادی بھائی! تم نے وعدہ کیا تھا کہ اپنی کچھ شاعری
Live سناؤ گے۔ میرا مطلب ہے کہ منہ زبانی۔ یا ر! ویسے
یہ اپنا سکرشیر وانی بڑا متاثر ہوا ہے تم سے۔ اس کا خیال ہے
کہ اگر تم یہاں قیام کے دوران میں ایک دو گیت اس کے
نئے البم کے لیے لکھ دو تو اس کا البم ہٹ ہو جائے۔ بڑا بیبا
لڑکا ہے لیکن آج کل ڈراما کس میں آیا ہوا ہے۔“
”ظہیر بھائی! میں کچھ لکھنے لکھانے کے قابل ہوتا تو
اس وقت لاہور میں بیٹھا ہوتا۔ فی الحال میرا ایسا کوئی
ارادہ نہیں ہے۔ بلکہ ارادے کی بھی بات نہیں۔ مجھ سے فی
الحال لکھا جا ہی نہیں سکتا۔“ آخر میں ہادی کا لہجہ ذرا سادہ
ہو گیا تھا۔

ظہیر جلدی سے بولا۔ ”نہیں نہیں، میں نے تو یونہی
بات کی تھی یا ر! یہ شاعری کا کام ہی موڈ کا ہے، میں بڑی
اچھی طرح جانتا ہوں۔“
”مسٹر! لا آئیں؟“ ہادی نے پوچھا۔
”ہاں، ابھی پہنچے ہیں۔“

ہادی نے اچانک موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ”اچھا
ظہیر بھائی! جس دن میں سے پہلی بار آپ کو دیکھا تھا۔۔۔۔۔
وہیں ریسٹوران میں آٹس کریم کھاتے ہوئے، اس دن
آپ لوگوں کے ساتھ ایک لڑکی تھیں۔ انہوں نے نقاب
نہیں کیا ہوا تھا۔ ذرا اونچی لمبی ناک تھی ان کی۔ کتابی سا چہرہ
تھا۔۔۔۔۔“ ہادی نے ہاتھوں کو حرکت دے کر باقاعدہ کتابی
چہرے کا اشارہ دیا۔
ظہیر کی پیشانی پر دو تین سلوٹیں ابھریں۔ وہ جیسے
کچھ سوچ رہا تھا، پھر چونک کر بولا۔ ”..... ہاں..... وہ
مار یہ تھی۔ بھائی! اب کی فریڈ ہے۔ وہ بھی وینس میں رہتی
ہے بھائی سے ملنے آئی ہوئی تھی۔ اسی دن واپس چلی گئی تھی
شام کو۔“

”اچھا، میں حیران ہو رہا تھا کہ باقی خواتین تو باہر وہ
ہیں، وہ کھلتے تھیں۔“ ہادی نے بات بنائی۔
”ہاں، وہ پہلی سے باہر کی تھی۔ ویسے بڑی اچھی لڑکی
ہے۔ بھائی کی دو تین قریبی دوستوں میں سے ہے۔ اب
صرف وہی ہے جس سے بھائی بھی کھانے ملتی ہیں۔ بھائی
جان نے اس کی اجازت دی ہوئی ہے۔“

ہادی کے ذہن میں شک کا بیج پڑ چکا تھا۔ اس کے
ذہن میں بار بار ایک اٹھکا خیال آنے لگا۔ ”نہیں! بھائی! تو
وہ لڑکی نہیں تھی؟“
لیکن یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ یہ تو شادی شدہ تھی۔
پردے کی پابند اور غالباً نہایت سنجیدہ اطوار والی۔ ہادی
نے ظہیر سے تھوڑی سی مزید گفتگو کی جس سے اسے پتا چلا
کہ بھائی پچھلے ہفتے روم سے آگے دوسرے کسی شہر میں تھی
ہوئی تھی۔ اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ وینس سے زیادہ
فاصلے پر نہیں ہے۔

وہ سوچنے لگا، کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ وہ کسی طرح
بھائی یعنی مسز جلال کو دیکھ سکے؟ یہ خاصا مشکل کام تھا۔ وہ
چادر پواری سے باہر پردے میں نظر آتی تھیں۔ ایک موقع
پیدا ہو سکتا تھا انہیں دیکھنے کا، جب وہ اسپتال میں تھیں اور
ہادی نے خون دیا تھا، لیکن اس وقت بھی اچانک وہاں بھائی
کی والدہ اور بھائی کی آمد ہوئی تھی اور ہادی کو دائیں بائیں
ہونا پڑا تھا۔

کئی دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ انسان جو کچھ سوچ رہا ہوتا
ہے اس کا ہوجانا کافی دشوار محسوس ہوتا ہے لیکن پھر وہ اتنا
دشوار نہیں ہوتا۔ مسز جلال یعنی بھائی کے حوالے سے بھی
کچھ ایسا ہی ہوا۔ تیسرے روز ناشتے کے بعد نوبے کے لگ

بجگ ہادی اپنے کمرے کی کھڑکی کی طرف آیا۔ یہ چھٹی کا
روز تھا۔ باہر مکمل خاموشی تھی لیکن شاید سوئے پڑے تھے۔
ہادی کی نگاہ رہا تھی حصے کی طرف گئی۔ اس نے ایک چادر
پوش لڑکی کو انہی کی جانب آتے دیکھا۔ ہادی فوراً سمجھ گیا
کہ یہ بھائی ہے۔ اس کی چادر کا رنگ کالا تھا اور اس پر تین
چار چوڑی چمکیں دھاریاں تھیں۔ یہ چادر ہادی پہلے بھی دو
تین بار دیکھ چکا تھا۔ چادر کے نقاب میں سے بھائی کی فقط
آنکھیں ہی نظر آتی تھیں۔ اس کے کندھے سے شوولڈر بیگ
جھول رہا تھا۔ بیماری کے بعد کی فاقہ تھ اب بھی اس کی
چال سے عیاں تھی۔ وہ مین گیٹ کی طرف جاری تھی اور
ایسا کرتے ہوئے اسے ہادی کے کمرے کی کھڑکی کے
نزدیک سے گزر رہا تھا۔ ابھی وہ کھڑکی سے پندرہ بیس قدم
دور ہی تھی کہ ہادی کو ایک دوسری صورت نظر آئی۔ یہ سیاہ
ڈاڑھی اور سخت چہرے والا جلال تھا۔ وہ لمبے ڈگ بھرتا
ہوا تیزی سے بھائی کے پیچھے آیا۔ اس نے شلوار کے اوپر
ایک نائٹ گون پہن رکھا تھا۔ کھڑکی سے کچھ ہی فاصلے پر
اس نے آواز دے کر بھائی کو روک لیا۔ وہ بیت بنی رہ گئی۔
ہادی کو اندازہ ہوا کہ وہ سسکیاں لے رہی ہے۔ کمرے
کے اندر چونکہ نیم تاریکی تھی اس لیے ان دونوں میں سے
کوئی بھی ہادی کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔

جلال الدین، بھائی کے پاس پہنچا۔ اس نے تیز
سرگوشی میں اس سے کچھ کہا۔ انداز ڈانٹنے والا ہی تھا۔
بھائی سمجھ گھٹا کھڑکی پر رہی۔ اس کا سیدھا بچپنوں
دل رہا تھا۔ دوسری بار جلال قدرے زور سے بولا۔ اس
مرتبہ مدہم آواز ہادی کے کانوں تک بھی پہنچی۔ ”یہ بھی کوئی
طریقہ ہے؟“ جلال نے پتھار کر کہا تھا۔

بھائی نے سب سے ہوئے انداز میں اپنی چمکیں
اٹھائیں۔ کھڑکی سے ان دونوں کا فاصلہ بہ مشکل تین چار میٹر
رہا ہوگا۔ سورج کی رو پہلی کر تین سیدھی بھائی کے چہرے پر
پڑ رہی تھیں۔ چہرے کا رخ ہادی کی طرف تھا۔ مگر اس کے
چہرے میں سے صرف اس کی آنکھیں ہی دکھائی دے رہی
تھیں۔ اچانک ایک بار پھر بائیں کی لہر ہادی کے سینے میں
دوڑ گئی۔ یہ ظہیر کی آنکھیں نہیں تھیں۔ اس کی گہری سیاہ
آنکھیں ابھی تک ہادی کے حافظے پر نقش تھیں۔ بھائی کی
آنکھیں ملکی براؤن تھیں۔ اس نے اپنی آنکھیں بار آنکھوں
سے شوہر کو دیکھ کر کچھ کہا۔ یہ منمنائی ہوئی سی آواز ہادی تک
نہیں پہنچ سکی۔

”چلو واپس۔ مجھے ایسے تماشے پسند نہیں۔“ ایک بار

پھر جلال کی تیز سرگوشی ہادی کے کانوں تک پہنچی۔ ”مگر جانا
ہو تو میں خود چھوڑ کر آؤں گا نہیں۔“
بھائی صدمہ کھینچی۔ اس کے جسم میں شاید اس کے آنسو
ہی متحرک ہوں گے جو سرگوشی سے ہادی کے کانوں تک پہنچیں۔ اس نقاب پر دو پتلی دھاریاں
بڑی نمایاں نظر آتی تھیں۔

”چلو۔“ جلال نے انگلی سے واپس رہا تھی حصے کی
طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ پھر بھائی کے کچھ کہنے سے
پہلے ہی اس کی کلائی تھامی اور اسے لیتا ہوا واپس چل دیا۔ وہ
جیسے اس کے ساتھ چلتی ہوئی چلی گئی۔ پندرہ بیس قدم آگے
جا کر اس کی ایک جوتی اس کے پاؤں سے نکل گئی لیکن جلال
کو پتا نہیں چلا۔ بھائی نے بھی رکنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ
اسی طرح ذرا لنگھتا ہوا تیزی سے شوہر کے ساتھ گاڑی کے باڑ
کے پیچھے اوجھل ہو گئی۔ قریباً ایک منٹ بعد گاڑی کے عقب
سے شریاں نمودار ہوئی اور بھائی کی جوتی اٹھا کر خاموشی
سے واپس چلی گئی۔

ہادی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ پہلے اس کا خیال تھا
کہ ارم ہی ظہیر اہو کی لیکن وہ نہیں تھی۔ پھر اس نے بھائی کے
بارے میں ایسا سوچا۔ بھائی قدامت میں ظہیر اچھی ہی
تھی لیکن اب ثابت ہو رہا تھا کہ وہ بھی ظہیر اچھی ہی
شریافاں اور ظہیر وغیرہ سے ہادی کی جو گفتگو ہوئی تھی اس میں
بھی ظہیر انا ہی لڑکی کا نہیں کوئی ذکر نہیں ہوا تھا۔

وہ اپنے آپ کو ملاتمت کرنے لگا۔ وہ کیوں خواجواہ
ایک بے کار چکر میں الجھ گیا تھا۔ وہ جو کوئی بھی تھی، اسے غپا
دے کر نکل گئی تھی۔ کوئی نام و نشان نہیں چھوڑا تھا اس نے۔ تو
پھر اس کا پیچھا کرنے کا فائدہ؟

بیٹھے بیٹھے ایک بات اس کے ذہن میں آئی۔ ظہیر نے
بتایا تھا کہ مار یہ نامی وہ اونچی ناک والی لڑکی بھائی کی قریبی
سہیلیوں میں سے ہے۔ دوسری طرف وہی لڑکی ظہیر کی
قریبی دوست بھی معلوم ہوئی تھی۔ تو کیا کسی طرح بھائی سے
ظہیر کے بارے میں کچھ معلوم کیا جاسکتا تھا؟ مگر بھائی سے
بات کرنا کیونکر ممکن تھا؟ جلال الدین اس کا موقع ہرگز نہیں
دے سکتا تھا اور دین ممکن تھا کہ بھائی خود بھی بات کرنا پسند نہ
کرتی۔ تو کیا وہ ظہیر سے اس سلسلے میں مدد لے؟ مگر..... یہ
بھی کسی طرح مناسب بات نہیں لگتی تھی۔ کیا وہ اس خاندان
کی لڑکیوں کی ٹوہ لگانے کے لیے یہاں نہیں آ رہا تھا۔ پرسوں
اس نے شریاں سے تھوڑی سی بات کی تھی..... اور باتوں
باتوں میں پوچھا تھا کہ ظہیر اکون ہے؟

میں اس نے مکمل خاموشی اختیار کی تھی۔ شاید اس کا خیال تھا کہ ہادی نقابوں اور چار دیواریوں کے پیچھے جھانکنے میں ناکام رہے گا اور دو چاروں میں یہاں سے چلا جائے گا اور یقیناً ہوتا بھی ایسا ہی تھا۔ اگر آج چانک علیزہ کے سامنے آنے والا واقعہ نہ ہوتا تو ہادی اس تناؤ بھرے ماحول سے نکل جاتا۔

وہ گھر پہنچا۔ اب ظہیر بھی آنے ہی والا تھا لیکن ہادی اس قدر ”اپ سیٹ“ تھا کہ کسی سے کوئی بات کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے شریفاں سے کہا کہ اس کے سر میں ہلکا درد ہے اور وہ سونے کے لیے جا رہا ہے۔ اپنے کمرے میں بند ہو کر وہ دیر تک اس ”معا لڑکی“ کے بارے میں غور کرتا رہا۔ وہ علیزہ نہیں تھی۔ وہ حجاب بھی اور جلال جیسے سخت گیر شوہر کی بیوی بھی۔ آج صبح سویرے بھی میاں بیوی کے درمیان کوئی گڑبڑ ہوئی تھی، روتی سسکتی بیوی کہیں جاری تھی جب جلال نے اسے روکا تھا اور سخت رویہ اختیار کر کے اسے واپس لے گیا تھا۔ یقیناً اس وقت حجاب نے اپنے باپ کے گھر آنے کا ارادہ ہی کیا تھا۔ تب جلال نے کہا تھا کہ اگر اس نے جانا ہی ہے تو وہ خود اسے چھوڑ کر آئے گا اور اب علیزہ اپنی حجاب اپنے والدین کے گھر میں تھی۔ ویش میں اپنی گفتگو کے دوران میں اس نے ہادی سے غورتوں کی مجبوریوں اور ان کے مصائب کے بارے میں جو باتیں کی تھیں وہ ہادی کے ذہن میں تازہ تھیں۔ تو کیا اس کا مطلب تھا کہ وہ باتیں جب جتنی نہیں آپ جتنی کے زمرے میں آتی تھیں۔

خبر نہیں کہ ہادی کتنی دیر ان سوچوں میں غلغلانہ بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔ آج شب روم کی فضا میں تھوڑی سی گرمی تھی۔ شریفاں نے اس کے آنے سے پہلے ہی کمرے کا اسے سی آن کر دیا تھا۔ ٹھنڈک محسوس ہوئی تو ہادی نے اٹھ کر اسے سی آف کر دیا اور ہلکا سا پکھلا چلا دیا۔ اب رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ کونجی میں سکوت تھا، لیکن سو رہے تھے۔ بس کونجی چوکیدار کی وصل کی آواز سنائی دے جاتی تھی۔ اسے میں ہادی کے موبائل کی کھنٹی بجی۔ کوئی نامعلوم نمبر تھا۔ مگر اٹلی کا ہی تھا۔ ہادی نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف سے ایک دہمی نسوانی آواز سنائی دی۔ ”ہیلو“

”کون بول رہا ہے؟“ ہادی نے پوچھا۔

”آ..... آپ ہادی ہی ہیں نا؟“ دوسری طرف سے دریافت کیا گیا۔

ہادی کا دل بیٹے میں اچھل کر رہ گیا۔ وہ پہچان گیا۔ یہ علیزہ ہی کی آواز تھی۔ علیزہ اپنی حجاب۔ وہ خود کو سنبھالتے

”جب“ بھی کہا جاتا ہے۔ چائے وغیرہ پینے کے بعد ہادی زیادہ دیر وہاں نہیں ٹھہر سکا۔ اس کا ذہن گھڑوڑ کا میدان بنا ہوا تھا۔ وہ یوں تو انکل فیاض اور خالہ صوفیہ وغیرہ سے باتیں کر رہا تھا مگر دھیان مسلسل اس ”معا لڑکی“ کی طرف لگا ہوا تھا جو کہیں علیزہ تھی، کہیں حجاب بھی اور کہیں صرف ایک نقاب تھی۔ یہ بڑی ڈرامائی صورت حال لگتی تھی۔ ہادی قریباً ایک گھنٹہ وہاں بیٹھا۔ وہ دوبارہ نظر آئی اور نہ اس کی صورت دکھائی دی۔ گھر والوں سے رخصت ہو کر ہادی واپس اپنی قیام گاہ کی طرف روانہ ہو گیا۔

اب اس میں شبیہ کی کوئی محال نہیں رہی تھی کہ یہی چھوٹی موٹی لڑکی حجاب بھی جو علیزہ ابن کر ویش میں ہادی سے ملی۔ لیکن اس کی آنکھیں اور اس کے بالوں کا رنگ؟ علیزہ کی آنکھیں گہری سیاہ تھیں اور بالوں کا رنگ بھی قدرے مختلف تھا۔ لیکن جو لڑکی ابھی ہادی نے انکل فیاض کے ڈرائنگ روم میں دیکھی، اس کی آنکھوں کا رنگ سیاہ نہیں تھا اور بال بھی شہد رنگ تھے۔ کسی قلم، ڈرائے کی پچویشن ہوتی تو ہادی ضرور سوچتا کہ یہ حجاب اس کی بیڑواں بہن یا ہم شکل وغیرہ ہوگی۔ لیکن یہ جتنی جاگتی زندگی تھی۔ ہادی نے ڈرائنگ روم میں اسے صرف اٹھ دھرتی فٹ کے فاصلے سے دیکھا تھا۔ وہ ننانوے فیصد علیزہ تھی اور پھر اس کی آنکھوں میں اٹھنے والی شائستگی، تو پھر کیا معاملہ تھا؟

جب وہ ویش میں اس سے ملی تو شاید اس نے بالوں کو رنگ کیا ہوا تھا اور آنکھیں؟ آنکھوں پر لینز لگائے گئے ہوں گے۔ بالوں کو رنگنا اور مختلف رنگوں کے لینز لگانا ”نی زمانہ“ اکثر خواتین کو بہت بھاتا ہے۔

یہاں ایک اور سوال بھی تھا۔ حجاب کو ویش میں جب ہادی نے علیزہ کے روپ میں دیکھا تو وہ ایک الحڑ ماڈرن لڑکی تھی۔ اس نے جتلون اور شرٹ پہن رکھی تھی، بال پونی ٹیل میں بندھے ہوئے تھے مگر یہاں وہ سرتاپا چادروں اور نقابوں میں لپیٹی ہوئی تھی۔ ان دور روپ میں اس قدر تضاد تھا۔ کیا یہ کسی عمل کا رد عمل تھا؟ یا اس کے پیچھے کوئی اور وجہ تھی۔ ہادی جتنا سوچ رہا تھا اتنا ہی اس کا ذہن الجھ رہا تھا۔ اب پتا نہیں کیا بات تھی کہ علیزہ اپنی حجاب کا شادی شدہ ہونا بھی ہادی کے لیے ایک عجیب سی بات نام جہنم کا باعث بنا تھا۔

ایک بات تو طے تھی۔ علیزہ یا حجاب اس کی یہاں موجودگی سے سو فیصد آگاہ تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ ان کے گھر کی انکسی میں بطور مہمان ٹھہرا ہوا ہے۔ بہر حال اس سلسلے

تھیں۔ انکل فیاض کسی اور کمرے میں تھے۔ پاس ہی نہیں نیوی چلنے کی مدد آواز آرہی تھی۔ خالہ صوفیہ اس سے بڑی محبت سے پیش آئیں۔ ان کے بے ہوش ہونے والا واقعہ ابھی ان دونوں تک ہی محدود تھا۔ دونوں باتیں کرنے لگے۔ اتنے میں ایک نسوانی آواز سنائی دی۔ ”فیصل..... فیصل یہ دیکھو۔“ پھر ایک لڑکی تیزی سے اندر داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں کھلا ہوا اخبار تھا۔ وہ اچانک ہی اندر آ گئی تھی۔ ہادی اسے دیکھ کر مہبت رہ گیا۔ وہ علیزہ تھی۔ بے شک وہ علیزہ تھی۔ علیزہ نے بھی اسے دیکھا اور بری طرح ٹھنک گئی۔ اس نے جلدی سے دوپٹا سر پر لے لیا۔ آنکھیں حیرت سے وا تھیں۔ چہرہ قدرے زرد نظر آ رہا تھا۔ ایک دیکھتے دیکھتے زرد رہنے کے بعد وہ تیزی سے مڑی اور دروازے سے نکل کر داخل ہو گئی۔

”یہ میری بیٹی حجاب ہے۔“ خالہ صوفیہ مسکراتے ہوئے بولیں۔ ”آج ہی سسرال سے آئی ہے۔“

ہادی نے یہ مشکل خود کو سنبھالا اور بولا۔ ”اب ان کی طبیعت کیسی ہے؟“

”اللہ کا شکر ہے۔ پہلے سے کافی بہتر ہے۔ ہفتہ دن دن یہاں رہے گی تو بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔“

”آ..... آپ سچ کہہ رہی ہیں۔ سسرال میں کتنا بھی پیار مل رہا ہو لیکن جس طرح ماں، بیٹی کی دیکھ بھال کر سکتی ہے کوئی اور نہیں۔“

”بیمار بھی تو کافی ہوئی تھی۔“ خالہ صوفیہ نے سر آدھ بھر کر کہا (ابارشن والی بات وہ ہادی کو نہیں بتا سکتی تھیں)

اتنے میں انکل فیاض بھی آ گئے۔ ان کے ہاتھ میں وہی اخبار تھا جو کچھ دیر پہلے علیزہ کے ہاتھ میں نظر آیا تھا۔ وہ یہی اخبار اپنے بھائی فیصل کو دکھانے کے لیے اندر آئی تھی اور اچانک ہادی کے سامنے آ گئی تھی۔ وہ اخبار دیکھنے لگے۔ ہادی نے بھی سرسری سی نظر دوڑائی۔ انکل فیاض صاحب کی توجہ ایک جواں سال، گلین شیوہ شخص کی تصویر پر پڑی۔ تصویر کے نیچے ایک خبر کا متن تھا۔ شاید یہ کوئی آرٹیکل تھا۔ اس میں اسلامی طرز کی بینکنگ کے کچھ نکتے بیان کیے گئے تھے۔ اخبار دیکھ کر ایک طرف رکھ دیا گیا۔

انکل فیاض بھی محل مل کر ہادی سے باتیں کرتے رہے، ان میں سے ابھی تک کسی کو معلوم نہیں تھا کہ ہادی بہ طور مہمان ان کی بیٹی کے سسرال میں ٹھہرا ہوا ہے اور چند دن پہلے ان کی بیٹی کو اس نے خون بھی دیا ہے۔ اس دوران میں ہادی کو یہ بھی معلوم ہوا کہ حجاب کو گھر میں پیار سے صرف

شریفاں نے اس نام سے اسے علمی ظاہر کی تھی مگر اس کے ساتھ ذرا چوٹی بھی تھی کہ ہادی اس طرح کے سوال کیوں پوچھ رہا ہے۔ اس کا چونکنا ہادی کے لیے شرمندگی کا باعث بنا تھا۔ دوپہر تک ہادی نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ایک دن مزید یہاں ٹھہر کر ظہیر سے اجازت لے گا اور کسی ہوش میں جا ٹھہرے گا۔ اس کے لیے کوئی معقول سا بہانہ بھی اس نے ڈھونڈنا شروع کر دیا۔ اس روز وہ تین چار گھنٹے ظہیر کے ساتھ روم میں گھومتا رہا۔ انہوں نے ایک دو علاقائی ڈشز کھائیں۔ تین چار جگہوں کی سیر کی اور معروف ”پونڈ آف وٹزر“ بھی دیکھا، جہاں دنیا بھر کے سیاح پانی میں سکے اچھالتے ہیں اور دل میں دہی ہوئی خواہشوں کو بڑی خاموشی سے دعاؤں کی شکل دیتے ہیں۔ پتا نہیں کہ یہاں کیا کیا دعائیں مانگی گئی ہوں گی۔ ان میں سے کئی دعائیں ایسی بھی ہوں گی جو اگر منظر عام پر آجائیں تو بے شمار افراد کی خانگی زندگی میں تھلک مچ جائے۔ شاید ماضی میں مانگی گئی کچھ دعائیں ایسی بھی ہوں جنہیں مانگنے والے اب خود اپنی دعاؤں پر شرمندہ ہوں۔ کچھ دعائیں ناکام حسرتوں کا روپ دھار چکی ہوں۔ کچھ دعائیں زندگیوں میں بہار لا چکی ہوں اور کچھ دعائیں ابھی تک ان فضاؤں میں جھلک رہی ہوں۔ پونڈ آف وٹزر کے مدار میں چکر لگا رہی ہوں۔ تالاب میں گرنے والی آبشاروں کے شور میں ان دعاؤں کی سرسراہٹ ہو۔

شام سے ذرا پہلے ظہیر کو اپنے اسٹور پر جانا تھا۔ ہادی کی خواہش پر ظہیر نے اسے ”کونسیئم“ کے قریب ایک چوراہے پر اتار دیا۔ نہجانے کیوں ہادی کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اس بیٹی اور اس کے معاملات کو خیر آباد کہنے سے پہلے ایک بار پھر خالہ صوفیہ اور انکل فیاض سے مل لے۔ خاص طور سے خالہ صوفیہ کی طرف اس کا دل کھینچتا تھا۔ وہ مہربان چہرے والی خاتون اپنی شفیق مسکراہٹ سے اس کے دل کو چھو لیتی تھیں۔ ہادی کے انداز سے کے مطابق انکل فیاض کا گھر وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ وہ پیدل ہی چل پڑا۔ ایک دو جگہوں سے پوچھ کر وہ منزل تک پہنچ گیا۔

گیٹ کی تیل بجانے پر مسکراتے چہرے والا نوجوان چوکیدار نمودار ہوا اور ہادی کو پہچان کر اندر لے گیا۔ ہادی پورچ میں کھڑا ہو گیا۔ ملازم نے اندر جا کر اطلاع دی۔ چند سیکنڈ بعد نوجوان فیصل باہر نکلا اور اس نے ہادی کو خوش آمدید کہا۔ ہادی فیصل کے ساتھ گھر کے سچے سچائے ڈرائنگ روم میں جا بیٹھا۔ خالہ صوفیہ بھی وہیں موجود

ہوئے بولا۔ ”جی، میں ہادی ہوں اور آپ کو کیا کہوں؟“
”میں سمجھی نہیں؟“

”آپ کو عزیز اکہوں یا حجاب؟“

دوسری طرف چند سیکنڈ خاموشی رہی۔ پھر حجاب کی مدغم آواز آئی۔ ”آپ کیوں میرے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ میں نے ایسی کون سی غلطی کر دی ہے؟“
”میری تو میں سوچ رہا ہوں کہ میں نے کیا غلطی کر دی لیکن..... پہلے آپ بتائیں کہ آپ کو میرا نمبر کہاں سے ملا؟“

”فیصل کے سیل فون سے لیا ہے۔“ دوسری طرف سے ساٹ لہجے میں جواب ملا۔
”مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا کہ میں آپ کی آواز سن رہا ہوں۔“

وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”دیکھیے ہادی صاحب۔ میں نے آپ کو ایک شریف ہم وطن سمجھا اور آپ کے ساتھ تھوڑا سا وقت گزارا۔ ہم اکٹھے کھوے پھرے اور پھر خوش دلی سے ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئے۔ میں آپ کے حوالے سے کچھ اچھے تاثرات لے کر لوٹی..... اور میرے خیال میں آپ کی کیفیت بھی یہی ہونی چاہیے تھی۔ یہ ایک بڑا اچھا اختتام تھا۔ مجھے آپ سے ہرگز ایسی توقع نہیں تھی.....“

”کیسی توقع؟“

”میری جو آپ کر رہے ہیں۔“ اس کا لہجہ قدرے تلخ ہو گیا۔ ”میری ٹوہ لگاتے ہوئے آپ میرے گھر پہنچے اور پھر یہاں امی کے گھر بھی پہنچ گئے۔ مہ..... میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آپ کیا چاہ رہے ہیں۔“ اس کی آواز میں خوف کی لرزش بھی شامل ہوئی۔

”یہ سب کچھ اتفاقیہ ہوا ہے۔ شاید آپ نے دیکھا ہی ہوگا۔ میں وہاں آئس کریم بار میں گیا تھا۔ وہاں آپ کے دو پرظہر صاحب نے مجھے پہچان لیا۔ انہوں نے ایک دن پہلے اخبار میں میری تصویر دیکھی تھی۔ وہ اٹھ کر میری میز پر آئے..... اور بعد میں زبردستی اپنے گھر بھی لے آئے۔“

”میں یہ بات نہیں مان سکتی۔“

”کون سی بات؟“

”میری کہ آپ اتفاقاً آئس کریم شاپ پر آ گئے تھے۔ آپ یقیناً پہلے سے میرے پیچھے تھے۔“ وہیں میں اس کی آواز بھرائی ہوئی رہی لیکن اب بالکل صاف اور کھٹک دائرگی۔

ہادی چند سیکنڈ کے لیے خاموش ہو گیا۔ وہ بات تو ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ وہ اتفاقاً آئس کریم بار میں نہیں کھرا تھا۔ اس نے پہلے اونچی ناک والی ماریہ کو دیکھا تھا اور پھر بار میں ”انٹری“ ڈی تھی۔

”میں آپ کو کیسے یقین دلاؤں؟“ وہ سنبھل کر بولا۔
”آپ کو یقین دلانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ پلیز میری چھوٹی غلطی کی مجھے اتنی بڑی سزا نہ دیں۔ آپ سوچ بھی نہیں سکتے کہ اس کا نتیجہ میرے لیے کتنا برا نکل سکتا ہے۔ میں شادی شدہ ہوں۔ میرے گھر والوں کو پتا چل گیا تو قیامت برپا ہو جائے گی۔“ اس کی آواز بھرائی۔

”عزیز!..... میرا مطلب ہے حجاب! آپ پریشان نہ ہوں۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا کہ میری وجہ سے آپ کے لیے کوئی مشکل کمزی ہو۔ مجھے تو صرف یہ محسوس تھا کہ آپ وہیں کے اس ریسٹوران میں بیٹھے بٹھائے اچانک کہاں چلی گئیں۔ کہیں خدا نخواستہ آپ کے ساتھ کوئی حادثہ پیش نہ آ گیا ہو۔ میں سوچتا تھا کہ اگر آپ خود ہی تھیں تو اس طرح اچانک کیوں گئی ہیں؟ کیا مجھ سے کوئی غلطی ہوئی جس کی وجہ سے آپ ناراض ہو گئیں، یا پھر ایسی ہی کوئی اور وجہ؟“
”کوئی وجہ نہیں مہادی صاحب۔ کچھ بھی نہیں تھا۔ بس مجھے لگا کہ ہمیں اب الگ ہو جانا چاہیے..... اور میں آگئی۔“

”آپ نے یہ بھی نہ سوچا کہ میں وہاں آپ کا انتظار کرتا رہوں گا اور دیوانوں کی طرح منہ اٹھا کر گھومتا رہوں گا۔ دکانوں میں جمگٹوں کا راہ گیروں سے بوجھوں گا.....“
”میری تو میں کہہ رہی ہوں کہ اتنی سی غلطی کی مجھے اتنی بڑی سزا نہ دیں۔ پلیز آپ چلے جائیں یہاں سے۔ میں ہمیشہ آپ کی شکر گزار رہوں گی.....“

ہادی مسکرایا اور ہلکے ہلکے لہجے میں بولا۔ ”اور ان سوالوں کا کیا ہوگا جو میرے ذہن میں پیدا ہو گئے ہیں۔ کچھ وہاں وہیں میں اور کچھ یہاں روم میں، آپ کے گھر کو اور وہاں کے ماحول کو دیکھ کر۔“

وہ ٹھنک آواز میں بولی۔ ”ضروری نہیں ہوتا کہ ہر سوال کا جواب ڈھونڈا جائے اور وہ مل بھی جائے اور یہاں کوئی ایسا اہم سوال ہے بھی نہیں۔ میں ایک سیدھی سادی گھریلو لڑکی ہوں۔ شادی شدہ ہوں۔ شادی شدہ زندگی کے جو تھوڑے بہت مسائل ہوتے ہیں وہ میرے ساتھ بھی ہیں۔ ہر کسی کے ساتھ ہوتے ہیں۔ یہاں کچھ بھی ایسا نہیں ہے ہادی صاحب! جس کی آپ جتنو کر سکیں اور جس میں

آپ کی دلچسپی کا کوئی سامان ہو۔“

ہادی نے کہا۔ ”ٹھیک ہے حجاب صاحبہ! میں مانتا ہوں کہ آپ ایک سیدھی سادی گھریلو لڑکی ہیں۔ شادی شدہ اور با پردہ ہیں لیکن اسی لڑکی کو میں نے وہیں میں ایک اور سی پنچل روپ میں دیکھا ہے۔ جین اور جوگرز کے ساتھ بھاگتے دوڑتے، جھولے جھولتے اور پیڈل بوٹ چلاتے۔ اس لڑکی میں اور آپ میں زمین آسمان کا فرق ہے۔“

”بس..... بس سمجھیں کہ وہ ایک..... ڈراما تھا، جو مجھے کسی مجبوری کی وجہ سے کرنا پڑا، کسی کی خاطر۔ آپ اس کے لیے مجھے معاف کر دیں۔ میں ساری زندگی آپ کی شکر گزار رہوں گی۔“ وہ پھر رو ہانسی ہو گئی۔

اس کے انداز سے عیاں تھا کہ وہ بات کو لپیٹ رہی ہے۔ سچائی کے قریب بھی جانا نہیں چاہتی۔ ہادی بھی اتنی آسانی سے چھٹا چھوڑنے والے نہیں تھا۔ وہ ایک تخلیق کار تھا۔ انسانی نفسیات کی گتھیوں کو سمجھنا اور سمجھانا اسے پسند تھا۔ وہ جانتا چاہتا تھا کہ اس لڑکی کے ساتھ کیا کچل رہا ہے۔ وہ کیا خوف ہے جس نے اسے اور اس کے ماں باپ کو اس بری طرح جکڑ رکھا ہے۔ لڑکی والوں کا لڑکے والوں سے دب کر رہنا کوئی انوکھی بات نہیں ہوتی لیکن یہاں یہ صورت حال کچھ زیادہ گہرے بلکے اسے ترس ناک کہنا مناسب تھا۔

پھر ہادی کے ذہن میں وہ تصویر والی بات آئی۔ وہاں حجاب کے میکے میں ایک کمرے کے اندر ایک لڑکی کی دیوار گیر تصویر لگی تھی۔ اس کے نیچے غالباً حجاب کے ہاتھ سے لکھا گیا تھا۔ ”میں تمہیں بھی بھول نہ پاؤں گی۔“

حجاب فحاش۔

وہ کون لڑکی تھی؟ کیا اس کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آ چکا تھا یا وہ کسی وجہ سے علیحدہ یعنی حجاب سے جدا ہو گئی تھی۔ بہت سے سوال ہادی کے ذہن میں کلپا رہے تھے۔

”آپ کی ایک چیز میرے پاس پڑی ہے۔ وہ میں آپ کو واپس دینا چاہتا ہوں۔“ ہادی نے بات بنائی۔

”آپ پارک بین سیٹ کی بات کر رہے ہیں۔ وہ آپ کا..... حق بنتا تھا۔ آپ نے زبردستی کر کے ہر جگہ اپنا پرس کھولا تھا۔ مجھے یہ اچھا نہیں لگا..... آپ ویسے تو ہر گز پیسے نہ لیتے۔ میں نے قلم آپ کے بیگ میں رکھ دیے۔“

”اگر آپ نے اتنی ہی باریکی سے حساب کتاب کرنا تھا تو پھر پورا کر لیتیں۔ میرے پاس سب لکھا ہوا ہے۔“

ڈائری میں حساب لکھنا میری Habit ہے۔“
”کیا..... کچھ اور نکتے ہیں میری طرف سے؟“

”نہیں آپ کے نکتے ہیں..... کم از کم 60 یورو۔“

”نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔“ وہ رسمی لہجے میں بولی۔ ”آپ نے کچھ اور بھی تو کیا ہے میرے لیے۔ مجھے پتا ہے جب میں اسپتال میں گئی تو آپ نے مجھے خون دیا۔ اس کی قیمت تو میں پچا ہی نہیں سکتی۔ بس آپ کے احسان کا شکر یہ ادا کر سکتی ہوں۔“

”تو پھر آپ نے مجھے شکر یہ ادا کرنے کا موقع کیوں نہیں دیا؟“

”چلیں غلطی ہو گئی۔ اب اس کے لیے بھی مجھے معاف کر دیں..... اور پھر، صرف ایک درخواست ہے آپ سے۔ پلیز آپ چلے جائیں۔ ایک اچھے دوست کی حیثیت سے میں آپ کو ہمیشہ یاد رکھوں گی۔“ اس کے لہجے میں غلٹ اور بیگانگی تھی۔

یہ غلٹ اور بیگانگی ہادی کو بری لگ رہی تھی۔ وہ اس سے کم از کم ایک بار تو ضرور ملنا چاہتا تھا اور وہ اس پوزیشن میں تھا بھی کہ عزیز اکہوں کے لیے مجبور کر سکتا۔ ویسے بھی وہ آٹھ دس دن کے لیے میکے آئی ہوئی تھی۔ تھوڑا بہت وقت نکال سکتی تھی۔

اس نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”ٹھیک ہے عزیز!..... میرا مطلب ہے حجاب صاحبہ! آپ کہتی ہیں تو میں چلا جاتا ہوں بلکہ شاید دو چار دن میں اٹلی سے ہی چلا جاؤں لیکن ایک چھوٹی سی بے ضرر شرط ہے۔ امید ہے آپ قبول کریں گی۔“

”کیا؟“ وہ ڈری ڈری آواز میں بولی۔

”آپ نے مجھے دوست کہا ہے..... اور میں حقیقتاً ایک خلص دوست ہی ہوں۔ کم از کم ایک بار مجھ سے کہیں مل لیں، بس تھوڑی دیر کے لیے۔ ہم ایک دوسرے کو اچھے طریقے سے خدا حافظ کہہ دیں گے۔“

وہ چپ رہی..... ہادی نے سمجھا شاید سوچ رہی ہے لیکن جب وہ بولی تو اس کا لہجہ مزید بیگانہ ہو چکا تھا۔ ”معاف کیجیے ہادی صاحب! میرے لیے ممکن نہیں ہے۔“

”لیکن میں تو آپ کی بات مان رہا ہوں۔“
”تو اس کا کیا مطلب ہے؟..... میں یہ سمجھوں کہ..... آپ مجھے بلک میل کرنا چاہ رہے ہیں؟“

”یہ کیسی بات کر رہی ہیں آپ؟“
”وہی جو آپ سمجھا رہے ہیں مجھے۔“ اس کا لہجہ مزید تلخ ہو گیا۔ ”انٹوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ مجھے آپ سے یہ توقع نہیں تھی۔ ہم نے ایک بڑے اچھے موڈ پر بات ختم کی

تھی لیکن آپ پھر دندنا تے ہوئے آگے ہیں میرے گھر تک۔ آپ..... آپ وہی کچھ کر رہے ہیں جو آپ جیسے مرد کرتے ہیں..... آپ میں اور ان مردوں میں شاید کوئی فرق نہیں جو عورت کو بس ایک ہی روپ میں دیکھتے ہیں۔ اس کو بس گھبرانا چاہتے ہیں۔“ اس کا لہجہ آنکھیں ہو گیا۔

”پلیسی بات کر رہی ہیں آپ؟“
”پلیز سٹ اپ..... پلیز سٹ اپ!“ وہ پھنکاری ”مجھے نہیں بلکہ میل ہوتا ہے آپ سے۔ میں نہیں مل سکتی..... نہیں مل سکتی..... مجھے شرم آ رہی ہے کہ میں نے آپ کو دوست کہا۔ آپ کے ساتھ وقت گزارا۔ مجھے شرم آ رہی ہے.....“ اس کی آواز غصے سے بھر گئی۔

”آپ میری بات سمجھنے کی کوشش کریں.....“
لیکن دوسری طرف سے رابطہ کٹ چکا تھا۔ ہادی نے کچھ دیر فون کان سے لگائے رکھا پھر مرے مرے انداز میں نیچے رکھ دیا۔ اسے حجاب سے اتنے شدید رد عمل کی توقع نہیں تھی۔

اسے غلطی کا احساس ہونے لگا۔ شاید اسے ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا۔ یہاں سے جانے کے لیے اس نے غلطی کی شرط نہیں رکھنی چاہیے تھی۔ یقیناً اس نے محسوس کیا تھا کہ ہادی اس پر دباؤ ڈال رہا ہے۔ اپنے حالات کی وجہ سے وہ پہلے ہی ڈپریشن میں تھی، اب مزید ڈپریشن ہو گئی تھی۔

ہادی کو افسوس ہونے لگا۔ اس نے کچھ دیر بعد اسی نمبر پر رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر وہ خاموش ہو چکا تھا۔ وہ سیکے سے ٹیک لگا کر ہم دروازہ ہو گیا۔

کچھ دیر بعد وہ پھر اس نمبر پر کال کرنے میں مصروف ہو گیا۔ اب نمبر تو آن ہو گیا تھا لیکن کال ریسپونڈ نہیں کی جا رہی تھی۔ وہ قریباً ایک گھنٹے تک وقفہ وقفہ سے کوشش کرتا رہا۔ آخر ایک جوانی ایس ایم ایس آیا۔ یہ اسی نمبر سے تھا۔ حجاب نے بس اتنا لکھا تھا۔ ”پلیز پلیز پلیز۔ میرے حال پر رحم کریں۔“

حجاب کی شکل ہادی کی نگاہوں میں گھوم گئی۔ وہی تابندہ پیشانی، وہی جاذب نقوش جن میں مصیبت کا عنصر نمایاں تھا۔ اس کے ساتھ ہی خالص صوفیانہ مہربان چہرہ بھی نگاہوں میں گھوما۔ یہ ماں میں مشکلات کا شکار تھیں بلکہ پورا گھبراتا ہی دکھاتا تھا۔ ہادی ان کی مشکلات میں اضافے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ کچھ دیر کم رہنے کے بعد اس نے موبائل فون اٹھایا..... اور ایس ایم ایس لکھ دیا۔ ”او کے حجاب! میں وہی کروں گا جو آپ چاہتی ہیں۔ گڈ بائے۔“

ایس ایم ایس لکھ کر جیسے اس کے سینے سے ایک بڑا بوجھ ہٹ گیا۔ وہ کچھ دیر تک حجاب کے کسی جوانی کی انتظار کرتا رہا۔ جب نہیں آیا تو وہ ٹھوڑی دیر تک گروٹس بدلنے کے بعد سو گیا۔

اگلے روز ہادی صبح اٹھا تو طبیعت میں کچھ بیماری پائی تھا۔ پہلے اس نے سوچا کہ شریفاں کو آواز دے اور بیٹنی کے لیے کہے لیکن پھر اسے اندازہ ہوا کہ وہ انہی میں نہیں ہے۔ اگر ہوتی تو کہیں نہ کہیں سے کھٹ پٹ کی آوازیں ضرور آ رہی ہوتیں۔ وہ شاید رہائشی حصے کی طرف گئی ہوئی تھی۔ وہ یونہی لیٹا رہا۔ رات والی فون کال کی ساری تفصیل ذہن میں تازہ ہونے لگی۔ اس نے پختہ ارادہ کر لیا کہ آج سہ پہر تک یہاں سے چلا جائے گا۔

کچھ دیر بعد شریفاں خود ہی کمرے میں نمودار ہوئی۔ ”سلاماں لکھ صاحب جی۔“ اس نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔

”کہاں چلی گئی تھیں؟“ ہادی نے پوچھا۔
وہ ڈرامہ بنا کر بولی۔ ”وہی بی بی ارم کے لیے نو والا قبوہ بنانے کے لیے۔ وہ صبح سویرے پہنچی ہیں۔ کافی غزے غزے ہیں ان کے۔ بس اب آگئی ہیں نا۔ میری جان کو مصیبت بڑی رہے گی۔“

”کیوں نہیں ان کا آنا چاہتا تھا؟“
”کسی کو بھی نہیں لگتا جی، بلکہ میرا تو اندازہ ہے کہ خود فوز یہ باقی کو بھی چنگا نہیں لگتا۔ پر وہ پھر بھی آجاتی ہیں بلکہ..... اب تو..... سنا ہے کہ پکا ہی آگئی ہیں۔ ان کا داخلہ یہاں کے ایک کالج ہو گیا ہے۔ اب ادھر ہی رہیں گی۔ مان نہ مان، میں تیرا مہمان۔“ شریفاں نے ہزاری سے سر ہلایا۔

اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اسے زیادہ پسند نہیں کرتی۔ اتنے میں ظہیر بھی آ گیا۔ ہادی نے نکل رات ہی ظہیر کو ذہنی طور پر تیار کر دیا تھا اور کہہ دیا تھا کہ وہ اب ڈرامہ جگہ جا رہا ہے۔ اس کے دوست نے یہاں کے ایک ہوٹل واسکوڈے میں قیام کیا تھا۔ اب وہ بھی دو چار روز وہاں رہنا چاہتا ہے ورنہ اسے روم کی سیر ادھوری لگے گی۔

ظہیر نے ہادی کو روکنے کی کوشش تو کی تھی لیکن زیادہ جوش سے نہیں، ہادی کو اندازہ ہوا تھا کہ شاید ظہیر کے بھائی جان جلال، یہاں مہمان خانے میں ہادی کے طویل قیام کو زیادہ پسند نہیں کر رہے۔ پچھلے سات آٹھ روز

میں وہ صرف ایک بار یہاں آ کر ہادی سے ملے تھے اور وہ بھی کھڑے کھڑے اس دوران میں بھی جناب کا فون مسلسل بچتا رہا تھا۔
ظہیر کے آتے ہی شریفاں باہر چلی گئی۔ ظہیر نے مایوس لہجے میں کہا۔ ”یار! اب تو تمہارے ساتھ دل لگنا شروع ہوا تھا۔ اب تم اڑن چھو ہو رہے ہو۔ ابھی تو ارم کسی ہوٹل میں تھیں ڈرنو دینا چاہ رہی تھی۔“

”اس نے کہہ دیا ظہیر بھائی تو سمجھیں ڈرن ہو گیا۔ میری بہن سے میری طرف سے معذرت کر دینا۔“
”یہ معذرت تو تمہیں خود ہی کرنا پڑے گی۔ ابھی بھائی جلال جاتے ہیں تو وہ تم سے ملنے آتی ہے۔“

ظہیر کے فقرے سے ہی ظاہر تھا کہ اس گھر میں کوئی بھی کام کرنے سے پہلے جلال الدین کی خوشی یا ناراضی کا سوچا جاتا ہے۔ جن کاموں میں اس کی ناراضی کا ڈر ہو وہ اس کی غیہ موجودگی میں کیے جاتے ہیں۔ مثلاً ارم اس سے ملنا چاہ رہی تھی لیکن ابھی تک نہیں مل سکی۔

سہ پہر تک ہادی جانے کے لیے سامان پیک کر چکا تھا۔ ان چند دنوں میں شریفاں کے ساتھ اس کی کافی بے لکھی ہو چکی تھی۔ وہ آزدہ نظر آ رہی تھی۔ اپنی گلابی اردو میں بولی۔ ”اسمیت تے سب ہی ٹیٹ اردو میں گل کرتے ہیں۔ میری تو زبان کوول پے گیا ہے اردو بول بول کے۔ آپ نے اک دوواری میرے نال دیا جی۔ بے گل سیتی ہے تو مجھے اپنے پنڈے کھیتوں اور باغوں کی خوشبو آتی ہے۔“
”کوئی بات نہیں شریفاں! میں تمہیں بھی بھی فون کیا کروں گا۔“ ہادی نے کہا۔

اس دوران میں ارم بھی آگئی۔ اس نے چادر کا رسی ساقبب کر رکھا تھا۔ اس نقاب نے صرف اس کے ہونٹ اور ناک کا مختصر حصہ چھپایا تھا۔ لگتا تھا کہ وہ پردے کی عادی نہیں مگر یہاں جلال الدین کی مرضی پر چلنا پڑتا تھا۔ ارم قبول صورت تھی، ہو سکتا ہے کہ وہ عمر میں حجاب سے کچھ چھوٹی ہو لیکن اپنے خندو خال کی وجہ سے حجاب کی ہم عمری نظر آتی۔ اس کی آنکھوں میں چمک اور ایک خاص طرح کی ہوشیاری تھی۔ اس نے ہادی کو بھائی جان کہہ کر مخاطب کیا اور کہا کہ وہ ہادی کو بطور گیت نگار جانتی ہے اور ٹی وی سے نشر ہونے والے اس کے ایک دو گیت اسے بہت اچھے لگتے ہیں۔ اس نے چار پانچ منٹ ہادی سے بات کی۔ وہ گفتگو کا فن جانتی تھی اور ان لوگوں میں سے تھی جو بات چیت کے دوران میں اپنے بارے میں کم بتاتے ہیں اور دوسرے کے

متعلق زیادہ سے زیادہ جان لیتے ہیں۔
ظہیر نے اطلاع دیتے ہوئے بتایا۔ ”بھائی جلال کی کوشش سے ارم کو یہاں روم کی ہی ایک یونیورسٹی میں داخلہ مل گیا ہے۔ اب اسے ویش کی دال روٹی نہیں کھانا پڑے گی۔“

وہ خوشی سے بولی۔ ”جی جی! دال روٹی تو خیر میں وہاں بھی نہیں کھاتی تھی..... بہترین Cook بن گئی ہوں ان دو چار مہینوں میں۔ اگر مجھے یہ ڈرنہ ہوتا کہ آپ مجھے مستقل کام پر لگا دیں گے تو آپ کو اپنی کوکنگ کے ایک دو نمونے ضرور دکھاتی۔“

”بہت دور کی سوچتی ہو بھی تم۔ تمہیں تو اقوام متحدہ کے پلاننگ کمیشن میں ہونا چاہیے۔“ ظہیر نے کہا اور ہنسنے لگا۔ ہنسنے ہوئے اس کی توند علیحدہ سے نکلتی تھی۔

شریفاں برا سامنہ بناتے ہوئے باہر چلی گئی تھی۔ ہادی کو ارم کا کردار کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ اس گھر میں اس کی موجودگی کو اس کی سگی بہن بھی کچھ زیادہ پسند نہیں کرتی تھی، پھر جی وہ یہاں موجود تھی۔

شام سات بجے کے لگ بھگ ہادی اپنے ہوٹل کے کمرے میں پہنچ چکا تھا۔ یوں تو وہ ظہیر، شریفاں اور ارم وغیرہ سے کہہ کر آیا تھا کہ ان سے فون پر رابطہ کرے گا، تاہم وہ اس قسم کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اس نے حجاب سے جو گفتش کی ہے اس پر پورا اترے اور اب ان لوگوں کی زندگی میں کسی طرح کا کوئی دخل نہ دے۔ خاک ڈال دے سارے معاملے پر۔ غالباً حجاب نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ ان دونوں کے اس بے ضرر تعلق کے بارے میں کسی کو پتا چل گیا تو قیامت آجائے گی۔ وہ اس گھر کا کھن سے پر ماحول دیکھ چکا تھا اور خاص طور سے جلال الدین کا رویہ بھی ملاحظہ کر چکا تھا۔ اسے معلوم تھا جلال جیسے لوگ ایسے معاملوں میں بے حد ”جی“ اور جذباتی ہوتے ہیں۔

☆☆☆

اگلے پانچ چھ روز ہادی نے روم میں گھومتے ہوئے ہی گزارے۔ اسے تاریخ میں بہت دلچسپی تو نہیں تھی لیکن وہ جن جگہوں کی سیاحت کرنا چاہ رہا تھا ان کے بارے میں اس نے کچھ نہ کچھ پڑھا تھا۔ روم میں جو چند جگہیں اسے لازمی دیکھنا تھیں۔ ان میں پونڈ آف وشر یعنی خواہشوں کا تالاب۔ کوئینم یعنی وہ قدیم جنگی اکھاڑا جہاں انسان بھوکے شیروں سے لڑتے تھے..... گلیڈی ایٹر اسکول جہاں سائیکلو کو بتایا جاتا ہے کہ گلیڈی ایٹر کیسے بنایا جاتا ہے..... اور

پھر روم سے ذرا آگے پومپائی کے کھنڈرات جہاں انسان لاوے میں جمے ہوئے ہیں، اور روم کی بڑی مسجد جو یورپ کی سب سے بڑی مسجد بھی ہے اور ”دینی کن“ یعنی عیسائیوں کا مقدس شہر وغیرہ شامل تھے۔ ان میں سے پونڈ آف وٹز وہ دیکھ چکا تھا باقی لاتعداد جگہیں ابھی دیکھنے والی تھیں۔ وہ صبح سویرے نکل جاتا اور شام کو گھٹن سے چور ہو کر واپس آ جاتا۔ یہ مصروفیت اس کے لیے ایک طرح سے سودمند بھی تھی۔ وہ علیزائقی حجاب کی طرف سے اپنی توجہ ہٹانے میں کامیاب ہو رہا تھا۔ اس کی تابندہ پیشانی، اس کے جاذب نقوش اور نقوش کے پیچھے چھپے ہوئے مسائل دھیرے دھیرے اس کی سوچ میں دھندلانے لگے۔ اٹلی کے پیزے کے بارے میں اس نے بہت سنا تھا بلکہ اسے معلوم ہوا تھا کہ پیزا ایجاد ہی اٹلی سے ہوا تھا۔ یہاں اسے عیسویں قسم کے پیزے دیکھنے کو ملے۔ کھانے کے وقت جہاں کوئی اچھی پیزا شاپ نظر آتی وہ اس میں گھس جاتا۔ اس نے مقامی دوستوں میں سے صرف دو بندوں کو بتایا تھا کہ وہ کہاں ٹھہرا ہوا ہے اور ساتھ ہی ان کو تاکہ بھی کر دیتی تھی کہ وہ اس قیام گوراز میں رکھیں۔ وہ کاغذ اور قلم سے دور ہونے کے لیے یہاں آیا تھا لیکن یہ دوست احباب اسے پھر ان چیزوں کی طرف مھکیٹ لاتے تھے۔ وہ چند پیسے آزادی کے چاہتا تھا، مکمل آزادی کے۔ کبھی کبھی تو اس کا دل چاہتا کہ اسے اپنے ارد گرد کوئی شتا سا چہرہ نظر ہی نہ آئے۔ بس وہ اجنبی لوگوں کے درمیان، اجنبی جگہوں پر گھومتا رہے اور اس کے کانوں میں اجنبی ناقابل فہم الفاظ ہی پڑتے رہیں۔ اگلے تین چار دن میں وہ بار نظیر کا فون آیا۔ ہادی نے اس سے بھی مختصر بات ہی کی۔ اس کے دل میں کوئی کھد بھد پیدا ہو چکی تھی۔ وہ اس کھد بھد کو کوئی نام نہیں دے سکتا تھا۔ کسی ایسی کیفیت کا اسے پہلے بھی کوئی تجربہ ہی نہیں ہوا تھا۔ اسے یوں لگتا تھا کہ اس کے سینے میں کوئی پتھر لی جگہ چاک نرم گداز شکل اختیار کر گئی ہے۔ رات کو جب وہ بستر پر لیٹا تو اس کی ساعت کو وہی الفاظ مجروح کرنے لگتے جو اپنی فون کال میں حجاب نے کہے تھے۔ ”آپ سب مرد ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔ عورت کو بس ایک ہی روپ میں دیکھتے ہیں۔ اس کو کسی طرح گھبرنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ مجھے شرم آ رہی ہے کہ میں نے آپ کے ساتھ وقت گزارا۔“

چند دن تو ان بھلوں کی کئی کافی شدید رہی، پھر ان کی کاٹ کا اثر کم ہونے لگا۔ بالکل جیسے حادثات اور ناپائیدہ واقعات کے برے اثرات بتدریج معدوم ہونے لگتے ہیں۔ لیکن سینے کے اندر کا وہ بام نام گداز جوں کا توں باقی رہا۔ یہ نویں دسویں روز کا واقعہ ہے۔ ہادی اپنے ہوٹل کی بالکونی میں بیٹھا سگریٹ پھونک رہا تھا۔ یہ بالکونی یہاں کی اکثر بالکونیوں کی طرح پھولوں سے لدی ہوئی تھی۔ یہ ہوٹل کا سیکنڈ فلور تھا اور یہاں سے نیچے سڑک کا منظر واضح نظر آتا تھا۔ ٹریفک رواں دواں تھی۔ اس ٹریفک میں کھلی چیت کی لگژری کاریں اور ہر طرح کے اسکوڑ بھی نظر آتے تھے۔ شام کا چھٹپٹا دھیرے دھیرے رات کی سیاہی میں ڈھل رہا تھا اور روم کی ہزار ہا روشنیاں نمایاں ہوتی جا رہی تھیں۔ سڑک کی دوسری جانب ایک کاشادہ گلی میں ایک کار پارک تھی۔ اس میں ایک مخمور جوڑا رومانی موڈ میں موجود تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو بازوؤں میں لیا ہوا تھا، لپٹ رہے تھے، چوم رہے تھے اور اس طرح کی دیگر حرکات میں مصروف تھے۔ ہادی کن انکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ اسے صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ چھوٹی سی کار اب اس پھر سے ہونے جوڑے کے لیے ناکافی ہے اور اب وہ کہیں اور جانا چاہیں گے۔ شاید کسی ہوٹل میں یا پھر کسی گھر کے بیڈ روم میں اور پھر یہی ہوا۔ کار وہاں سے روانہ ہوئی۔ ہادی نے اپنی توجہ دیگر مناظر کی طرف مبذول کر دی۔ مناظر کی یہاں کوئی کمی نہیں تھی۔ ہر مزاج کے شخص کے لیے ہر طرح کا سنجیدہ اور غیر سنجیدہ منظر یہاں موجود تھا۔

اچانک ہادی کے فون کی بیل ہوئی۔ اس نے اسکرین دیکھی۔ مقامی نمبر تھا۔ وہ کچھ دیر دیکھتا رہا پھر ایک دم اس کی رگوں میں ابھری گردش تیز ہو گئی۔ اس نمبر سے ایک بار حجاب نے اسے فون کیا تھا۔ تو کیا یہ حجاب تھی؟ یہ کیسے ہو سکتا تھا؟ اس نے لرزتی انکھوں سے کال ریسیو کی۔

دو سیکنڈ کی خاموشی کے بعد ٹھنک دار نوسانی آواز سنائی دی۔ ”ہیلو۔“

”ہیلو کو؟“ ہادی نے جانتے بوجھتے سوال کیا۔

”میں حجاب بول رہی ہوں، کیسے ہیں آپ؟“

”بس ٹھیک ہوں۔“ ہادی نے تجھے تجھے لہجے میں کہا۔

”کہاں پر ہیں اس وقت؟“

”میںیں روم سینٹر میں واسکوڈے ہوٹل ہے۔ آپ نے کیسے یاد کیا؟“

”بس یونہی، دل چاہ رہا تھا بات کرنے کو۔ آپ اس وقت مصروف تو نہیں؟“

”نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں۔“

”یہ ہوٹل واسکوڈے یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ میٹروپین کے ذریعے دس منٹ کا راستہ ہے۔“ آپ کا روم نمبر کیا ہے؟“

ہادی کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو گئیں۔ ”118، سیکنڈ فلور۔“ لیکن کیا آپ آنا چاہ رہی ہیں؟“

”شاید۔“

”میں سمجھا نہیں۔“

”مجھے آپ ناراض لگ رہے ہیں۔ ہماری جو آخری بات چیت ہوئی وہ زیادہ اچھی نہیں تھی۔ مجھے آپ سے اس طرح نہیں بولنا چاہیے تھا۔“

ہادی کو ڈر محسوس ہوا کہ وہ کہیں فون پر ہی معافی طلبی نہ کر لے۔ وہ ذرا زور سے بولا۔ ”آپ کی آواز صاف نہیں آ رہی۔ شورا گیا ہے لائن میں۔“

”اچھا چلیں۔“ میں آتی ہوں آپ کے پاس۔“ وہ بھی ذرا زور سے بولی۔ ”قریباً آدھ گھنٹا لگے گا۔“

”ٹھیک ہے، میں ہوٹل میں ہی ہوں۔“ ہادی نے بلند آواز میں کہا۔

فون بند کر کے وہ آرام کر رہی پر دم دراز ہو گیا۔ سیل فون اس کی ٹھوڑی کو چھو رہا تھا۔ یہ کیسی کایا کلپ ہوئی تھی۔ ہادی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس طرح حجاب کا فون آئے گا۔ نہ صرف فون آنے کا بلکہ وہ خود بھی ہوٹل آنے کو تیار ہوگی۔

اس نے جلدی جلدی کمرے میں بکھری ہوئی اشیا سمیٹیں۔ بیڈ شیٹ درست کی۔ لباس چھینچ کیا اور اس کا انتظار کرنے لگا۔ ٹھیک آدھ گھنٹے بعد وہ وہاں پہنچ گئی۔ وہ چمکیلی دھاریوں والی اسی سیاہ چادر میں تھی جس میں پہلے بھی یہاں نظر آتی رہی تھی۔ نقاب میں سے بس اس کی دلکش آنکھیں اور ناک کا تھوڑا سا حصہ نظر آ رہا تھا۔ کندھے سے بیگ جھول رہا تھا۔ رکی کلمات کی ادا گئی کے بعد وہ صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس نے چادر میں لگی ہوئی Pins کھولیں اور اسے اتار کر ایک طرف رکھ دیا۔ وہ اسٹائلش شلوار قمیض میں تھی۔ یہ ہاف سیلوٹس تھی جو اس کے چمکیلے بازوؤں کو نمایاں کر رہی تھی اور متناسب جسم پر بہت چڑ رہی تھی۔ ”آپ کیا نہیں کی؟“

”کچھ نہیں، بس بیٹھ کر باتیں کریں گے۔“

”کچھ نہ کچھ تو ہونا چاہیے۔“

”گرین ٹی منگوا لیجیے۔“ اس نے کہا۔

اس میں آج پھر اسی علیزائقی جھلک نظر آ رہی تھی جس سے دیش میں ملاقات ہوئی تھی۔ تاہم وہ کچھ افسردہ بھی

دکھائی دیتی تھی۔ منجانبے کیوں اس کی ہلکی براؤن آنکھوں میں دیکھ کر ہادی کو احساس ہوا کہ ان ہلکوں کے پیچھے کوئی گہرے غم کرکٹیں لیٹا رہا ہے اور شاید چند گھنٹے پہلے تک وہ روتی بھی رہی ہے۔

”کیا دیکھ رہے ہیں؟“ وہ مسکرائی۔

”میں آپ کی آنکھوں کا یہ رنگ اصلی ہے یا وہ اصلی تھا جو دیش میں دیکھا۔“

”اس وقت میں نے لیس نگار کئے تھے۔“ اور ہال بھی ڈائی کیے ہوئے تھے۔ اصلی وہی ہے جو آپ کو اس وقت نظر آ رہا ہے۔“ وہ پھر مسکرائی اور اس کی پیشانی کا چاند چمک اٹھا۔

”آپ نے کہا تھا کہ کوئی مجبور تھی اس وقت۔“ جس کے سبب آپ کو وہ رنگ روپ اختیار کرنا پڑا۔“

”مجبوری ہی کہہ لیں۔“ لیکن کیا آپ کو صرف پرانی باتیں ہی کرتے رہتا ہے۔ کوئی نئی بات کریں بھی۔ کیا کر رہے ہیں؟ کہاں کہاں محموم رہے ہیں؟ اور آج کل موڈ کیا ہے آپ کا وغیرہ وغیرہ؟ کہیں مجھے آپ کے کان کے پاس پھر تو کوئی غبارہ نہیں پھوٹنا پڑے گا۔“ اس نے کہا اور خود ہی ہنس دی۔

”صورت حال تو آپ نے کچھ ایسی ہی بنا دی تھی لیکن پھر آہستہ آہستہ سنبھال لیا خود کو۔“ ہادی نے پوچھ لیا

وہ ایک ٹک اس کی طرف دیکھتی رہی۔ منجلا ہونٹ ہولے دامتوں میں دبا رکھا تھا۔ یہ بڑا پیارا انداز تھا اس کا۔ چند سیکنڈ بعد بولی۔ ”مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ سے اس طرح کا رویہ اختیار کیا۔ میں واقعی معافی چاہتی ہوں آپ سے۔ دیکھیے چل کر آپ کے پاس آگئی ہوں، گھر آنے والے تو جانی دن کو بھی معاف کر دیا جاتا ہے۔“

”چلیں، آپ کو احساس ہو گیا، میرے لیے یہ بہت بڑی بات ہے۔ یقیناً مجھ سے بھی بے وقوفی ہوئی کہ میں نے آپ پر دباؤ ڈال کر آپ سے ملاقات کرنا چاہی۔ اس کے لیے میں بھی بہت معذرت چاہتا ہوں۔“

”نو مینشن ہادی صاحب۔ اٹ ازاو کے۔ اب بتائیے کیا پروگرام ہے آپ کا؟“

”وہی جو آپ نے حکم دیا تھا۔ کل سویرے جا رہا ہوں اٹلی سے۔ آسٹریا کا پروگرام ہے۔“ ہادی نے سنجیدہ صورت بنا کر کہا۔

”لگتا ہے کہ واقعی آپ کے کان کے پاس کوئی بڑا سا



دروازے پر شائستہ دستک ہوئی اور روم سرویس والے چائے کی ٹرالی دکھائی ہوا اندر آ گیا۔ حجاب خود ہی کھڑی ہو کر چائے بنانے لگی۔ ہادی نے کن انگیوں سے اسے دیکھا۔ وہ ٹرالی پر جھکی ہوئی تھی۔ شہد رنگ بالوں کی دو لٹیں چہرے پر جمبول رہی تھیں۔ کمان کی طرح خم کھایا ہوا جسم دلکش نظر آتا تھا۔ اس کا حسین سراپا کسی بھی دیدہ ور کو اس کے عشق میں مبتلا کر سکتا تھا..... اور جلال نے اس کی ناقدری کی انتہا کر رکھی تھی۔ ہادی نے سوچا، ایسا کیوں ہوتا ہے کہ جو چیزیں حاصل ہو جائیں وہ اپنی قدر کھودتی ہیں۔

انہوں نے بڑے اچھے موڈ میں چائے پی۔ ہادی نے اس کی طبیعت کے بارے میں پوچھا۔ صرف چوبیس پچیس دن پہلے وہ اسپتال میں تھی لیکن اب بیماری کے آثار اس پر نہ ہونے کے برابر تھے۔ غالباً وہ سخت جان بھی تھی۔ کسی ایسے ساز کے تاریک طرح جو رات بھر بچتا رہتا ہے لیکن صبح پھرتا ہوا نظر آتا ہے۔ ہادی نے اس سے انکل فیاض اور خالہ صوفیہ کا حال احوال پوچھا۔ خاص طور سے خالہ صوفیہ کا۔ ان کا اسپتال میں بے ہوش ہو جانا اور پھر گھر والوں سے یہ بات چھپانا ابھی تک ہادی کے ذہن میں تازہ تھا۔ مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ پھر اگلے روز دس بجے آنے کا وعدہ کر کے وہ چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد بھی ہادی ہکا بکا بیٹھا رہا۔ وہ کیا شے تھی؟ اس کی کوئی بات پوری طرح سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ نجانے کیوں ہادی کو لگ رہا تھا کہ وہاں حجاب کے مینے یا سسرال میں کوئی ایسی بات ہوئی ہے جس کے رد عمل میں اس کے مزاج میں یہ اچانک تبدیلی آئی ہے۔

وہ کل سے شریفان کو فون کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس نے بڑے اصرار کے ساتھ کہا تھا کہ وہ اس سے گاہے بگاہے بات کرتا رہے۔ یہ اچھا موقع تھا۔ اس وقت وہ انیسویں میں ہی ہوئی تھی۔ ہادی نے نمبر ملایا۔ چند ہی سیکنڈ بعد شریفان کی بات دار آواز سنائی دی "ہیلو، کون بول رہا ہے؟" وہ پنجابی لہجے میں بولی۔

"تمہارا لاہوری بھائی ہادی۔"

"اوہ لاہوری بھائی جان! کسی سے کمال کر دتا۔ بڑی لمبی حیاتی ہے آپ کی۔ یقین کرو میں آپ کے بارے میں دج ای سوچ رہی تھی۔ کیسے ہیں آپ؟ کہاں ہیں، طبیعت تو ٹھیک ہے؟ مجھے تو فکر پڑی ہوئی ہے کہ آپ کو بازاری کھانے..... کھانے پے رہے ہوں گے۔ کتنا چنگا ہوتا کہ آپ یہاں سے جاتے ہی نہ۔ کیا آپ واپس نہیں

غبارہ پھوڑنا پڑے گا۔" ہادی ہنسنے لگا۔ وہ بھی ہنس دی۔ لوگ دانتوں کو موتیوں سے تشبیہ دیتے ہیں، وہ واقعی موتی تھے اور ان کی چمک پیشانی سے ہم آہنگ ہو کر اس کی مسکراہٹ کو ایک بے مثال دلکشی دے دیتی تھی۔

ہادی نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ "مذاق کر رہا تھا، فی الحال تو کہیں نہیں جا رہا..... اور جی تو یہی چاہتا ہے کہ جتنے دن یہاں روم میں ہوں، آپ میرے ساتھ ٹھوٹیں پھریں لیکن یہ بھی جانتا ہوں کہ یہ آپ کے لیے ناممکن ہے۔ آپ کے گھر والے خاص طور سے سسرال والے تو بھی یہ برداشت نہیں کر سکتے۔"

وہ عجیب نظروں سے ہادی کی طرف دیکھتی رہی پھر بولی۔ "اگر آپ چاہتے ہیں کہ ایسا ہو..... اور میرے ایسا کرنے سے آپ تڑول سے میری معذرت قبول کر سکتے ہیں تو میں ایسا کر سکتی ہوں۔"

اب ایک بار پھر ہادی کے لیے شدید حیرت کا موقع تھا۔ وہ روم میں اس کے ساتھ گئے کھوم پھر سکتی تھی۔ جلال جیسا شخص یہ کیونکر برداشت کر سکتا تھا؟ وہ تو شاید خون پی جاتا اس کا۔ ہادی کی اب تک کی معلومات کے مطابق وہ دولت مند ہی نہیں کافی بااثر شخص تھا۔ مقامی انتظامیہ میں بھی اس کے رابطے تھے۔ میلانو جیسے شہر میں شاہجگ سینئر تعمیر کرنا کوئی معمولی کام تو نہیں تھا۔ غرض، وہ ہر لحاظ سے ایک دیگ بندہ تھا۔

"کیا سوچ رہے ہیں؟" وہ ادا سے بولی۔

"یہی کہ آپ مذاق کر رہی ہیں یا واقعی ایسا کر سکتی ہیں۔"

"میں کر سکتی ہوں لیکن ایک شرط کے ساتھ۔"

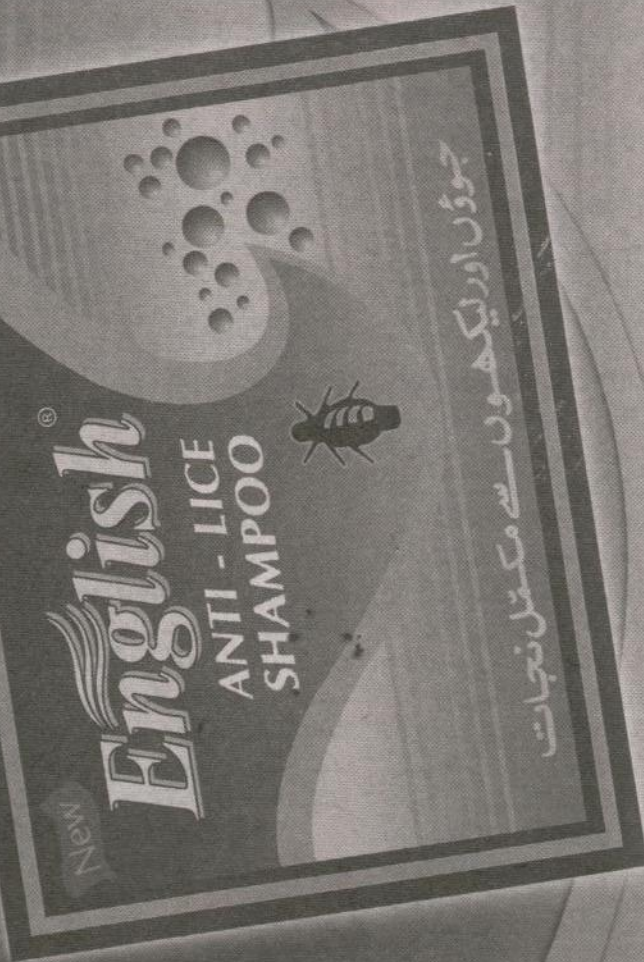
"وہ کیا؟"

"میں چادر میں رہوں گی۔"

ایک دم بات ہادی کی سمجھ میں آ گئی۔ بڑا سادہ اور آسان حل تھا۔ اگر وہ حسب معمول پردے میں ہوتی اور اس کے ساتھ گھومتی پھرتی..... تو اگر کوئی دیکھ بھی لیتا تو نہ دیکھ پاتا۔ یہ تو سلیمانی ٹوپی جیسا معاملہ تھا۔ ٹوپی پہنی اور منظر سے غائب۔ صرف آنکھوں کو دیکھ کر تو اس کے گھر والے بھی اسے نہیں پہچان سکتے تھے۔ اسے صرف ایک نئی چادر اور نئی جوتی کی ضرورت ہوتی۔

"زبردست!" ہادی کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ اس کے ساتھ ہی اسے احساس ہوا کہ یہ حجاب کا وہی خاص موڈ ہے جو وہیں میں نظر آیا تھا۔

منٹ میں جوڑوں اور لیکھوں سے مکمل نجات



آئندے؟“ وہ اوپر تلے سوال کرتی چلی گئی۔
ہادی نے اس کے سوالوں کے جواب دیے۔ ریکی باتیں
کیں۔ حال احوال پوچھا۔ پھر باتوں ہی باتوں میں دریافت
کیا۔ ”تمہاری وڈی باجی میکے سے آگئی ہیں کہ نہیں؟“
وڈی باجی یعنی حجاب کے ذکر پر وہ ایک دم اداس سی
ہو گئی۔ سنجیدہ لہجے میں بولی۔ ”وہ تو وہ چاری حکم کی بندی ہیں
جی۔ جب وڈے بھائی جان کا آرڈر ہوگا وہ آجائیں گی۔
کتنی بھی دکھی ہوں گی بس دوڑی چلی آئیں گی۔ وہ بڑے
معروف ہیں، خود کو لینے کی ہی جاتے ہیں۔ بس چھوٹے بھائی
جان ٹھیکر کونج دیتے ہیں پاڈرا نیور وغیرہ کو۔“
”وڈی باجی کے دکھی ہونے کی بات کیوں کی تم نے؟“
کیا کوئی مسئلہ ہوا ہے؟“

”کوئی اک مسئلہ ہو تو پھر ہے نا جی۔ یہاں تو مسئلے ہی
مسئلے ہیں۔۔۔۔۔ سب سے وڈا مسئلہ تو۔۔۔۔۔ بس۔۔۔۔۔ کچھ نہ بچیں
جی۔“ وہ کہتے کہتے بات بدل گئی۔
”شریفان! تم بات بھی کرتی ہو اور ڈرتی بھی رہتی
ہو۔ اچھی بہن ہو تم؟ میں نے تم سے وعدہ کیا ہوا ہے کہ تم اگر
کچھ کہو گی تو وہ صرف اور صرف میرے تک رہے گا۔۔۔۔۔ یا تو
بات شروع نہ کیا کرو یا پھر پوری کر دیا کرو۔“
وہ کچھ دیر خاموش رہ کر بولی۔ ”صیب جی! آج کل
سب سے وڈا مسئلہ تو یہی بی بی ارم ہی بنی ہوئی ہے۔ پتا نہیں
کہ اس نے کیا چن چڑھانا ہے۔ چلی چلی چلی گئی تو دو بے
شہر میں۔ اب پھر آگئی ہے۔ پہلے وڈے بھائی جان کہتے
تھے کہ آدھ دن ایستے رہے گی پھر ہوشل شوٹل میں چلی
جائے گی۔ پر اب ایستے ایسی تک گئی ہے، اس کا سامان
شامان بھی آگیا ہے گھر وچ۔“
”اس سے کیا ہوگا؟“ ہادی نے پوچھا۔

”سب نوں پتا ہے جی کہ باجی حجاب اس ارم بی بی
سے چڑھاتی ہیں، وہ بڑی چالو سیال کرتی ہے وڈے بھائی
جان کی۔ آگے پیچھے گھومتی رہتی ہے۔ اس کو یہاں کی یوناورشی
وچ داخل کرانے والے بھی وڈے بھائی جان ہی ہیں۔ یوں
لگدا ہے کہ وہ ہولی ہولی اس گھر وچ اپنا رستہ بنا رہی ہے۔
اندروڑ رہی ہے اس گھر کے۔ اب پرسوں سے اک ہور کم
شروع ہو گیا ہے۔ پتا نہیں کہ باجی حجاب کو اس کا پتا چلا ہے کہ
نہیں۔ انج نہیں توکل چل جائے گا۔ ان کو بڑا دکھ ہوتا ہے اس
کا۔ وہ ابھی ابھی تو بستر سے اٹھی ہیں و چاری۔“
”کون سا کام شروع ہوا ہے؟“ ہادی نے عام سے
انداز میں پوچھا۔

”اب جناب وڈے بھائی جان اپنی کار وچ بی بی
ارم کو یوناورشی چھوڑ کے آتے ہیں۔ یوناورشی، اسٹور کے
رستے میں آتی ہے۔ اسٹور جانے کے لیے نکلے ہیں تو اس بی
بی کو بھی اپنے نال بٹھا لیتے ہیں۔ اب تو صاف پتا چلنے لگا ہے
جی کہ یہ بی بی وڈے ڈال رہی ہے وڈے بھائی جان
پر۔۔۔۔۔ بلکہ شاید ڈال ہی چکی ہے، اس گھر وچ بڑی مصیبتیں
پہنچی ہیں باجی حجاب نے۔ اب پتا نہیں یہ آخری کسر وہ کی
تھی۔“ ذرا توقف سے شریفان بولی۔ ”مخورت بہت کچھ
سہہ لیتی ہے صیب جی! پر یہ جو آخری ظلم ہوتا ہے نا۔ اس ظلم
پر چپ رہنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔۔۔۔۔ بڑا مشکل۔“ شریفان کی
آواز رندہ گئی۔

کچھ آہٹ سنائی دی۔ شریفان جلدی سے بولی۔
”اچھا، مجھے لگدا ہے کہ بی بی ارم آواز میں دے رہی ہیں
مجھے۔ شاید کوئی کم ہوگا۔ میں چلتی ہوں۔ ہم فیر گل کریں
گے۔ آپ ٹیلی فون ضرور کرنا۔“
”ٹھیک ہے شریفان۔“ ہادی نے کہا اور فون بند
ہو گیا۔

یہ عجیب انکشاف ہو رہا تھا ہادی پر۔ اس کے دماغ
میں بالکل نیکی ہوئی تھی۔ شریفان کے الفاظ اس کے کانوں
میں گونجنے لگے۔ ”اس گھر میں بڑی مصیبتیں پہنچی ہیں باجی
حجاب نے۔ پتا نہیں یہ آخری کسر رہی تھی۔“ وہ لکڑی کے
نفس فرش پر ٹھٹھا رہا اور سوچتا رہا۔ اس کی اب تک کی
معلومات کے مطابق حجاب نے واقعی اپنے شوہر کے گھر میں
بہت کچھ سہا تھا۔ اسے ایک سخت گیر سراس اور سخت گیر شوہر ملا
تھا۔ پچھلے ڈھائی تین سال میں یقیناً بے شمار موقعوں پر اس
کی اور اس کے والدین کی سخت توہین ہوئی تھی۔ توہین کا
ایک واقعہ تو تازہ تازہ تھا اور ہادی کی یہاں موجودگی میں ہی
ہوا تھا۔ حجاب کا ڈیڑھ دو ماہ کا مکمل ضائع ہو گیا تھا۔ اس کا
الزام بھی حجاب کی والدہ پر لگایا جا رہا تھا کہ اس نے بی بی کو
انجیریں کھلا دیں جس سے یہ نقصان ہو گیا۔ یہ بالکل بے
وزن کی بات تھی لیکن حجاب کی والدہ اس پر مصر تھیں۔

حجاب نے حجاب کو ایک باندی کی طرح اپنے حکم کی
زنجیروں سے باندھ رکھا تھا اور وہ شاید ماں باپ کی عزت
کے لیے بندھ بھی چکی تھی لیکن وہ پھر بھی مطمئن نہیں تھا۔ اپنی
حاکمیت مسلم کرنے کے لیے بہانے ڈھونڈتا رہتا تھا۔۔۔۔۔ اور
وہ یہ سب کچھ بھی برداشت کرتی تھی۔ مگر اب اس گھر میں کچھ
ایسا ہو رہا تھا جو ایک بیوی کی حیثیت سے حجاب کو قبول نہیں
تھا۔ تو کیا یہی وہ عمل تھا جس کے رد عمل میں وہ اپنا جھکا ہوا سر

پہلی زندگی

حاصل کرنا چاہتی تھی۔۔۔۔۔ اور یہ تو ایسا موقع تھا کہ اگر حاصل
ہو جاتا تو زندگی ہی بدل کر رہ جاتی۔ جلال جیسے باحیثیت اور
بلند اقبال شخص کا انکشاف حاصل ہو جاتا اور پھر اس کی زندگی
میں آجانا کوئی معمولی بات نہ ہوتی اور اپنی باجی فوزیہ۔۔۔۔۔
چیچا جی ٹھیکر اور دیگر لوگوں کی پروا کیے بغیر وہ دل جمعی سے
اس کام میں لگی ہوئی تھی۔

جو کچھ بھی تھا، وہ جانتی تھی کہ یہ کوئی آسان کام نہیں
ہے، حجاب پچھلے ڈھائی تین سال سے اس گھر میں ہے۔ اس
گھر میں اس کی جڑیں ہیں اور کسی حد تک جلال کے دل میں
بھی۔ ان جڑوں کا آنا فنا ختم ہو جانا ممکن نہیں تھا۔ ارم کی
بڑی بہن فوزیہ، چیچا جی ٹھیکر اور گھر کے نوکر حجاب کا دم
بھرتے تھے۔ اب ابا رشن والے واقعے کے بعد سے حجاب
میکے میں تھی۔ ارم کے لیے یہ صورت حال، فائدہ مند تھی۔ وہ
آج کل یونیورسٹی گئی، جلال کے ساتھ اس کی گاڑی میں ہی
جا رہی تھی۔

وہ سوچوں سے چونک گئی۔ جلال کی والدہ آبا خانم کی
آواز آئی۔ ”ارم بیٹا! ذرا شریفان کو دکھ کہاں مر گئی ہے۔
بیٹھے بیٹھے ایک دم غائب ہو جاتی ہے۔ جلال کی شیر وانی پر پس
ہونے والی ہے۔ اس نے گیارہ بجے نیشن میں پہنچنا ہے۔“
”اچھا جی جی۔“ ارم نے شہد بھرے لہجے میں کہا۔
”میں دیکھتی ہوں اسے۔“

اونچی بڑی پر ٹھٹھک ٹھٹھک کرتی وہ باہر نکلی اور گاڑی کی
پاؤں پارک کے انیسکی کی طرف آگئی۔ دروازے پر کھڑے ہو کر
اس نے آواز دی۔ ”شریفان!۔۔۔۔۔ او۔۔۔۔۔ شریفان۔“
اس کی دوسری تیسری آواز پر شریفان لوکھلائی ہوئی
سی انیسکی کے برآمدے میں آگئی۔ ”جی بی بی جی۔“
ارم کو اندازہ ہوا کہ وہ کسی کوفون کر رہی تھی۔
”کہاں دفع ہو جاتی ہے تو بیٹھے بیٹھے، کسی کوفون کر
رہی تھی؟“

”وہ جی۔۔۔۔۔ جی وہ۔۔۔۔۔ اپنی وڈی بھین کو سحرات
میں۔ وہ نانی بنی ہے نا پچھلے اوڑھ کر۔“
”بس ٹھیک ہے۔ جب تک وہ پڑ نانی نہ بن جائے
اس کوفون کرتی جا اور ہم وہاں بیٹھے تیری جان کو روٹے رہیں
گے۔ کچھ ہم پر بھی نظر کر مفر ما لیا کر۔“
”آپ حکم کریں بی بی جی۔“

ارم اسے لے کر گھر میں آئی اور اسے بتایا کہ اسے کیا
کرنا ہے۔۔۔۔۔ اور اس کے بعد کیا کیا کرنا ہے۔
وہ خود اپنے کمرے میں آئی اور نیشن پالش کے لیے

انٹار ہی تھی۔ جیسے پر سکون سمندروں کی تہ میں چھپا ہوا کوئی
طوفان دھیرے دھیرے رخ آب کی طرف بڑھ رہا ہو۔
جیسے کوئی قیدی اپنی زنجیروں کو ہلارہا ہو۔ انہیں جھنجھوڑنے اور
توڑنے کا سوچ رہا ہو۔ مدتوں سے زندان کے اندھیروں
میں رہنے والا شخص زندان کی سلاخوں سے ٹکرانے کا ارادہ کر
رہا تھا شاید۔۔۔۔۔ ہاں یہاں کچھ انوکھا ہو رہا تھا اور اگر انوکھا
ہو رہا تھا تو اس کا کوئی طویل پس منظر تھا۔ ہادی ابھی اس پس
منظر سے آگاہ نہیں تھا لیکن اس کی سبکی کو محسوس کر سکتا تھا۔
اگر یہ پس منظر تکین نہ ہوتا تو حجاب جیسی ناتواں لڑکی میں اتنی
جرات کیسے پیدا ہوتی۔

ہادی ہول و اسکوڑے کے کمرے میں ٹہل رہا تھا اور
کھڑکیوں سے باہر روم کی ہزار ہا روشنیاں جیسے اس کے
اضطراب کو حیرت سے دیکھ رہی تھیں۔ ان روشنیوں کے
علاوہ بھی یہاں کچھ موجود تھا۔ یہ ایک سایہ تھا۔ یہ سایہ ہادی
کے کمرے سے باہر کوریڈور میں موجود تھا۔ وہ کوریڈور میں
دھیرے دھیرے چلتا کروں کے سامنے سے گزر رہا
تھا۔۔۔۔۔ وہ جیسے کچھ تلاش کر رہا تھا۔

☆☆☆

ارم اپنے کمرے میں موجود تھی۔ جلال کی کوشش سے
اسے روم ہی کی ایک یونیورسٹی میں داخلہ مل گیا تھا۔ وہ خوش
تھی کہ اسے پھر سے روم میں اور خاص طور سے اسی گھر میں
رہنے کا موقع مل رہا ہے۔ وہ قدامت آجینے کے سامنے کھڑی
تھی۔ اس نے اپنے بھرے بھرے جسم پر قمیص کو کھینچ کر
نیچے کیا۔ بالوں کو کندھوں کے پیچھے پیچھا کر ڈھیلے ڈھالے
جوڑے کی صورت میں باندھا اور دو ہٹا ایک خاص انداز
سے سر پر اور سینے پر پھیلا کر دیکھنے لگی۔ وہ دوپٹا وغیرہ کم ہی
استعمال کیا کرتی تھی مگر جب سے اس گھر میں زیادہ آنا جانا
ہوا تھا اسے دوپٹا اور قمیص بھی اسی طرح استعمال کرنا پڑ رہی
تھی۔ اس گھر میں کچھ بھی حجاب کی مرضی کے بغیر نہیں ہوتا تھا
اور حجاب کی مرضی ارم کو بھی عزیز تھی۔

وہ جانتی تھی جلال بہت آہستہ آہستہ لیکن مسلسل اس کی
طرف متوجہ ہو رہا ہے۔ رفتار بہت سست تھی لیکن نہ ہونے
سے تو بہتر تھی۔ جلال کے یوں اس کی طرف متوجہ ہونے
میں کچھ عمل دخل میاں بیوی یعنی جلال اور حجاب کی باہمی
چپقلش کا بھی تھا۔ اس چپقلش میں روز افزوں اضافہ ہو رہا
تھا اور یہ صورت حال ارم کے لیے خوش آئند تھی۔ وہ کسی کی
مصیبت پر بغلیں بجانے والی تو نہیں تھی لیکن بے وقوف بھی
نہیں تھی۔ زندگی میں اسے جو بھی موقع ملتا تھا وہ اسے

کوئی مناسب سائڈ فٹنگ کرنے میں مصروف ہو گئی۔ ابھی وہ اس انتخاب میں مصروف تھی کہ اس کی نگاہ کھڑکی سے باہر بین گیت کی طرف اٹھ گئی۔ چونکہ ارمن دبا کر آؤ بیگ گیت کھول رہا تھا اور جلال کی شاندار سرخ ”ہمز“ جیب اندر داخل ہو رہی تھی۔ غیر متوقع طور پر جلال وقت سے پہلے ہی آ گیا تھا۔ ارم نے جلدی جلدی ڈریسنگ کی درازیں بند کیں۔ آئینے میں خود کو دیکھا۔ بال درست کیے۔ کچھ دیر سوچتی رہی پھر اس کمرے کی طرف بڑھ گئی جہاں شریفان جلال کی شیروانی پر بس کر رہی تھی۔

اس نے تنقیدی نظروں سے شریفان کے کام کو دیکھا اور بولی۔ ”دیکھو، کالر کا سٹینا نا سنہ کر دینا۔ اچھا تم جاؤ ادھر کچن میں کٹنگم کو دیکھو، میں یہ کر لیتی ہوں۔“

شریفان ”بی بی بی“ کہتی ہوئی کچن کی طرف چل گئی۔ وہ بڑے انہماک سے شیروانی پر بس کرنے میں لگ گئی۔ ایسا کرتے ہوئے اس کا دو پٹا ڈھلک گیا۔ اس نے اسے ڈھلکا ہی رہنے دیا۔ گرمیان سے اس کا چمکیلا جسم جھانک رہا تھا۔ بالوں کی دو ٹیٹیں پیشانی پر آ گئی تھیں۔ جلال کے قدموں کی مدد سے چمک چمک سناٹی دی، مگر وہ اپنے کام میں لگی رہی۔ جب اسے اندازہ ہو گیا کہ جلال اندر آ گیا ہے تو اس نے چونک کر اسے دیکھا اور جیسے گڑبڑا کر سر پر دو پٹا درست کر لیا۔ ”السلام علیکم۔ آپ جلدی آ گئے۔“

”ہاں، ذرا جلدی لگتا ہے۔“ جلال نے ہماری آواز میں کہا۔ اس کے سر اچھے کی طرح اس کی آواز میں بھی رعب تھا۔

”بس، یہ دو چار منٹ کا کام رہ گیا ہے۔“ ارم نے توجہ سے شیروانی کی سلوٹس نکالتے ہوئے کہا۔

”کسی ملازمہ سے کہہ دینا تھا۔“

”کیوں کہہ دیتی؟ مجھے آپ کا کام کرنا اچھا لگتا ہے۔“ وہ اس کی طرف دیکھے بغیر ادا سے بولی۔

جلال گہری سانس لیتے ہوئے آگے نکل گیا۔

وہ جتنی جلدی آیا تھا، اتنی ہی جلدی روانہ بھی ہو گیا۔ اس کے جانے کے کچھ ہی دیر بعد ارم اپنے کمرے میں واپس آ گئی۔ دروازہ بند کرنے کے بعد اس نے کھڑکیاں چیک کیں اور پردے بھی برابر کر دیے۔ بستر پر نیم دراز ہو کر اس نے اپنے ٹیکے کے نیچے سے سل فون نکالا اور ایک نمبر ملا یا۔

کال مل گئی۔ دوسری طرف سے باریک سی مردانہ ”ہیلو“ سناٹی دی۔ ارم غصے سے بولی۔ ”کیا بات ہے گلزار۔“

کیوں بار بار فون کر رہے تھے؟

”گلزار جب بار بار فون کرتا ہے تو اس کا کوئی مقصد ہوتا ہے۔“

”مقصد یہی ہوتا ہے، کسی لڑکی کو چھنانا۔ اس کے ساتھ چکر چلانا، چند دن اس کے ساتھ گھومنا پھرتا اور پھر کسی اور کے پیچھے چر چڑانا، ہاتھ دھو کر۔“

وہ ہنسا۔ ”یہ سب کچھ تو دوسروں کے لیے ہے۔ تم تو اپنی سسر ہو ارم۔۔۔۔۔ اور ہمیشہ رہو گی۔ اللہ نے تمہیں بڑی خوبیاں دی ہیں۔ بس تھوڑی سی تنہوس ہو تم۔“

”میں تھوڑی سی تنہوس ہوں اور تم کافی سارے کینے ہو۔ اچھا بکواس بند کرو۔ فون کیوں کیا تھا تم نے؟“

”ایک خوش خبری ہے سسر! تھوڑا سا کھرا ہاتھ آیا ہے تمہارے ذہن جاں کا۔“

”اچھا اگر کوئی بات ہے تو بتاؤ درندہ وقت بر بامت کرو۔“

”وقت بر باد نہیں ہو گا۔ گارنٹی دیتا ہوں، لیکن سسر! تمہیں بھی تھوڑی سی مٹھی ڈھیلی کرنی ہو گی۔“

”جگ بگھتا ہوں ایک دم کڑکی چل رہی ہے۔“

ارم اسے ڈانٹنے کا ارادہ رکھتی تھی لیکن پھر اس کے لہجے میں اسے کچھ ایسی اچھل محسوس ہوئی کہ وہ ڈانٹ نہ سکی۔ شاید واقعی اس کے پاس کوئی برائی تھی۔ وہ اپنا لہجہ بدل کر بولی۔ ”کہا ہے نا، تم ایک نمبر کے کینے ہو گلزاری۔ میرا خیال ہے کہ پیدا ہوتے ہی تم نے سب سے پہلے اپنی دانائی سے پیسے طلب کیے ہوں گے، پیدا ہونے کے بدلے میں۔ اچھا، بکواس کرو، کوئی کام کی بات ہوگی تو دوں گی بڑی تمہارے منہ میں۔“

”سسر! ہڈی نہیں۔ اس بار تو گوشت ہونا چاہیے اور مجھے پتا ہے تم دوں گی بھی۔ تمہیں مزہ آتا ہے میری بات کا۔“

”اچھا، کچھ پھوٹو منہ سے۔“

”جباب کا چچا کیا ہے میں نے۔ وہ بڑے مشکوک انداز میں گھر سے نکلی ہے۔۔۔۔۔ اور ہوٹل واسکوڈے میں کسی سے ملنے لگی ہے۔“

”مشکوک انداز کیوں کہہ رہے ہو تم۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کسی سبیلی یا عزیز وغیرہ سے ملنے لگی ہو۔“

”سسر! آپ کا یہ بھائی اڑتی چڑیا کے پر لگتا ہے اور یہ بھی بتا دیتا ہے کہ اس کے پیٹ میں انڈا ہے یا نہیں۔“

”کیا کہنا چاہ رہے ہو؟“

”آپ کو پتا ہی ہے کہ یوں تو وہ گھر سے نکلتی ہی نہیں۔ اگر نکلتے تو اس کا وہ بیو بھائی ساتھ ہوتا ہے یا والدہ ہوتی ہے۔ وہ گاڑی پر نکلے ہیں۔ پر آج یہ جباب بی بی میٹرو پر نکلی تھی۔ چادر میں لپٹی لپٹائی۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ وال

میں کچھ کالا ہے۔ میں بھی اس کے پیچھے ہی میزرو میں چڑھا۔ میں اسکو اترے اگلے اسٹاپ پر وہ اتر گئی۔ وہ فٹ ہاتھ پر سیدھی جاری تھی پھر ایک دم ہوٹل واسکوڈے میں چلی گئی۔ میں اس وقت سڑک کی دوسری طرف تھا، مسئلہ لال تھا۔ مجھے سڑک پار کرتے تھوڑی سی دیر ہوئی۔ پھر بھی مجھے اتنا اندازہ ہو گیا کہ وہ سیدھیوں سے سینکڑوں فٹ پر گئی ہے۔ میں بھاگ بھاگ سینکڑوں فٹ تک پہنچا تو وہ غائب تھی۔ یہاں اس فلور پر چالیس پچاس رہائشی کمرے اور سوئٹ ہیں۔ فیملیاں یہاں غم ہی ہوتی ہیں۔ زیادہ تر ٹورسٹ ہوتے ہیں یا پھر کاروباری لوگ۔۔۔۔۔ میں اسے ڈھونڈتا رہا لیکن وہ لپٹی نہیں۔ وہ کم از کم ڈیڑھ گھنٹا کسی کمرے میں رہی ہے۔“

”جب تم کہہ رہے ہو کہ وہ لپٹی نہیں تو پھر یہ کیسے پتا چلا کہ وہ ڈیڑھ گھنٹا کمرے میں رہی۔“

”قریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد میں نے ایک بالکونی سے نیچہ دیکھا تو وہ میں انٹرنس سے باہر نکل رہی تھی۔ اسی طرح لپٹی لپٹائی۔ میں پھر پیچھے لگ گیا۔ بہر حال اس دفعہ وہ سیدھی ٹھہر گئی۔“

ارم نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”خیر۔۔۔۔۔ یہ خبر تو تم نے کارڈ میز پر سنا ہی ہے لیکن آدھی خبر ہے، پتا تو یہ چلنا چاہیے کہ وہ لپٹی کس سے اور کیوں؟ اور کیا اس نے جلال صاحب سے کہیں جانے کی اجازت لی تھی؟“

”اجازت لینے یا نہ لینے کی بات کا پتا تو تم خود کرو نا سسر! میں نے پتا کروں گا کہ وہ لپٹی کس سے ہے؟“

”کس طرح کرو گے؟“

”پتا نہیں کیوں مجھے یقین ہے کہ وہ دوبارہ جائے گی۔ ہو سکتا ہے کہ ایک دو دن کے اندر ہی جائے۔“

”چلو ٹھیک ہے، جیسے ہی کچھ پتا چلے مجھے بتاؤ اور تمہیں ہزار دفعہ کہا ہے کہ فون کرنے سے پہلے نتیجہ کر دیا کرو، مجھے کسی خواہ مخواہ کی مصیبت میں نہ ڈالنا۔“

”ٹھیک ہے سسر! لیکن کب تک ہو جائے گا؟“

”کیا کب تک ہو جائے گا؟“

”زم سسر، میں سچ کہہ رہا ہوں، بڑی سخت ضرورت ہے۔ فلیٹ خالی کرنا پڑ جائے گا یا پھر لینڈ لارڈ کا مارک میری ناک کی ہڈی ٹوک کر دے گا۔“

”تمہاری ہڈی ٹوک ہوئی جائے تو اچھا ہے۔ تم بہت ہی کینے ہو گلزاری۔ آدھی خبر دے کر پیسوں کے لیے بھاڑ جیسا منہ کھول رہے ہو۔“

”چلو آدھی خبر ہے تو آدھے پیسے ہی دے دیں، یعنی

کوئی 500 روپے۔“

”مجھ سے کچھ سنا نہ۔“ ارم نے دے لہجے میں غصے سے کہا۔ ”کل 200 روپے ترانسفر کر دوں گی اکاؤنٹ میں۔“

اس کے ساتھ ہی اس نے فون بند کر دیا۔۔۔۔۔ اور صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

گلزاری کالج میں اس کا کلاس فیلو رہا تھا۔ قد بہ مشکل پانچ فٹ تین انچ تھا لیکن جسم خوب گھٹا ہوا تھا۔ ایک نمبر کا حریفیں اور لالچی تھا۔ لڑکیوں میں ٹکڑی کے نام سے مشہور تھا۔ ان کے گرد اپنی باتوں کا ایسا تاننا پٹنا تھا کہ وہ جانتے بوجھے اس میں پھنس کر رہ جاتی تھیں۔ اس میں ہوشیاری اور عیاری کی مفت کو ارم نے بڑی گہرائی سے محسوس کیا تھا۔ وہ ہوشیار لوگوں کو پسند کرتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اپنی تمام تر خامیوں کے باوجود گلزاری اس کے قریب تھا۔ وہ بڑی روانی سے اسے سسر کہتا تھا۔ وہ بھی اسے ایک کارآمد دوست سمجھتی تھی۔ گلزاری کو یہاں جلال اور ارم کے درمیان چلنے والے معاملے کا پتا تھا۔۔۔۔۔ اور اس کی خواہش تھی کہ ارم یہاں اپنا مقصد حاصل کرے (تا کہ اس کے ثمرات اس تک بھی پہنچیں) ایک اچھا اتفاق یہ ہوا تھا کہ آج کل گلزاری جس بلڈنگ کے اپارٹمنٹ میں مقیم تھا وہ اسی سڑک پر تھی جہاں جباب کے والدین رہائش پذیر تھے۔ فاصلہ بھی زیادہ نہیں تھا۔ بلکہ اپارٹمنٹ میں سے اس کوٹھی کے لان اور برآمدے کا کچھ حصہ بھی نظر آتا تھا۔ ارم نے دو تین مہینے سے گلزاری کو یہ کام سونپ رکھا تھا کہ جب جب جباب اپنے میکے آئے تو وہ اس کی نقل و حرکت پر نظر رکھنے کی کوشش کرے۔ آج کافی دنوں بعد گلزاری نے اس حوالے سے کوئی توجہ طلب خبر دی تھی۔ وہ بیٹھی رہی اور اس بارے میں سوچتی رہی۔

☆☆☆

ہادی ہوٹل واسکوڈے کے سینکڑوں فٹ پر اپنے آرام وہ کمرے میں بیٹھا تھا۔ وال کلاک کی ٹیک ٹیک کے ساتھ اس کا دل بھی دھڑک رہا تھا۔ جباب آج پھر اس سے ملنے آ رہی تھی۔ انہیں روم میں ٹھکونے پھرنے کے لیے لگنا تھا۔ دو دن پہلے تک ہادی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایسا ہو گا لیکن یہ ہو چکا تھا۔ وہ سیلائی لڑکی یہ سب کر کے دکھا رہی تھی۔ اس نے دوپہر بارہ بجے کا وعدہ کیا تھا اور ہادی اب تک جان چکا تھا کہ وہ وقت کی پابند ہے۔ اس نے ہوٹل کی بالکونی میں سے دیکھا۔ ٹھیک بارہ بجے وہ سڑک کراس کر کے ہوٹل کے مین گیت کی طرف آئی دکھائی دی۔ اسی طرح ایک براؤن

مارچ 2014ء کا خصوصی بہار نمبر..... خوشبو بکھیرنا شمارہ

پاکیزہ

مسلسل ناول کا نگار پر رفعت سراج اور عزیزہ سید کی خوب صورت تحریریں

رضوانہ پرنس کا اک نئے موڑ پر اب کیا موڑ لے کر آیا ہے

نایاب جیلانی، ترک وفا کی کیا وجوہات بیان کرتی ہیں ضرور پڑھیے

چشم غم آشنا..... دردانہ نوشین کے دلنشین بیان کا مظہر مکمل ناول

وہ آنے بزم میں ملاقات کیجیے ہم سب کا محترم ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی سے

اس کے ساتھ ساتھ پڑھیے

اُمّ ثمامہ، عروسہ عالم، اُمّ طیفور، عاشفہ مسعود

بشری گوندل، ہالا احمد، دیگر مصنفات کی بہار تحریریں

حب سابق مستقل سلسلوں کا پڑا اثر اور سحر انگیز امتزاج صرف آپ کی خوش ذوقی کی نذر

جادو میں لپٹی لپٹائی، چہرہ مکمل طور پر نقاب میں تھا۔ فقط آنکھیں ہی دکھائی دیتی تھیں۔ ہادی نے دور ہی سے دیکھ لیا۔ آج اس کا شولڈر بیگ تھا اور غالباً سینٹرل بھی تھی ہی تھی۔ چادر سے ہاؤس بے دو چیزیں ہی دکھائی دیتی تھیں اور یہ دونوں اس نے بدل دی تھیں۔ براؤن چادر بھی آج کبھی دھندھی اس کے جسم پر نظر آ رہی تھی۔

پروگرام کے مطابق حجاب کو نیچے ہوٹل کی لابی میں ہی رکنا تھا۔ ہادی نے لفٹ کا انتظار نہیں کیا اور تیزی سے سیڑھیاں اترتا ہوا نیچے آ گیا۔ وہ آج اپنے بہترین لباس میں تھا۔ وہ اس جذبے کو کیا نام دے؟ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا لیکن یہ جذبہ اپنی جگہ موجود تھا۔ حجاب کے بارے میں سوچتے ہوئے اس کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوتی تھیں۔ اسے اپنے قریب یا کراس کی رگوں میں ابھو کی گردش تیز ہو جاتی تھی۔ آج بھی کچھ ایسا ہی ہو رہا تھا۔ پروگرام کے مطابق وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے ہوٹل واسکوڈے سے نکلے اور فٹ پاتھ پر پیدل ہی چلتے ہوئے میٹرو سٹریٹ کے اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گئے۔ روم میں یہ ایک چمکیلا دن تھا۔ ٹھنڈی ہوائے موسم کو خوشگوار بنا رکھا تھا۔ ”کیا خیال ہے، کونسی سیم چلیں؟“ ہادی نے پوچھا۔

”نہیں..... آج سمندر دیکھنے کا موڈ ہو رہا ہے۔“ وہ چنچل انداز میں بولی۔
”تو پھر ویسٹ روم؟“
”نہیں..... ویسٹ روم۔“
وہ دونوں دو منزلہ سیڑھیاں اتر کر میٹرو سٹریٹ میں بیٹھے اور پھر بے پروے روم کے نیچے ہی نیچے طوفانی رفتار سے سفر کرتے مغربی روم میں پہنچ گئے۔ انہوں نے پندرہ بیس کلو میٹر کا فاصلہ طے کیا اور نیشنل پلو کو جیسے مچان علاقوں کے نیچے سے گزرے۔ یہ سفر وہ سڑک کے ذریعے کرتے تو شاید ٹھنڈوں لگ جاتے۔ اس بات کا امکان بہت ہی کم تھا کہ کوئی جان پہچان والا ہادی کو ملے گا۔ اگر کوئی مل بھی جاتا تو اسے یہ جرأت ہرگز نہیں ہو سکتی تھی کہ ہادی سے اس کی ”سامی لڑکی“ کے بارے میں کچھ پوچھتا۔ اور اب سمندر ان کے سامنے تھا۔ بحیرہ روم کا لہریں لیتا ہوا نیلگوں پانی جس پر سیڑوں تفریحی کشتیاں رواں تھیں اور جس کے ساحل پر دلچسپ نظارے تاحہ نگاہ پھیلے ہوئے تھے، قلعاریاں مارتے ہوئے بیچ، حیناؤں کے جھرمٹ، چلتی پھرتی دکائیں اور رنگ برنگی چھتیاں جن کے نیچے نیم عریاں مردوزن ایک دوسرے کو ”سلاش“ کرنے کی کوشش کر رہے

تھے۔ وہ دونوں اس گہما گہمی سے ذرا ہٹ کر کڑی کے ایک سبز بیچ پر بیٹھ گئے۔ حجاب تحویت سے سمندر کو دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں کسی بچے کی خواہشیں چل رہی تھیں..... وہ جیسے چادر اتار کر اور سینٹرل پیسٹک کے ان کپڑوں سمیت سمندر میں کود جانا چاہتی تھی۔ اس کے پانیوں سے کھیلنا چاہتی تھی، اس کی لہروں سے بغل گیر ہونا چاہتی تھی۔
”گھر میں کیا بتایا آپ نے؟“ ہادی نے پوچھا۔
”بس کالج کی ایک دوست یہاں روما آئی ہوئی ہے۔ اس کے ہاں جا رہی ہوں۔ ویسے ای ای ابو مجھ سے زیادہ پوچھ کچھ نہیں کرتے۔ انہیں معلوم ہے ان کی بیٹی کس مزاج کی ہے۔“
”یعنی میں اس وقت آپ کی کالج کی دوست ہوں۔“ ہادی نے کہا۔
حجاب کی آنکھوں سے پتا چلا کہ وہ مسکرا رہی ہے۔ یقیناً اس کی پیشانی پر چاند چمک اٹھا تھا اور سچے موتیوں جیسے دانت بہار دکھارہے تھے، لیکن یہ سب کچھ براؤن چادر کے نقاب کے پیچھے اوجھل تھا۔
وہ بولی۔ ”ہاں جی..... دوست کی حد تک تو بات سمجھ رہے، لیکن آپ کالج کے نہیں ہیں..... بلکہ کالج کی نہیں ہیں۔ اچھا آپ مجھ سے سوال پوچھتے جا رہے ہیں، مجھے کچھ نہیں بتاتے۔ آپ مجھ تک پہنچے کیسے؟ لیکن پہلے والی اسٹوری نہیں سچ بتائیے گا۔“
ہادی نے گہری سانس لی۔ ”تین چار دن تو میں روم سینٹر میں گھومتا رہا۔ پھر سوچا کہ اگر گھومتا ہی ہے تو بھڑکیوں نہ وہاں گھوما جائے جہاں آپ جناب کے ملنے کا امکان ہو۔ لہذا ”کاسیا“ کے علاقے میں آوارہ گردی شروع کر دی۔ وہاں سے بھی مایوس ہونے والا تھا جب آکس کریم بار میں آپ کی دوست ماریہ پر نظر پڑ گئی۔ باقی کا کام آپ کے دیوے پھر صاحب نے آسان فرما دیا۔ وہ میرے کیتوں کے پرستار نکل آئے اور آپ کے گھر لے گئے۔“
”لیکن آپ ڈھونڈ کیوں رہے تھے مجھے؟“ حجاب نے اچانک سوال کیا اور ہادی گڑبڑا گیا۔
ذرا سنبھل کر بولا۔ ”اس لیے ڈھونڈ رہا تھا کہ دانے دانے پر مہر ہوتی ہے، ہمیں یہاں سمندر کے کنارے بیٹھ کر مکئی کے دانے کھانے تھے اور ضرور کھانے تھے..... اس لیے میں آپ کو ڈھونڈتا رہا۔“
”مکئی کے دانے؟ یہ کہاں سے آ گئے جی۔“
”وہ سامنے سے۔“ ہادی نے بائیں جانب اشارہ

کیا۔ ایک جین شرٹ والا اسمارٹ ساخو انچا فروش گلے میں اپنی دکان لٹکانے ان کی طرف آ رہا تھا۔ وہ بٹنے اور ابلے ہوئے بٹنے بچ رہا تھا۔ ساتھ میں دو تین طرح کی چٹنی تھی۔

انہوں نے بٹنے لیے اور کھانے لگے۔ ہادی کو یہ اچھا لگا کیونکہ بٹنا کھانے کے لیے حجاب کو اپنا نقاب تھوڑا سا نیچے کھٹکا تا پڑا۔ اس کے ہونٹوں کے پیچھے اس کے خوش نما دانتوں کی تھوڑی سی جھلک نظر آنے لگی۔

وہ بٹنا کھا رہی تھی اور ساتھ ساتھ اپنے پاؤں کو حرکت دے رہی تھی۔ یہ ایک چٹنل انداز تھا۔ اس کی عمر کے بارے میں ابھی ہادی درست اندازہ نہیں لگا سکا تھا، تاہم وہ بائیس چوبیس سے زیادہ کی نظر نہیں آتی تھی۔ جلال اپنے ذیل ڈول کی وجہ سے بھی قدرے بڑا نظر آتا تھا۔ یوں میاں بیوی کی عمروں میں فرق مزید نمایاں ہو جاتا تھا۔

حجاب کی نگاہ سامنے سے گزرتے ہوئے ایک جوڑے پر پڑی۔ یہ اپنے لباس اور حلیے سے چلبلی علاقے کا جوڑا لگتا تھا۔ شاید کوئی یا اماراتی، مرد درمیانی شکل و صورت کا تھا لیکن لڑکی خوب صورت تھی۔ حجاب کھوٹی کھوٹی آواز میں بولی۔ ”ہادی صاحب! سنا ہے یہاں لوگ اکثر دو تین شادیاں کر لیتے ہیں، کیا یہ لوگ اپنی بیویوں سے انصاف کر لیتے ہیں؟“

”میں سمجھا نہیں۔“

”دیکھیں نا اپنی تین بیویوں کو ایک جیسے فرنیج یا ایل سی ڈی لے دینا۔۔۔۔۔ ایک جیسے کپڑے سلوا دینا یا ایک جتنے نوکر رکھ دینا۔۔۔۔۔ یہ تو انصاف یا مساوی سلوک نہیں کہلا سکتا نا۔ بلکہ۔۔۔۔۔“ وہ کہتے کہتے چپ ہو گئی۔

ہادی اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ذرا توقف سے بولی۔ ”بلکہ ہادی صاحب اگر ایک شوہر ان تین بیویوں کو برابر وقت بھی دیتا ہو یعنی ایک ایک ہفتہ ہر بیوی کے پاس رہتا ہو تو بھی یہ مساوی سلوک تو نہیں کہلا سکتا نا۔ عورت، فرنیج، ایل سی ڈی یا ہفتہ تو نہیں مانگتی نا۔ وہ تو محبت مانگتی ہے اور محبت دل کے اندر سے نکلتی ہے، جب میں سے نہیں نکل سکتی اور نہ بونے میں سے نکل سکتی ہے چاہے وہ کتنا بھاری ہو۔ ہمارا اسلام اس بارے میں کیا کہتا ہے؟“

”اسلام یہی کہتا ہے جناب کہ مرد جب ہی ایک سے زائد شادیاں کرے جب وہ بیویوں کے ساتھ مساوی سلوک کر سکے۔“

”اور ہم نے مساوی سلوک سے مراد فرنیج، کار اور ایل سی ڈی وغیرہ لے رکھے ہیں۔ اس حکم کی اصل روح تو

محبت اور چاہت میں پوشیدہ ہے جس کو ہم بیکسر فراموش کر دیتے ہیں اور اپنے لیے آسانیاں ڈھونڈ لیتے ہیں۔۔۔۔۔ حالانکہ یہ کام اللہ نے اتنا آسان نہیں بنایا ہے۔“

وہ باتیں کر رہی تھی اور ہادی اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی باتیں ہادی کی سمجھ میں آ رہی تھیں اور وہ وجہ بھی سمجھ میں آ رہی تھی جس کے سبب وہ یہ باتیں کر رہی تھی۔ شریکان نے جو کچھ فون پر ہادی کو بتایا تھا وہ ظاہر ہے کہ حجاب کے علم میں بھی تھا اور اس نے حجاب کی ہستی کو اندر سے درہم برہم کر رکھا تھا۔ اس نے اس گھر میں بہت کچھ سہا تھا لیکن اب ایک سوکن کا عذاب سہنے کے لیے وہ خود کو تیار نہیں کر پاری تھی۔ وہ جوان تھی، خوب صورت تھی۔ اس کے دل میں ایک باوقاف شوہر اور ایک پھولوں بھرے آنگن کی خواہشیں تھیں۔ ان خواہشوں کو روندنا جا رہا تھا۔ شادی کے صرف دو حاتی تین سال بعد اس سے اس کی نصف ازدواجی زندگی چھیننے کے پروگرام بن رہے تھے۔ کیا کوئی ناقابل معافی غلطی کر دی تھی اس نے؟

وہ باتیں کرتی رہی۔ ہادی نے بھی کہیں کہیں جواب دیا۔ وہ زیادہ سنا ہی رہا۔ پھر لاہور سے شیوجی کی کال آئی۔ ہادی بٹنے لگا۔ فون پر بات کرتے ہوئے بھی اس کی نظریں حجاب کی طرف ہی تھیں۔ وہ سمندر کو دیکھ رہی تھی۔ سمندر میں تلاطم تھا۔ موجیں اٹھ رہی تھیں، بلند ہو رہی تھیں اور ساحل سے ٹکرا رہی تھیں۔۔۔۔۔ شاید ایسا ہی کچھ حجاب کے اندر بھی تھا۔

فون پر بات کرتے ہوئے اور شیوجی سے گیتوں کے لیے چند نونوں کی مزید مہلت مانگتے ہوئے ہادی کی نگاہ حجاب کے عقب میں ایک سرخ چھتری کی طرف اٹھ گئی۔ گہرے سرخ رنگ کی یہ چھ سات فٹ اونچی چھتری تھی۔ اس کے قریب جو درمیانے قد کا بندہ کھڑا تھا اسے ہادی دوسری تیسری بار دیکھ رہا تھا۔ ہادی نے پہلی بار اسے کوئی ڈیڑھ گھنٹہ پہلے میٹرو سٹریٹ میں دیکھا تھا۔ پھر جب وہ خانچا فروش سے بٹنے لے رہے تھے، یہی شخص ان کے سامنے سے گزر کر پانی کی طرف گیا تھا۔ اب وہ چھتری کے قریب موجود تھا۔ پتا نہیں کیوں یہ شخص ہادی کو ٹھوک لگا۔ وہ مسلسل ان کے آس پاس تھا۔۔۔۔۔ کیا وہ کسی چکر میں تھا؟ کوئی جیب کترا، اٹھائی خیر، یا کوئی مزید خطرناک شخص۔

اگلے دس پندرہ منٹ میں بھی وہ شخص ہادی اور حجاب کے آس پاس ہی رہا۔ ہادی کو یقین ہونے لگا کہ وہ کسی چکر میں ہے۔ بہر حال اس بارے میں ہادی نے حجاب کو کچھ

نہیں بتایا۔ وہ خوفزدہ ہو جاتی۔۔۔۔۔ اور یہ تقریباً ”ٹریپ“ شاید اسی جگہ ختم ہو جاتا۔ تھوڑی دیر بعد ہادی کو لڈو رنگ لینے کے بہانے اس سرخ چھتری کی طرف گیا۔ چھتری کے ساتھ ہی ایک سائیکل کے نیچے کولڈ ڈرنکس اور اسٹیکس وغیرہ کا اسٹال تھا۔ ہادی نے کچھ چپس لیے اور چارٹن پیک ڈرنکس۔ درمیانے قد کا دھاری دار شرٹ والا شخص اس سے فقط دس بارہ فٹ کی دوری پر موجود تھا۔ اس کا جسم کسی گینڈے کی طرح مضبوط اور گھٹنا ہوا تھا۔ وہ بہ ظاہر بڑے اٹھناک کے ساتھ ایک اٹالین خاتون سے اطالوی میں باتیں کر رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں شوخی اور ہوشیاری کی چمک تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کی آنکھیں کچھ اور بھی ظاہر کرتی تھیں۔ نیچانے کیوں ان آنکھوں کو دیکھ کر ہادی کو لگا کہ یہ تانے قد کا شخص عورتوں کا زبردست رسیا ہے۔ صرف ایک لمحے کے لیے ہادی کی نظریں اس سے چار ہوئی تھیں۔ ہادی کو اس کی آنکھوں میں سرخ ڈورے اور ایک طرح کی بھوک دکھائی دی تھی۔ اٹالین خاتون قد میں اس سے تھوڑی سی لمبی ہی ہوگی۔ وہ غالباً اس کے لباس اور اس کی خوب صورتی کی تعریف کرنے میں مصروف تھا۔ خاتون ہنستی جا رہی تھی۔

ہادی اشیائے خورد و نوش لے کر واپس آ گیا۔ دونوں ساحل کے ساتھ ساتھ چلتے رہے، باتیں کرتے رہے۔ حجاب بڑے ”لائٹ“ موڈ میں تھی۔ وہ ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی۔ اپنے بچپن کی، لڑپن کی، کالج کے دور کی۔ اس نے روم بھی کی ایک یونیورسٹی سے اسے ایس ایس کیا تھا۔ ماسٹر کرنا چاہتی تھی اور ب۔ آسانی کر بھی سکتی تھی لیکن پھر ارادہ ترک کر دیا۔ کیونکہ اس کی معنی ہو چکی تھی اور سسرال والوں کو شادی کی جلدی تھی۔ حجاب کی باتوں سے ہرگز اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ اس کی ازدواجی زندگی مشکلات کا شکار ہے۔ اس نے ہادی کے سامنے جلال کو ایک اچھا اور دیکھ بھال کرنے والا شوہر قرار دیا۔ باتوں باتوں میں ہادی کو اچانک ایک بات یاد آئی۔ اس نے حجاب سے پوچھا۔ ”آپ کے گھر کے ایک کمرے میں غالباً آپ کی کسی فریڈز کی تصویر لگی ہوئی ہے۔ نیچے لکھا ہوا ہے۔۔۔۔۔ میں تمہیں بھی بھول نہ پاؤں گی۔“

ہادی نے دیکھا، حجاب کی آنکھوں میں ایک دم ایک سایہ سا بھرا گیا۔ وہ جیسے خشک سی گئی تھی۔ شاید کوئی کہانی تھی اس تصویر کے پیچھے۔ یقیناً ایسا ہی تھا۔

حجاب نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ”ہاں۔۔۔۔۔ بڑی

بیاری دوست تھی میری۔ اب جا چکی ہے۔“

”کہاں؟“

”جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔“ اس کی آواز میں دردلہریں لینے لگا۔

”اوہ۔۔۔۔۔ آئی ایم ساری، کیا ہوا تھا انہیں؟“

”بس۔۔۔۔۔ ایک حادثہ، جس میں جان چلی گئی اس کی۔ اپنے گھر کی سیڑھیوں سے گری گئی تھی۔ سر پر گہری چوٹیں آئیں، اسپتال پہنچنے سے پہلے ہی ختم ہو گئی۔“

”ویری سیڈ۔ شادی شدہ؟“

”ہاں۔“ حجاب نے مختصر جواب دیا۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ اس موضوع پر زیادہ بات کرنا نہیں چاہتی۔ ہادی بھی اس کا موڈ برابرا نہیں چاہتا تھا۔

دو تین منٹ بعد ہادی نے بڑی صفائی سے موضوع بدل دیا۔ وہ دونوں پاکستان کی باتیں کرنے لگے۔ حجاب اپنے والدین کے ساتھ بہت چھوٹی عمر میں اٹلی آ گئی تھی لیکن اس کی مٹی کو پاکستان سے نسبت تھی۔ اسے پاکستان کے بارے میں جانتا بہت اچھا لگتا تھا۔ وہ کئی بار وہاں جا بھی چکی تھی۔ ہادی نے اسے پاکستان میں اپنی مصروفیات اور والدہ اور بھائی کے بارے میں بتایا۔

اس گفتگو کے دوران میں اس کا دھیان دھاری دار شرٹ والے شخص کی طرف بھی رہا۔ وہ مسلسل ان کے آس پاس نظر آ رہا تھا۔ لگتا تھا کہ اسے ایسے کاموں کا کافی تجربہ ہے۔ ہادی کی جگہ کوئی اور شخص ہوتا تو شاید اس کی سرگرمی سے آگاہ نہ ہو سکتا۔

حجاب نے کہا۔ ”چلیں۔۔۔۔۔ اب کوئٹہم (قدیم اسٹیڈیم) کی سیر ہو جائے۔“

کوئی اور موقع ہوتا تو ہادی اس پیشکش کو سمر آنکھوں پر رکھتا لیکن اس وقت دھاری دار شرٹ والے کی وجہ سے صورت حال مختلف تھی۔ اس نے کہا۔ ”کیوں نہ کل چلیں۔۔۔۔۔ تازہ دم ہو کر۔“

”لیکن۔۔۔۔۔ کل تو میں نہیں آسکوں گی۔۔۔۔۔ بلکہ۔۔۔۔۔ شاید دوبارہ آ ہی نہ سکوں۔“

ہادی کے سینے میں مایوسی کی لہری دوڑ گئی۔ ”یہ تو پھر کوئی بات نہ ہوئی۔“ وہ بولا۔

”کیا اتنا کافی نہیں ہے؟“ اس کی آنکھوں میں مسکراہٹ تھی۔

”آپ نے جتنا ستایا ہے، اس لحاظ سے تو آپ کو کم از کم چھ سات دن مجھے چھٹی دینی چاہیے۔“

”جتنا تصور کیا ہے، اتنی ہی سزا دیجیے۔“

”یعنی آپ سزا بھگت رہی ہیں؟“

وہ ہنس ہنس کر سرخ ہونے لگی۔ لیکن یہ سرخی ہادی کو نقاب کی وجہ سے نظر نہیں آ رہی تھی اور نہ ہی وہ پیشانی جو نقاب کے ہنسنے ہی جتنی تھی اور چاند بن جاتی تھی۔ مذاق کر رہی تھی۔ یقین کریں، آپ کے ساتھ ٹھونٹنا مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ بیماری کے بعد کوئی ٹانگ سال گیا ہے، ایک دو ہفتے تو سخت ڈپریشن میں رہی ہوں۔“

”ٹانگ جب شروع کریں تو اسے چند دن تو استعمال کرنا چاہیے۔“ ہادی نے نامحانا انداز میں کہا۔

”ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب، لیکن اگلی ڈوز اگر پرسوں ہو جائے تو کوئی حرج تو نہیں؟“

”جیسے آپ کی مرضی۔“ ہادی نے کہا۔

اسی دوران میں نقاب کو سائل کی ریت پر قلقاریاں مارتا ایک جاپانی بچہ نظر آیا۔ اس نے اسے گود میں اٹھا کر چوما جانا۔ وہ اس کی بانہوں میں کھینے لگا۔ اس کی جاپانی ماں اور والد خوش ہونے لگے۔ کچھ دیر بعد ہادی اور نقاب ایک ساحلی ریسٹورنٹ میں داخل ہوئے۔ یہاں انہوں نے کھانا کھایا۔ کولڈ کافی پی اور باتیں کرتے ہوئے واپس روانہ ہو گئے۔

میٹر وٹرین میں بیٹھنے تک دھاری دار شرٹ والا شخص ہادی کو کہیں نظر نہیں آیا۔ لیکن جب وہ ہوٹل واسکوڈے کے قریب ٹرین سے اتر رہے تھے، اس نے دوبارہ اپنی نخوس جھلک دکھا دی۔ ابھی تک نقاب کو اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ نقاب کو یہاں سے دوسری ٹرین پکڑنا تھی۔ جب تک نقاب ٹرین میں سوار نہیں ہوئی۔ ہادی وہیں کھڑا رہا۔ اس نے فیصلہ کیا تھا کہ اگر دھاری دار شرٹ والا نقاب کے پیچھے گیا تو وہ خود بھی ٹرین میں سوار ہو جائے گا اور اسے بخفا غت گھر تک چھوڑ کر آئے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ وہ شخص وہیں پلیٹ فارم کے ایک گوشے میں موجود رہا۔

ہادی پیدل اپنے ہوٹل کی طرف روانہ ہو گیا۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ شخص آس پاس موجود ہے۔ اس کی موجودگی ہادی کے اندر شیش اور پریشانی کی لہر ابھار رہی تھی۔

☆☆☆

نقاب گھر کے باغچے میں ٹہل رہی تھی۔ پھر وہ آرام کرسی پر بیٹھ گئی۔ امی، فیصل کے ساتھ اپنے ”چیک اپ“ کے لیے اسپتال گئی ہوئی تھیں۔ ابو کرے میں سو رہے

تھے۔ وہ سوچ رہی تھی..... وعدے کے مطابق کل اسے ہادی کی طرف جانا تھا۔ ان کا پروگرام حسب سابق روم میں گھومنے پھرنے کا تھا۔ وہ تاحال تذبذب میں تھی، جائے کہ نہ جائے۔ پتا نہیں کیوں ہادی اس کو بہت اپنا سا لگتا تھا۔ جیسے وہ اسے بہت پہلے سے جانتی ہو۔ اس کی ہر ادا پر پتائی ہو۔ اس کے لہجے کی شائستگی سیدھی نقاب کے دل میں اثراتی تھی۔ بہر حال اس جذبے میں کسی طرح کی روایت کو دخل نہیں تھا۔ یہ ویسی ہی اپنائیت تھی جیسی کسی قریبی عزیز یا گہری سہیلی کے ساتھ ہو سکتی ہے۔ لیکن..... نقاب نے بار بار یہ بھی سن رکھا تھا کہ مرد اور عورت کے درمیان ”دوستی“ نام کی چیز تادیر برقرار نہیں رہتی۔ یہ کھٹنے کھٹنے ختم ہو جاتی ہے یا بڑھتے بڑھتے محبت بن جاتی ہے۔ بہر حال نقاب اس بات کی قائل نہیں تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ انسان اندر سے مضبوط ہو تو وہ ہر قسم کی صورت حال کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھال سکتا ہے، ہر طرح کی رواجی اور معاشرتی غیث گونیوں کو غلط ثابت کر سکتا ہے۔

ایک بات غور طلب تھی اور یہ خود نقاب کی سمجھ میں بھی نہیں آ رہی تھی۔ وہ یہ شارڈز خیروں میں بندھی ہوئی عورت تھی۔ انہیں تو نہیں سکتی تھی۔ پھر وہ انہیں کیوں بلا رہی تھی۔ اس نے اپنے سسرال میں بہت سی مصیبتیں جھیلی تھیں۔ کئی کڑی آزمائشوں سے گزری تھی۔ شادی کے چند دن بعد ہی اس کے والدین کی بے وجہ توہین شروع ہوئی تھی۔ شادی کے دو مہینے بعد ہی جلال نے اسے برا بھلا کہنا اور دھکے دینے شروع کر دیے تھے۔ اس کی ناراضگی کی جڑیں نقاب کی اس ”جرات“ کے اندر تھیں جو نقاب نے شادی سے پہلے کی تھی۔ اس نے جاب کرنے کی بات کی تھی۔ بے شک بعد میں جاب کا کارادہ ترک کر دیا تھا، جلال سے معافی بھی مانگ لی تھی لیکن جلال کے دل میں یہ بات انک کر رہی تھی کہ شادی سے پہلے نقاب نے ”اپنے جاب کرنے کو“ ایک شرط کے طور پر پیش کیا تھا۔

ساس آپا خانم کا رو بہ پہلے روز سے ہی نقاب کے ساتھ مناسب نہیں تھا۔ نقاب کی تمام تر کوششوں کے باوجود یہ خراب سے خراب تر ہی ہوتا گیا تھا۔ وہ نقاب کے خلاف جلال کو بھڑکانے میں اکثر کامیاب رہتی تھیں۔ یہ بات نقاب کے سوا، نقاب کے سسرال اور میٹے میں کسی کو معلوم نہیں تھی کہ جلال اس پر ہاتھ بھی اٹھاتا تھا۔ یہ سلسلہ شادی کے ایک سال بعد ہی شروع ہو گیا تھا۔ اب تو نقاب ان چھڑوں کی تعداد بھی بھول چکی تھی جو اس نے گاہے بگاہے کھائے

تھے..... ہاں پہلا چھڑا اسے آج تک نہیں بھولا تھا۔ نقاب کے ایک خالہ زادی شادی تھی۔ جلال نے اسے وہاں جانے سے منع کر دیا تھا..... کیونکہ مردوں اور عورتوں کے لیے بیٹھنے کا علیحدہ انتظام نہیں تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہاں بے ہودگی ہوگی۔ اس کے علاوہ ڈھونگ، مہندی کے گیت اور اس طرح کی دیگر رسوم بھی جلال کو بالکل پسند نہیں تھیں۔ وہ اس کی شادیوں پر جانے سے گریز کرتا تھا۔ نقاب نے بہت کہا کہ وہ پردے میں رہے گی، کسی کو نہ میں بیٹھی رہے گی لیکن وہ نہیں مانا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ عورت جب کسی شادی بیاہ میں جانے کے لیے پڑے بنوائی ہے، تیار ہوتی ہے تو پھر وہ اپنا آپ دکھائے بغیر رہ ہی نہیں سکتی۔ کسی نہ کسی طور وہ خود فحاشی کا کوئی بہانہ ڈھونڈ لیتی ہے۔ نقاب کا جرم یہ نہیں تھا کہ وہ خدا آؤ است پھر بھی شادی پر گئی تھی۔ اس کا جرم صرف یہ تھا کہ وہ نہ جانے کی وجہ سے چپ رہی تھی اور اس کی آنکھوں میں رونے کے سبب لانی لگی۔ جلال نے اس کو روکنا تھا کہ باہر کھانا کھائیں گے۔ عشا کی نماز کے فوراً بعد نقاب تیار بھی ہوئی تھی۔ جانے سے ذرا پہلے جلال کی نگاہ نقاب کے چہرے پر پڑی اور اس کا موڈ ایک دم خراب ہو گیا۔

”تم کھانے پر جا رہی ہو یا کسی کے سوگ پر؟“

”کیا ہوا جلال؟“ وہ طرز کو بولی۔

”کون مر گیا ہے تمہارا جو ایسی صورت بنائی ہوئی ہے؟“ وہ مزید بھڑک کر بولا۔

وہ سکتے میں رہ گئی۔ ”جلال! میں نے کیا کہا ہے، آپ کیوں بولتے ہیں اس طرح۔ ایسے تو لوگ نوکرائیوں سے بھی.....“

اس کی بات ادھوری رہ گئی تھی کیونکہ جلال کا تھپڑ اس کے رخسار پر پڑا تھا۔ وہ جیسے چکر اکبر پر گر گئی۔ جلال کا ر کی چابی فرش پر پڑتا ہوا باہر چلا گیا تھا..... ہاں اس کے بعد بھی بند کمرے میں کی تھپڑ نقاب کے حصے میں آئے تھے لیکن وہ تھپڑ آج بھی اسے یاد تھا۔

نقاب نے سب کچھ سہا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ سسرال والوں کے دل جیتنے کی بھرپور کوشش بھی کی تھی۔ اس نے اپنے آپ کو جلال کی مرضی میں فنا کر لیا تھا۔ وہ دن کو رات کہتا تو وہ بھی بڑے خلوص سے اسے رات کہنے اور بیٹھنے کی تھی..... لیکن پتا نہیں کیا بات تھی، جلال کی جاہت کو نقاب کی خود پردہ گیوں اور عاجزوں سے ہمیشہ بیرہا تھا۔

بہر حال نقاب کو کوئی شکوہ نہیں تھا۔ اگر وہ کچھ جمیل رہی تھی تو اپنے گھر کے لیے جمیل رہی تھی۔ یہ اس کا آگن

لطائف

یوڑھا سردار۔ ”ڈاکٹر صاحب میری سیدی ٹانگ میں درد ہے۔“

ڈاکٹر۔ ”یہ تو بڑھاپے کی وجہ سے ہے۔“
سردار۔ ”مگر ڈاکٹر صاحب میری امی ٹانگ بھی تو اسی عمر کی ہے۔“

☆ الو اور شوہر میں کیا فرق ہوتا ہے۔
O شوہر کو آسانی سے الو بنایا جاسکتا ہے، جبکہ الو اتنا الو بھی نہیں ہوتا کہ شوہر بن جائے۔

فقیر۔ ”صاحب 50 روپے دے دو چائے پیوں گا۔“

آدی۔ ”چائے 25 روپے میں آتی ہے۔“
فقیر۔ ”صاحب گرل فرینڈ بھی ہے کی۔“

آدی۔ ”گرل فرینڈ بھی بنائی؟“

فقیر۔ ”نہیں صاحب گرل فرینڈ نے فقیر بنا دیا۔“

دو سردار بینک لوٹنے گئے، مگن گھر بھول گئے، پھر بھی بینک لوٹ لیا، کیسے؟
بینک منیجر بھی سردار تھا، بولا۔ ”مگن کل دکھا دینا ہم کو زبان پر اعتبار ہے۔“

ایک مین بادام بیج رہا تھا، سردار نے پوچھا ”یہ کھانے سے کیا ہوتا ہے۔“

مین۔ ”دماغ تیز ہوتا ہے۔“
سردار۔ ”کیسے؟“

مین۔ ”اچھا یہ بتاؤ ایک کلو چاول میں کتنے دانے ہوتے ہیں؟“

سردار۔ ”پتا نہیں۔“

مین نے سردار کو ایک بادام کھلایا اور بولا۔ ”بتاؤ ایک درجن میں کتنے کیلے ہوتے ہیں؟“

سردار۔ ”12“

مین۔ ”دیکھا دماغ تیز ہوا کہ نہیں؟“

سردار۔ ”2 کلو سے دیر بہت کام کی چیز ہے۔“

مرسلہ: رضوان تنولی کریڈی، اورنگی ٹاؤن کراچی

اہلیت

استاد۔ ”وہ کون سا ڈیپارٹمنٹ ہے جس میں عورت کام نہیں کر سکتی۔“
شاگرد۔ ”فائر بریگیڈ۔“
استاد۔ ”کیوں؟“
شاگرد۔ ”عورت کا کام آگ لگانا ہے۔ جھاننا نہیں۔“

مرسلہ: رضوان خٹولی کریڈوی، اورنگی ٹاؤن کراچی

”رومن سینٹرم۔“ ہادی نے جواب دیا۔
وہ دونوں نقشے پر جھک گئے۔ وہ شخص ہادی کو انگلی کی مدد سے بتانے لگا فلاں رستہ کہاں سے نکلتا ہے اور کدھر کو جاتا ہے اور میٹروپولین یا بس کہاں سے بہ آسانی مل سکتی ہے وغیرہ وغیرہ۔

یہ سب کچھ سمجھتے ہوئے ہادی اس کے بالکل قریب آ گیا تھا۔ ہادی نے جان بوجھ کر اپنی بائیں کبھی کو اس کے جسم سے قریب تر کر دیا اور یوں اس کا شک یقین میں بدل گیا۔ اس کی کبھی اس نامعلوم شخص کی ہیلت سے بچ ہوئی۔ یہاں ہادی کو کسی ابھری ہوئی سخت چیز کا احساس ہوا۔ یہ یقیناً پستول یا ریولور وغیرہ کا دستہ ہی تھا۔ ہادی کے جسم میں دوڑتی ہوئی سسٹماٹ کچھ اور بڑھ گئی۔

اب وہ ہادی کو اندرونی گلیوں کے کچھ شارٹ کش بتا رہا تھا۔ یقیناً وہ اس شہر کو اپنے ہاتھ کی لکیروں کی طرح جانتا تھا۔ ہادی نے لمبی سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”اچھا یہ بتائیں کہ اگر کوئی بندہ یہاں..... میٹرو کے اس اسٹیشن سے آپ کے پیچھے لگ جاتا ہے اور آپ اس سے بچ بچا کر یہاں..... اس ساحل تک جانا چاہتے ہیں تو آپ کو کون سا راستہ اختیار کرنا چاہیے۔“

اس نے ذرا چونک کر ہادی کو دیکھا۔ ”میں سمجھا نہیں۔“ ہادی نے کہا۔ ”میرا مطلب ہے یہ روم ہے، یہاں ہر طرح کے برے بھلے لوگ پائے جاتے ہیں۔ اگر کوئی کسی غلط نیت سے آپ کے پیچھے لگ جائے تو پھر..... کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔“

ہادی نے دیکھا کہ ہری سرخ شرٹ والا دراز قد پولیس آفیسر لانی میں پہنچ چکا تھا اور اب سگریٹ سلگا کرٹی دی دیکھنے میں مصروف تھا۔ دو لمبے کے لیے اس کے ساتھ ہادی کی نگاہیں ملیں اور آنکھوں آنکھوں میں علیک ملیک ہوئی۔ ہادی پولیس آفیسر ہاشم ایرک کے پاس سے گزرتا ہوا سیدھا ہانے قد والے کے پاس پہنچ گیا۔
”ہیلو..... السلام علیکم!“ ہادی نے اس کے پاس جھک کر کہا۔

اس نے ہادی کو دیکھا اور اس کے چہرے پر رنگ سا آکر گزر گیا۔ جلدی سے سنبھل کر بولا۔ ”علیک السلام۔“
”آپ پاکستانی ہیں؟“ ہادی نے پوچھا۔
”نہیں..... نہیں۔ لیکن اردو بول سکتا ہوں۔ آپ فرمائیں کیا بات ہے؟“

”یہاں زبان کا بہت مسئلہ ہے۔“ ”ہم زبان“ سے مل کر خوش ہوتی ہے۔ میرا نام ہادی ہے۔ میں یہاں کمرانمبر 118 میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ ویسے آپ اطالوی پڑھ لیتے ہیں؟“
”کافی حد تک..... آپ فرمائیے۔“

”میرے کمرے میں دیوار پر روم کا ایک نقشہ لگا ہے۔ لیکن جگہوں اور راستوں کے نام وغیرہ اطالوی میں ہیں۔ کیا آپ اس کو سمجھتے ہیں میری مدد کر سکتے ہیں؟“
وہ جیسے چند لمحوں کے لیے تذبذب میں رہا۔ پھر بولا۔
”چلیے..... میں دیکھ لیتا ہوں۔“

دونوں لانی سے اٹھ کر کمرے میں آ گئے۔ ہادی نے دروازہ بند کر دیا لیکن لاگ نہیں کیا۔ دیوار پر قریباً تین فٹ ضرب چار فٹ کا ایک اسٹیشن نقشہ موجود تھا۔ اسے دیکھ کر وہ شخص مسکرائے لگا۔ ”جی ہاں، یہ نقشہ تو اطالوی میں ہے لیکن اس کا انگلش اور عربی وغیرہ میں بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ یہ دیکھیے۔“

اس نے نقشے کو ہاتھ سے حرکت دی وہ سلائڈ کر کے ایک طرف چلا گیا۔ اس کے پیچھے ویسا ہی ایک دوسرا نقشہ موجود تھا، یہ انگلش میں تھا۔ ”اوہو! تو یہ بات ہے۔“ ہادی نے ہونٹ نکلتے۔

وہ صرف اداکاری کر رہا تھا، ورنہ اسے بھی معلوم تھا کہ نقشے کے نیچے دو تین اور نقشے بھی موجود ہیں۔

”کہاں گھومنا چاہتے ہیں آپ؟“ تو جوان شخص نے قدرے باریک آواز میں پوچھا۔ مضبوط جسم کے مقابلے میں یہ آواز ایک طرح کا تشدد پیش کرتی تھی۔

”وہی جو آپ نے کہا تھا۔“ ٹھیک دس بجے ہوئی کی لانی میں۔ اگر اس میں کوئی ردوبدل ہوا تو میں آپ کو بتا دوں گا۔“
”ردوبدل کا امکان بھی ہے؟“ اس نے کہا اور نچلا ہونٹ آہستہ سے دانتوں تلے دبایا۔
”نہیں۔ ویسے ہی بات کر رہا تھا۔“ ہادی نے گھبرا کر کہا۔

وہ مسکرائی۔ ”اگر ردوبدل کا امکان ہے تو میں بھی شاپنگ وغیرہ کی شکل میں کوئی سینکڑا آپشن رکھ لوں کل کے لیے۔“
”خدا کے لیے مجھے معاف کر دیجیے۔ میں کانوں کو ہاتھ لگاتا ہوں۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔“
وہ ہنسنے لگی۔ چند لمحوں کے بعد یہ ٹیلی فونک گفتگو اختتام پذیر ہو گئی۔

☆☆☆

حجاب کے فون کے بعد ہادی نے پچھنی سے ہوٹل کے کمرے میں ٹھیلے لگا۔ پروگرام کے مطابق حجاب کو کل دس سواڑیں بچے آنا تھا۔ اور یہاں صورت حال یہ تھی کہ وہ مخصوص شخص ابھی تک ہادی کے ارد گرد میڈل لارہا تھا۔ اب بھی وہ سینکڑوں فلوری لانی میں موجود تھا اور صوفے پر آرام سے بیٹھا سا پیر کا اخبار پڑھ رہا تھا۔ یہ کون تھا؟ کیا چاہ رہا تھا؟ ہادی کے ذہن میں ان گنت سوال میڈل لارہے تھے۔ ابھی ڈھائی تین گھنٹے پہلے ہادی نے لاہور میں اپنے پروڈیوسر شیو

صاحب سے بات کی تھی اور صورت حال سے ٹھوڑا بہت آگاہ کیا تھا۔ شیو صاحب نے تین نمبرز لکھوائے تھے۔ ان میں سے ایک نمبر بڑا کارآمد تھا۔ یہ نمبر ایک ایسے پاکستانی بڑا اطالوی کا تھا جو روم کی پولیس میں حاضر سروس ڈپٹی انسپکٹر تھا۔ اس کا نام شیو صاحب نے ہاشم ایرک بتایا تھا..... ایرک کی سمجھ تو ہادی کو نہیں آتی تھی لیکن ہاشم کی اچھی طرح آگئی تھی۔ اب یہ ہاشم ایرک ٹھوڑی دیر میں ہوٹل پہنچنے والا تھا۔ پروگرام کے مطابق وہ سادہ لباس میں تھا۔ اس نے سرخ شرٹ پہن رکھی تھی ہادی نے بھی اسے اپنے لباس کا رنگ بتا دیا تھا اور سیل نمبر بھی دے دیا تھا۔

پروگرام کے مطابق ٹھیک پانچ بجے ہادی اٹھا اور ٹھیلٹا ہوالانی میں پہنچ گیا۔ ایلی ڈی ڈی پر ایک رومانٹک کامیڈی فلم چل رہی تھی۔ آٹھ دس مردوزن ٹوٹا تھا۔ ان میں ہی وہ دھاری دار شرٹ والا ناٹا شخص بھی تھا لیکن وہ فلم نہیں دیکھ رہا تھا۔ بہ ظاہر وہ اخبار پڑھنے میں مصروف تھا۔

”وہ کسی کی منتی ہی کب ہے جی۔ وہ کیا کہتے ہیں جی، ساری خدائی ایک پائے..... میرا ڈھولن بھی اک پائے۔ اسے آج کل وڈے بھائی جان کے سوا کسی کی پروا نہیں ہے جی۔“ شریفان کی آواز میں دکھ لہریں رہا تھا۔
حجاب کے دل پر بھی اس خبر نے غیر معمولی اثر کیا۔ اسے اپنی پیشانی پر پسینے کی نمی محسوس ہوئی۔ اس اور پروا لے کمرے میں ارم نے ایک بار پہلے بھی آنے کی کوشش کی تھی۔ اس وقت حجاب نے ایسا نہیں ہونے دیا تھا۔ اس نے جلال سے کہا تھا کہ ان کی ”پرائیویسی“ متاثر ہوگی۔ جلال کی سمجھ میں یہ بات آگئی تھی لیکن اب ارم نے پھر وہ کمرہ منتخب کر کے اور جلال نے اس کی اجازت دے کر حجاب کو بتایا تھا کہ بات کتنی تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ یقیناً ارم کا حوصلہ بڑھانے میں آپا خانم کا بھی عمل دخل تھا۔

وہ سب کچھ سننے کو تیار تھی۔ جلال سے ہر طرح کی جسمانی اور ذہنی توہین برداشت کر کے بھی اس کے آگے پیچھے پھر سکتی تھی۔ جی ضروری کر سکتی تھی لیکن دوسری عورت سے بچنے کے لیے کسی کے سامنے کسی طرح کی عاجزی، مستعدی کا اظہار اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ وہ ایسا کر ہی نہیں سکتی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ وہ ایسا کرے گی تو عورت کے درجے سے نیچے گر جائے گی۔ ایک مفاد پرست منافع خلو بن جائے گی۔ کوئی ایسی جس جو دانے پانی اور زندگی کی دیگر بولتوں کی خاطر عورت اور بیوی کا روپ دھارے گی۔

شریفان سے بات کر کے وہ دیر تک بستر پر لیٹی رہی۔ سینے میں کچھ جدا سی ہلچل تھی..... چنگاری..... پھر ایک چنگاری۔ زیادہ روشن..... زیادہ حرارت والی۔

ایسا کیوں ہو رہا تھا؟ اس کا جواب نہیں تھا..... لیکن ایسا ہو رہا تھا۔ درختوں کے سامنے مختصر ہونے کے بعد پھر بڑھنا شروع ہو گئے تھے۔ شام دے پاؤں روم کے دروازے پر اتر رہی تھی۔ ٹیلے آسمان پر جہازوں کی چھوڑی ہوئی لاتعداد سفید لکیریں تھیں اور ان لکیروں سے نیچے پرندے جو پرواز تھے۔ ایک گہری سانس لے کر حجاب نے فون اٹھایا۔ ہادی کا نمبر پریس کیا۔ ”ہیلو کون؟“ دوسری طرف سے ہادی کی شائستہ آواز ابھری۔

”حجاب بول رہی ہوں۔“
”جی جی، بولے، کب سے آپ کے بولنے کا منتظر تھا۔“
”تو کیا پروگرام ہے کل کا؟“

تیل تو کہیں بھی نہیں ملے گا تمہارے لیے۔“
وہ شخص کرسی پر بیٹھ گیا اور سوالیہ نظروں سے ہاشم اور
ہادی کو دیکھنے لگا۔ ہاشم نے اس کی جیبوں سے نکلنے والی اشیا
دیکھیں۔ ان میں اس شخص کا کوئی شناختی کاغذ موجود نہیں تھا۔
”کیا نام ہے تمہارا؟“ ہاشم نے ڈرے لہجے میں پوچھا۔
”گلزار..... گلزار احمد۔“
”کیا کرتے ہو؟“
”ڈوب ہو یونیورسٹی سے اکاؤنٹنٹ کو رس کیا ہے۔ اب
جواب دھونڈ رہا ہوں۔“
”رہائش کہاں ہے؟“
اس گلزار نامی شخص نے اپنا انڈریس آفیسر کو لکھوا دیا۔
”مسٹر ہادی کا پیچھا کیوں کر رہے ہو مسکس؟“ ہاشم
نے پولیس والوں کے انداز میں آجاک سوال کیا۔
اس کا رنگ کچھ اور پھیکا پڑ گیا۔ ”یہ..... یہ آپ کیا کہہ
رہے ہیں؟“
”میں نے کہہ رہا ہوں کہ تم مسٹر ہادی کا پیچھا کیوں کر
رہے ہو پچھلے دو دن سے؟ یہ جہاں جاتے ہیں تم ان کے پیچھے
ہوتے ہو۔“

”اگر ایسا ہے تو میرے لیے حیران کن بات ہے۔ یہ ایک..... اتفاق ہی ہوگا۔“

”میں اگر تمہیں دوسرا تھپڑ رسید کروں گا تو یہ بھی ایک اتفاق ہی ہوگا..... اور پھر میں اتفاقاً ہی تمہیں تھانے لے جا کر اتفاقاً ہی تمہیں آڑے ہاتھوں لوں گا..... دیکھو مسٹر گلزار! تمہاری خیریت اسی میں ہے کہ جو کچھ بھی ہے صاف صاف بتا دو۔ بالفرض محال تمہارے خلاف کچھ اور ذبحی سامنے آیا تو یہ بتو لی تمہیں جیل بھیجنے کے لیے کافی ہے۔“

”میں قسم کھاتا ہوں کہ.....“

ابھی اس کا قہر پورا نہیں ہوا تھا کہ ہاشم کا ایک اور زوردار چہرہ گزار کے منہ پر پڑا۔ وہ کرسی سمیت اٹتے اٹتے بچا۔ ہاشم نے اس کے بال بھی میں جکڑے اور دانت چس کر کہا۔ ”آسانی سے نہیں بتاؤ گے تو سخت مشکل میں پڑو گے۔ تمہارے خلاف ثبوت ہیں۔“

سے پھٹ گئی تھی۔ وہاں ایک عورت کا ناز یا بیٹو بنا ہوا تھا۔
 نیچے آنکری میں ایک فقرہ لکھا تھا..... مجھے ایک اچھا بستر اور
 ایک اچھی عورت دے دو۔ اس کے بعد مجھے کچھ نہیں
 چاہیے..... (یہ دراصل ایک یورپی دانشور کے معروف قول کی

وہ ڈاؤن ہل چلا گیا۔ ہاشم نے اس کی جیب میں سے نکلنے والی چیزوں کی جانچ شروع کی۔ اس کے پرس میں سے 270 یورو نکلتے۔ کچھ رسیدیں تھیں۔ ایک نیم عریاں اطالوی حینے کی تصویر تھی۔ ایک رسید سے اندازہ ہوا کہ اس نے اپنا ایڈریس درست بتایا ہے۔ وہ "ایون میوز" کے علاقے میں ایک بلڈنگ کے ایپارٹمنٹ میں رہائش پذیر تھا۔ تین جارنگے پہلے اس نے ایک "اے ٹی ایم" مشین سے کیش چھوڑا تھا۔ "اے ٹی ایم" کی رسید پر اس کے اکاؤنٹ کی تفصیل درج تھی۔ ہاشم نے اس کا سیل فون چیک کیا۔ اس فون سے آخری تین کا لیبل مٹا رہے "اے ٹی ایم" نامی کسی فرد کو کی تھیں۔ اے ٹی ایم کی اور کسی کا بھی سیل فون کی "کال ہسٹری"

سبل فون پر ایک نمبر پریس کرتے ہوئے ہاشم کے سر کے ایک کونے میں چلا گیا۔ وہاں ایک کرسی پر بیٹھ کر وہ اطالوی میں کسی سادھی افسر سے باتیں کرنے لگا۔ دو چار منٹ بعد اس نے ایک اور نمبر ملا یا اور وہاں بھی اطالوی میں بات کی۔ اس گفتگو میں اس نے فخر اے کے ڈینک اکاؤنٹ کی تفصیل بھی دوسرے شخص کو بتائی۔ باہر کے ملکوں میں شہریوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا نظام کتنا منظم ہے اور اس تک رسائی کتنی تیزی سے ہوتی ہے اس کا اندازہ ہادی کو اگلے چند منٹ میں ہوا۔

”یہ جو آئی ایم لکھا ہوا ہے..... اس سے مراد مس ارم

Q. 4. The following are the results of a survey of 100 students in a school. The students were asked to choose their favourite sport from among the following: Football, Basketball, Tennis, Badminton, Table Tennis, and Volleyball. The results are as follows:

ہادی کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا..... ارم ہی وہ لڑکی تھی جو حجاب کے گھر میں تیزی سے اپنا رستہ بنا رہی تھی..... حجاب اور اس کے شوہر جلال میں دوریاں پیدا کرنے کے حوالے سے ارم کا اہم کردار تھا اور اب ثابت ہو رہا تھا کہ یہی ارم اس گھڑانہ کی شخص کے ساتھ مستقل رابطہ میں ہے، اسے کسی نامعلوم مد میں ارم دے رہی ہے..... اور یہ طرار، ہادی کے پیچھے کا ہوا تھا..... یا شاید حجاب کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ اگر وہ حجاب کے پیچھے کا ہوا تھا تو یقیناً جان چکا تھا کہ ہادی اور حجاب روم میں اگلے گھوم رہے ہیں۔ یہ خطرناک صورت حال تھی..... حجاب جو پہلے ہی مشکلات کا شکار تھی شدید ترین مشکلات میں گھس گئی تھی۔ ہادی کی تھیلیوں پر پسینا اُگیا۔ وہ ہاشم کو ایک طرف کوشے میں لے گیا اور سرگوشیوں میں اس سے بات کرنے لگا۔ اس نے ہاشم کو بتایا کہ اس بندے سے کچھ نہ پوچھا اگلا ضروری ہے ورنہ وہ اس کی دوست کو بہت نقصان پہنچا سکتا ہے۔ اس گفتگو کے دوران میں ان دونوں نے اپنی اپنی گھڑا کی طرف ہی رکھی تھی..... کروہ کہیں کوئی جالاکا کی نہ دکھا جائے۔

ہادی نے مختصر الفاظ میں ہاشم ایک کو صورت حال سے آگاہ کیا اور اسے بتایا کہ اس کی دوست کا نام حجاب ہے اور وہ صرف مخلص دوست کی حیثیت سے چلتے ہیں۔ حجاب کے بارے میں اس سے پہلے اسی وہ ہاشم کو تعویذ بہت چکا تھا (شیخو صاحب نے ہادی کو بتایا تھا کہ ہاشم ایک کو ہر طرح کا بھروسہ کیا جاسکتا ہے)

11 مارچ 2014ء

غلطی

تنویر ریاض

وہ ایک ایسا جادوگر تھا جسے خود کو چھپانے کا ہنر آتا تھا... وہ جو بہت بڑا بازی گر تھا... جسے دنیا کو انگلی پر نہانے کا زعم تھا جانے کیسی غلطی سرزد ہوئی کہ انگلی کٹاکر خود کو ظاہر کر بیٹھا مگر... اس کے قافلے سے بچھڑنے والے پھر بھی اس کی گرد تک نہ پاسکے... یہ اور بات کہ وہ اس ماہر سراغ رساں کی نظروں سے نہ بچ سکا۔

لباس کے مانند شریک سفر بدلنے والے شعیبہ بازی مستقل مزاجی

پرائیویٹ سراغ رساں کولن اسمتھ نے سامنے بیٹھی ہوئی عورتوں کو دیکھا اور نوٹ پینے اپنی جانب کھسکے ہوئے بولا۔ ”میں تمہاری کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“
دائیں جانب بیٹھی ہوئی عورت نے سکر تے ہوئے تھوڑا سا سر خم کیا اور بولی۔ ”میرا نام اتھل ہے اور یہ میری سوکن سارہ ہے۔“
کولن نے چونک کر دیکھا جیسے اسے اپنی سماعت پر یقین نہ آیا ہو۔ وہ عورت کولن کی پریشانی کو بھانپ گئی۔ اس

اور اسے بتایا کہ اسے پولیس اسٹیشن چلنا ہوگا اور اس کے خلاف کیس رجسٹرڈ ہوگا۔ اس کے علاوہ اس نے اسے یہ بھی بتا دیا کہ وہ بہت سخت طریقے سے جھٹکنے والا ہے۔
گزار اب بار بار خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔ وہ ہاشم کی سخت مزاجی سے بھی اچھی طرح آگاہ ہو چکا تھا اور مزید تھپڑ کھانے کے خوف سے سہا ہوا تھا۔ اپنی پیشہ وارانہ مہارت سے، دس پندرہ منٹ کے اندر اندر ہاشم ایرک نے گزار کو بالکل گھٹنوں پر کر دیا۔ وہ وکیل دلیل والی ساری باتیں بھول کر منت سماجت پر اتر آیا۔ اس نے یہ بھی تسلیم کیا کہ اس کے پاس اس بریٹا پتول کا لائسنس نہیں ہے اور یہ پتول اس نے کسی اٹھائی گیرے سے 800 یورو میں خریدا تھا۔ تاہم ارم کے حوالے سے وہ کسی سوال کا تسلی بخش جواب نہیں دے رہا تھا۔ بس یہی کہہ رہا تھا کہ وہ اس کی گلاس فیلو رہی ہے اور ان کا آپس میں دین چلنا رہتا ہے۔
بہر حال ہاشم نے اس پر اپنا دباؤ برقرار رکھا، بلکہ اسے بڑھاتا چلا گیا۔ وہ اسے پھٹکڑی لگا کر پولیس اسٹیشن لے جانا چاہ رہا تھا۔ پھٹکڑی منگوانے اور اپنے معاون اہلکار کو بلانے کے لیے اس نے اپنا داک ٹائیگھ میں لیا تو گزار کی رہی سہی برداشت بھی ختم ہو گئی۔ اس نے ڈپٹی انسپٹر ہاشم کے داک ٹائیگھ پر ہاتھ رکھ دیا اور منت سماجت کرنے لگا۔

اس موقع پر ہادی نے مداخلت کی اور ہاشم سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”آفسر اگر یہ تعاون کر رہے تو پھر اسے پھٹکڑی نہ لگائی جائے اور کیا اس کے وکیل سے اس کی بات کرنا بھی ہمارے لیے ممکن ہوگا؟“
ہاشم ایرک نے ہادی کو گھورا۔ ”مسٹر ہادی! کیا آپ مجھے سکھائیں گے کہ مجھے اپنا کام کس طرح کرنا چاہیے؟“
”نہیں، میرا مطلب تھا کہ اگر.....“
”پلیز، مسٹر ہادی! آپ خاموش رہیں۔ یہ بہت سیریس کیس ہو گیا ہے..... اور جناب! مجھے بھی اپنے بڑوں کو جواب دینا ہے۔“

وہ یہ کہتے ہوئے تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا۔ ہادی جانتا تھا کہ وہ یہ سب دکھاوے کے لیے کر رہا ہے۔ اس کا مقصد گزار پر دباؤ بڑھانا ہے۔ اگر یہ بندہ پولیس اسٹیشن چلا جاتا تو پھر ان کے ہاتھ میں بھی گھمبیر نہ رہتا اور یہ سلسلہ جناب اور اس کے اہل خانہ کی رسوائی کی طرف چل لگتا۔ ہادی نے آواز دے کر ہاشم کو روک لیا اور پھر کمرے کے ایک گوشے میں جا کر دوبارہ اس سے پھر پھر شروع کر دی۔ کسی حد تک ہادی بھی جان چکا تھا کہ اب گزار عرف

”دیکھیں، میرے پاس بتانے کو زیادہ کچھ نہیں ہے اور اگر میں آپ کو بتاتا بھی ہوں تو اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ آپ مکر نہیں جائیں گے..... اور ڈپٹی کومٹائیں گے؟“ وہ دونوں اردو میں بات کر رہے تھے۔
ہادی نے ذرا روکے لہجے میں کہا۔ ”تمہارے پاس سو دے بازی کے لیے کچھ نہیں ہے گزار..... میں بس تمہارے منہ سے سنتا چاہتا ہوں کہ ارم چودھری نے جلال کی وائف جناب کو مشکل میں ڈالنے کے لیے تمہیں اس کے پیچھے لگا رکھا ہے..... اور تم اس کے کہنے پر عمل کر رہے ہو۔“
گزار کچھ دیر سوچتا رہا، اس کے گورے چنے چہرے پر تذبذب کے گہرے سائے تھے، پٹنی ہوئی شرٹ میں سے بے ہودہ ٹیڈ کا کچھ حصہ نکلتا رہا تھا..... آخر طویل سانس لے کر بولا۔ ”بے شک ایسا ہوا ہے لیکن مجھے کسی اندر کی کہانی کا پتا نہیں۔ ارم نے بس اتنا کہا تھا کہ جناب اس کی فیملی ممبر ہے اور میں اس کے آنے جانے پر ذرا نظر رکھوں۔“

زندگی کے نشیب و فراز گھٹن زدہ ماحول اور حدود قیود سے نبرد آزما باہمت حسینہ کی داستان کے مزید واقعات اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”ہماری شادی ایک ہی مرد سے ہوئی ہے۔“

کولن نے ایک طویل سانس لے کر اپنی کمر کرسی کی پشت سے لگائی اور دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ یہ کیسے ممکن ہے۔ ایک میان میں دو کواہیں..... سوال یہ پیدا نہیں ہوتا۔

”اتھل نے اپنے پرس میں سے ایک تصویر نکالی اور کولن کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ ”ہم چاہتے ہیں کہ تم اس شخص کو تلاش کرو۔“

کولن نے اس تصویر پر ایک نظر ڈالی۔ اس شخص کے چہرے میں ایسی کوئی خاص بات نہیں تھی جس کی بنا پر اسے جمع میں شناخت کیا جاسکتا۔ کولن نے جیب سے قلم نکالا اور بولا۔ ”کیا میں اس شخص کا نام جان سکتا ہوں؟“

”ہیریسن جونز۔“ اتھل نے بولنا شروع کیا۔ ”عمر تیس سال، قد باج فٹ چھانچ، وزن ایک سو چالیس پونڈ، سرخ بال، ہبز آنکھیں، وہ کسی بھی تیس سالہ لڑکی کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔“

ہیریسن کولن کو شدت سے محرومی کا احساس ہونے لگا۔ اس کی عمر بھی تیس کے لگ بھگ تھی۔ قد چھ فٹ، وزن ایک سو نو پونڈ، بادامی آنکھیں، گھنے سیاہ بال، اس کے باوجود کسی لڑکی نے اسے نظر بھر کر نہیں دیکھا تھا۔ اس شخص میں ضرور کوئی ایسی صلاحیت ہوگی جس کا اتھل کو بھی علم نہیں۔

”اتھل نے اپنا پورا نام اتھل فلور یڈا جونز بتایا تھا۔ عمر پینتیس سال، قد پانچ فٹ دو انچ، وزن ایک سو چالیس پونڈ، بھورے بال۔ وہ نیو اور لینز میں پیدا ہوئی اور وہیں پلی بڑھی۔ اس نے کیتھولک اسکول سے گریجویشن کر رکھا تھا۔ سرخ لباس میں وہ خاصی دلکش نظر آ رہی تھی جبکہ سارہ نے زور رنگ کا لباس پہن رکھا تھا۔“

”کیا تم نے اس بارے میں پولیس کو بتایا؟“ کولن نے دونوں کو باری باری دیکھتے ہوئے کہا۔

”اتھل بولی۔ ”ہاں اور نہیں۔“

”پولیس کے اسی رویہ کے وجہ سے ہم ڈسٹرکٹ اٹارنی کے دفتر بھی نہیں جاسکتے۔“ سارہ نے کہا۔

”میں کچھ سمجھ نہیں۔“ کولن بولا۔ ”ہاں اور نہ سے تمہاری کیا مراد ہے؟“

”ہم نے ایک پولیس آفیسر کرسٹو سے بات کی تھی لیکن وہ بڑی بدتمیزی سے پیش آیا۔“ اتھل نے جواب دیا۔

سارہ بولی۔ ”صرف یہی نہیں بلکہ اس نے ہمارا مذاق بھی اڑایا۔“

”اس نے کہا کہ پولیس کسی کے نجی معاملات میں مداخلت نہیں کر سکتی۔ ہمیں خود ہی اسے تلاش کرنا ہوگا۔“

کولن اس پولیس آفیسر کرسٹو کو اچھی طرح جانتا تھا۔ کسی زمانے میں دونوں ایک ہی شفٹ میں کام کیا کرتے تھے پھر کولن نے پولیس کی ملازمت چھوڑ کر سرائی کا پیشہ اختیار کر لیا۔ کرسٹو عموماً لوگوں کے ذاتی معاملات سے دور رہنے کی کوشش کرتا تھا۔

”قانون ایک وقت دو بیویاں رکھنا جرم ہے۔“ کولن نے کہا۔

”میرے پاس اس کا ثبوت ہے۔“ اتھل نے اپنے پرس سے کچھ کاغذات نکال کر اس کی طرف بڑھا دیے۔

ان میں سے ایک سرٹیفکیٹ کے مطابق ہیریسن جونز کی شادی دو سال قبل اتھل فلور یڈا جونز سے ہوئی تھی جبکہ دوسرے سرٹیفکیٹ سے ظاہر ہو رہا تھا کہ ہیریسن جونز نے گزشتہ جنوری میں سارہ سے شادی رچائی تھی اور یہ دونوں سرٹیفکیٹس اور لینز کے گرجا سے جاری ہوئے تھے۔

”کیا گرجا میں ہونے والی شادیوں کا کوئی ریکارڈ نہیں رکھا جاتا جس سے معلوم ہو سکے کہ ہیریسن جونز ایک سے زیادہ شادیاں کر چکا ہے۔ دوسری شادی صرف پہلی بیوی کے انتقال یا طلاق کے بعد ہی ہو سکتی ہے۔“ کولن نے کاغذات دیکھنے کے بعد اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”ممکن ہے کہ اس نے اپنے آپ کو رنڈا ظاہر کیا ہو۔“ اتھل بولی۔

”اس مقصد کے لیے وہ جھوٹا سرٹیفکیٹ بھی حاصل کر سکتا ہے۔ گرجا گھروں میں پیدائش اور اموات کا ریکارڈ نہیں رکھا جاتا اور نہ ہی ان کے پاس اسے چیک کرنے کا کوئی بندوبست ہے۔“

”وہ دوسری شادی کرنے کے لیے جھوٹا طلاق نامہ بھی پیش کر سکتا ہے۔“ سارہ نے کہا۔

”سمجھ گیا۔“ کولن سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”فطری طور پر وہ جبرمانہ ذہنیت کا مالک ہے اور اپنے مقصد کے حصول کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہے۔“

”اس کی اور بھی بیویاں تھیں۔“ سارہ نے انکشاف کیا۔

کولن نے ایک گہری سانس لی اور پوچھا۔ ”کتنی؟“

”اب تک ہم چار کا پتا لگانے میں کامیاب ہو سکے ہیں۔“ سارہ نے اپنے پرس سے ایک کاغذ نکال کر کولن کو دیتے ہوئے کہا۔

”میرے والد ریٹائرڈ ملٹری آفیسر ہیں۔ ان کا خیال

ہے کہ اسے تلاش کرنے کے لیے ہمیں کسی پرائیویٹ سرائی رساں کی خدمات حاصل کرنی چاہئیں۔ وہ مختلف نام استعمال کرتا ہے۔“ اتھل نے کہا۔

”مثلاً فیلکس، انٹونی، بیٹرک اور جیمس وغیرہ وغیرہ۔“ سارہ بولی۔

”تم یہ کیسے کہہ سکتی ہو کہ ہیریسن جونز اس کا اصلی نام ہے۔“ کولن نے پوچھا۔

”اتھل نے اس کی پیدائش کا سرٹیفکیٹ نکالا۔ وہ کولن کی پیدائش سے تین ماہ پہلے پیدا ہوا تھا۔ کولن نے حساب لگایا۔ اس کی عمر واقعی تیس سال تھی۔

”تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ وہ مختلف نام استعمال کرتا رہا ہے؟“

”دراصل ان ناموں کا تعلق اس کے ماضی سے ہے۔“ اتھل نے کہا۔ ”اس نے سینٹ انٹونی گرامر اسکول میں تعلیم حاصل کی۔ اس کے باپ کی تدفین سینٹ پیٹرک کے قبرستان میں ہوئی اور وہ کچھ عرصہ جیمس ہائی اسکول میں بھی زیر تعلیم رہا۔“

”اور فیلکس کے بارے میں کیا ہوگی؟“

”یہ اس کا پسندیدہ کارٹون کیئر کٹر ہے۔“ سارہ نے جواب دیا۔

کولن نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔ ”تم میں سے کس نے اسے آخری بار کب دیکھا تھا؟“

”تقریباً ایک ماہ پہلے۔“ انھارہ جون اور اتوار کا دن تھا۔“ سارہ بولی۔ ”اس نے مجھے گرجا کے باہر اتارا اور گاڑی پارک کرنے چلا گیا۔ میں اس کا انتظار ہی کرتی رہی لیکن وہ پلٹ کر نہیں آیا۔ اس کے بعد سے میں نے اسے نہیں دیکھا۔“

”وہ ہمارے بینک اکاؤنٹ بھی خالی کر گیا۔“

”اتھل تقریباً رو دینے کے انداز میں بولی۔

”وہ کہاں کام کرتا تھا؟“

دونوں عورتوں نے کندھے اچکا دیے جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ انہیں اس بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ کولن ان سے آدھا گھنٹا تک مزید تفصیلات معلوم کرتا رہا۔ جس میں دوسری چار بیویوں کے نام اور پتے کے علاوہ سارہ اور اتھل کے بینک اکاؤنٹ کی تفصیل بھی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ یہ خاصا دردمری کا کام ہے لیکن دوسو ڈالرز ملنے کے بعد وہ اس کے لیے تیار ہو گیا۔

ان دونوں عورتوں کے جاتے ہی بارش شروع ہو گئی۔

وہ دفتر کی کھڑکی سے باہر کا منظر دیکھنے لگا۔ اس نے اپنے دونوں پاؤں مزید پھیلا دیے اور آنکھیں بند کر لیں۔ باہر زوروں کی بارش ہو رہی تھی اور چند ہی منٹوں میں جل تھل ایک ہو گیا۔ یہ مون سون کا موسم تھا اور کچھ پتا نہیں ہوتا کہ موسم کے تبد کو بادل جا چکے۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد اس کے سر درد میں کمی واقع ہو گئی۔ اس نے سوچا کہ آج جمعہ ہے اور اسے وقت ضائع کیے بغیر ہیریسن جونز کے کیس پر کام شروع کر دینا چاہیے۔

اس نے فون اٹھا کر پہلا نمبر ملا یا۔ اگر ہیریسن نے مکان تبدیل کیا تھا تو یقیناً وہ بجلی، گیس اور فون کا بل بھی ادا کرتا ہوگا لیکن پبلک سروس والوں نے بتایا کہ ان کے ریکارڈ کے مطابق ہیریسن جونز... نامی کسی شخص کے نام پر کوئی بل جاری نہیں ہوا۔ اسی طرح مردہ خانے اور قبرستان سے بھی اس نام کے کسی شخص کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں ملی۔ پولیس ریکارڈ کے مطابق اس نام کا کوئی شخص بھی گرفتار نہیں ہوا۔ نہ ہی اس کا کبھی کوئی چالان ہوا۔ البتہ اس کے ڈرائیونگ لائسنس پر سارہ کے گھر کا پتہ درج تھا لیکن اس سے ہیریسن کا کوئی سرائی نہیں لگایا جاسکتا تھا۔

کولن نے دونوں ہاتھ پھیلا دیے اور اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ پانچ بج رہے تھے۔ آج اس نے سچ کہا تھا۔ وہ دفتر بند کر کے نیچے آیا اور ایک رستوران میں بیٹھ کر برگر اور کافی سے دل بہلائے لگا۔ بارش رک چکی تھی۔ اس نے کافی ختم کر کے سگریٹ سلگایا اور ہیریسن کے بارے میں سوچنے لگا۔ اسے یقین تھا کہ وہ اسی شہر میں کسی دوسرے نام سے اپنی حرکتوں میں مصروف ہوگا۔

سارہ نے ہیریسن کی بیویوں کے ناموں کی فہرست حروف تہجی کے لحاظ سے بنائی تھی لہذا کولن نے سب سے پہلے ایسا ہیریسن جونز سے ملنے کا فیصلہ کیا جو گارنڈ اسٹریٹ کے ایک منزلہ مکان میں رہتی تھی۔ ہیرڈنی دروازہ کھلا ہوا تھا البتہ جالی والے دروازے کی جتنی چوڑی ہوئی تھی۔ کولن نے اطلاعی کھنی بجائی تو اسے چوبی فرش پر اوپنی ایڈری کے سینڈل کی کھٹ کھٹ سنائی دی۔ چند لمحوں بعد ہی ایک لمبے قد کی دبی عورت دروازے پر نمودار ہوئی، اس نے زرد رنگ کا لباس پہن رکھا تھا اور اس کے ہاتھ میں جھاڑو تھی۔

”کون ہے؟“ اس نے اندر سے ہی پوچھا۔

کولن نے اپنی جیب سے تعارفی کارڈ نکالا اور بولا۔ ”میں پرائیویٹ سرائی رساں کولن اسمتھ ہوں اور ایک ایسے شخص کی تلاش میں ہوں جس کے بارے میں شاید تم کچھ

بتا سکو۔
 ”اچھا، کون ہے وہ شخص؟“ وہ دروازہ کھولتے ہوئے بولی۔
 کون نے ہیرین کی تصویر اس کے سامنے کر دی
 جسے دیکھتے ہی اس عورت کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور وہ
 مٹھیاں جھنجھٹتے ہوئے بولی۔ ”میں نہیں اپنا فون نمبر دے سکتی
 ہوں اگر یہ شخص تمہیں مل جائے تو فون کر دیتا۔“
 کون نے جیب سے نوٹ بک نکالی اور اس عورت کا
 فون نمبر لکھنے کے بعد بولا۔ ”تم نے آخری بار اسے کب
 دیکھا تھا؟“

”1946ء میں نئے سال کی آمد پر وہ میری بیوک
 کار لے کر کسی کام سے گیا تھا اور پلٹ کر نہیں آیا۔ میری کار
 پولیس کو دوسرے دن ریلوے اسٹیشن کے پارکنگ لائٹ
 سے ملی۔ اس سے بھی بڑا ستم اس وقت ہوا جب بینک شیئر
 نے مجھے فون پر بتایا کہ میرا اکاؤنٹ خالی ہو چکا ہے۔“
 اس نے اپنی بات ختم کی اور چہرے پر آئی ہوئی لٹ
 کو ہاتھ سے چھپے کرتے ہوئے بولی۔ ”تم کافی لوگے یا
 اسکاچ؟“

کون نے کافی کا انتخاب کیا اور لیٹا کے ساتھ چلتا ہوا
 کچن تک آ گیا۔
 ”میرا پہلا شو ہر ایک فضائی حادثے میں ہلاک ہو گیا
 تھا۔“ وہ کون کے سامنے کافی کا کپ رکھتے ہوئے بولی۔
 اپنے لیے اس نے اسکاچ کا انتخاب کیا تھا پھر وہ اسے
 حادثے کی تفصیل بتانے لگی۔ کون پوری توجہ سے اس کی
 بات سنتا رہا۔ وہ تقریبی انداز میں بولی۔ ”تم ایک اچھے
 سامع ہو۔ پیٹرک میں بھی یہ خوبی تھی۔ میں اس کے کندھے
 پر سر رکھ کر گھنٹوں اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرتی اور وہ تسلی دینے
 والے انداز میں میرا شانہ جھکاتا رہتا۔ مجھے لگا کہ اس دنیا میں
 اس سے زیادہ غم گسار اور ہمدرد کوئی نہیں ہو سکتا۔“

”اس کا اصلی نام ہیرین جونز ہے۔“
 اس نے حیرت سے اپنی پلکیں جھپکائیں اور ہنستے
 ہوئے بولی۔ ”مجھے یہ بات معلوم نہیں تھی۔“
 ”پھر تو تمہیں یہ بھی معلوم نہیں ہوگا کہ اس کی اور بھی
 بیویاں تھیں۔“
 ”مجھے یہ سن کر بالکل بھی حیرت نہیں ہوئی۔ جو شخص
 اپنا نام بدل کر مجھے دھوکا دے سکتا ہے۔ مجھے فلاش کر کے
 جاسکتا ہے۔ اس سے کچھ بھی بعید نہیں۔“ وہ اپنے آنسو
 پونچھتے ہوئے بولی۔
 کون نے اس کا تفصیلی بیان لیا اور کچھ سوالات پوچھے

لیکن ہیرین کے بارے میں کوئی خاص بات معلوم نہ ہو سکی۔
 سوائے اس کے کہ وہ کیری کرائٹ کا بہت بڑا پرستار تھا اور اس
 کی ہر فلم کی بار دیکھا کرتا تھا۔ البتہ یہ وہ نہ بتا سکی کہ وہ کون
 کی پرزیاہ جاپا کرتا تھا۔ اس کے پسندیدہ بار یا رستوران کون سے
 تھے اور وہ کن مشاغل میں دلچسپی لیتا تھا۔

لیٹا نے اپنی کہناں میز پر لٹکائیں اور آگے کی طرف
 جھکتے ہوئے بولی۔ ”تم بھی کیری کرائٹ سے کم نہیں ہو۔ اسی
 کی طرح سیاہ بال، لمبا قد اور پیٹنڈ سٹم۔“
 کون نے گھڑی دیکھی اور اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے
 بولا۔ ”اب مجھے چلنا چاہیے، کوئی میرا انتظار کر رہا ہوگا۔“
 وہ مایوس ہوتے ہوئے بولی۔ ”کیا تم شادی شدہ ہو؟“
 کون نے جواب دینے کے بجائے مسکرانے پر اکتفا
 کیا اور تیز قدم اٹھاتا ہوا باہر آ گیا۔

☆ ☆ ☆
 کیسی طرح جونز نے دروازہ کھولنے کے بجائے انڈر کام
 کے ذریعے بات کرنے کو ترجیح دی۔ اس نے بتایا کہ انتھونی
 جونز سے اس کی شادی جنگ کے زمانے میں ہوئی تھی اور وہ
 اس سے یہ کہہ کر رخصت ہوا کہ اسے محاذ پر جانے کا حکم ملا
 ہے۔ کیسی کو بعد میں معلوم ہوا کہ اس نے جھوٹ بولا تھا۔
 ایک سال بعد ان دونوں کا ٹکراؤ ایک ڈانس ہال میں ہوا
 لیکن وہ اسے دیکھتے ہی بھاگ گیا۔
 ”کیا تم اس ڈانس ہال کا نام بتا سکتی ہو؟“
 ”دافورٹ، ویسٹ اینڈ لیکن اب وہ بند ہو چکا ہے۔“
 ”اس کے بعد تم نے اسے کبھی دیکھا یا اس کے
 بارے میں سنا؟“

”نہیں، تم اسے تلاش کرو۔ وہ میرے گیارہ سوڈالرز
 بھی لے گیا ہے جو اس نے مجھ سے ادھار لیے تھے۔“
 ☆ ☆ ☆
 ہیرین کی بیویوں میں تیسرا نمبر میری جونز کا تھا۔ وہ
 جب اس کے ایبارمنٹ پہنچا تو عمارت کی مالکن نے بتایا کہ
 میری سات ماہ قبل وہاں سے جا چکی ہے اور وہ اس کے موجودہ
 چہرے سے لاعلم ہے۔ اسے بس اتنا یاد تھا کہ میری کا کوئی شو رہی
 تھا لیکن وہ اس کے محلے کے بارے میں کچھ نہ بتا سکی۔
 فہرست میں آخری نام سیدی لیون جونز کا تھا جو ابھی
 تک بوڈن اسٹریٹ پر واقع اسی دو منزلہ اینٹوں سے بنے
 ہوئے مکان میں رہ رہی تھی جس کا پتہ سارہ نے بتایا تھا۔ اس
 کی عمر چالیس کے لگ بھگ تھی۔ اس نے سفید بلاؤز اور سیاہ
 اسکرٹ پہن رکھا تھا۔ اس کا قد پانچ فٹ دس انچ کے قریب

کہیں آپ کو اعصابی کمزوری تو نہیں؟

آجکل تو ہر انسان ذہنی تفکرات، ناقص غذاؤں
 بے صبری، بے احتیاطی اور بد پرہیزی کی وجہ سے
 اعصابی کمزوری کا شکار ہو چکا ہے۔ اعصابی طور پر
 کمزور لوگ تو ہمیشہ ندامت کی زندگی گزارتے
 ہیں۔ آپ کی اعصابی کمزوری ختم کرنے، بے پناہ
 اعصابی قوت دینے کیلئے دیسی طبی یونانی قدرتی
 جڑی بوٹیوں اور کستوری عطر زعفران سے ایک
 خاص قسم کا ہربلز اعصابی کورس مقوی اعصاب
 کورس کے نام سے تیار کیا ہے۔ اپنے ازدواجی
 تعلقات میں کامیابی حاصل کر کے لطف کو دو بالا
 کرنے کیلئے اور اپنے خاص لحاظ کو خوشگوار بنانے
 کے لئے آج ہی فون پر اپنی تمام علامات سے آگاہ
 کر کے گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک وی پی VP مقوی
 اعصاب کورس منگوائیں۔

المسلم دارالحکمت (رجسٹرڈ)
 (دیسی طبی یونانی دواخانہ)
 ضلع وشہر حافظ آباد پاکستان
0300-6526061
0301-6690383
 صبح 10 بجے سے رات 8 بجے تک

تصدیق ہوگئی تھی۔

”حادثاتی موت۔“ کون نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ”اس کے شوہر کے بارے میں کچھ معلومات ہیں؟“

”اس کا نام بہرین جوز اور پیشہ مشغلی بیکلرین لکھا ہوا ہے۔ وہ ان دنوں شہر سے باہر گیا ہوا تھا۔ اس نے واپس آکر لاش وصول کر لی لیکن ڈورس کا انشورنس نہیں تھا۔“

کون نے اپنے دوست کا شکریہ ادا کیا اور دفتر کی عمارت سے باہر آگیا۔ ابھی تک بہرین کے بارے میں کوئی خاص بات معلوم نہیں ہوئی تھی۔ سوائے اس کے کہ وہ کیری گرانٹ کا پرستار تھا۔ اس نے ایک ریسٹوران میں بچے کرنے کے دوران اخبار دیکھا تو معلوم ہوا کہ کوریٹر سینما میں کیری گرانٹ کی دو فلمیں چل رہی تھیں۔ اس نے جلدی جلدی بچے ختم کیا اور سینما کی طرف چل دیا۔ چار بجے کا شو شروع ہونے والا تھا اور سینما کے باہر ٹکٹ خریدنے والوں کی ایک لمبی قطار موجود تھی۔ کچھ لوگ ہال سے باہر جا رہے تھے اور کچھ اندر جا رہے تھے۔ کون نے گاڑی سڑک کے کنارے کھڑی کر دی اور سینما ہال سے نکلے اور اندر جانے والے لوگوں کو دیکھنے لگا کہ کوئی تعین سے نہیں کہا جاسکتا تھا کہ بہرین یہ فلم دیکھنے آئے گا لیکن تمہارا بہت امکان ضرور تھا کیونکہ اگلے روز اس کی جگہ دوسری فلم لگ جاتی اور بہرین کے بارے میں اس کی ایک بیوی نے بتایا تھا کہ وہ کیری گرانٹ کی فلمیں بار بار دیکھتا ہے۔ اس لیے اگر وہ شہر میں موجود ہے تو یہ فلم دیکھنے ضرور آئے گا لیکن یہ کہنا مشکل تھا کہ وہ کون سا شو دیکھے گا۔ کون نے فیصلہ کر لیا کہ وہ رات بارہ بجے تک بہرے کے شروع ہونے پر سینما کا چکر لگا تارے گا۔

وہ اپنی گاڑی سے ٹیک لگائے سینما کے داخلی دروازے پر نظر پڑا جہاں کھڑا ہوا تھا کہ قریبی عمارت سے ایک شخص بیٹان اور پچامہ میں بیٹوں باہر نکلا اور آنکھیں نکالتے ہوئے بولا۔ ”مہیں نو پارٹنگ کا بورڈ نظر نہیں آ رہا۔ اس کے باوجود تم نے اپنی گاڑی یہاں کھڑی کر دی۔“

کون نے سرسے پاؤں تک اس کا جائزہ لیا اور ٹالنے کے انداز میں بولا۔ ”میں نے گاڑی پارک نہیں کی ایک دوست کا انتظار کر رہا ہوں۔ چند منٹوں بعد چلا جاؤں گا۔“

”تم ایسے نہیں مانو گے۔ میں پولیس کو بلاتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ پیچ پٹتا ہوا چلا گیا۔

کون اپنی گاڑی ہٹانے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک اس کی نظر قطار میں کھڑے ہوئے ایک سرخ بالوں والے شخص پر پڑی۔ کون سب کچھ بھول کر اس کی جانب

متوجہ ہو گیا۔ اس نے تیزی سے سڑک پار کی اور ٹکٹ گھری کھڑکی کے قریب پہنچ گیا۔ وہ یقیناً بہرین تھا۔ وہ ٹکٹ لے کر قطار سے باہر آیا تو ایک لمبے قد کی سنبھلے ہالوں والی عورت نے اس کا بازو تھام لیا اور اس کے ساتھ سینما ہال میں چلی گئی۔ اتنی دیر میں کون ان دونوں کا اچھی طرح جائزہ لے چکا تھا۔ بہرین نے سفید شرٹ کے ساتھ سلٹی رنگ کی چٹون پہن رکھی تھی جبکہ عورت کا لباس زرد بلاؤز اور سفید اسکرٹ پر مشتمل تھا۔

کون تیزی سے واپس آیا اور اپنی کار سینما کی پارٹنگ لائٹ میں کھڑی کر دی پھر وہ ٹکٹ خرید کر ہال میں داخل ہو گیا۔ فلم ابھی شروع نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے اندر کی بتیاں روشن تھیں جس کی وجہ سے اسے اپنی مطلوبہ نشست تک پہنچنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ وہ بہرین کی نشست سے دو قطار پیچھے ایک ایسی جگہ پر بیٹھ گیا جہاں سے اس کی نقل و حرکت پر یہ آسانی نظر رہی جاسکتی تھی۔ اس کے بیٹھتے ہی ہال میں اندھیرا چھا گیا اور فلم شروع ہوئی۔ بہرین اور اس کی ساتھی عورت فلم دیکھنے کے بجائے سرگوشیوں میں مصروف تھے اور کبھی کبھی اتنے قریب ہو جاتے کہ کسی غیر اخلاقی حرکت کا گمان ہونے لگتا۔

پہلا شو ختم ہوا تو وہ دونوں باہر لاؤنج میں آگئے اور کوک سے دل بہلانے لگے۔ کون کا خیال تھا کہ وہ اس شو کے اختتام پر روانہ ہو جائیں گے لیکن وہ دوسری فلم دیکھنے کے لیے رک گئے جو ایک سال پہلے ریلیز ہو چکی تھی اور اب دوسری بار نمائش کے لیے پیش کی گئی تھی لیکن انہوں نے پوری فلم نہیں دیکھی بلکہ تیسرا ایٹم ختم ہوتے ہی باہر آگئے۔ کون نے بھی ان کی تقلید کی اور کچھ فاصلہ رکھ کر تعاقب کرتا رہا۔ وہ دونوں پارٹنگ لائٹ کی طرف جانے کے بجائے پیدل کوریٹر اسٹریٹ پر آگئے اور بینک اسٹریٹ پر واقع ایک دو منزلہ مکان میں داخل ہوئے لیکن بہرین اندر نہیں گیا بلکہ دروازے سے ہی واپس آگیا۔ وہ آہستہ آہستہ چلا ہوا ایک ریسٹوران میں داخل ہوا اور کاؤنٹر کے قریب ایک اسٹول پر بیٹھ گیا۔ کون نے بھی اس کے برابر والا اسٹول سنبھال لیا۔ ایک لمبے قد کی ویٹرس نے ان کے آگے کافی اور مینور رکھ دیا۔ بہرین نے کلب سینڈویچ کا آرڈر دیا جبکہ کون نے اپنے لیے سادہ سینڈویچ منگوائے۔ ویٹرس کے جانے کے بجائے کون آہستہ سے بولا۔

”بہری، اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو یہ تمہاری آٹھویں بیوی ہوگی؟“



مرحبا
SINCE 1975
قدرت کی حکمت

مرحبا شہد
میٹھی صبح بخیر

Marhaba Honey

بیکلرین لکھا ہوا ہے۔ وہ ان دنوں شہر سے باہر گیا ہوا تھا۔ اس نے واپس آکر لاش وصول کر لی لیکن ڈورس کا انشورنس نہیں تھا۔

کون نے اپنے دوست کا شکریہ ادا کیا اور دفتر کی عمارت سے باہر آگیا۔ ابھی تک بہرین کے بارے میں کوئی خاص بات معلوم نہیں ہوئی تھی۔ سوائے اس کے کہ وہ کیری گرانٹ کا پرستار تھا۔ اس نے ایک ریسٹوران میں بچے کرنے کے دوران اخبار دیکھا تو معلوم ہوا کہ کوریٹر سینما میں کیری گرانٹ کی دو فلمیں چل رہی تھیں۔ اس نے جلدی جلدی بچے ختم کیا اور سینما کی طرف چل دیا۔ چار بجے کا شو شروع ہونے والا تھا اور سینما کے باہر ٹکٹ خریدنے والوں کی ایک لمبی قطار موجود تھی۔ کچھ لوگ ہال سے باہر جا رہے تھے اور کچھ اندر جا رہے تھے۔ کون نے گاڑی سڑک کے کنارے کھڑی کر دی اور سینما ہال سے نکلے اور اندر جانے والے لوگوں کو دیکھنے لگا کہ کوئی تعین سے نہیں کہا جاسکتا تھا کہ بہرین یہ فلم دیکھنے ضرور آئے گا لیکن تمہارا بہت امکان ضرور تھا کیونکہ اگلے روز اس کی جگہ دوسری فلم لگ جاتی اور بہرین کے بارے میں اس کی ایک بیوی نے بتایا تھا کہ وہ کیری گرانٹ کی فلمیں بار بار دیکھتا ہے۔ اس لیے اگر وہ شہر میں موجود ہے تو یہ فلم دیکھنے ضرور آئے گا لیکن یہ کہنا مشکل تھا کہ وہ کون سا شو دیکھے گا۔ کون نے فیصلہ کر لیا کہ وہ رات بارہ بجے تک بہرے کے شروع ہونے پر سینما کا چکر لگا تارے گا۔

وہ اپنی گاڑی سے ٹیک لگائے سینما کے داخلی دروازے پر نظر پڑا جہاں کھڑا ہوا تھا کہ قریبی عمارت سے ایک شخص بیٹان اور پچامہ میں بیٹوں باہر نکلا اور آنکھیں نکالتے ہوئے بولا۔ ”مہیں نو پارٹنگ کا بورڈ نظر نہیں آ رہا۔ اس کے باوجود تم نے اپنی گاڑی یہاں کھڑی کر دی۔“

کون نے سرسے پاؤں تک اس کا جائزہ لیا اور ٹالنے کے انداز میں بولا۔ ”میں نے گاڑی پارک نہیں کی ایک دوست کا انتظار کر رہا ہوں۔ چند منٹوں بعد چلا جاؤں گا۔“

”تم ایسے نہیں مانو گے۔ میں پولیس کو بلاتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ پیچ پٹتا ہوا چلا گیا۔

کون اپنی گاڑی ہٹانے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک اس کی نظر قطار میں کھڑے ہوئے ایک سرخ بالوں والے شخص پر پڑی۔ کون سب کچھ بھول کر اس کی جانب

متوجہ ہو گیا۔ اس نے تیزی سے سڑک پار کی اور ٹکٹ گھری کھڑکی کے قریب پہنچ گیا۔ وہ یقیناً بہرین تھا۔ وہ ٹکٹ لے کر قطار سے باہر آیا تو ایک لمبے قد کی سنبھلے ہالوں والی عورت نے اس کا بازو تھام لیا اور اس کے ساتھ سینما ہال میں چلی گئی۔ اتنی دیر میں کون ان دونوں کا اچھی طرح جائزہ لے چکا تھا۔ بہرین نے سفید شرٹ کے ساتھ سلٹی رنگ کی چٹون پہن رکھی تھی جبکہ عورت کا لباس زرد بلاؤز اور سفید اسکرٹ پر مشتمل تھا۔

کون تیزی سے واپس آیا اور اپنی کار سینما کی پارٹنگ لائٹ میں کھڑی کر دی پھر وہ ٹکٹ خرید کر ہال میں داخل ہو گیا۔ فلم ابھی شروع نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے اندر کی بتیاں روشن تھیں جس کی وجہ سے اسے اپنی مطلوبہ نشست تک پہنچنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ وہ بہرین کی نشست سے دو قطار پیچھے ایک ایسی جگہ پر بیٹھ گیا جہاں سے اس کی نقل و حرکت پر یہ آسانی نظر رہی جاسکتی تھی۔ اس کے بیٹھتے ہی ہال میں اندھیرا چھا گیا اور فلم شروع ہوئی۔ بہرین اور اس کی ساتھی عورت فلم دیکھنے کے بجائے سرگوشیوں میں مصروف تھے اور کبھی کبھی اتنے قریب ہو جاتے کہ کسی غیر اخلاقی حرکت کا گمان ہونے لگتا۔

پہلا شو ختم ہوا تو وہ دونوں باہر لاؤنج میں آگئے اور کوک سے دل بہلانے لگے۔ کون کا خیال تھا کہ وہ اس شو کے اختتام پر روانہ ہو جائیں گے لیکن وہ دوسری فلم دیکھنے کے لیے رک گئے جو ایک سال پہلے ریلیز ہو چکی تھی اور اب دوسری بار نمائش کے لیے پیش کی گئی تھی لیکن انہوں نے پوری فلم نہیں دیکھی بلکہ تیسرا ایٹم ختم ہوتے ہی باہر آگئے۔ کون نے بھی ان کی تقلید کی اور کچھ فاصلہ رکھ کر تعاقب کرتا رہا۔ وہ دونوں پارٹنگ لائٹ کی طرف جانے کے بجائے پیدل کوریٹر اسٹریٹ پر آگئے اور بینک اسٹریٹ پر واقع ایک دو منزلہ مکان میں داخل ہوئے لیکن بہرین اندر نہیں گیا بلکہ دروازے سے ہی واپس آگیا۔ وہ آہستہ آہستہ چلا ہوا ایک ریسٹوران میں داخل ہوا اور کاؤنٹر کے قریب ایک اسٹول پر بیٹھ گیا۔ کون نے بھی اس کے برابر والا اسٹول سنبھال لیا۔ ایک لمبے قد کی ویٹرس نے ان کے آگے کافی اور مینور رکھ دیا۔ بہرین نے کلب سینڈویچ کا آرڈر دیا جبکہ کون نے اپنے لیے سادہ سینڈویچ منگوائے۔ ویٹرس کے جانے کے بجائے کون آہستہ سے بولا۔

”بہری، اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو یہ تمہاری آٹھویں بیوی ہوگی؟“

Marhaba Laboratories
UAN: 111-152-152
www.marhaba.com.pk

بہرین نے چونک کر اسے دیکھا اور اپنی نظریں کون کے چہرے پر گاڑ دیں۔ چند لمحوں بعد اس نے ایک گہری سانس لی اور جیسے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”میں نے تمہیں کہیں دیکھا ہے۔“

”شاید“ کون نے سرسری انداز میں کہا۔

”سٹی پارک اسٹیڈیم۔“ بہرین نے کون کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”سٹی پیمنٹ شپ، تم نے ہی تنگ شات کھیلا تھا۔“

یہ جملہ سن کر کون بھی ماضی میں پہنچ گیا۔ اسے یہ توقع نہیں تھی کہ بہرین اس تاریخی رخ کی یاد دلا دے گا جسے وہ خود بھی بھلا چکا تھا۔ اس نے اپنی جینپ مٹاتے ہوئے کہا۔ ”تم غالباً ہال کھیلتے تھے۔“

”نہیں، تمہاری تصویر بھی اخبار میں شائع ہوئی تھی۔“ کون سوچنے لگا کہ اس شخص کی یادداشت کتنی تیز ہے کہ اسے تیرہ برس پرانی باتیں بھی یاد ہیں اور یہ اچھی طرح جانتا ہے کہ ان باتوں کو دہرا کر کس طرح بھٹکا یا جاسکتا ہے۔ اس نے اپنے سر کو ہلکا سا جھٹکا اور اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے بولا۔ ”وہ سہرے بال والی عورت کون ہے، اگر تم نہیں بتاؤ گے تو مجھے خود اس سے پوچھنا پڑے گا۔“

”ڈورسٹی پال۔“ اس نے آہستہ سے جواب دیا۔
ویٹس مینڈوچ نے لکرائی تھی۔ ان دونوں نے اپنی اپنی پلیٹ اٹھائی اور کھانے میں مصروف ہو گئے۔ بہرین بولا۔ ”میں ایک آوارہ گرد شخص ہوں۔ کام کی نوعیت بھی ایسی ہے کہ جس میں مجھے بہت زیادہ سفر کرنا پڑتا ہے۔ اسی دوران اس طرح کے واقعات پیش آ جاتے ہیں۔ مجھ میں ایک بہت بری عادت ہے جسے کوشش کے باوجود دور نہیں کر سکا۔ میں کسی بھی عورت کو دیکھ کر اس پر فریفتہ ہو جاتا ہوں۔ بعض معمولی شکل و صورت کی عورتوں پر بھی میرا دل آ جاتا ہے۔ میں اس سے شادی کر لیتا ہوں۔ ہنی مون بہت اچھا گزرتا ہے لیکن سال چھ مہینے بعد میرا دل اکتا جاتا ہے اور میں کسی دوسری عورت کی تلاش میں نکل جاتا ہوں۔“

”تم ان سب سے شادی کر لیتے ہو؟“ کون نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔
”ہاں لیکن انہیں طلاق بھی دے دیتا ہوں۔“
”طلاق، وہ کس طرح؟“
”رینو نویدا میں میری کزن جج ہے۔ جب بھی ضرورت پڑتی ہے ٹرین کے ذریعے وہاں جاتا ہوں اور دوسری شادی کرنے سے پہلے طلاق نامہ حاصل کر لیتا

ہوں۔ اس طرح مجھ پر قانون کی خلاف ورزی کا الزام عائد نہیں ہو سکتا۔“
”لیکن یہ کیسے ممکن ہے، تمہاری بیویوں کو تو اس کا علم نہیں ہے۔ وہ اب بھی تمہیں اپنا شوہر سمجھتی ہیں۔“

”یہ میرا درد سر نہیں ہے۔ اگر کوئی مسئلہ ہوا تو میری کزن سنبھال لے گی۔“

”تم نے ان کے چپک اکاؤنٹ سے جو قومات نکالی ہیں ان کے بارے میں کیا کہو گے؟“

”یہ رقم طلاق کے اخراجات کی نذر ہو جاتی ہے۔ تم جانتے ہو آج کل ریل کا سفر کتنا مہنگا ہو گیا ہے۔“

”گو یا اب تم ڈورسٹی سے بھی شادی کرو گے؟“ کون نے پوچھا۔

”امید تو ہے۔ شاید یہ شادی دو سال چل جائے کیونکہ وہ دیکھنے میں بہت خوب صورت ہے۔“ بہرین نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”تم نے اپنے بارے میں نہیں بتایا، سراخ رساں ہو یا رپورٹر؟“

کون نے جیب سے اپنا کارڈ نکال کر اسے دکھایا اور بولا۔ ”پرائیویٹ سراخ رساں، تمہاری دو بیویوں نے میری خدمات حاصل کی ہیں۔“

”وہ کس لیے؟“

”وہ دونوں اب بھی تمہیں اپنا شوہر سمجھتی ہیں اور انہوں نے مجھے تمہاری تلاش پر مامور کیا ہے۔“

”تم بے شک میرے بارے میں انہیں بتا دو۔ وہ میرا کچھ نہیں لگاؤ سکتیں۔ زیادہ سے زیادہ مقدمہ کریں گی۔ اس سے بھی کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ میرے پاس انہیں دینے کے لیے کچھ نہیں۔“

”زیادہ جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں ورنہ میں ڈورسٹی کے سامنے تمہارا کچا چھٹا بیان کر دوں گا تاکہ اسے معلوم ہو جائے کہ ہنی مون کے بعد اس کا کیا انجام ہونے والا ہے۔ تم مجھے ساتھ لے کر چلو گے یا.....“

بہرین اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ ”اگر مجھے بلک میل کرنے کی کوشش کر رہے ہو تو اس میں تمہیں ناکامی ہوگی۔ ڈورسٹی تمہاری کسی بات پر یقین نہیں کرے گی۔ وہ مجھ سے شادی کرنے کے لیے تیار ہے اور اس وقت بھی اس سلسلے میں وہاں ایک پارٹی ہو رہی ہے۔ میں تمہیں ساتھ لے چلا ہوں لیکن تم اپنی زبان بند رکھو گے۔“

جب کون نے ڈورسٹی کے چہرے پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں غیر معمولی چمک دیکھی تو وہ اپنا ارادہ قائم نہ کر

سکا۔ وہ اس عورت کا دل نہیں توڑنا نہیں چاہتا تھا اور نہ ہی اسے یہ گوارہ تھا کہ وہ ڈورسٹی کی پارٹی میں کوئی بد مزگی پیدا کرے۔ وہ کچھ دیر وہاں ٹھہرا اور ڈورسٹی سے رسی لٹکتو کرنے کے بعد بہرین سے الوداعی مصافحہ کرتے ہوئے بولا۔ ”مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔ تم سے بعد میں ملاقات ہوگی۔“

یہ سن کر بہرین نے سکون کا سانس لیا ورنہ وہ ڈر رہا تھا کہ کہیں کون اس کا بھانڈا نہ پھوڑ دے۔

دفتر واپس آ کر اس نے بہرین کی سب بیویوں کو باری باری فون کر کے بتایا کہ بہرین کہاں مل سکتا ہے۔ اس نے جو بتایا وہ ڈورسٹی کے ایمارمنٹ کا تھا۔ ایتھل نے اس کا شکر یہ ادا کیا اور پوچھا کہ کیا انہیں اس کے معاوضے کے سلسلے میں مزید رقم ادا کرنا ہوگی۔ جس پر کون نے کہا کہ جو کچھ انہوں نے ایڈوائس میں دیا تھا وہی کافی ہے۔ ویسے بھی کون کو اس شخص کی تلاش میں زیادہ وقت صرف نہیں کرنا پڑا

اور وہ صرف دودن میں ہی اس تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ وہ اسی بارے میں سوچ رہا تھا کہ اطلاعی کھٹی بجی۔ اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ دس بجتے والے تھے، اس نے دروازہ کھول کر بیچے جھانکنا تو ایک جانا بچانا چہرہ نظر آیا۔ وہ

ہوئی سائڈ براج کا کٹیفینٹ فرگوئن تھا۔ کون نے اسے اوپر آنے کا اشارہ کیا اور فریج کھول کر اس کی خاطر تواضع کے لیے مشروب نکالے لگے۔ فرگوئن بڑی بے تکلفی سے لوگ دم میں پڑے صوفے پر بیٹھ گیا۔ کون نے گلاس میں مشروب انڈیلا اور اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

”اس وقت کیسے آنا ہوا؟“

فرگوئن نے ایک گھونٹ لیا پھر جیب سے کوئی چیز نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”اسے پہچانتے ہو؟“

وہ کون کا بزنس کارڈ تھا جس پر خون کے دھبے لگے ہوئے تھے۔ اس نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔ ”ہاں یہ میرا کارڈ ہے لیکن تمہیں کہاں سے ملا اور اس پر خون کے دھبے کیسے لگے؟“

فرگوئن نے اپنی نظریں کون کے چہرے پر گاڑ دیں اور قدرے سر دھچکے میں بولا۔ ”بہرین نامی شخص کو کسی نے آٹھ بجے کے قریب بین ولا اسٹریٹ پر واقع براؤن اسٹون کے باہر گولی مار دی اور اس کی جیب سے تمہارا یہ کارڈ برآمد ہوا ہے۔“

کون کو یاد آیا کہ اس نے سینما سے واپس آتے

بہن کی فضیلت

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ ”تم جب اپنی بہن کے گھر جاؤ تو اپنی بساط کے مطابق کچھ لے کے جاؤ۔ کیونکہ تمہاری بہن کا تم پر حق اسے والدین کی ولایت وراثت سے ملا ہے۔ اور انتہائی بد نصیب ہے وہ شخص جس کی بہن اس سے ناراض ہو اور اس کی یا بہن کی موت واقع ہو جائے۔ پس خدا کا شکر کرو کہ اللہ پاک نے تمہیں یہ پاکیزہ رشتہ عطا کیا اور تمہیں تمہارے دکھوں کا سہارا دیا۔ خدا کی قسم یہ وہ رشتہ ہے جو اگر نہ ہوتا تو حضرت حسین رضی اللہ عنہ اپنا عزم پورا نہ کر پاتے۔“

اللہ پاک دنیا کی سب بہنوں کو سدا خوش رکھے۔ آمین

کفارہ

سلطان الہند معین الدین چنگی نے ایک مرتبہ سوچ سمجھ کر نقلی روزہ توڑ دیا اور پھر 60 روزے رکھ کر کفارہ ادا کیا۔

ہوا یہ تھا کہ ایک بہت ہی ضعیف شخص جو بہرہ اور گوشتا تھا۔ بہت دور سے پیدل چل کر آپ کے پاس کھانا لے کر آیا۔

وہ شخص بعد تھا کہ آپ اس کا لایا ہوا کھانا کھائیں۔ وہ شخص سمجھ ہی نہیں بارہا تھا کہ آپ روزے سے ہیں آپ نے اس شخص کا لایا ہوا کھانا شروع ہی کیا تھا کہ تیسرا شخص آیا اور کہنے لگا: آپ تو روزے سے تھے اس پر آپ نے خوب صورت ارشاد فرمایا کہ روزہ توڑنے کا کفارہ ہے۔ ”مکرول توڑنے کا کفارہ نہیں۔“

اسلام تحقیق کی روشنی میں

امریکی سائنس دانوں نے قرآن پاک کے تصور موت و حیات کو تسلیم کر لیا ہے۔

انسان کو آسمان سے نازل کیا گیا۔

موت کے بعد بھی حیات ہے۔

”تحقیقاتی رپورٹ تحقیق قرآن پاک کی روشنی میں کی گئی ہے جو سو فیصد صحیح ثابت ہوئی۔“ ڈاکٹر سلور

”جو انسان دنیا میں پیدا ہوا ہے وہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیا جائے گا جو کچھ قرآن پاک میں ہے وہ سچ ہے تورات، زبور، انجیل، میں آخری رسول اور قرآن کا ذکر موجود ہے۔“ ڈاکٹر ابراہم

مرسلہ: محمد جاوید، تحصیل علی پور

جواب آن غزل

دوست: ”یاریہ سکون اور چین کیا ہوتا ہے؟“
دوسرا دوست: ”پتا نہیں یار میری تو خود کراچی کی پیدا کنس ہے۔“

ختم شد

آدی ہیوی کو دفن کے گھر آیا تو آسمان پر بادل گرجنے لگ گئے۔
بجلی کڑکی اور طوفان آگیا۔
آدی اوپر کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”لگتا ہے پہنچ گئی ہے۔“

حکایت جدید

میرے استاد کہتے ہیں، لوہے کو لوہا کا قتا ہے۔
ہیرے کو ہیرا کا قتا ہے۔
آپ کو ایک دن کتا کاٹنے گا۔
کیونکہ.....
کتا کسی کو بھی کاٹ سکتا ہے، آپ کیا سوچ رہے تھے؟ کیا یا خود بے؟
اود نہیں بھائی جی ایسا نہیں ہو سکتا اپنی سوچ بدلو اور خود کو بھی پلیز۔

امارت

بوائے فرینڈ: ”ہائے۔“
گرل فرینڈ: ”ہیلو۔“
بوائے فرینڈ: ”کہاں ہو؟“
گرل فرینڈ: ”میں پاپا کی BMW میں کلب جا رہی ہوں۔ ابھی ڈرائیور مجھے کلب چھوڑ دے گا اس کے بعد مارکیٹ میں شاپنگ کے لیے جاؤں گی، تب تم کو کال کرتی ہوں تم کہاں ہو؟“
بوائے فرینڈ: ”میں W-11 کی بس میں تمہاری سیٹ کے پیچھے ہوں تم کرایہ نہیں دینا میں دے چکا ہوں۔“
مرسلہ: رضوان تولی کریزوی، اورنگی ٹاؤن کراچی

”کیا وہ گھر میں موجود ہیں؟“

اس نے جواب دینے کے بجائے کون سے پوچھا۔
”کیا تم نے باہر کوئی پیلے رنگ کی بیوک دیکھی ہے؟“
”نہیں، باہر صرف ایک سیاہ رنگ کی پرانی کار نظر آ رہی ہے۔“

”وہ میری کار ہے۔“ اتھل نے کہا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ وہ گھر پر نہیں ہیں۔ شاید کسی دوست سے ملنے گئے ہوں۔“
فرگون کرسی ٹھیک کر بیٹھ گیا اور سوالات کرتا شروع کر دے، پہلا سوال تھا۔ ”کیا تم نے ہی ہیرسن کو گولی ماری ہے؟“

”میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتی۔“
”کیا تمہیں کسی پر شک ہے؟“

اس نے نفی میں سر ہلادیا۔ فرگون نے اس سے تمام معلومات حاصل کر لیں۔ ہیرسن نے اس کی پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی۔ وہ اسے چھوڑ کر کیوں چلا گیا۔ اس نے اسے کہاں کہاں تلاش کیا۔ سارہ سے وہ کس طرح ملی، وغیرہ وغیرہ۔

پوری کہانی سن لینے کے بعد فرگون جانے کے لیے اپنی جگہ سے اٹھا اور اتھل سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ”فی الحال سارہ کو فون کرنے کی ضرورت نہیں۔ پہلے ہم اس سے مل لیں پھر وہ خود ہمیں فون کرے گی۔“

سارہ بھی شب خوابی کے لباس میں تھی۔ اس کے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے اور اس کے چہرے پر چٹائی کی نظر آ رہی تھی۔ غالباً سونے سے پہلے وہ کوئی کریم استعمال کرتی تھی۔ اس کی چپکلیں نیند سے پھسل ہو رہی تھیں لیکن جب کون نے اسے بتایا کہ ہیرسن کو کسی نے گولی ماری ہے تو اس کی نیند غائب ہو گئی۔ اس نے دروازے کی چوکت کا سہارا لیا اور بولی۔ ”کیا وہ اسپتال میں ہے؟“

”نہیں۔“ کون نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔
”اس کی نوٹ ہی نہیں آئی، وہ مر چکا ہے۔“

وہ بری طرح لکھڑائی اور اس سے پہلے کہ وہ فرش پر گرے۔ کون نے آگے بڑھ کر اسے اپنے بازوؤں میں سنبھال لیا۔ وہ بے ہوش تو نہیں ہوئی البتہ اس کی حالت سے لگ رہا تھا کہ اسے ہیرسن کی موت پر شدید صدمہ ہوا ہے۔ وہ تباہی مچاتی تھی لہذا اس نے فون کر کے اتھل کو بلا لیا۔ جس وقت کون اور فرگون وہاں سے رخصت ہو رہے تھے تو

اتھل نے اسے پہچان لیا تھا۔ چنانچہ اس نے دروازہ کھول دیا۔ کون... آگے بڑھتے ہوئے بولا۔
”لیفٹیننٹ فرگون تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتے ہیں۔“

اتھل نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھی اور ہچکچاتے ہوئے انہیں اندر بلا لیا۔ لوگ روم کو خاصی خوب صورتی سے سجایا گیا تھا۔ نیا فرنیچر، دیواروں پر آویزاں تصاویر اور کونے میں رکھا خوب صورت لیپ اس کی سجاوٹ میں اضافہ کر رہے تھے۔ کون نے تعریفی انداز میں کمرے کا جائزہ لیا اور صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

”کیا تم شام سے ہی گھر ہو؟“

”ہاں۔“ وہ کچھ پریشان ہوتے ہوئے بولی۔
”جب میں نے تمہیں ہیرسن کا پتا بتایا، اس کے بعد گھر سے باہر نکلے؟“

اس نے نفی میں گردن ہلائی اور بولی۔ ”لگتا ہے کوئی خاص بات ہوئی ہے؟“

کون نے اثبات میں سر ہلایا اور بولا۔ ”میں نے تمہیں جس عمارت کا پتا بتایا تھا اس کے باہر کسی نے ہیرسن کو گولی ماری۔“

”کیا!...!“ وہ اپنی جگہ سے تقریباً اچھلتے ہوئے بولی۔ ”وہ کس اسپتال میں ہے؟“

کون نے نفی میں سر ہلادیا۔ اتھل کا منہ کھلا رہ گیا اور اس کی آنکھوں میں آنسو اُڑ آئے۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور مکان کے عقبی حصے کی طرف بھاگی۔ کون اور فرگون بھی اس کے پیچھے ہو لیے۔ انہوں نے دیکھا اتھل کچن میں کھڑی عقیقہ جھن میں کھٹنے والے دروازے کی چوکی گرا رہی تھی پھر وہ تیزی سے باہر نکلی اور ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ وہ دونوں پورچ لائٹ کے نیچے کھڑے اس کا انتظار کرتے رہے۔ کون نے آگے بڑھ کر دیکھا تو اسے وہاں پلائی وڈ کے تختے رکھے ہوئے نظر آئے۔

تھوڑی دیر بعد اتھل تیزی سے واپس آئی اور ان کے پاس سے گزرتی ہوئی کچن کے سنک پر گئی۔ اس نے ایک گلاس میں پانی بھرا اور اپنا چہرہ دھوئے لگی پھر اس نے تولیا سے اپنا منہ صاف کیا اور کچن ٹیبل پر بیٹھ گئی۔ فرگون نے اپنی نوٹ بک کھولی اور بولا۔ ”تو تم یہاں ایلی ریوی تھی؟“

اتھل نے نفی میں سر ہلایا اور کہنے لگی۔ ”میرے والد بھی یہیں رہتے ہیں۔“

ہوئے ہیرسن کو یہ کارڈ دیا تھا۔ وہ یہ بات بتانے ہی والا تھا لیکن اس سے پہلے ہی فرگون بول اٹھا۔ ”تم جائے وقوع سے غیر موجودگی کا کوئی ثبوت پیش کر سکتے ہو؟“ کون کا چہرہ زرد پڑ گیا اور وہ ہونٹوں کی طرح اس کا منہ دیکھنے لگا۔

فرگون قہقہہ مارتے ہوئے بولا۔ ”گھبراؤ نہیں، میں مذاق کر رہا تھا۔ موقع کے گواہ نے سیاہ لباس اور ہیٹ پہنے ہوئے شخص کو فرار ہوتے دیکھا ہے جس کا قد تمہارے مقابلے میں بہت کم تھا اور ویسے بھی تم نے ڈیپارٹمنٹ چھوڑنے کے بعد کبھی ہیٹ نہیں پہنا۔“

کون نے مشروب کی بوتل اٹھا کر فریج میں رکھی اور کافی بنانے کے لیے پانی گرم کرنے لگا۔

”میرا خیال ہے کہ اس قتل میں اس کی بائیں بیویوں میں سے کسی ایک کے ملوث ہونے کے امکان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔“ وہ اس کے سامنے کافی کی پیالی رکھتے ہوئے بولا۔ ”میں نے آج ہی انہیں باری باری فون کر کے اس کے ٹھکانے کے بارے میں اطلاع دی تھی۔ ان میں سے دو نے اسے تلاش کرنے کے لیے میری خدمات حاصل کی تھیں۔“

فرگون نے سگریٹ سلگایا اور بولا۔ ”تب تو ہمیں ایک ساتھ مل کر اس کیس پر کام کرنا چاہیے۔“

”مت بھولو کہ تم پولیس سرائے رسال ہو جبکہ میں پرائیویٹ طور پر یہ کام کرتا ہوں۔“

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ فرگون بولا۔ ”تمہارے ساتھ رہنے سے مجھے کافی مدد مل سکتی ہے۔ چلو جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ جب تم انہیں اس قتل کے بارے میں بتاؤ گے تو ان کا رد عمل دیکھنے والا ہوگا اس کے ذریعے ہم کسی نتیجے پر پہنچ سکیں گے۔“

ان کی کار بیک اسٹریٹ سے گزر رہی تھی۔ کون نے پوچھا۔ ”اسے کتنی گولیاں لگیں؟“

”قاتل نے سڑک کے پار سے گولی چلائی جو اس کے سینے میں لگی۔ اس کے ہاتھ میں رائفل تھی۔ زخم کی نوعیت سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس رائفل کا سائز اعشاریہ بائیس کے ریلو اور جتنا تھا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ سے گولی کے سائز کا پتا چل سکتا ہے۔“

سب سے پہلے وہ اتھل کے گھر پہنچے۔ وہاں مکمل تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ کون نے اطلاع کھینچی بھائی لیکن کوئی جواب نہیں آیا۔ چوتھی کوشش پر ایک کمرے کی لائٹ روشن ہوئی۔ کھڑکی کا پردہ ہٹا اور کسی نے باہر کی طرف جھانکا۔

”مصل اپنی سیاہ کاریں سارہ کے گھر پہنچ چکی تھی۔“

☆☆☆

اب وہ کسی طرہ جواز کے پاس جا رہے تھے۔ اس بار بھی اس نے دروازہ کھولنے کے بجائے انٹرکام کے ذریعے ہی گفتگو کرنے کو ترجیح دی۔ زیادہ تر سوالات فرگوں نے کیے جبکہ کولن نے مکان کے اطراف کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ ڈرائیوے میں ایک پرانی کار کھڑی ہوئی تھی جب وہ مکان کا چکر لگا کر واپس آیا تو اس کے کالوں میں کسی کی آواز آئی جو کہہ رہی تھی۔

”میرے پاس کوئی گمن نہیں ہے اور اگر تم کوئی حوالہ چاہتے ہو تو سنو، میں ڈسٹرکٹ انٹاری کی سیکریٹری ہوں۔ اگر تمہیں مجھ سے مزید سوالات کرنا ہیں تو میرے دفتر آ جاؤ میں اپنے گھر پر اجنبیوں سے بات کرنا پسند نہیں کرتی۔“

اس دو نوک جواب کے بعد ان کا وہاں رکتا ہے سود تھا چنانچہ وہ دونوں اٹھا ہیرسن کی جانب روانہ ہو گئے۔ رات بہت زیادہ ہو گئی تھی لیکن انہیں اندازہ تھا کہ اٹھا جیسی عورتیں دیر تک جاگتی رہتی ہیں۔ ان کا اندازہ درست ثابت ہوا۔ اٹھا اس وقت بھی اپنے پسندیدہ مشروب سے دل بہلا رہی تھی۔ اس نے انہیں اندر بلا لیا اور فرگوں کو بیئرک جواز کے بارے میں سب کچھ بتا دیا جو وہ جانتی تھی۔

”مجھے اس وقت تک اس کا اصلی نام معلوم نہیں تھا۔ یہ مجھے اس اسمارٹ شخص نے بتایا تھا۔“ اس نے کولن کی طرف مشروب کا گلاس بڑھایا لیکن اس نے انکار کر دیا۔ بقیہ وقت وہ کیری گرائٹ کے قصیدے پڑھتی رہی۔ بڑی مشکل سے ان دونوں نے پیچھا چھڑایا اور وہاں سے روانہ ہونے میں کامیاب ہو سکے۔

سیڈی لیون جواز کو بھی ان کا بے وقت آنا اچھا نہ لگا اور اس نے اس کا اظہار بھی کر دیا لیکن جب کولن نے آنے کی وجہ بتائی تو وہ سنجیدہ ہو گئی اور بولی۔ ”تم لوگ ٹیٹھو میں تمہارے لیے کافی کا بندوبست کرتی ہوں۔“

کافی بد مزہ ضرور تھی لیکن اس وقت انہوں نے اسے بھی قیمت جانا۔ فرگوں نے پہلا گھونٹ لیا اور گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے بولا۔ ”ہیرسن سے تمہاری ملاقات کیسے ہوئی تھی؟“

سیڈی نے اسے بھی وہی کچھ بتایا جو اس سے پہلے کولن سے کہہ چکی تھی۔ فرگوں نے پوچھا۔ ”تم یہاں تیار رہتی ہو؟“ ”فی الحال تو تنہا ہی ہوں۔“ اس نے فرگوں پر ایک پرچس نگاہ ڈالی۔ وہ اس وقت شب بخوابی کے لباس میں تھی۔ ”تم نے یہ کیوں پوچھا۔ کیا کسی ٹھکانے کی تلاش میں ہو؟“

”فی الحال نہیں۔“ فرگوں نے سر دھجے میں کہا۔

”تمہارے پاس کوئی ہتھیار ہے؟“

”ہاں، میں ہر بندوں کا شکار کرتی ہوں۔ الماری میں بائیس یوری دو رائفلیں موجود ہیں۔ تم نے بتایا ہے کہ ہیرسن کو بھی ایسی ہی رائفل سے قتل کیا گیا ہے۔ تم نے دونوں رائفلیں لے جا کر چیک کر سکتے ہو۔“

فرگوں نے دونوں رائفلیں قبضے میں لیں اور ان کی رسید دے دی۔ راستے میں کولن نے کہا۔

”حیرت ہے کہ یہ عورت پرندوں کے شکار کے لیے بائیس یوری رائفل استعمال کرتی ہے۔“

”کسی پر شک کرنے سے پہلے حقائق پر نظر ڈالنا بہتر ہے۔“ فرگوں نے کہا۔ ”اس عورت کا قد پانچ فٹ دو انچ ہے جبکہ میں انہیں پہلے بتا چکا ہوں کہ قاتل چھوٹے قد کا تھا۔“

☆☆☆

کولن سو اگیارہ بجے کے قریب سینٹ چارلس کے گرجا گھر پہنچا تو پارکنگ لائٹ مکمل طور پر بھر چکا تھا۔ اسے اپنی گاڑی گرجا سے آگے بلاک کے فاصلے پر پارک کرنا پڑی۔ فرگوں پہلے سے وہاں موجود تھا۔ اس نے کولن سے سرکشی میں کہا۔ ”ہیرسن کا قتل سیڈی کی رائفل سے نہیں ہوا۔“ یہ کہہ کر وہ کولن کے ساتھ بڑے ہال میں داخل ہو گیا۔ وہاں لوگوں کی کثیر تعداد کو دیکھ کر کولن حیران رہ گیا۔ ہیرسن کی تمام سابقہ بیویاں اس کی آخری رسومات کے موقع پر موجود تھیں۔ ڈورسکی نے سیاہ سلک کا اسکرٹ پہن رکھا تھا اور وہ کافی خوب صورت نظر آ رہی تھی۔ اٹھل اور سارہ بھی سیاہ مٹی لباس میں تھیں۔ کسی طرہ ان دونوں کے قریب ہی بیٹھی ہوئی تھی لیکن اس نے ان سے کوئی بات نہیں کی جبکہ اٹھا نے کولن کو دیکھ کر خاصی گرم جوش کا اظہار کیا تھا جیسے وہ اسے برسوں سے جانتی ہو۔

پادری کے آنے پر دعائے تقریب شروع ہوئی تو وہ دونوں گرجا کے عقبی دالان میں آ گئے۔ فرگوں نے کہا۔ ”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہیرسن کی مقبولیت کا راز کیا تھا۔ عورتیں اس پر کس طرح فریفتہ ہو جاتی تھیں؟“

”وہ ان کی باتیں غور سے سنتا تھا، ان پر پوری توجہ دیتا تھا۔“ کولن نے کہا۔

”میرا بھی یہی خیال ہے۔“ فرگوں بولا۔

”حالانکہ بہت سی عورتیں کہہ چکی ہیں کہ میں بہت اچھا سامع ہوں۔ اس کے باوجود کسی عورت کا ساتھ نصیب نہیں ہوا۔ میں ابھی تک تنہا ہوں۔“

”ہمارا دماغ اتنا تیز نہیں چلتا کہ عورتوں کو قابو میں کر سکیں۔“

”ہاں اور ہیرسن میں یہ صلاحیت تھی۔“ کولن نے اعتراف کیا۔

پادری نے دعائے ختم کی تو پورا ہال خواتین کی سسکیوں سے گونج اٹھا۔ اچانک فرگوں کی نظر اٹھل اور سارہ کے درمیان بیٹھے ہوئے شخص پر گئی تو وہ بولا۔ ”سراغ رساں مفرضوں پر کام نہیں کرتے، یہ تصدیق کرنا ضروری ہے کہ یہ ناراض شخص اٹھل کا باپ ہے۔“

”اس کا قد پانچ فٹ چار انچ کے قریب معلوم ہوتا ہے۔“ کولن نے کہا۔

”ہاں تمہارا خیال درست ہے۔“

”تمہارے مشترکہ افراد کی فہرست میں ایک اور کا اضافہ ہو گیا۔“ کولن نے معنی خیز انداز میں کہا۔

دعائے ختم ہونے کے بعد سب لوگ قبرستان جانے کے لیے اپنی کاروں کی طرف جانے لگے لیکن کولن نے اپنی گاڑی کا رخ کسی اور جانب موڑ دیا۔ وہ ایک لمبا چکر کاٹ کر آیا اور اپنی کار اٹھل کے مکان کے باہر کھڑی کر کے خود عقبی حصے کی طرف چلا گیا۔ درخت کے ساتھ رکے ہوئے پلائی وڈ کے ٹکڑے پر کم از کم ایک درجن گولیوں کے نشان نظر آ رہے تھے۔ جس جگہ مکان کی خدمت ہوئی تھی وہاں جنگل گھنٹا تھا۔ اس نے وہاں پلائی وڈ کے دو تختے دیکھے جن پر سیاہ دائرے بنے ہوئے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی نے نشانہ بازی کی مشق کی ہو۔ اس کا خیال درست نکلا۔ اسے وہاں تین خالی کارٹوس نظر آئے جو درخت کی جڑ اور تنے کے درمیانی حصے میں گڑے ہوئے تھے۔ کولن نے جیب سے چاقو نکالا اور بڑی احتیاط سے کارٹوسوں کے ارد گرد کی جگہ انہیں احتیاط سے نکال لیا۔ ان کا تو سوں کی ساخت سے لگ رہا تھا کہ انہیں اعشاریہ بائیس کی گن سے فائر کیا گیا تھا۔ کولن نے چاقو جیب میں رکھا اور واپسی کے لیے مڑا ہی تھا کہ ایک فائر کی آواز سن کر ہولکھ گیا لیکن اس نے اپنے حواس قابو میں رکھے اور تیزی سے بھاگ کر ایک درخت کی آڑ میں ہو گیا۔

”اپنی جگہ پر رک جاؤ اور ہتھیار چھینک دو۔“ یہ فرگوں کی آواز تھی۔

کولن نے جیب سے اپنا ریوالور نکال لیا اور کسی ناخوشگوار صورت حال سے نمٹنے کے لیے تیار ہو گیا پھر اسے زمین پر کسی ہتھیار کے گرنے کی آواز سنائی دی۔

”اب تم باہر آ سکتے ہو ستر پرائیویٹ سراغ رساں۔“

میں نے اسے قابو کر لیا ہے۔“

کولن نے دیکھا کہ ایک چھوٹے قد کا آدمی فوجی ہیٹ پہنے ہاتھ اوپر کیے کھڑا ہے۔ اس کے قدموں کے پاس ایک رائفل پڑی ہوئی تھی۔ اس کے بالکل عقب میں فرگوں دونوں ہاتھوں سے اعشاریہ 38 کا ریوالور تھامے کھڑا تھا۔

”اس سے ملو کولن، یہ اٹھل کا باپ ہے۔“ فرگوں نے طنز یہ انداز میں کہا۔

کولن درخت کی آڑ سے نکل آیا تھا۔ فرگوں نے اسے رائفل اٹھانے کے لیے کہا۔ وہ اعشاریہ بائیس کی رائفل تھی۔ فرگوں نے جیب سے ہتھکڑیاں نکال کر اٹھل کے باپ کے ہاتھوں میں ڈال دیں۔ وہ بوڑھا کولن پر غرانے لگا لیکن منہ سے کچھ نہیں بولا۔ کولن نے اس کے کوٹ کی جینیں دیکھیں تو اسے بائیس جیب کے نیچے کارٹوس کے قطر کے برابر سوراخ نظر آیا۔

فرگوں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اس کی تعریف کرتے ہوئے بولا۔ ”لگتا ہے کہ تم بھی تھوڑی بہت سراغ رسائی سیکھ گئے ہو۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ کولن منہ بناتے ہوئے بولا۔ ”میں نے ہی نہیں قاتل تک پہنچایا ہے۔“

فرگوں کی ہنسی چھوٹ گئی۔ وہ مسلسل ہنستا رہا۔ یہاں تک کہ اسے کھاسی آ گئی۔ اس نے بڑی مشکل سے کھاسی پر قابو پایا اور بولا۔ ”تمہارا کیا خیال ہے اٹھل بھی اس جرم میں باپ کے ساتھ شریک ہے؟“

”بالکل نہیں۔“ کولن نے کہا۔ ”اے ہیرسن سے بہت محبت تھی اور وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس کا باپ جوش انتقام میں اس حد تک آگے بڑھ جائے گا۔“

”بہت خوش نصیب تھا ہیرسن جس کے لیے ایک نہیں چھ عورتیں پریشان ہو رہی تھیں۔“ فرگوں نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے کہا اور اٹھل کے باپ کو لے کر پولیس کار کی جانب چل دیا۔

کولن نے ایک سگریٹ سلگا لیا اور اٹھل کے بارے میں سوچنے لگا جو شوہر کے بعد باپ سے بھی محروم ہو گئی تھی۔ کولن کے دماغ میں ایک خیال ابھرا کہ کہیں اس نے ہیرسن کو تلاش کر کے غلطی تو نہیں کی تھی لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے سر کو جھٹکا اور اپنی گاڑی کی طرف چل دیا۔

وقت کا دھارا

گھر بنانے کا خواب صرف عورت کی آنکھ ہی نہیں دیکھتی بلکہ عہد حاضر میں ہر ایسے انسان کی خواہش بھی بن گئی ہے جو معمولی تنخواہ کے ساتھ اپنے گھر کی چھت سے بھی محروم ہیں... اور جب ان حالات میں بے بسی جنون بھی سوار کر دے تو ایسی حماقتیں سرزد ہو جاتی ہیں جن کا خمیازہ تمام عمر کی جمع پونجی گنوا نے کی صورت میں بھگتنا پڑتا ہے۔ ایسے میں کسی جرم کے ارتکاب سے خود کو روکنا جوئے شیر لانے کے برابر ہی ہو سکتا ہے... یہ کارنامہ اس نے بھی انجام تو دے ڈالا تھا مگر سنبھلنے کے لیے کسی سہارے کی ضرورت تھی اور ایسے میں اسے بیگ صاحب جیسے پمرد کا ساتھ ملا تو گویا نہ صرف ڈوبے ہوئے کو تنکے کا سہارا میسر آگیا بلکہ لٹی ہوئی پونجی کی جھلک بھی نظر آگئی لیکن... ہر ایک کو کب ایسا سہارا ملتا ہے لہذا جمع پونجی دائرہ پر لگانے سے پہلے ہر زاویے پر غور کر لیا جائے تو بہتر ہے ورنہ پونجی جمع کرنے میں ہی عمر گھٹ جاتی ہے۔

آسان اقساط پر مشکلات کو دعوت دینے والے دعووں کا کچا چٹا

حاصل کرنے کے بجائے وہ لغو اور فروغی باتوں کو بیچ جان کر نہ صرف یہ کہ خود بدگمان ہوتے ہیں بلکہ دوسروں کو بھی گمراہ کرنے کا سبب بنتے ہیں۔

اس تہذیب کے بعد میں اصل واقعے کی طرف آتا ہوں۔ ایک روز میں عدالتی بکھیروں سے مت کر اپنے آفس پہنچا تو انتظار گاہ میں فرد واحد کو بیٹھے دیکھا۔ مجھ پر نگاہ پڑے ہی وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی اس فوری حرکت سے شناسائی جھلکتی تھی۔ میں اس کے پاس سے گزرا تو اس نے مجھے سلام کیا۔ میں اس کے سلام کا جواب دینے کے بعد اپنے مخصوص کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ ٹھوڑی ہی دیر کے بعد وہ میرے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔

میں نے پیشہ وارانہ مسکراہٹ کے ساتھ استقبال کیا اور رسمی ملک ملک کے بعد پوچھا۔ ”جی فرمایا، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“

ابتدائی تعارف میں اس نے اپنا نام خالد نیازی بتایا تھا۔ اس کی عمر پینتالیس سے تھوڑی تھی۔ وہ عام سی شکل و صورت کا بالک ایک دبلا پٹلا شخص تھا۔ جب میں انتظار گاہ میں اس کے قریب سے گزرا تھا تو میں نے اس کے ہاتھ میں ایک فائل دہی دیکھی تھی۔ وہ مذکورہ فائل کو اپنے سامنے میز پر

آپ نے اکثر لوگوں کی زبان سے اس قسم کے الفاظ نکلتے سنے ہوں گے، دولت میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ اس کے بل بوتے پر دنیا کی ہر شے خریدی جاسکتی ہے حتیٰ کر جگہ، وکیل، گواہ... سب ”برائے فروخت“ ہیں۔ سب کا اپنا اپنا ایک مخصوص ریٹ ہے۔ اگر آپ میں قوت خرید ہے تو ان لوگوں سے اپنی مرضی کے مطابق کام لگاوا سکتے ہیں۔ وکیل اگر مرضی میں ہو تو سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ ثابت کرنا چنداں مشکل نہیں۔ بعض تو خیر انداز میں یہ جملہ بھی بول جاتے ہیں۔

”صاحب! غریب آدمی وکیل کرتا ہے اور صاحب ثروت ج...!“

عدالت، انصاف، وکیل اور جج کے حوالے سے اس نوعیت کی آراء میں مکمل اختلاف کرتا ہوں۔ اس امر سے انکار ممکن نہیں کہ سو میں سے کسی ایک آدھ کیس میں جزی یا کلی طور پر اس قسم کی صورت حال پیش آگئی ہو تاہم اس کو فارمولا بنا کر ایک فتویٰ جاری کر دینا کسی بھی طور مناسب نہیں۔ ایسی باتیں عموماً وہی لوگ کرتے ہیں جو قانون کی پیچیدگیوں اور انصاف کے تقاضوں سے کما حقہ واقف نہیں ہوتے۔ کسی بھی معاملے کی تیز میں اتر کر حقائق سے آگاہی

رکھنے کے بعد بولا۔

”بیگ صاحب! میں اپنا ایک کس آپ کے حوالے کرنا چاہتا ہوں۔“

وہ میرا شاسنا نہیں تھا ورنہ کس کی بات کرنے سے پہلے وہ تعارف کے دوران میں مجھے یہ ضرور یاد کرانے کی کوشش کرتا کہ مجھے کیوں کر جانتا ہے۔ اب یہی ہو سکتا تھا کہ جب میں آفس میں داخل ہوا تو آفس ہوائے نے اشارے سے اسے میرے بارے میں بتا دیا ہو اور اس نے کسی واقف کاری طرح اٹھ کر میرا استقبال کیا ہو۔ بہر حال، اس کی بات کے جواب میں، میں نے کہا۔

”نیازی صاحب! میں اس بلڈنگ میں اسی لیے دفتر کھولے بیٹھا ہوں کہ لوگوں کے کس لوں۔ آپ بتائیں، کیا مسئلہ ہے.....؟“

”میرا مسئلہ اس فائل کے اندر موجود ہے بیگ صاحب!“ وہ اپنے سامنے، میز پر رکھی فائل کو تھپ تھپاتے ہوئے بولا۔

”لائیں.....“ میں نے اس کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”میں دیکھوں، آپ کا مسئلہ کیا ہے.....؟“

وہ فائل کو میرے حوالے کرنے کے بجائے عجیب سے لچے میں بولا۔ ”جناب! میں چاہتا ہوں، پہلے فیس کا معاملہ طے کر لیں۔“

مجھے خالد نیازی کا یہ انداز قطعاً پسند نہ آیا تاہم وہ کہتے ہیں تاکہ جب دکان کھول کر بیٹھ جائیں تو پھر کسی بھی طرح کا گاہک آ سکتا ہے۔ مجھے بھی ہر روائی کے کلائنٹس سے واسطہ پڑتا رہتا تھا اور میں کسی کے بھی اسٹائل کو مانڈ نہیں کرتا تھا۔ پسند اور ناپسند کی بات الگ ہے۔

”خالد نیازی صاحب!“ میں نے ٹھہرے ہوئے لچے میں کہا۔ ”در اصل، فیس کی بات پہلے نہیں سکتی۔“

”جی..... میں کچھ سمجھتا ہوں۔“ وہ ابھین زدہ انداز میں مجھے دیکھتا ہوا۔ ”آپ اپنی بات کی وضاحت کریں گے؟“

”بالکل کروں گا۔“ میں نے خالص پیشہ وارانہ انداز میں کہا۔ ”نیازی صاحب، میں کلائنٹ کو اپنی فیس کے بارے میں اس وقت بتاتا ہوں جب میں اس کا فیس لینے کا حتمی فیصلہ کر لوں اور یہ فیصلہ میں تمام تر حالات و واقعات کی پوری جان کاری کے بعد کرتا ہوں۔ ایک اہم بات اور.....“

میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”جب میں کسی کس کو لینے کا ارادہ ظاہر کروں تو اپنی فیس ایڈوانس میں وصول کرتا ہوں۔“

”اوہ.....!“ اس نے ایک گہری سانس خارج کی اور بولا۔ ”آپ تو دوسرے وکیلوں سے بہت مختلف ہیں۔“

”رزق کے حوالے سے میرا عقیدہ یہ ہے کہ اس کی ذمہ داری کسی اور ہی ذات نے اٹھارھی ہے۔“ میں نے مضبوط لچے میں کہا۔ ”انسانوں میں سے کوئی نہ تو مجھے رزق دے سکتا ہے اور نہ ہی میرا رزق چھین سکتا ہے لہذا میں فیس وصول کرنے سے پہلے اس بات کی تسلی ضروری سمجھتا ہوں کہ میں جس کام کے پیسے وصول کر رہا ہوں وہ انسانی، اخلاقی، معاشرتی اور قانونی بنیادوں پر درست بھی ہے یا نہیں۔ میں رزق حلال کے طمینان کے بعد کس لینا ہوں.....“

”بیگ صاحب! آپ نے اتنی بڑی بات کہہ دی ہے کہ میرے پاس کہنے کے لیے کچھ بچا ہی نہیں۔“ وہ فائل کو میری جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”آپ ابھی طرے ان کاغذات کا مطالعہ کر لیں جناب، پھر بات کرتے ہیں۔“

میں نے اس کے ہاتھ سے فائل لی اور کھول کر اس کے اندر لگے ہوئے کاغذات کا جائزہ لینے لگا۔

فائل کے اندر مختلف قسم کی ادائی کے ذیل میں حاصل ہونے والی رسیدیں لگی ہوئی تھیں۔ ایک دو ایسی دستاویزات بھی تھیں جنہیں ایگری منٹ کہا جا سکتا تھا۔ کسی ایف ڈیوٹ کی ایک نوٹو کا بھی نظر آ رہی تھی۔ بیشتر رسیدوں سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کسی فلیٹ وغیرہ کی بینک کے سلسلے میں ادا کی جانے والی ماہانہ اقساط کے حوالے سے ہیں۔

علاوہ ازیں چند بھاری رقم کی ادائیگوں کی رسیدیں بھی موجود تھیں۔ یہ تمام تر کاغذات کسی ”ڈائمنڈ پلازا“ نامی اپارٹمنٹس بلڈنگ سے تعلق رکھتے تھے۔

میں نے ان تمام کاغذات کا معائنہ کرنے کے بعد فائل کو بند کیا اور اپنے سامنے بیٹھے خالد نیازی کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

”ان دستاویزات سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ نے ڈائمنڈ پلازا نامی کسی اپارٹمنٹس بلڈنگ میں کوئی فلیٹ بک کر لیا تھا جس کے سلسلے میں آپ ماہانہ اقساط ادا کرتے رہے ہیں اور دو تین مرتبہ بھاری رقم بھی جمع کرائی ہیں۔“

میں غلط تو نہیں کہہ رہا.....؟“

”نہیں جناب، آپ بالکل درست فرما رہے ہیں۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

”آپ کا پریشان حال میرے پاس آنا اور اس فائل

کی بنیاد پر کوئی کس میرے حوالے کرنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ بلڈر کے ساتھ آپ کا کوئی تنازعہ اٹھ کھڑا ہوا ہے۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کیا میں درست اندازہ لگا پا رہا ہوں؟“

”جی ہاں!“ اس نے ایک بار پھر سر کو اٹھاتی جنبش دی۔ ”آپ کا اندازہ وہی ہے جو حقیقت ہے۔ بیگ صاحب! میں بے حد پریشان ہوں۔ آپ اگر میرا مسئلہ حل کرانے کو تیار ہو جائیں تو میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر یاد رکھوں گا۔“

”کاغذات کو میں نے اچھی طرح دیکھ لیا ہے۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”اب آپ حالات و واقعات کی تفصیل بھی بتائیں۔“

اس نے چند لمحات تک خاموش رہ کر ذہن میں بکھرے خیالات کو جمع کیا پھر مجھے اپنی پتا سنانے میں مصروف ہو گیا۔

خالد نیازی کی زبانی مجھے اس کس کے حوالے سے جو معلومات حاصل ہوئیں ان میں سے غیر ضروری باتوں کو حذف کر کے میں خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں تاکہ عدالتی کارروائی کے دوران میں آپ کا ذہن کسی ابھین کا شکار نہ ہو۔ ایک بات کی وضاحت کرنا چلوں کہ ان میں سے بہت ساری باتیں مجھے بعد میں پتا چلی تھیں تاہم واقعات کی ترتیب کے پیش نظر انہیں بھی شامل کر لیا گیا ہے۔ اسی طرح محض باتیں میں نے دانستہ آپ سے چھپائی ہیں۔ ان کا ذکر عدالتی کارروائی کے دوران میں سنسنی خیز مواقع پر کیا جائے گا۔

☆☆☆

خالد نیازی محدود آمدنی والا ایک غریب شخص تھا۔ وہ کسی مقامی ڈائجسٹ میں پروف ریڈنگ کی جاب کرتا تھا۔ مذکورہ ڈائجسٹ کا نام ظاہر کرنا مناسب نہیں ہوگا۔ بہر حال، پروف ریڈنگ جو خواہ ہوئی ہے اس میں وہ صحیح تان کر گزارہ کر رہا تھا۔ وہ لوگ ٹیل پاڈا کے علاقے میں ایک چھوٹے سے دو کمروں کے گھر میں رہتے تھے۔ ان کے دو بچے تھے۔

فائزہ کی عمر آٹھ سال تھی جبکہ عمران پانچ سال کا تھا۔ نیازی کی بیوی ریحانہ ایک روایتی قسم کی گھریلو عورت تھی۔

ایک رات جب دونوں بچے سو سکے تھے تو ریحانہ نے نیازی سے کہا۔ ”تمہاری آدمی کے گک بھگ تنخواہ تو مکان کے کرایے میں نکل جاتی ہے۔ باقی پیسوں سے میں گھر کیسے چلاؤں.....؟“

”میں اپنی پوری تنخواہ لا کر تمہارے ہاتھ میں دے دیتا ہوں۔“ خالد نے جھکے ہوئے لچے میں کہا۔ ”بس، تم سے کرایہ بھڑاؤ کے پیسے لیتا ہوں۔ میں کوشش تو کر رہا ہوں کہ آفس ہی میں مجھے کوئی اضافی کام مل جائے۔ میں نے پیٹر کی منت خوشامد کے کا پی پیسٹنگ کا ہنر سیکھ لیا ہے۔ اگر مجھے یہ کام پارٹ ٹائم بھی مل گیا تو آمدنی میں اچھا خاصا اضافہ ہو جائے گا۔“

”وہ تو جب ہوگا تا جب تمہیں پیسٹنگ کا کام ملے گا۔“ ریحانہ نے عجیب سے لچے میں کہا۔ ”میں تو ابھی کی سوچ رہی ہوں۔“

”سوچنے پر کوئی پابندی نہیں ہے۔“ نیازی نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”لیکن ایک بات ذہن میں رکھو ریحانہ.....“

”کیا؟“ ریحانہ نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”لیکن ایک بات ذہن میں رکھو ریحانہ.....“

”میں تو ابھی کی سوچ رہی ہوں۔“

خالد نیازی نے ابھین زدہ انداز میں اپنی بیوی کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ”کیا مطلب ہے تمہارا ریحانہ؟“

وہ اس کے سوال پر توجہ دے بغیر بولی۔ ”میرے ذہن میں ایک آئیڈیا ہے نیازی!“

”اس آئیڈیا کو اپنے ذہن سے باہر نکالو۔“ نیازی نے گہری دچکھی سے کہا۔ ”میں بھی تو دیکھوں، وہ آخر ہے کیا؟“

”کسی طرح اگر ہمارا چھوٹا سا اپنا گھر ہو جائے تو بہت سارے مسئلے خود بخود حل ہو جائیں گے۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لچے میں بولی۔ ”کرایہ کی مدت میں جانے والی رقم بچے کی تو پھر تمہاری اتنی خواہ میں بھی بہت اچھا گزارہ ہونے لگے گا۔“

”مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اپنا گھر ہوگا کیسے؟“

نیازی نے سوال اٹھایا۔ ”تم نے آئیڈیا تو آسانی سے سوچ لیا۔ اب میرے سوال کا جواب بھی دے دو؟“

ریحانہ نے ایک مرتبہ پھر اس کی بات پر توجہ نہ دیتے ہوئے کہا۔ ”لگتا ہے، میں تو اپنے گھر کے خواب دیکھتے دیکھتے ہی قبر میں اترا جاؤں گی۔“

”مایوی کنہا ہے ریحانہ۔“ نیازی نے سرزنش کرنے والے انداز میں کہا۔

”جب ساری زندگی کرایے کے گھر میں گزرتی دکھائی دے رہی ہو تو کیا گناہ اور کیا ثواب۔“ وہ بیزاری سے بولی۔ ”لگتا ہے، تمہیں میرا ذرا ساجھی خیال نہیں۔“

”تم ہر بات کے لیے مجھے ہی قصور وار ٹھہراتی رہتی ہو۔“ نیازی نے ہنچلا ہٹ آمیز انداز میں کہا۔ ”بتاؤ، میں

اس تنخواہ میں تمہارے لیے ذاتی گھر کیسے خرید سکتا ہوں؟“
”میں خریدنے کو کب کہہ رہی ہوں۔“ وہ عجیب سے
لہجے میں بولی۔

نیازی نے الجھن زدہ انداز میں بیوی کو دیکھا۔
”پھر.....؟“

”آج کل گھر حاصل کرنا بہت آسان ہو گیا ہے
نیازی۔“ وہ مدبرانہ انداز میں بولی۔

”وہ کیسے؟“ نیازی کی الجھن حیرت میں بدل گئی۔
”میں فلیٹ بک کرانے کی بات کر رہی ہوں.....“ وہ

گو یا انکشاف کرنے والے انداز میں بولی۔
”اوہ..... تو تمہارا یہ مقصد تھا۔“ نیازی نے ایک

گہری سانس خارج کی۔ ”تم قسطوں والے فلیٹ کی بات کر
رہی ہو؟“

ریحانہ نے اثبات میں گردن ہلانے پر انکشاف کیا۔
نیازی نے کہا۔ ”اللہ کی بندی! یہ اتنا بھی آسان نہیں

ہے جیسے تم سوچ رہی ہو۔ یہ قسطوں کا گورکھ دھندا برا عجیب
اور چھٹانے والا ہے۔ اگر بک کرانے والا کسی وجہ سے ڈی

فالٹر ہو جائے تو لینے کے دینے پڑ جاتے ہیں۔“
”سوچتے رہنے سے کچھ سمجھ نہیں ہوتا۔“ وہ خشکی آمیز

لہجے میں بولی۔ ”انسان عملی قدم اٹھائے تو مشکل سے مشکل
کام بھی آسان ہو جاتا ہے۔ جن کے پاس کچھ نہیں ہوتا ان

کے بارے میں بھی سننے میں آتا ہے کہ انہوں نے فلیٹ بک
کرا لیا ہے۔ اب ہم اتنے بھی گمے زمرے نہیں ہیں.....“

وہ لمبے بھر کے لیے تھی، ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی
بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

”آخر کسی نہ کسی طرح ہم ہر ماہ اس گھر کا کرایہ بھی تو
دے ہی رہے ہیں نا۔ اسی میں دو چار سو ماہ کی فلیٹ کی قسط بھر

دیا کریں گے۔ اگر تم کسی بلڈنگ میں فلیٹ بک کرانے کے
لیے تیار ہو جاؤ تو میں کم سے کم پیسوں میں گھر چلانے کا وعدہ

کرتی ہوں۔“
ریحانہ کا منصوبہ تو خاصا پُرکشش تھا لیکن خالد نیازی

بہت ہی محتاط واقع ہوا تھا۔ وہ چھوٹک چھوٹک قدم اٹھانے
کا عادی تھا۔ جب تک وہ کسی معاملے سے پوری طرح

مطمئن نہیں ہو جاتا تھا، ہا ہی نہیں بھرتا تھا۔ ریحانہ کی بات
اس نے توجہ سے سنی اور یہ اعتراض اٹھایا۔

”یہاں تک تو ٹھیک ہے کہ ہم کرایے والی رقم میں
دو چار سو ڈال کر فلیٹ کی قسط ادا کر دیا کریں گے۔“ وہ

سمجھانے والے انداز میں بولا۔ ”لیکن شاید تم اس حقیقت کو

فراموش کر رہی ہو کہ فلیٹس وغیرہ تیار ہونے میں سال، دو
سال اور بعض پروجنکس تو تین چار سال کا عرصہ بھی بچھنے

جاتے ہیں.....“
”ہاں.....“ وہ قطع کلامی کرتے ہوئے بولی۔ ”یہ

بات میں اچھی طرح جانتی ہوں۔“
”اچھی طرح جانتی ہو تو.....“ نیازی نے قدرے

طنز یہ لہجے میں کہا۔ ”پھر یہ بھی بتا دو کہ تنازعہ ہم رہیں گے
کہاں کیونکہ فلیٹ کی قسط تو اسی صورت جاسکے گی اگر ہم گھر کا

کرایہ ادا نہ کریں اور ایسا ممکن بنانے کے لیے ہمیں کرایے کا
یہ گھر چھوڑنا پڑے گا۔“

”مجھے پتا تھا کہ تم یہ سوال ضرور کرو گے.....“ وہ ایسی
نظر سے اپنے شوہر کو دیکھنے لگی جیسے وہ ابھی اس کے قدموں

میں گر کر اس کی لیاقت کا اعتراف کر لے گا۔
”ٹھیک ہے، تمہیں پتا تھا۔“ خالد نیازی معتدل

انداز میں بولا۔ ”جب تمہیں اس سوال کا پہلے سے علم تھا تو
پھر جواب بھی دے دو۔“

”تمہارے اس سوال کا جواب ہے ظفر
ماموں.....!“ وہ معنی خیر لہجے میں بولی۔

”ظفر ماموں.....“ نیازی چونک اٹھا۔ ”کیا مطلب
ہے تمہارا؟“

ریحانہ کا ایک ماموں موٹر مینیک تھا جس کا نام ظفر
حسین تھا۔ فلستان کے قریب اس کا موٹر مرمت کا ایک

گیراج تھا۔ وہ گاڑیوں کی مرمت کے علاوہ خرید و فروخت
میں بھی گھسا ہوا تھا۔ وہ پرانی، خصوصاً خراب گاڑیوں کو خرید

کر ان کی مرمت وغیرہ کرتا اور پھر انہیں اچھی قیمت پر
فروخت کر دیا کرتا تھا۔ ظفر حسین کی رہائش گویہار کے

علاقے میں تھی۔ ٹیبل پاڑا، گویہار اور فلستان میں زیادہ
فاصلہ نہیں ہے۔ آپ انہیں ایک دوسرے سے واکنگ

ڈسٹنس پر سمجھ لیں۔ یہ وضاحت میں نے صرف ان قارئین
کے لیے کی ہے جو کراچی کے اندرونی جغرافیہ سے واقفیت

نہیں رکھتے۔
”مطلب یہ کہ ہم ظفر ماموں کے گھر شفٹ ہو جائیں

گے۔“ ریحانہ اسے اپنے منصوبے سے آگاہ کرتے ہوئے
بولی۔ ”ان کا گویہار میں دو منزلہ مکان ہے۔ زیریں منزل

پر وہ خود رہتے ہیں اور اوپر کا پورشن وہ اکثر کرایے پر
اٹھائے رکھتے ہیں۔ آج کل وہ پورشن خالی پڑا ہے۔ ہم

کرایے کا یہ مکان چھوڑ کر فوری طور پر ظفر ماموں کے اس
پورشن میں منتقل ہو سکتے ہیں۔“

”مجھے تو یوں محسوس ہو رہا ہے.....“ وہ اپنی بیوی کو
نبولی ہوئی نظر سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”تم نے اس سلسلے

میں اپنے ظفر ماموں سے بات کر لی ہے۔“
”اور نہیں تو کیا.....“ وہ اترا کر بولی۔ ”تم سے ضد

ایسے ہی تو نہیں کر رہی۔ میں تمہارے مزاج سے اچھی طرح
واقف ہوں۔ جب تک تم بال کی کھال نہ نکال لو، مطمئن ہی

نہیں ہوتے.....“
”ٹھیک ہے۔“ نیازی نے کہا۔ ”فرض کرو، ہم

کرایے کا یہ گھر چھوڑ کر تمہارے ماموں کے گھر کی بالائی
منزل پر شفٹ ہو جاتے ہیں۔ ہم چنانچہ عرصہ بھی وہاں رہیں

گے کیا ظفر ماموں ہم سے کرایہ نہیں لیں گے.....؟“
”میں نے اس سلسلے میں بھی ماموں سے بات کر لی

ہے۔“ ریحانہ فخریہ انداز میں بتانے لگی۔ ”ماموں کا کہنا
ہے، وہ ہمارے لیے رعایتی کرایہ مقرر کر دیں گے اور اس

کے ساتھ ہی یہ بھولت بھی دیں گے کہ ہمیں جب بھی آسانی
ہو، انہیں کرایہ دے دیا کریں۔ جب ہم ان کا گھر چھوڑ کر

اپنے فلیٹ میں منتقل ہو جائیں گے تو واجبات کا حساب بھی
کر لیں گے۔ جب کی جب دیکھی جائے گی۔“

”واہ بھئی.....“ نیازی مسرت آمیز حیرت سے بولا۔
”تمہارے ماموں تو ہمارے لیے بہت بڑی قربانی دے

رہے ہیں۔“
”وہ میرے اکلوتے ماموں ہیں اور میں ان کی

اکلوتی بھانجی۔“ ریحانہ نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ”وہ میرے
لیے جو بھی کریں، کم ہے۔“

”اللہ ان کو اس کا اجر دے گا۔“ نیازی نے کہا۔ پھر
تشویش بھرے انداز میں بولا۔ ”لیکن ریحانہ فلیٹ کی

بجگ کے سلسلے میں ہم نے سب سے زیادہ سنگین معاملے پر
تو ابھی بات ہی نہیں کی.....“

”مثلاً کون سا معاملہ؟“ ریحانہ نے سوالیہ نظر سے
اس کی طرف دیکھا۔

خالد نیازی وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”جب کوئی
فلیٹ بک کرایا جاتا ہے تو بجگ کے وقت ایک بھاری رقم بھی

ادا کرنا ہوتی ہے۔ ہمارا اقساط کا مرحلہ تو بعد میں شروع ہوتا
ہے۔ وہ رقم یکشت کہاں سے آئے گی؟“

”تمہارے آفس سے۔“ ریحانہ نے ٹھوس انداز
میں کہا۔

”آفس سے..... کیا مطلب؟“
”مطلب یہ کہ اس رقم کے حصول کے لیے تم اپنے

دفتر میں قرض کی درخواست دو گے۔“ ریحانہ نے کہا۔
”تمہیں اس آفس میں کام کرتے ہوئے آٹھ دس سال

ہو گئے ہیں۔ مجھے یقین ہے، تمہارا پاس اس درخواست کو رد
نہیں کرے گا.....“ وہ سانس بھرا کر گرنے کے لیے متوقف

ہوئی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولی۔
”میں نے آج تک تمہارے پاس کے جو بھی قصے

سنے ہیں ان سے تو یہی لگتا ہے کہ وہ ایک نیک دل اور
خدا ترس انسان ہے۔ وہ اپنے درکار کا بہت خیال رکھتا

ہے۔ چہرہ اس کی بہن کی شادی ہو یا کسی کے گھر میں میت کا
معاملہ، وہ مالی مدد کرنے میں کسی جیل و جنت سے کام نہیں

لیتا۔ پھر آپ ہی تو بتاتے ہو کہ آفس کی طرف سے ہر سال
کسی ایک شخص کو بچہ پر بھی بھیجا جاتا ہے۔“

”ہاں.....“ نیازی نے تائیدی انداز میں گردن
ہلاتی۔ ”یہ سب تو درست ہے۔“

”بس تو پھر دیر کر بات کی ہے۔“ وہ حوصلہ
بڑھانے والے انداز میں بولی۔ ”تمہارا تو ریکارڈ بھی

کورے کا غذائی طرح صاف ہے۔ مجھے امید ہے، جب تم
پہلی مرتبہ قرض کے لیے درخواست ڈالو گے تو تمہیں انکار کا

سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور پاس اس بات پر بھی راضی
ہو جائے گا کہ واپسی کے لیے تمہاری تنخواہ میں سے کم سے کم

کنوٹی ہو.....“
”ہاں، یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔“ خالد نیازی نے

بڑے اعتماد سے کہا۔ ”مجھے بھی یقین ہے کہ میری قرض کی
درخواست ضرور منظور ہو جائے گی۔“

”بس تو پھر ہم کل ہی جا کر کسی ایجنے سے پروجیکٹ
میں قسطوں والے فلیٹ کے بارے میں معلومات حاصل

کرتے ہیں۔“ ریحانہ خوش ہوتے ہوئے بولی۔ ”پہلے سارا
نقشہ ہمارے سامنے آجائے، پھر آرام سے بیٹھ کر پلاننگ

کریں گے کہ وہ رقم ہم کس طرح اور کہاں کہاں سے جمع
کر سکتے ہیں۔“

ریحانہ کی تجویز نے خالد نیازی کے دل کو چھو لیا تھا
لہذا اگلے روز اس نے آفس سے چھٹی ماری اور بیوی کو ساتھ

لے کر ایک سنسنی خیز اور مستقبل سنوار مشن پر روانہ ہو گیا۔
دو چار مقامات کا سروے کرنے کے بعد ان کی نگاہ انتخاب

گارڈن ویسٹ کے ایک پروجیکٹ پر آکر ٹھہر گئی۔ مذکورہ
پروجیکٹ کا نام تھا ”ڈائنمنڈ پلازا“

وہ دونوں ”ڈائنمنڈ پلازا“ کے بلیک آفس پہنچ گئے۔ یہ
پروجیکٹ چڑیا گھر کے بہت قریب واقع تھا۔ یہی چڑیا گھر جو

”بعض عادی مجرم تو ایسے بھی ہیں اس شہر میں کہ وہ دھونس دھاندلی سے رقم جمع کرانے بغیر ہی قلیت پر قابض ہونے کے چکر میں رہتے ہیں۔ یہ شرائط ایسے لوگوں سے کورٹ میں منسنے کے لیے بڑی موثر ثابت ہوتی ہیں۔“

بکنگ فلرک کی وضاحت نے دونوں میاں بیوی کی تسلی کر دی اور وہ سائٹ آفس سے اٹھ کر گھر آ گئے۔ ویسے جی وہ ایگری منٹ پر دھنڈل کر چکے تھے۔ اگر انہوں نے قواعد و ضوابط کا مطالعہ بعد میں کیا تھا تو اس میں ”شاہ بلڈرز“ کا کوئی ”قصور“ نہیں تھا۔

کڑی تھیں۔ نمبر ایک، اگر بایا نقطہ مسلسل دو ماہ تک ادائیگی مٹی تو قلم کی بگ لگ خود بخود کینسل ہو جائے گی اور جس وقت ایسا ہوگا اس وقت تک مٹی کے پاس جمع ہونے والی رقم پر وینکٹ کی تکمیل کے بعد ڈی فالٹر الاٹی کو ادا کی جائے گی۔ نمبر دو، اگر چھ ماہ بعد دی جانے والی آٹھ ہزار کی کوئی قسط ایک ماہ کے اندر ادائیگی مٹی تو الاٹی ایسی صورت میں بھی ڈی فالٹر تصور کی جائے گا اور یہی طریقہ طور پر اس کی بگ لگ کو کینسل کر دیا جائے گا۔ ”شاہ بلندز“ اس بات کا مجاز ہوگا کہ اپنی مرضی سے وہ قلم کی اور پارٹی کو الٹ کر دے۔

یہ شرائط پڑھ کر نیاز کی فکر مند ہو گیا۔ اس نے ریحانہ کو اپنی پریشانی سے آگاہ کیا۔ کائیاں بگ لگ کلرک بڑی توجہ سے ان کے چروں پر ابھرنے والے تاثرات کا جائزہ لے رہا تھا۔ انہیں انجمن میں جتا دیکھ کر وہ جلدی سے بولا۔

”جناب! ان نکات کو پڑھ کر آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اسے آپ ریس کی کارروائی سمجھ لیں۔“

”کیا مطلب؟“ نیاز نے پوچھا۔ ”کیا ان اصولوں کا اطلاق الاٹی پر نہیں ہوتا؟“

”ہر الاٹی پر نہیں ہوتا صاحب!“ وہ ذومعنی انداز میں

”کون سی بات؟“ ریحانہ نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔
 ”یہ جو ہر چھ ماہ کے بعد آٹھ ہزار روپے ادا کرنا ہیں وہ کہاں سے آئیں گے۔“ وہ فکرمندی سے بولا۔ ”اور قلیٹ کا قبضہ لیتے وقت تو پورے بیس ہزار ادا کرنا ہوں گے؟“
 ”قلیٹ کے قرضے میں ابھی دو سال پڑے ہیں نیازی اور آٹھ ہزار کی ادائیگی بھی چھ ماہ کے بعد کرنا ہوگی۔“ وہ تسلی بھرے انداز میں بولی۔ ”اللہ کوئی نہ کوئی سبب پیدا کر دیے گا۔ ابھی سے فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔“
 ریحانہ کی ”طمینان بھری“ وضاحت جب نیازی کو ہضم نہیں ہوئی تو اس کا ذہن الجھ کر رہ گیا۔ ریحانہ نے اس کی کیفیت کو ٹورا تھا بلکہ اپنا رخ پھیرے ہوئے کچھ میں بولی۔
 ”دل چھوٹا نہیں کرو نیازی! اگر تم کا بندوبست کسی بھی طرح نہ ہو سکا تو میں اپنا زور پوچھ دوں گی۔“

”زبور!“.....“ نیازی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ”تیرا کیا کہہ رہی ہو۔ بھانہ؟“

”میں سچ کہہ رہی ہوں۔“ وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔ ”اپنے گھر کا خواب میں ایک عرصے سے دیکھ رہی ہوں۔ زبور کا کیا ہے۔ تو دوبارہ بن جائے گا۔“

”لیکن تمہارا پاس اتنا زبور ہے تو کہاں جس سے.....“

”جو بھی ہے!“ وہ نیازی کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھی۔ ”اور مجھے یہ بھی امید ہے کہ تم اس کی نوبت نہیں آنے دو گے۔ زبور چلنے سے پہلے ہی تم نہیں نہ کہیں سے رقم کا بندہ دست کر لو گے.....“

خالد نیازی ایک ملک اسے دیکھتا چلا گیا۔
چند روز کے بعد وہ لوگ ظفر ماموں کے ہاں منتقل ہو گئے۔ آٹھ سے پندرہ ہزار کا قرضہ منظور ہو گیا تھا لہذا وہ پہلی فرصت میں "ڈائمنڈ پلازا" کے بینک آفس پہنچ گئے۔ ابتدائی معاملات نمٹانے کے بعد انہیں ایگری منٹ کی کامیابی فراہم کر دی گئی۔ یہ ایگری منٹ خالد نیازی اور "شاہ بلڈرز" کے درمیان ڈائمنڈ پلازا کے تھرو فلور پر واقع ٹائپ تھری کے فلیٹ نمبر تین سو تین کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ آٹھ ہزار بینک کی رقم اور پہلی آٹھ سو ماہانہ قسط کی ادائیگی کی رسیدیں بھی ایگری منٹ کے ساتھ منسلک تھیں۔ یہ تمام کاغذات ایک فائل میں لگا کر انہیں پیش کیے گئے تھے۔ فائل کے کور پر "شاہ بلڈرز" چھپا ہوا تھا۔ مذکورہ ایگری منٹ کی پشت پر قواعد و ضوابط بہت ہی مبین تحریر میں درج تھے۔ خالد نیازی نے جب ان قواعد و ضوابط کا مطالعہ کیا تو پریشان ہو گیا۔ دیگر چھوٹے موٹے اصولوں کے علاوہ دوسرا اٹکل بڑی

ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ”ان ملازمین میں سے اکثر نے باس کو دعو کا دیا تھا..... باس کادل کھا ہوا گیا اور آئندہ پھر بھی اس کے دل میں ایسی رہائی اسکیم کا خیال نہیں آیا۔ بہر حال.....“ اس نے پھر لمحاتی توقف کیا اور اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”میں کل ہی باس سے بات کرتا ہوں.....“
 ”شاباش!“ ریحانہ نے سراپنے والے انداز میں
 کہا۔ ”اگر میرے دماغ سے سوچو گے تو ہر مشکل آسان
 ہو جائے گی۔“
 ”اچھا!“ نیاز نے حیرت بھرے انداز میں کہا۔
 ”فوری طور پر تو تم میری یہ مشکل آسان کر دو کہ پندرہ ہزار
 قرض لینے کا مشورہ کیوں دے رہی ہو۔ فلیٹ کی بینک تو
 آٹھ ہزار سے ہو رہی ہے؟“

”تم اسے آٹھ نہیں بلکہ ہزار ہزار کہو!“ وہ سمجھانے والے انداز میں بولی۔ ”آٹھ ہزار بلیک کے، آٹھ سو پکلی قسط اور کچھ دیگر دستاویزاتی اخراجات بھی ہو سکتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے.....!“ نیازی نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ ”اور باقی کے بائج ہزار.....؟“

”ہاتھ میں رکھنے کے لیے۔“ رحمانہ نے کہا۔ ”کچھ رقم ہاتھ میں رہے گی تو بعد میں کوئی پر اہل نہیں ہوگی اور میں فرنیچ بھی تبدیل کرنے کے بارے میں سوچ رہی ہوں.....“

”فرنیچ کیوں تبدیل کرنا چاہتی ہو؟“ نیازی نے پوچھا۔

”دس سال سے چل رہا ہے۔“ رحمانہ نے کہا۔

”اس کی باڈی کئی جگہ سے گل چلی ہے۔ کبیر بس میں بھی جان نہیں رہی۔ ظہور صاحب کی بیوی اپنا فرنیچ چاہ رہی ہیں۔“

صرف ایک ڈیڑھ ہزار ہی ملانا پڑے گا۔ میں سوچ رہی ہوں اپنے فرنیچ کو نکال کر وہ فرنیچ لے لوں۔ وہ دو سال چلا ہوا ہے۔ ظفر ماموں کے گھر جا رہے ہیں تو کھٹار فرنیچ کو ساتھ لے جانا مناسب نہیں۔ وہ کیا سوچیں گے ہمارے بارے میں.....؟“

فرق کے موضوع پر نیازی نے اپنی ہیوی سے بحث کرنا مناسب نہ سمجھا کیونکہ اس کا کوئی حاصل وصول نہیں تھا۔ اس کے ذہن میں ایک بار جو بات سما جاتی تھی پھر وہ اس پر عمل کیے بغیر جین سے نہیں بیٹھتی تھی۔ وہ موجودہ موضوع کی طرف آتے ہوئے بولا۔

”ریحانہ! اگر مجھے آفس سے قرض مل جاتا ہے تو سمجھو فلیٹ کی بنگ کا ابتدائی مرحلو تو طے ہو جائے گا۔ لیکن ایک بات میرے ذہن کو پریشان کر رہی ہے.....“

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

فروری 2014ء کی سرخیزی
جاسوسی کے شمارے کی حرارت انگیزی

پہلی سوغات ● انسانی اور انسانیت کو متحرک کرنے والے ڈھول کی لرزہ جواں سال
ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی فکر انگیز حقیقت نگاری

گرداب ● واقعات کے غزل و لہجہ میں گرفتار دل کا گناہ و گناہ کا افسانہ قادری کا سلسلہ

جوازی ● احمد اقبال کے شہرہ قلم سے ایک جوازی کے کھیل کے نئے انداز

مغرب کے نالے انداز ● مغرب کی تہذیب و ماحول کی عکاسی اور مجتبیٰ کی ناقابل فراموش کہانیاں

سُورق کی کہانیاں

پہلی کہانی ● وطن سے دور دیار غیر میں رہنا ہونے والے نفسی خیز
حادثات کی پرتجسس کہانی، کاشف زبیری کی شیوہ لیت

دوسری کہانی ● پلور لائٹوں کی کہانیاں کے خالق سرور اکرم کی ایک اور شاہکار سرفراز کی کہانی



آپ کے بھرے...
 مشوے... محبتیں... شکایتیں...
 اور نئی نئی دلچسپ باتیں... کتنا کثیر...

بنگ کے بعد، خالد نیازی نہایت پابندی کے ساتھ باہور اقساط ادا کر رہا تھا۔ بیچ میں چھ ماہ کے بعد اس نے کہیں سے پکڑ کر آٹھ ہزار روپے بھی ”شاہ بلڈرز“ کے دفتر میں جمع کرادیے تھے۔ یعنی آٹھ ہزار شروع میں بنگ کے وقت اور آٹھ ہزار چھ ماہ کے بعد۔ پھر جب ماہانہ قسطیں ادا کرتے ہوئے ایک سال گزر گیا تو نیازی کو گہری تشویش نے آگھیرا۔ وہ جب بھی قسط جمع کرانے جاتا، سائٹ کا معائنہ بھی ضرور کرتا تھا۔ یہ دیکھ کر اسے بہت مایوسی ہوتی کہ ابھی تک ”ڈائننڈ پلازا“ کی باقاعدہ تعمیر کا کام شروع نہیں ہو سکا تھا۔ وہ کسی طرح گھس گھسا کے ”شاہ بلڈرز“ کے مالک سے ملنے میں کامیاب ہو گیا۔

”شاہ بلڈرز“ نامی وہ تعمیراتی کمپنی دراصل دو بھائیوں کی مشترکہ کوششوں سے چل رہی تھی۔ بڑے بھائی کا نام قربان شاہ اور چھوٹے بھائی کا نام فرحان شاہ تھا جو علی الترتیب ”بڑے شاہ جی“ اور ”چھوٹے شاہ جی“ کہلاتے تھے۔ نیازی کی ملاقات جب چھوٹے شاہ جی سے ہوئی تو اس نے اپنی تشویش کو کھل کر بیان کر دیا۔

”شاہ جی! بنگ کو تقریباً ایک سال ہونے والا ہے۔ میں نہایت ہی پابندی کے ساتھ قسطیں جمع کر رہا ہوں اور ابھی تک کل ملا کر پچیس ہزار چھ سو روپے میں آپ کے آفس میں جمع کرا چکا ہوں۔ آپ کے بندے نے بنگ کے دت بتایا تھا کہ دو سال میں یہ پروجیکٹ مکمل ہو جائے گا۔“

”ہمارے بندے نے آپ کے ساتھ کسی قسم کی غلط بیانی نہیں کی جناب۔“ چھوٹا شاہ جی کراری آواز میں بولا۔

”ہماری پلاننگ کے مطابق یہ تعمیراتی منصوبہ دو سال کی مدت ہی میں مکمل ہوگا۔“

”لیکن شاہ جی.....!“ نیازی نے فکر مندی سے کہا۔

”ان دو سال میں سے ایک سال تو گزر گیا اور آپ بھی دیکھ رہے ہیں کہ ابھی تک باقاعدہ تعمیر کا کام شروع ہی نہیں ہو سکا؟“

”جی ہاں، میں بالکل دیکھ رہا ہوں، ہم سے زیادہ اس معاملے کو اور کون دیکھے گا۔“ شاہ جی نے کہا۔ ”لیکن اگر ابھی تک تعمیراتی کام میں تیزی نظر نہیں آ رہی تو اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں۔“

”پھر کس کا قصور ہے؟“ نیازی پوچھے بناندرہ سکا۔

شاہ جی نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔ ”اچھ بی ایف سی والوں کا۔“

”جی.....!“ نیازی نے حیرت بھرے لہجے میں

پوچھا۔ ”میں سمجھا نہیں شاہ جی۔ اچھ بی ایف سی والوں کا قصور کس طرح ہے؟“

”انہوں نے ابھی تک لون سکشن نہیں کیا۔“

”کیوں جناب!“ نیازی نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔ ”ایک سال ہونے کو آ رہا ہے۔ آپ نے ابھی تک لون کے لیے کوشش کیوں نہیں کی؟“

”ہماری کوششیں برابر جاری ہیں جناب!“ چھوٹے شاہ جی نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”اچھ بی ایف سی میں بھی انسان ہی بیٹھے ہوئے ہیں اور ان سے ہمارے مذاکرات چل رہے ہیں۔ انشاء اللہ! بہت جلد کوئی مثبت نتیجہ سامنے آ جائے گا۔“

فرحان شاہ کی باتوں سے خالد نیازی کی تسلی نہ ہوئی تو اس نے قدرے بدگمان لہجے میں پوچھا۔ ”جناب! اچھ بی ایف سی سے آپ کے کس قسم کے مذاکرات چل رہے ہیں؟“

”یہ مذاکرات فرضی کی منظوری کے سلسلے میں ہیں۔“ شاہ جی وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”آپ کو کیا پتا کہ ہمارے ملک کے ہر جگہ میں کام کروانے کے لیے مال کھانا پڑتا ہے۔“

”شاہ جی! ماشاء اللہ، آپ تو کافی عرصے سے یہ کام کر رہے ہیں۔“ نیازی نے شاکی نظر سے فرحان شاہ کو دیکھا۔

”مال کھانے والی یہ راز کی بات آپ کو پہلے معلوم نہیں تھی؟“

”بالکل معلوم تھی صاحب!“ وہ بڑے زوردار انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”بلکہ ہم تو ہر پروجیکٹ کے وقت ان کی ”خدمت“ کرتے ہیں مگر اس مرتبہ وہ دو گنا کا مطالبہ کر رہے ہیں۔“

”اوہ.....!“ نیازی ایک گہری سانس خارج کر کے رہ گیا۔

”ہم اگر ان کا مطالبہ مان لیں تو اس میں ہمارا کوئی نقصان نہیں۔“ چھوٹا شاہ، نیازی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ٹھوس لہجے میں بولا۔ ”بلکہ اس خسارے کو پورا کرنے کے لیے ہمیں مجبوراً الاٹیز پر بوجھ ڈالنا پڑے گا جس کے نتیجے میں فی قلیٹ میں، تیس ہزار قیمت بڑھ جائے گی اور ہم ایسا نہیں چاہتے۔“

”یہ تو خاصی تشویش ناک صورت حال ہے۔“ نیازی پریشان ہو گیا۔

”آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ تھوڑا مہرے کام لیں۔“ فرحان شاہ نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ”ہم اچھ بی ایف سی والوں کو کھٹے پکٹے پر مجبور کر دیں گے۔“

چھوٹے شاہ کی وضاحت پر یقین کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ نیازی قرضہ جات اور اس کی منظوری کے کھماؤ پھراؤ سے واقفیت نہیں رکھتا تھا تاہم اس نے سر میں جو گردش خدشے کا اظہار کرنے میں کوئی قاحت نہ سمجھی اور مستغفر ہوا۔

”شاہ جی! اگر اچھ بی ایف سی والوں نے مزید ایک سال تک آپ کو قرضہ نہ دیا تو پروجیکٹ کی تعمیر کا کام شروع نہیں ہو سکے گا۔ اس صورت میں بے چارے ہم کہاں جائیں گے۔ میرے تو بچپن ہزار چھ سو پچیس لگے نا۔“

”بیکس صاحب!“ چھوٹا شاہ نہایت ہی محمل انداز میں بولا۔ ”پہلی بات تو یہ کہ دیر یا سویر، اس پروجیکٹ پر کام ضرور ہونا ہے اس لیے آپ کی ادا کردہ رقم کے ضائع ہونے کا کوئی اندیشہ نہیں۔ دوسری بات یہ کہ آپ کے تو بچپن چھپیس ہزار لگے ہوئے ہیں اور ہمارے صرف پلاٹ پر ہی لاکھوں کی انویسٹمنٹ ہے پھر پچھلے ایک سال سے سائٹ آفس کھولے بیٹھے ہیں۔ پانچ ہزار افراد کا اسٹاف رکھا ہوا ہے۔ ان کی تنخواہیں اور آفس کے دیگر اخراجات ہیں۔ آپ کیا سمجھتے ہیں، اگر ہم اس پروجیکٹ کے ساتھ نتیجہ نہ ہوتے تو کیا ہمارا دماغ خراب ہے جو اتنا پیسہ لگاتے۔“

”مجھے آپ کی نیت یا سنجیدگی پر کوئی شک نہیں شاہ جی!“ نیازی اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔

”آپ کو شاید علم نہیں کہ ہم اپنے ماموں کے گھر میں عارضی طور پر رہائش اختیار کیے ہوئے ہیں۔ امید تھی کہ دو سال کے بعد ذاتی قلیٹ میں منتقل ہو جائیں گے مگر یہاں تو سارے راءمانوں پر پانی پھرتا نظر آ رہا ہے۔“

”نیازی صاحب! آپ مسلمان ہیں نا؟“ چھوٹا شاہ شاطرانہ انداز میں مستغفر ہوا۔

اس غیر متوقع سوال پر نیازی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور یہ آواز بلند جواب دیا۔ ”الحمد للہ..... میں مسلمان ہوں۔“

”اگر آپ سچے مسلمان ہیں تو آپ کو یہ بھی پتا ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے مایوسی کو سخت ناپسند فرمایا ہے۔“ چھوٹا شاہ بدستور نیازی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ ”بلکہ مایوسی کو گناہ تصور کیا جاتا ہے۔“

”جی.....!“ نیازی ندامت آمیز لہجے میں بولا۔

”میں یہ بات جانتا ہوں۔“

”میں سمجھتا ہوں۔“ چھوٹا شاہ نیازی کا نفسیاتی ٹرینٹ کرتے ہوئے بولا۔ ”آپ مایوس نہیں بلکہ پریشان ہیں۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا۔“

”نہیں شاہ جی.....“ وہ جلدی سے بولا۔ ”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ بالکل یہی بات ہے۔“

”فی الحال.....“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

”آپ کی پریشانی کا میرے پاس صرف ایک ہی حل ہے۔“

نیازی دچکی بھری سوالیہ نظر سے چھوٹے شاہ جی کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ”کون سا حل؟“

”اگر آپ مزید انتظار کے متحمل نہیں ہو سکتے تو اپنی بنگ کینسل کرا دیں۔“ فرحان نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔

”تو کیا ایسی صورت میں میرے بچپن ہزار چھ سو روپے مجھے فوراً مل جائیں گے؟“ نیازی نے پراشتیاق لہجے میں پوچھا۔

”فوری طور پر کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ چھوٹے شاہ جی نے دو ٹوک انداز میں جواب دیا۔ ”یہ ادائیگی مگر منٹ میں درج شرائط کے عین مطابق پروجیکٹ کی مکملی پر ہو سکے گی۔“

نیازی سوچ میں پڑ گیا۔ وہ ہر زاویے سے چنٹ گیا تھا۔ اگر وہ قلیٹ کی بنگ کو کینسل کراتا تھا تو اس کے پچیس ہزار چھ سو پروجیکٹ کی مکملی سے پہلے نہیں مل سکتے تھے اور ایک سال گزر جانے کے باوجود بھی ابھی تک پروجیکٹ کا عملی کام شروع نہیں ہو سکا تھا۔ اگر یہ کام ہی رفتار سے آگے بڑھتا تھا تو آئندہ دس سال میں بھی اس کی مکملی کے آثار نظر نہیں آتے تھے۔ دوسری صورت یہ تھی کہ وہ کڑوا ٹھونٹ سمجھ کر قسطوں کی ادائیگی کا سلسلہ جاری رکھے اور اللہ سے دعا کرتا رہے کہ اچھ بی ایف سی والے جلد از جلد لون سکشن کر دیں۔

”آپ کن سوچوں میں گم ہیں نیازی صاحب؟“ چھوٹا شاہ ٹٹولنے والے انداز میں بولا۔ ”آپ اگر آج بنگ کینسل کرتے ہیں تو اس قلیٹ کے دس خریدار کھڑے ہوں گے۔ آپ کو اندازہ نہیں ہے کہ ”ڈائننڈ پلازا“ کتنی پرامن لوکیشن پر بننے جا رہا ہے۔“

”نہیں شاہ جی۔“ نیازی نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”بنگ کینسل کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ کیا کہتے ہیں کہ۔ جب اوکھلی میں سرودے دیا تو پھر موشوں سے کیا ڈرنا!“

”شاپاش!“ چھوٹا شاہ ساکشی نظر سے نیازی کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اب آپ نے کی ہے نامردوں والی بات..... بس آپ، ممبر کا دامن مضبوطی سے تھامے رکھیں۔ اللہ کوئی نہ کوئی راستہ نکال ہی دے گا۔“

خالد نیازی نے چھوٹے شاہ جی کا شکریہ ادا کیا اور اس کے دفتر سے نکل آیا۔

گھر آکر اس نے ریحانہ کو تمام تر صورت حال سے آگاہ کر دیا۔ باہمی مشاورت کے بعد یہی طے پایا کہ بنگک کو کنینٹرل کرنا حماقت ہوگی لہذا قسطوں کی ادائیگی کا سلسلہ جاری رکھا گیا پھر دو ماہ کے بعد انہیں ایک خوش خبری سننے کو ملی کہ کراچی کی ایف سی نے ”شاہ بلڈرز“ کو قرضہ جاری کر دیا ہے۔ اس کے بعد پروجیکٹ پر بڑی تیزی سے کام شروع ہو گیا تھا۔

ریحانہ اور خالد نیازی بہت خوش تھے کہ بہت جلد وہ اپنے ذاتی فلیٹ میں شفٹ ہو جائیں گے تاہم ماہانہ قسطوں کی ادائیگی میں ان کا جالوس نکل گیا تھا۔ خاص طور پر چھ ماہ بعد آٹھ ہزار روپے کی ادائیگی نے انہیں قرض کی دلدل میں گردن تک دھنسا دیا تھا۔ ریحانہ کا زور فروخت ہو گیا، نیازی اپنے جس جاننے والے سے جو بھی لے سکتا تھا وہ اس نے لیا، آخری بیس ہزار کی بھاری پے منٹ کے لیے انہیں ظفر ماموں کے سامنے بھی ہاتھ پھیلانا پڑے تھے بہر حال، سب خیریت سے منٹ گیا تھا لیکن اس تمام تر ادائیگی کے دوران میں تین چار مرتبہ گوبڑ ہو گئی تھی۔ دو تین بار ماہانہ قسطیں تاخیر سے جمع کرائی گئی تھیں، ایک دفعہ آٹھ ہزار ادائیگی پے منٹ بھی مقررہ دورانیے سے لیٹ ہو گئی تھی اور بیس ہزار والا اماؤنٹ بھی چند روز کی تاخیر سے جمع کرایا گیا تھا۔ ان مواقع پر نیازی نے ان کاؤنٹ ڈیپارٹمنٹ سے پوچھا۔

”جناب! یہ جو پے منٹ میں تھوڑی بہت تاخیر ہو گئی ہے اس کا بنگک پر کوئی اثر تو نہیں پڑے گا؟“

”ارے بیس صاحب!“ لکھنیر نے سرسری لہجے میں جواب دیا تھا۔ ”آپ کا ریکارڈ بہت صاف ہے۔ شاہ جی آپ سے بہت خوش ہیں۔ آپ کو کسی قسم کی فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“

نیازی مطمئن ہو گیا تھا۔ ”ڈائمنڈ پلازا“ کا پروجیکٹ مکمل کے آخری مراحل میں داخل ہوا تو ایک ناخوشگوار خبر نے نیازی کے ہاتھوں کے طوطے اڑا دیے۔ یقیناً دیگر الاٹیز کی ذمہ داری کیفیت بھی دیکھی ہوئی ہوگی جو نیازی اور ریحانہ کی تھی۔ پتا یہ چلا تھا کہ دونوں بھائیوں میں کسی بات پر شدید ترین جھگڑا ہو گیا تھا یعنی بڑے شاہ جی قربان علی اور چھوٹے شاہ جی قربان علی میں پھوٹ پڑ گئی تھی۔

یہ بات کسی الاٹی کے علم میں نہیں تھی کہ دونوں بھائیوں کی لڑائی کا سبب کیا تھا۔ بس، چھوٹا شاہ اچانک منظر سے غائب ہو گیا تھا۔ البتہ بڑا شاہ گنڈے دار آفس کا چکر لگا

رہا تھا تا کہ الاٹیز کو زیادہ مایوسی نہ ہو۔ آفس کا عملہ الاٹیز کو تسلی دلا سے دے رہا تھا کہ وہ فکر نہ کریں، بہت جلد اس مسئلے کو حل کر لیا جائے گا۔ بڑا شاہ جی عموماً الاٹیز سے ملاقات نہیں کرتا تھا۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے آفس آتا، الاٹیز کو جھک دکھاتا اور اپنی گاڑی میں بیٹھ کر واپس چلا جاتا۔ دونوں بھائیوں کی پھوٹ کا سب سے زیادہ اثر پروجیکٹ پر پڑا تھا۔ تعمیر کا کام رک گیا تھا۔ پروجیکٹ آخری مراحل میں تھا اور ایک آدھ ماہ میں الاٹیز کو قبضہ دیا جانے والا تھا۔

بڑا شاہ جی، قربان علی اگرچہ الاٹیز کو نہیں نہیں کر رہا تھا تاہم اس نے اپنا ”سیاسی بیان“ آفس کے عمل کو رٹا رکھا تھا جو کچھ اس طرح تھا کہ ”دراصل دونوں بھائیوں میں کوئی جھگڑا وغیرہ نہیں ہوا لیکن چھوٹا شاہ فراڈ کر کے کہیں غائب ہو گیا ہے۔ زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ وہ ملک سے باہر نکل گیا ہو۔ پیسے کا سارا حساب کتاب قربان شاہ کے پاس تھا۔ لگ بھگ میں لاکھ روپے تھے اس کے ہاتھ میں۔ بڑا شاہ جی بالکل خالی ہو گیا ہے لیکن پھر بھی وہ الاٹیز کے بیچ موجود ہے اور بڑی شد و مد سے رقم کے انتظام میں لگا ہوا ہے تا کہ پروجیکٹ کو جلد از جلد مکمل کر کے الاٹیز کے حوالے کیا جاسکے۔ وہ اپنے فراڈ یا بھائی کو تو ڈھونڈ کر نہیں لاسکتا تاہم اس کی نیت بالکل صاف ہے۔ وہ جلد یا بدیر الاٹیز کی امیدوں پر پورا اترے دکھادے گا۔ وغیرہ وغیرہ.....!“

یہ صورت حال خاصی مایوس کن تھی تاہم الاٹیز کے پاس صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا لہذا دوسرے لوگوں کی طرح نیازی بھی صبر کرنے پر مجبور تھا۔ ممکن تھا کہ وہ کافی عرصہ صبر کیے بیٹھا رہتا کہ ایک سستی خیر واقعہ نے اس کی رات کی نیند اور دن کا سکون اڑا کر رکھ دیا۔ ایک روز وہ آفس سے واپسی پر جب ڈائمنڈ پلازا کی طرف سے گزرا تو اس کے جی میں آئی کہ سائٹ آفس جا کر تازہ ترین صورت حال سے آگاہی حاصل کرے۔ جب وہ پلازا کے سامنے پہنچا تو یہ دیکھ کر اس کے ہوش اڑ گئے کہ پلازا کے دس فیصد فلیٹ آباد ہو چکے تھے۔ گیلریوں کے باہر بندی ہوئی الگ انیاں اور ان پر لپہا تے ہوئے کپڑے اس بات کا یقین ثبوت تھے کہ وہاں ٹیلیفون رہائش پذیر ہو چکی ہیں جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ ان لوگوں کو فلیٹ کا قبضہ مل چکا تھا۔ یہ منظر دل خوش کن تھا۔ وہ اپنے فلیٹ کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے دفتر کے اندر گھر گیا۔

آفس کے عملے میں اکثر نئے چہرے نظر آ رہے تھے۔ بنگک کلرک، لکھنیر، چہرہ اسی سب سے بھرتی تھی۔ نیازی نے

معلومات کا ڈنٹر پر جا کر مسرت بھرے لہجے میں پوچھا۔ ”جناب! کیا ڈائمنڈ پلازا کے الاٹیز کو قبضہ دینے کا کام شروع ہو گیا ہے؟“

”جی صاحب! بالکل.....“ اس شخص نے بتایا۔ ”مجھے اپنے فلیٹ کے بارے میں پوچھنا تھا؟“

”آپ اس کا ڈنٹر پر چلے جائیں۔“ وہ شخص بنگک کلرک کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”وہ آپ کو سب کچھ بتا دیں گے۔“

نیازی نے اس کی ہدایت پر عمل کیا اور بنگک کلرک کے پاس پہنچ گیا۔ پہلے والا بنگک کلرک اسے اچھی طرح جانتا تھا اور نیازی جب بھی وہاں پہنچتا وہ مسکراتے ہوئے چہرے کے ساتھ اس کا استقبال کرتا تھا اور رسی علیک سلک بھی لازمی تھی لیکن نئے کلرک نے نیازی پر نظر پڑتے ہی کھرے لہجے میں کہا۔

”جی فرمائیں.....؟“

”وہ پہلے والے کلرک صاحب کہاں چلے گئے ہیں؟“ نیازی نے پوچھا۔

”ان کی چھٹی کر دی گئی ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”بلکہ جن ملازموں کو چھوٹے شاہ جی نے لکھا تھا، بڑے شاہ جی نے ان سب کو فارغ کر دیا ہے۔ بڑے شاہ جی کہتے ہیں..... قربان شاہ فراڈ نکلا ہے تو اس کے رکھے ہوئے بندے بھی کسی موقع پر دھوکا دے سکتے ہیں۔ صاحب بڑا خراب وقت آ گیا ہے۔ لوگوں کے خون سفید ہو گئے ہیں۔ بھائی، بھائی کا گلا کاٹ رہا ہے۔ اللہ معاف کرے.....!“

”یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ نیازی نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتی۔ ”اللہ ہم سب کی حفاظت کرے۔“

”خیر.....!“ کلرک ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ”فرمائیں، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“

”میں نے بھی اس پلازا میں ایک ٹائپ تھری فلیٹ بک کر رکھا ہے۔“ نیازی نے بتایا۔ ”اسی کے قبضے کے بارے میں معلوم کرنے آیا ہوں۔“

”آپ فلیٹ کی فائل ساتھ لائے ہیں؟“ کلرک نے استفسار کیا۔

”سب رسیدیں بھی فائل کے اندر لگی ہوئی ہیں۔“

”تب تو ٹھیک ہے۔“ وہ اطمینان سے گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”آپ کل کی وقت فائل لے کر آجائیں۔ آپ کو کاغذات کی اور فائل کے ساتھ قبضہ دے دیا جائے گا۔“

نیازی کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ اس نے جذبات سے مغلوب آواز میں کہا۔ ”آپ چاہیں تو اپنے ریکارڈ میں چیک کر کے تسلی کر سکتے ہیں۔ میرے فلیٹ کا نمبر ہے تین سو تین.....!“

”سوری جناب!“ کلرک نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”بڑے شاہ جی نے سختی سے منع کر رکھا ہے کہ غیر متعلقہ افراد کو کسی بھی نوعیت کی معلومات فراہم نہ کی جائیں۔ جب سے چھوٹے شاہ جی فراڈ کر کے غائب ہوئے ہیں، بڑے شاہ جی اس پروجیکٹ کے حوالے سے بہت محتاط ہو گئے ہیں۔“

”لیکن صاحب! میں تو غیر متعلق شخص نہیں ہوں۔“

نیازی نے شکایتی نظروں سے نئے کلرک کی طرف دیکھا۔ ”پچھلے تین سال سے میرا یہاں آنا جانا ہے۔ اس پلازا میں مجھے ایک فلیٹ الاٹ ہوا ہے۔ میں نے باقاعدگی کے ساتھ اس کی ساری اقساط بھری ہیں۔ میں غیر متعلق کیسے ہو سکتا ہوں؟“

”آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں۔ میں آپ کی باتوں کو جھٹلاتا تو نہیں رہا۔“ کلرک نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ ”میں نے تو ایک اصولی بات بیان کی ہے۔ میں چونکہ آپ کو شکل و صورت سے نہیں جانتا اس لیے مجھے اسی وقت آپ کے الاٹی ہونے کا یقین آئے گا جب آپ فلیٹ کی فائل اپنے ساتھ لے کر آئیں گے۔“

کلرک کے ساتھ بحث کا کوئی جواز نظر نہیں آتا تھا لہذا نیازی واپس آ گیا تاہم واپسی کے سفر میں اس کا دل بلبوں اچھل رہا تھا۔ وہ بڑے فخر کے ساتھ ریحانہ کو یہ خوش خبری دینے والا تھا کہ کل انہیں ان کے ذاتی فلیٹ کا قبضہ مل جائے گا۔

ریحانہ کی خوشی کا بھی کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ یہ خبر تھی ہی ایسی کہ انہیں جسم و جان سے نہال کر گئی تھی۔ وہ لہجہ آن پہنچا تھا جس کے لیے انہوں نے ایک ایک دن کن کر گزارا تھا۔ ان تین سال کے دوران میں دو تین ایسے مرحلے بھی آئے تھے جب انہیں فلیٹ ہاتھ سے نکلتا اور رقم ذمہ داری محسوس ہوئی تھی لیکن پھر تقدیر ان پر مہربان ہو گئی تھی۔ ظفر ماموں بھی ان کی خوشی میں برابر کے شریک تھے۔ انہوں نے اخلاقی اور مالی دونوں طریقوں سے ان کی حتی الامکان مدد کی تھی۔

اگلی صبح نیازی اور ریحانہ تاشتے کے فوراً بعد ”ڈائمنڈ

پلازا؟ کے آفس پہنچ گئے۔ نیازی نے یہی فیصلہ کیا تھا کہ وہ قبضہ ملنے کے بعد اپنے فلیٹ پر نیا تالا ڈالے گا اور پھر آفس چلا جائے گا۔ اس مقصد کے لیے اس نے رات ہی کو چائنا کا ایک بڑا سا مضبوط تالا بھی خرید لیا تھا۔ وہ لوگ کلرک کی آمد سے بھی پہلے پلازا کے آفس پہنچ گئے تھے۔ فائل کو نیازی نے بڑی حفاظت سے تمام رکھا تھا۔

کلرک اپنی سیٹ پر بیٹھ کر ہوا تو نیازی اس کے پاس پہنچ گیا۔ کلرک نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”آپ رات کو بھی آئے تھے نا؟“

”جی..... جی.....“ نیازی نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ ”لائیں فائل دکھائیں۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

نیازی نے فائل اس کی جانب بڑھادی۔ کلرک نے بغور فائل کا جائزہ لیا۔ نیازی ایک ٹک کلرک کے چہرے کو دیکھ کر جا رہا تھا۔ کلرک کے چہرے پر الجھن کے آثار پیدا ہوئے تو نیازی کو گھبراہٹ محسوس ہونے لگی۔ وہ پوچھنے پر تیار نہ رہا۔

”جناب! آپ خاموش کیوں ہیں؟“

”خالد نیازی آپ ہی ہیں نا؟“ کلرک نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

”جی ہاں، میں ہی ہوں۔“ اس نے جلدی سے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”آپ کو کوئی شک ہو رہا ہے تو میں اپنا کارڈ دکھاتا ہوں۔“

”بات شک کی نہیں ہے نیازی صاحب.....!“

”کچھ کیا بات ہے؟“ ریحانہ جو نیازی کے قریب ہی بیٹھی تھی چونک کر متحیر ہوئی۔

”ایک منٹ.....!“ کلرک نے ان کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ ”میں پہلے اپنا کارڈ چیک کر لوں پھر بتاتا ہوں۔“

ریحانہ اور نیازی نے پریشان نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ریحانہ بولی۔ ”نیازی، یہ کیا چکر ہے؟“

”مجھے کیا معلوم.....!“ وہ الجھی ہوئی آواز میں بولا۔

”تم تو رات کو بھی یہاں سے ہو کر گئے ہوتا.....!“ وہ ٹوٹتی ہوئی نظر سے اپنے شوہر کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ”اگر کوئی ایسی ویسی بات تھی تو.....“

”آپ لوگ آپس میں نہ الجھیں پلیز۔“ کلرک نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے سپاٹ آواز میں کہا۔ ”سارا چکر میری سمجھ میں آگیا ہے۔“

”کیسا چکر؟“ وہ دونوں پر یک زبان ہو کر بولے۔

”دیکھیں صاحب!“ کلرک نیازی کی آنکھوں میں

دیکھتے ہوئے بولا۔ ”کیا یہ درست ہے کہ ماہانہ اقساط کی ادائیگی میں ایک قسط دس دن اور دوسری قسط بارہ دن مقررہ تاریخ سے لیتے جمع کرانی تھی؟“

”جی ہاں، ایسا ہوا تھا۔“ نیازی نے تصدیق کی۔

”اور ہر چھ ماہ کے بعد جو آٹھ ہزار ادائیگی پر منٹ تھیں ان میں سے بھی آپ نے ایک بے منٹ مقررہ تاریخ گزر جانے کے ڈیڑھ ماہ بعد جمع کرانی تھی؟“

”جی، یہ حقیقت ہے۔“ نیازی نے ایک مرتبہ پھر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”لیکن آپ سے پہلے ہر کلرک تھے انہوں نے مجھے یقین دلایا تھا کہ اس معمولی تاخیر سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“

کلرک اس کی سنی ان سنی کرتے ہوئے بولا۔ ”اور سب سے آخر والی بیس ہزار کی بے منٹ جو کلرک بیس تین ماہ پہلے آپ نے جمع کرانی ہے وہ بھی مقررہ تاریخ سے کوئی ڈیڑھ، دو ماہ لیٹ تھی؟“

”جناب! میں نے عرض کیا ہے تاکہ آپ سے پہلے والے کلرک نے کہا تھا، مجھے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“

نیازی اپنی صفائی دیتے ہوئے بولا۔ ”معمولی سی.....“

”دیکھیں نیازی صاحب!“ کلرک قطع کلامی کرتے ہوئے خشک لہجے میں بولا۔ ”کو تا ہی معمولی سی ہو یا بہت بڑی..... وہ کو تا ہی ہی کہلائے گی۔ ہم لوگ انگری منٹ پر درج قواعد و ضوابط کی بڑی سختی سے پاس داری کرتے ہیں اور آپ کو بھی ایسا ہی کرنا ہوگا.....!“

”مطلب کیا ہے، آپ کا؟“ پہلی مرتبہ نیازی کے لہجے میں دشمنی آئی۔

”صاف سی بات ہے۔“ وہ بے پروائی سے بولا۔ ”قواعد و ضوابط کی رو سے آپ تین بار ڈی فالتز ہو چکے ہیں.....“

”تو؟“ ریحانہ نے بھری ہوئی آواز میں سوال کیا۔

”تو آپ کی بکنگ کینسل کر دی گئی ہے۔“ کلرک نے ٹھہرے ہوئے انداز میں بتایا۔ ”دو ماہ پہلے آپ کا فلیٹ کسی اور پارٹی کو الٹ کر دیا گیا ہے۔“

یہ اطلاع ان دونوں میاں بیوی کے لیے کسی دھماکے سے کم نہیں تھی۔ نیازی نے احتجاجی لہجے میں کہا۔

”اگر ایسی کوئی بات تھی تو مجھے اسی وقت کیوں نہیں بتا دیا گیا جب پہلی بار بے منٹ لیت ہوئی تھی؟“

”آپ کا اعتراض جائز ہے نیازی صاحب۔“ کلرک نے جمل سے جواب دیا۔ ”مجھ سے پہلے جو کلرک تھا اسے یقیناً آپ پر یہ واضح کر دینا چاہیے تھا۔ پہلی بار میں تو

دوسری مرتبہ، دوسری مرتبہ نہیں تو تیسری دفعہ.....“

”یہ تو آپ کے کلرک کی غلطی ہوئی نا۔“ ریحانہ نے برہمی سے کہا۔ ”اس کے کیسے کی سزا ہم کیوں جھگڑیں۔ ہم نے تو فلیٹ کی پوری قیمت چکا دی ہے۔“

”میڈم! بڑے شاہ جی کے ساتھ لاکھوں کا فراڈ ہوا ہے۔ کسی اور نے نہیں بلکہ مجھے چھوٹے بھائی نے انہیں دھوکا دیا ہے۔“ کلرک اپنی کمپنی کی حمایت کرتے ہوئے بولا۔

”پہلے والا کلرک بھی چھوٹے شاہ جی ہی کا رکھا ہوا بندہ تھا۔ اس کے بھی کافی کھیلے سامنے آئے ہیں اسی لیے بڑے شاہ جی نے اسے ملازمت سے نکال دیا ہے۔“

”شاہ جی اسے ملازمت سے نکالیں یا جہنم میں بھیجیں، ہمیں اس بات سے کوئی دلچسپی ہے اور نہ ہی غرض۔“ ریحانہ غصے سے بولی۔ ”ہم نے فلیٹ کی قیمت کلرک کو نہیں بلکہ ”شاہ بلڈرز“ کو ادا کی ہے اور ”شاہ بلڈرز“ بڑے شاہ جی کی کمپنی ہے۔ ان کے چھوٹے بھائی نے ان کے ساتھ کیا کیا، وہ ہمارا مسئلہ نہیں۔“

”یقیناً وہ آپ کا مسئلہ نہیں۔“ کلرک نے تائیدی انداز میں کہا۔ ”کمپنی نے آپ کا فلیٹ اس لیے کینسل نہیں کیا کہ چھوٹے شاہ جی کمپنی کے ساتھ کسی قسم کا فراڈ کر کے غائب ہو گئے ہیں۔“

”کچھ.....“ ریحانہ کلرک کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بولی اٹھی۔ پھر ہمارا فلیٹ کینسل کر کے کسی اور پارٹی کو کیوں الٹ کر دیا گیا ہے؟“

”اس لیے کہ قواعد و ضوابط کی رو سے ایک نہیں، آپ تین بار ڈی فالتز ہو چکے تھے۔“ کلرک نے واضح کلامی الفاظ میں کہا۔ ”آپ نے وہ انگری منٹ سامنے کیا ہے جس پر درج قواعد و ضوابط کا میں ذکر کر رہا ہوں.....“

”کیا کسی فلیٹ کو کینسل کرنے یا کسی نئی پارٹی کو الٹ کرنے کے اختیارات آپ کے پاس ہیں؟“ نیازی نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

”فائل اتھارٹی تو بڑے شاہ جی ہی ہیں۔“ کلرک نے بتایا۔ ”ہم لوگ انہیں مشورہ دے سکتے ہیں اور وہ خود بھی ہم سے گاہے بگاہے مشورہ لیتے رہتے ہیں۔“

”میں بڑے شاہ جی سے ملنا چاہتا ہوں۔“ نیازی نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

”فوری طور پر تو یہ ممکن نہیں جناب۔“ کلرک روکھے انداز میں بولا۔

”میں شام میں آجاتا ہوں۔“

”نہیں جناب!“ کلرک دو ٹوک لہجے میں بولا۔ ”اگر آپ کو شاہ جی سے ملنے ہے تو دو ماہ تک انتظار کرنا ہوگا.....“ لہجائی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس خارج کی اور بولا۔

”میں سمجھتا ہوں، بڑے شاہ جی سے ملاقات کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ قصور آپ کا ہے۔ کمپنی کے اصول کے مطابق، ہم نے آپ کی بکنگ کینسل کر کے دوسری پارٹی کو اس فلیٹ کا قبضہ دے دیا ہے۔ وہ لوگ تو اب فلیٹ نمبر تین سو تین میں رہائش بھی اختیار کر چکے ہیں۔ انہوں نے یکسویت بے منٹ کر دی تھی۔“

”کون ہیں وہ لوگ؟“ ریحانہ نے سرسراتی ہوئی آواز میں سوال کیا۔

”کامران نام ہے ان کا۔“ کلرک نے بتایا۔ ”وہ اپنی بیوی اور بچے کے ساتھ اس فلیٹ میں شفٹ ہوئے ہیں۔ کامران صاحب کا تعلق پولیس ڈیپارٹمنٹ سے ہے۔“

”پولیس.....!“ ریحانہ اور نیازی نے بیک وقت ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

پولیس کا نام سن کر ان کی رہی سہی امید بھی جاتی رہی تھی۔ ایک تو بلڈرز ہی سے نمٹنا تقریباً ناممکن دکھائی دے رہا تھا اور دوسرے وہ فلیٹ کسی پولیس والے کو الٹ ہو چکا تھا۔

نیازی نے مرہل سی آواز میں کلرک سے پوچھا۔

”شاہ جی سے ملاقات کے لیے دو ماہ تک انتظار کیوں کرنا پڑے گا؟“

”بڑے شاہ جی جج پر گئے ہوئے ہیں۔“ کلرک نے بتایا۔ ”ان کی واپسی دو ماہ کے بعد ہوگی۔“

ریحانہ نے بڑا اہم سوال کیا۔ ”فرض کریں، ہماری ہی کسی غلطی کے سبب وہ فلیٹ اور کو الٹ ہو چکا ہے لیکن یہ بھی تو ایک محسوس حیثیت ہے تاکہ ہم نے اس فلیٹ کے حصول کے لیے ”شاہ بلڈرز“ کو ایک لاکھ چالیس ہزار روپے ادا کیے ہیں۔ ہمارے پاس ہر چھوٹی بڑی ادائیگی کی رسید موجود ہے۔“

”میں اس حقیقت سے انکار کر رہا ہوں میڈم!“ کلرک زیر لب مسکراتے ہوئے بولا۔ ”آپ کی ادا کردہ رقم ایک امانت کی حیثیت سے ”شاہ بلڈرز“ کے پاس محفوظ ہے اور آپ کمپنی کے قواعد کی روشنی میں وہ رقم واپس لے سکتے ہیں۔“

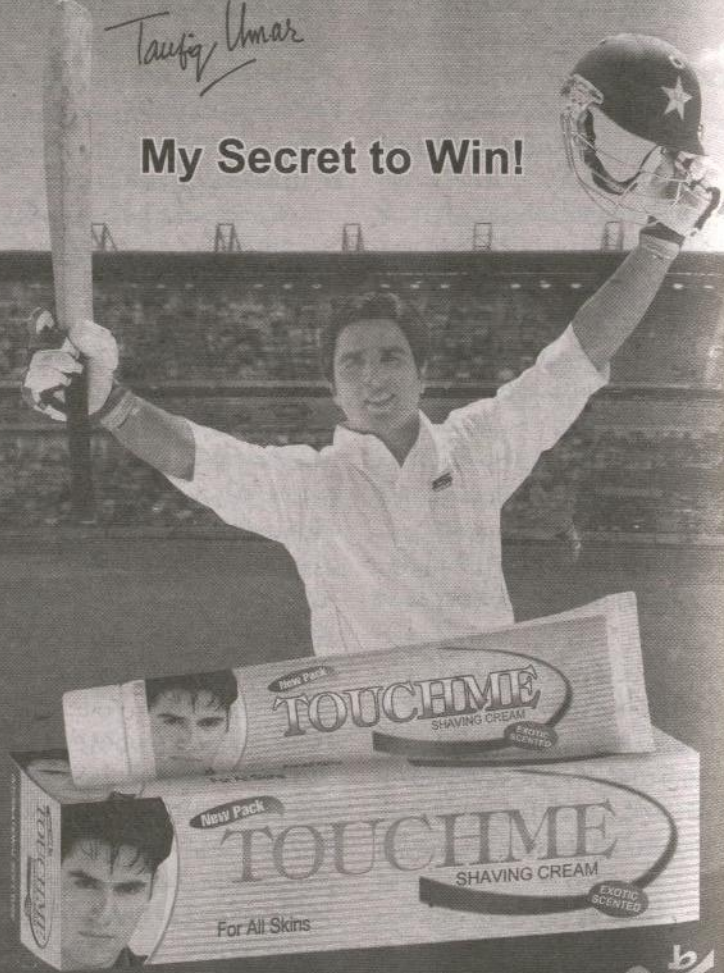
”انگری منٹ میں تو یہی اصول درج ہے کہ بکنگ کینسل ہونے کی صورت میں پروڈیکٹ کی تکمیل کے بعد جمع شدہ رقم واپس کر دی جائے گی۔“ نیازی نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”اور یہ پروڈیکٹ تو اب مکمل ہو چکا۔“

خزم و ملائم Smooth شیو!

دے مجھے Confidence گھر ہو یا پھر کھیل کا میدان

Taufiq Umar

My Secret to Win!



شیونگ کریم

بلڈرز پر وجیکٹ مکمل ہونے کا انتظار کرتے رہتے ہیں کیونکہ تیاری کی زیادہ قیمت مل جاتی ہے۔ مجھے یقین ہے، شاہ جی نے پولیس والے کامران کو دو، ڈھائی لاکھ سے کم میں یہ فلیٹ نہیں بیچا ہوگا۔ جب وہ ہمارے ایک لاکھ چالیس ہزار واپس کرے گا تو کم از کم ایک لاکھ کا پروفٹ پھر بھی اس کی جیب میں چلا جائے گا۔ وہ لمبے بھر کو رکھا پھر زہریلے انداز میں اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”سچ کہتے ہیں..... پیسا، پیسے کو کھینچتا ہے۔ کاروبار چاہے، بے ایمانی کا ہو یا نیک نیتی کا..... ہر جگہ یہی اصول کارفرما دکھائی دیتا ہے۔“

”کچھ بھی ہے۔“ ریحانہ ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ”فلیٹ تو ہاتھ سے نکل گیا۔ اب تم گھر جاؤ گے یا آفس؟“

”گھر ہی چلے ہیں۔“ وہ پوچھل آواز میں بولا۔ ”آج آفس جانے کو جی نہیں چاہ رہا۔۔۔۔۔“

دو ماہ تک وہ شاہ جی کی واپسی کا انتظار کرتے رہے۔ پھر پتا چلا، وہ سعودیہ سے ایران چلے گئے ہیں۔ بہر حال ایران، عراق اور شام وغیرہ سے ہوتے ہوئے جب وہ واپس کراچی پہنچے تو اس دوران میں چار ماہ سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا تھا۔ یہاں آتے ہی ان کی طبیعت نامساز ہو گئی۔ ہفتے دس دن میں ایک آدھ پکڑ آفس کا لگ جاتا۔ نیازی نے ہمت اور کوشش کر کے شاہ جی سے ایک آدھ ملاقات بھی کر لی لیکن رقم وصول ہونے کی کوئی سہیل نہ بن سکی۔ شاہ جی یہ تو مانتے تھے کہ وہ نیازی کی رقم ضرور واپس کریں گے مگر کبھی حالات کار و بار بھی طبیعت کا بہانہ کر کے وہ چپٹی چپٹی کی طرح نیازی کے ہاتھ سے نکل جاتے تھے۔

جب خالد نیازی کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ شاہ جی کی نیت میں خرابی ہے اور وہ کسی بھی صورت میں اس کی رقم ادا کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے تو اس نے اپنا حق وصول کرنے کے لیے قانونی چارہ جوئی کے پارے میں سوچا تھا۔ مجھ سے اس کی ملاقات اسی سلسلے کی کڑی تھی۔

☆☆☆

پچھلی ملاقات پر وہ فائل میرے حوالے کرتے ہوئے بڑے شاہ جی یعنی قربان شاہ کی پکڑ باز یوں سے مجھے تفصیلاً آگاہ کر گیا تھا لہذا میں نے فیس وصول کر کے یہ فیس اپنے ہاتھ میں کر لیا تھا۔ اب کی بار جو وہ دوبارہ مجھ سے لئے آیا تو امید بھرے انداز میں پوچھا۔

”بیگ صاحب! آپ نے اس فائل کا مطالعہ تو

”جی ہاں، بالکل.....“ کلرک تائیدی انداز میں بولا۔ ”نہ صرف پروجیکٹ مکمل ہو چکا بلکہ دس سے پندرہ فیصد فلیٹس میں تو لوگوں نے رہائش بھی اختیار کر لی ہے۔“

”تو پھر براہ مہربانی آپ ہماری رقم واپس کر دیں۔“ نیازی نے دانش مندی کا فیصلہ کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے نہ تو بڑے شاہ جی سے ملنا ہے اور نہ ہی کسی اور سے۔“

ریحانہ نے بھی شوہر کی تائید میں کہا۔ ”ہم کسی سے لڑائی چھڑاتو کر نہیں سکتے۔ اب اس مسئلے کا آخری حل یہ ہے کہ آپ ہمارے ایک لاکھ چالیس ہزار لوٹا دیں۔“

”آپ کی ادا کردہ رقم میرے نہیں بلکہ شاہ جی کے اکاؤنٹ میں محفوظ ہے۔“ کلرک انہیں ہری جھنڈی دکھاتے ہوئے بولا۔ ”آپ کو ہر صورت میں شاہ جی کی واپسی کا انتظار کرنا ہوگا البتہ.....“ لحاظی توقف کر کے اس نے ایک پوچھل سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”البتہ..... میں آپ کو اس بات کا یقین دلاتا ہوں کہ آپ کی رقم بالکل محفوظ ہے۔ اس سلسلے میں آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“

وہ دونوں گردنیں جھکا کر، سستے ہوئے چہروں اور پوچھل دلوں کے ساتھ آفس سے باہر نکل آئے۔ یہ حقیقت تھی کہ جو صورت حال ان کے سامنے آئی تھی اس میں اگر ان کے ایک لاکھ چالیس ہزار ہی واپس مل جاتے تو وہ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتے۔

واپسی کی راہ اختیار کرتے ہوئے ریحانہ نے کہا۔ ”نیازی کیوں نہ ہم ایک نظر اپنے فلیٹ کو دیکھتے چلیں.....!“

”کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ جھنجھلاہٹ بھرے انداز میں بولا۔ ”تم کس فلیٹ کو اپنا کہہ رہی ہو..... وہ جو ہمارا ہونے سے پہلے ہی کسی پولیس والے کا ہو چکا ہے۔“

”اس میں بھی تو تمہارا ہی قصور ہے نا۔“ ریحانہ بگڑ کر بولی۔ ”اگر تم بروقت چلیں.....!“

”بکواس بند کرو.....“ وہ یکدم غصے میں آ گیا۔ ”اس دنیا کے ہر آلے کا نام میں تمہیں میرا ہی ہاتھ نظر آتا ہے۔ میں بلڈرز کا حرامی پن صاف سمجھ رہا ہوں۔ یہ لوگ کسی بھی جیلے بہانے سے الائیڈ کو ڈی فالٹر کرنے کے چکر میں رہتے ہیں۔ ان کی رقم سے یہ پلازا اکھڑے کرتے ہیں پھر جب بلڈنگ رہائش کے قابل ہو جاتی ہے تو کسی دوسری پارٹی سے زیادہ رقم لے کر فلیٹ اس کے حوالے کر دیتے ہیں۔ اگر شاہ جی کی نیت صاف تھی تو ہمیں اسی وقت ڈی فالٹر کر دینا چاہیے تھا جب میری طرف سے پہلی قسط لیٹ ہوئی تھی۔ یہ بد معاش

کر لیا ہوگا؟“

”جی ہاں..... بہت اچھی طرح!“ میں نے پرامتداد لہجے میں جواب دیا۔

”تو پھر کیا رائے ہے آپ کی؟“ وہ بدستور امید بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”آپ کو میرے کیس میں کوئی جان نظر آتی ہے؟“

”ایسی دیکھی جان.....“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”نیازی صاحب! یہ ایک جاندار اور ایمان دار کیس ہے جس میں مجھے آپ کی کامیابی کے روشن امکانات نظر آرہے ہیں۔ یہ دوسرے کیسوں کی بہ نسبت مختلف نوعیت کا کیس ہے۔“

”گو یا میری ڈوبی ہوئی رقم وصول ہو جائے گی؟“ وہ امید بھری، تصدیق طلب نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

”کیوں نہیں۔“ میں نے پُر دھڑلے انداز میں کہا۔ ”لیکن اس کے لیے آپ کو میری ہدایات پر سن و سن عمل کرنا ہوگا نیازی صاحب!“

”آپ جو بھی حکم کریں گے، میں اس کی تعمیل کروں گا۔“ وہ فرماں برداری سے بولا۔

میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”نیازی صاحب! شاہ جی جیسے فراڈی یا لوگوں کو بڑے طریقے سلیقے سے گھبرانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ لوگ چونکہ بہ یک وقت کئی افراد سے فراڈ کر رہے ہوتے ہیں اس لیے کورٹ ہجری کا سامنا کرنے یا ان کے معاملات کو اخبارات کی زینت بننے میں انہیں خاصی گھبراہٹ ہوتی ہے۔ مجھے امید ہے کہ کیس کو کورٹ میں لے جائے بغیر، میں یہاں، اس آفس ہی میں شاہ جی سے یہ آسانی منٹ لوں گا۔“

”اچھا..... وہ کیسے؟“ وہ بے یقینی سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ ”شاہ جی کی فطرت ایسے لوگ اس اصول کے تحت دھوکا دہی کا کاروبار کرتے ہیں کہ کمزور کو دباؤ اور خاموشی سے ہڑپ کر جاؤ اور اگر کسی زوردار سے پالا پڑ جائے تو اس کے سامنے فوراً گھٹنے ٹیک دو۔ اس دنیا میں چونکہ کمزور افراد کی تعداد زیادہ ہے لہذا اس قسم کے فراڈیہ زیادہ تر فائدہ سے میں اور میری بھاری نقصان میں رہتے ہیں۔“

”میں پہلے کمزور تھا۔“ وہ پرمعزز لہجے میں بولا۔ ”لیکن اب مجھے آپ جیسے قابل وکیل کا ساتھ اور تعاون حاصل ہے اس لیے میں خود کو کافی طاقتور محسوس کر رہا ہوں۔“

”اس لیے آپ کے معاملے میں شاہ جی کے ساتھ کبھی

بکھار والی صورت حال پیش آئے گی۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”وہ گھٹنے ٹیک دے گا اور خود نقصان میں رہ کر آپ کی رقم واپس کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔“

”وہ مگر مجھے میرے ایک لاکھ چالیس ہزار روپے بڑے مزے سے ہڑپ کیے بیٹھا ہے۔“ وہ زبردستی لہجے میں بولا۔ ”اسے میری رقم اٹھانا ہی ہوگی۔“

”نیازی صاحب!“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”یہاں میں ایک بات کی تصریح کرنا ضرور سمجھتا ہوں۔“

”کون سی بات؟“ وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

”جہاں تک میں مجھے پایا ہوں یا جہاں تک آپ کے فلیٹ کی فائل نے میری رہنمائی کی ہے اس کے مطابق، آپ نے ”شاہ بلڈرز“ کو مختلف اقساط کی صورت میں لگ

بھگ اسی ہزار روپے ادا کیے ہیں۔ ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن کے ساتھ ہزار ملانے کے بعد فلیٹ کی کل قیمت ایک لاکھ چالیس ہزار بنتی ہے، چونکہ آپ کو فلیٹ کا قبضہ نہیں ملا لہذا ”انچلی ایف سی“ کی اقساط بھی شروع نہیں ہو سکیں۔

یہ ساٹھ ہزار تو آپ نے فلیٹ میں رہائش اختیار کرنے کے بعد آسان اقساط کی صورت ادا کرنا تھے..... آپ میری بات سمجھ گئے نا؟“

”جی..... اچھی طرح سمجھ گیا۔“ وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”آپ حکم کریں، مجھے کیا کرنا ہوگا؟“

آئندہ پندرہ مہینے میں اس سے کس نوعیت کا تعاون چاہتا ہوں۔ اس نے پوری توجہ سے میری بات سنی اور میرے خاموش ہونے پر کہا۔

”آپ بالکل بے فکر ہو جائیں بیگ صاحب! میں آپ کی مطلوبہ معلومات دو تین دن میں آپ کو فراہم کروں گا۔“

”دو تین دن نہیں، میں اس کام کے لیے آپ کو پورا ایک ہفتہ دیتا ہوں۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میں اس دوران میں خود بھی شاہ جی پر تھوڑی ریسرچ کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کو ایک بات کا خاص طور پر خیال رکھنا ہوگا۔“

میں سانس ہموار کرنے کے لیے تھما تو اس نے پوچھ لیا۔ ”جی، کون سی بات بیگ صاحب؟“

”کسی بھی قیمت پر شاہ جی کو یہ یقین نہیں پڑنا چاہیے کہ آپ نے اپنا کیس کسی وکیل کے ہاتھ میں دے رکھا ہے۔“ میں نے تھوڑا آگے بھج کر سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ”اور یہ کہ آپ شاہ جی کے خلاف کسی قسم کی قانونی چارہ

جوئی کارا دہ رکھتے ہیں۔“

”جی، میں اچھی طرح سمجھ گیا۔“ وہ سرکوا ثباتی جینٹل دیتے ہوئے بولا۔ ”میں آپ کی ہدایات کا پوری طرح خیال رکھوں گا۔ میری کارکردگی آپ کا پاموس نہیں کرے گی۔“

میں نے اسے رخصت کر دیا۔ آئندہ چند روز میں، میں نے اپنے تعلقات کے گھوڑے ہر سمت دوڑائے اور ”شاہ بلڈرز“ خصوصاً بڑے شاہ جی قربان علی کے حوالے سے بہت سی سنسنی خیز معلومات حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس مہم جوئی میں کئی ایک تہلکہ خیز اعشاشات بھی ہوئے جن کا ذکر میں آگے چل کر عدالتی کارروائی کے دوران میں کسی مناسب موقع پر کروں گا، بشرطیکہ ایسا کوئی موقع آتا ہو.....!

ایک ہفتے کے بعد خالد نیازی میرے دفتر آیا۔ اس کے چہرے پر دبا دبا جوش اس امر کا غماز تھا کہ میں نے اس کے ذمے جو کام لگایا تھا وہ اسے کرنے میں خاطر خواہ کامیاب رہا تھا۔ رکی علیک سلیک کے بعد میں نے پوچھا۔

”نیازی صاحب! کیا رہا؟“

”آپ کے حکم کے مطابق، میں نے وہ ساری معلومات جمع کر لی ہیں جن کی بنا پر شاہ جی کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کیا جاسکتا ہے۔“ اس نے سرسراتی ہوئی آواز میں بتایا۔ ”آپ کی ہدایت کی روشنی میں مجھے کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔“

”ویری لگتا!“ میں نے سر اٹھنے والے انداز میں کہا۔ ہمارے درمیان تھوڑی دیر تک اس کیس کے مختلف پہلوؤں پر بات ہوئی رہی پھر میں نے تسلی دینے کے بعد اسے رخصت کر دیا۔

دو روز کے بعد ان حاصل شدہ معلومات کو ذہن میں رکھتے ہوئے میں نے ”شاہ بلڈرز“ کے روح رواں شاہ جی قربان علی کے نام ایک قانونی نوٹس پر ذریعہ رجسٹری ڈاک پوسٹ کر دیا۔ اس نوٹس کا مضمون انگلش میں کچھ اس طرح تھا۔

”میرے موکل مسی خالد نیازی ولد افضل نیازی رہائشی گولیمار، مکان نمبر قلاں بیٹا قلاں جو کہ آپ کے رہائشی پروڈیٹ ”ڈائمنڈ پلازا“ واقع گاؤن ویسٹ نزد چڑیا گھر کا لائی ہے، اس نے مجھے بتایا ہے کہ آپ نے اپنے مختلف نمبراتی بھائیوں کے ذریعے مرحلہ وار فراڈ کر کے اس سے لگ بھگ اسی ہزار روپے بطور لیے ہیں لیکن پروڈیٹ کی پینل کے بعد آپ نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا۔ مذکورہ پانڈنس بلڈنگ ”ڈائمنڈ پلازا“ کا فلیٹ نمبر تھری ناٹ تھری یعنی تین سو تین جس کی بینک میرے موکل کے نام سے

تھی اور وہی اس فلیٹ کا لائی بھی تھا مگر آپ نے مختلف جیلوں پہانوں سے خالد نیازی کو ڈی فالتز قرار دے کر مذکورہ فلیٹ کسی پولیس والے کے ہاتھ میں دے دیا۔ اس پر سخت کر دیا ہے۔ آپ کا یہ فعل سراسر غیر اخلاقی، غیر قانونی اور غیر انسانی ہے۔ میں خالد نیازی کا وکیل مرزا امجد بیگ اس لیگل نوٹس کے ذریعے آپ کو متنبہ کرتا ہوں کہ اس نوٹس کی ترسیل کے بعد عرصہ دس یوم کے اندر میرے موکل کی رقم مبلغ اسی ہزار روپے، ہرافت کے ساتھ اسے واپس کر دیں۔ یہ صورت دیگر آپ کے خلاف قانونی چارہ جوئی کی جائے گی۔“

اس نوٹس کے اندر بعض خالصتاً قانونی نوعیت کی ٹیکنیکل باتیں بھی شامل تھیں جن کا ذکر آپ کو پور کرنے کے مترادف ہوگا لہذا ہم چپکے سے آگے بڑھتے ہیں۔

اس نوٹس کو پوسٹ کیے پانچ یا چھ دن ہوئے تھے کہ ایک بار میں محض میرے دفتر میں داخل ہوا۔ اس کی عمر پچاس کے آس پاس رہی ہوگی۔ چہرہ سرخ و سپید، ڈاڑھی درمیانے سائز کی اور شب و بچور کی طرح سیاہ۔ ڈاڑھی کے بالوں کا رنگ سر کے بالوں سے مماثلت نہیں رکھتا تھا۔ ڈاڑھی کی ایک دم سیاہ رنگت کو دیکھتے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ اس نے کوئی عملی درجے کا خطاب (ہیز ڈرائی) استعمال کر رکھا تھا۔ لباس سفید اور کلف وارتھا۔ اس کے اوپر سیاہ واسٹ اور پاؤں میں پشاور چپل تھی۔ اس کی شخصیت مجموعی طور پر خاصی پُرکشش اور متاثر کن تھی۔ اس نے ہاتھ میں ایک عالی شان، قیمتی بریف کیس بھی اٹھا رکھا تھا۔

میں نے حسب معمول پیشہ وارانہ مسکراہٹ سے اس کا استقبال کیا اور اسے بیٹھنے کے لیے کہا۔ وہ گہری سنجیدگی کے ساتھ ایک کرسی کھینچ کر میرے سامنے بیٹھ گیا۔ میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

”جی فرمائیے..... میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“

”غالباً.....“ وہ سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”مرزا امجد بیگ آپ ہی ہیں؟“

”غالباً نہیں.....“ میں نے ترکی برتری جواب دیا۔ ”یقیناً میں ہی مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ ہوں۔“

اس نے اپنا بریف کیس کھولا اور اس میں سے ایک لفافہ نکال کر میری جانب بڑھاتا ہوا متعجب ہوا۔ ”یہ نوٹس آپ ہی کے دفتر سے ارسال کیا گیا ہے نا؟“

یہ وہی لفافہ تھا جو میں نے چند روز قبل بڑے شاہ جی کے نام پوسٹ کر دیا تھا۔ گویا اس وقت قربان شاہ فراڈ یا بہ نفس غلیظ میرے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔

سیدنا زکریاؑ

میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”شاہ بلڈرز کے مالک آپ ہی ہیں؟“

وہ تھوک لگتے ہوئے بولا۔ ”جی، اب تو اس کا مالک

میں ہی ہوں۔“

”گو یا پہلے اس کمپنی کا مالک کوئی اور شخص تھا۔“ میں

نے غیر محسوس انداز میں چٹکی لیتے ہوئے کہا۔ ”آپ نے یہ

کمپنی اس شخص سے خرید لی ہے۔“

”جی، ایسی کوئی بات نہیں۔“ وہ ناپندیدہ نظر سے مجھے

دیکھتے ہوئے بولا۔ ”پہلے یہ پارٹنرشپ برنس تھا۔ میرا چھوٹا

بھائی اس کاروبار میں میرا پارٹنر تھا۔ اب میں بلا شرکت غیرے

اکلا ہی ”شاہ بلڈرز“ کا مالک ہوں اور.....“ وہ لمبے بھر کے لیے

متوقف ہوا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”اور یہ بات آپ کو بھی معلوم ہے وکیل صاحب!“

”ہمیں، آپ کو اور ہم سب کو بہت سی باتیں معلوم ہوتی

ہیں لیکن عدالت کے علم میں لانے کے لیے، انہیں دہرانا پڑتا

ہے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”کیا آپ معزز

عدالت کو بتانا پسند کریں گے کہ آپ کی اپنے چھوٹے بھائی سے

کاروباری علیحدگی کیسے ہوئی مطلب..... آپ اس برنس کے

اکھوتے مالک کیسے بن گئے؟“

”علحدگی نہیں ہوئی بلکہ وہ مجھے دھوکا دے کر کہیں غائب

ہو گیا تھا۔“ وہ برا سامنے بٹاتے ہوئے بولا۔ اس کے چہرے

کے تاثرات سے مصنوعی یں جھلکتا تھا۔ ”اس نامعقول انسان

کی وجہ سے میں نے بہت نقصان اٹھایا ہے۔“

میں نے اپنے مخصوص انداز میں اسے گھسنے کی کوشش

کرتے ہوئے کہا۔ ”میں نے سنا ہے، آپ کا چھوٹا بھائی

ایک بھاری رقم بھی ساتھ لے گیا ہے؟“

”جی، آپ نے بالکل درست سنا ہے۔“ وہ اثبات

میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”اس مالی نقصان کی وجہ سے

پروڈیکٹ کی تکمیل میں بھی تاخیر ہوئی جس کے سبب ”ڈائنمنڈ

پلازا“ کی تعمیر کے اخراجات کئی گنا بڑھ گئے تھے۔“

”چھوٹے شاہ جی آپ کو کتنے کی ڈر دے گئے

ہیں؟“ میں نے سرسری انداز میں پوچھا۔

”بچپن سے تیس لاکھ کی۔“ اس نے جواب دیا۔

”جب کوئی پارٹنرشپ برنس کیا جاتا ہے تو کمپنی کے

نام سے اکاؤنٹ بھی کھولا جاتا ہے۔“ میں نے جرح کے

سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ اکاؤنٹ جوائنٹ ہوتا

ہے۔ شاہ جی! کیا آپ نے ”شاہ بلڈرز“ کا ایسا کوئی

اکاؤنٹ کسی بینک میں کھول رکھا تھا؟“

”ظاہر ہے، یہ تو بہت ضروری تھا۔“ اس نے میرے

جال میں قدم رکھ دیا۔

”شاہ بلڈرز کی ساری رقم یقیناً اسی اکاؤنٹ میں جمع

رہتی ہوں گی؟“ میں نے استفسار کیا۔

”جی بالکل۔“ اس نے سرکوا شکاری جنبش دی۔

”جوائنٹ اکاؤنٹ کے اصول کے مطابق جب بینک

تمام فریق کسی چیک پر دستخط نہ کریں، بینک اس چیک کو

کیش نہیں کر سکتا۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ”آپ کا

چھوٹا بھائی فرقان شاہ آپ کے علم میں لائے بغیر پچیس تیس

لاکھ ایسی خفیہ رقم کس طرح کمپنی کے اکاؤنٹ سے نکال کر

فرار ہو گیا۔ کیا آپ نے اتنی ہیوی اماؤنٹ کے کسی چیک پر

دستخط کیے تھے؟“

”نہیں!“ اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ”اس نے

میرے اعتماد کا خون کیا ہے۔“

”کیا مطلب؟“ میں نے پوچھا۔

”چھوٹا بھائی ہونے کے ناتے میں فرقان شاہ پر

اندھا اعتماد کرتا تھا۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

”بینک چیکس پر دستخط کر کے چیک بک اس کے حوالے کر

رکھی تھی۔ اسے جب، جتنے پیسوں کی ضرورت ہوتی، اپنے

دستخط کر کے وہ مطلب رقم بینک سے نکلوا لیا کرتا تھا اور بعد

میں مجھے بتا دیا کرتا تھا۔ سال ہا سال سے اسی طرح کام چل

رہا تھا۔ کبھی ایک پیسے کی ادائیج نہیں ہوتی مگر کسی نے بالکل

ٹھیک کہا ہے کہ.....“ لچائی تو قوت کر کے اس نے گہری

سائنس کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”کہ انسان کی نیت بدلتے دیر نہیں لگتی۔ میں فرقان

شاہ پر بھروسہ کرتا رہا اور وہ مجھے دھوکا دے کر فرار ہو گیا۔“

”شاہ جی! میں آپ کے غم میں برابر کا شریک

ہوں۔“ میں نے مصنوعی ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”پچیس تیس لاکھ کوئی معمولی رقم نہیں ہوتی۔ آپ نے

چھوٹے شاہ جی کو تلاش کرنے کی کوشش تو کی ہوگی؟“

”میں جہاں جہاں تلاش کر سکتا تھا، میں نے ڈھونڈ لیا

مگر وہ کہیں نہیں ملا۔“ وہ مایوسی سے گردن ہلاتے ہوئے

بولا۔ ”مجھے شک ہے کہ وہ ملک سے باہر چلا گیا ہے۔“

”کیا آپ معزز عدالت کو یہ بتانا پسند کریں گے کہ

”شاہ بلڈرز“ کا اکاؤنٹ کس بینک کی کس برانچ میں تھا؟“

میں نے اپنے ناپندیدہ جال کو سمیٹتے ہوئے پوچھا۔

وکیل صفائی شاہ جی کی مدد کو لپکا۔ ”جناب عالی!

زیر سماعت کیس کا ”شاہ بلڈرز“ کے بینک اکاؤنٹ سے براہ

راست کوئی تعلق نہیں ہے۔ وکیل استغاثہ ایک غیر متعلق

سوال کر رہے ہیں۔“

جج نے نگاہ اٹھا کر میری جانب دیکھا اور کہا۔ ”آپ

کیا کہتے ہیں بیگ صاحب اس سلسلے میں؟“

”یور آئرا! میں وکیل صفائی کی اس بات سے متفق

ہوں کہ ”شاہ بلڈرز“ کا اکاؤنٹ کا زیر سماعت کیس سے

براہ راست کوئی تعلق نہیں۔“ میں نے نہایت ہی ٹھہرے

ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اس کا مطلب یہ ہوا کہ بلا واسطہ تعلق

موجود ہے لہذا میرا سوال غیر متعلق نہیں ہو سکتا اور ویسے

بھی..... میں نے یہ سوال کسی اور مقصد کی خاطر پوچھا تھا۔“

”کس مقصد کی خاطر؟“ وکیل صفائی نے چونک کر

میری طرف دیکھا۔

”آپ کے موکل کے جھوٹ کو پکڑنے کے لیے!“

میں نے ساپ آواز میں کہا۔

”آئی کیویشن یور آئرا! وکیل صفائی حیر آواز میں بولا۔

”وکیل استغاثہ میرے موکل کے ساتھ زیادتی کر رہے

ہیں۔ وہ میرے موکل کو دروغ گو کہہ کر سنگین جرم کا ارتکاب

کر رہے ہیں۔“

”بیگ صاحب! آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں؟“ جج نے

مجھ سے پوچھا۔

”جناب عالی!“ میں نے نہایت ہی مودبانہ انداز

میں کہا۔ ”پہلی بات تو یہ کہ شاہ جی کی دروغ گوئی کے

حوالے سے کوئی الزام نہیں لگایا۔ مجھے اس بات کا یقین

ہے کہ یہ جھوٹے، دھوکے باز، عیار اور مکار درجہ اول ہیں۔

اگر یہ میری باتوں کی تردید کرتے ہیں تو خود کو سچا ثابت

کرنے کے لیے انہیں معزز عدالت کے سامنے چند شواہد

پیش کرنا ہوں گے۔“

”شٹا! کس قسم کے شواہد؟“ وکیل صفائی نے مجھ سے پوچھا۔

”نمبروں..... انہیں معزز عدالت کو بتانا ہوگا کہ ”شاہ

بلڈرز“ کا اکاؤنٹ کس بینک کی کون سی برانچ میں تھا۔“ میں

نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اس کے ساتھ ہی وہ چیک

بک بھی عدالت میں پیش کرنا ہوگی جس کی مدد سے چھوٹا شاہ

پچیس تیس لاکھ کا فراڈ کر کے فرار ہو گیا اور مجھے یقین ہے کہ

شاہ جی کی بھی قیمت پر ایسا نہیں کر پائیں گے۔“

”وہ چیک بک تو..... فرقان شاہ اپنے..... ساتھ ہی

لے گیا تھا۔“ وہ شکستہ لہجے میں بولا۔ ”اسے..... عدالت میں

پیش کرنا ممکن نہیں ہے۔“

”اوکے.....!“ میں نے معتدل انداز میں کہا۔

”چیک بک کے سلسلے میں عدالت آپ کو مجبور نہیں کرے گی

مگر عدالت یہ ماننے کو تیار نہیں ہوگی کہ چھوٹا شاہ کوئی

”عصرت من الجن“ تھا جو بینک کی اس برانچ کو بھی اپنے

ساتھ اٹھا لے گیا جس میں ”شاہ بلڈرز“ کا اکاؤنٹ تھا۔ یہ

چونکہ ممکن نہیں ہے لہذا بڑے شاہ جی اس بات کے پابند ہیں

کہ عدالت کو اس بینک کا نام بتائیں اور آئندہ پچیس پر وہ

بیلنس شیٹ بھی اس بینک سے نکلوا کر عدالت میں پیش کریں

جس میں اس چیک کا اندراج ہو جس کی مدد سے چھوٹے شاہ

نے کمپنی کے اکاؤنٹ سے پچیس تیس لاکھ نکال لیے تھے۔

یہی نہیں..... میں نے لچائی تو قوت کر کے ایک طویل سانس

لی پھر جج کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

”جناب عالی! معزز عدالت سے میری استدعا ہے

کہ شاہ جی کو اس بات کا بھی پابند کیا جائے کہ آئندہ پچیس پر یہ

اس ”پارٹنرشپ برنس“ کے لیگل ڈاؤنٹیشن بھی عدالت میں

پیش کریں جن کی بنا پر یہ دونوں بھائی اس برنس میں ایک

دوسرے کے پارٹنر تھے۔“

”ہمارا برنس اعتماد اور بھروسے پر چل رہا تھا۔“ شاہ

جی نے سیانا گواہنے کی کوشش کی۔ ”ہم نے آپس میں ایسا

کوئی پارٹنرشپ برنس سائن نہیں کیا تھا اور نہ ہی ایسے لیگل

ڈاؤنٹیشن تیار کیے تھے۔“

میں مکانی انداز میں جھکا اور ایک طرف کو گھوم کر شاہ

جی کے پاؤں کو دیکھتے ہوئے سرسری ہوئی آواز میں پوچھا۔

”شاہ جی! آپ کے پاؤں کہاں ہیں؟“

”کیا مطلب ہے آپ کا؟“ وہ برہمی سے پاؤں

پٹختے ہوئے بولا۔ ”میرے پاؤں میرے ساتھ ہیں۔“

وکیل صفائی نے کہا۔ ”یہ کیا مذاق ہے؟“

”جناب عالی!“ میں جج کی جانب متوجہ ہوتے

ہوئے بولا۔ ”ہم بچپن سے پڑھتے اور سنتے آئے ہیں کہ

”جھوٹ کے پاؤں کہاں؟“ میں بھی یہی دیکھ رہا تھا کہ شاہ

جی کے پاؤں کہاں ہیں۔ انہوں نے تو دروغ گوئی کی انتہا

کردی ہے۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی بینک کسی کمپنی کا

جوائنٹ اکاؤنٹ آئینہیں بند کر کے کھول دے۔ ایسے

اکاؤنٹ کھولنے کے لیے کمپنی کے لیگل ڈاؤنٹیشن اور پارٹنر

شپ برنس کی دستاویزات اکاؤنٹ کے فارم کے ساتھ

مشک کرنا لازمی ہوتی ہیں اور..... شاہ جی فرما رہے ہیں کہ

ان بھائیوں کا برنس ”اللہ توکل“ چل رہا تھا۔ مذاق کی بھی

کوئی حد ہوتی ہے اور وہ بھی معزز عدالت کے سامنے.....“

جج نے غور کر کر فرماں شاہ کی طرف دیکھا اور خشکی آمیز

لجے میں کہا۔ ”مشر شاہ! یہ عدالت آپ کو اس بات کا پابند کرتی ہے کہ آپ آئندہ پیشی پر پانڈرشپ برٹس کے لیگل ڈاکو میٹس اور بینک کا اس دور کا بینک اسٹنٹ منٹ عدالت میں پیش کر سں جب مذکورہ بینک سے بچیں تیس لاکھ ایسی خطیر رقم نکالی گئی تھی۔ جب آپ بینک اسٹنٹ منٹ پیش کر دیں گے تو پھر خود ہی یہ بات سامنے آجائے گی کہ ”شاہ بلڈرز“ کا اکاؤنٹ کس بینک کی کون سی برانچ میں تھا۔“

عدالت کے ان احکامات پر شاہ جی کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ اس موقع پر اس کے پاس کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ امداد طلب نظر سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ وکیل صفائی فوراً اس کی دست گیری کو لپکا۔ وہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

”میرے فاضل دوست! آپ اپنے موکل کو بھول کر غیر متعلقہ باتوں میں الجھ کر رہ گئے ہیں اور آپ کو یہ بھی یاد نہیں رہا کہ اس وقت عدالت میں کون سے کیس کی سماعت ہو رہی ہے۔“

”سبلی!“ میں نے اس کی چوٹ کو طنزی کی زبان میں جوتے کی نوک پر مارتے ہوئے کہا۔ ”واقعی آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں مجھے اپنے موکل کے مفادات کی نگرانی کرتے ہوئے اس کے حقوق کی جنگ لڑنا چاہیے۔“ پھر میں کٹہرے میں کھڑے بڑے شاہ جی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”شاہ جی! میرے موکل سے آپ کی کیا دشمنی ہے؟“ میں نے جیسے انداز میں سوال کیا۔

وہ گڑبڑا گیا اور جلدی سے بولا۔ ”میری تو کسی سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔“

”آپ نے مختلف تعمیراتی ہیکٹروں کو آزما کر اس غریب کے مبلغ اتنی ہزار روپے ہڑپ کر لیے ہیں۔“ میں نے تیز آواز میں بولنا شروع کیا۔ ”اُسے جو فلیٹ الاٹ کیا گیا تھا وہ دھوکا دہی سے آپ نے کامران نامی کسی پولیس والے کے ہاتھ ہینکے داسوں فروخت کر دیا۔ میری معلومات کے مطابق مذکورہ فلیٹ آپ نے کامران سے ڈیڑھ لاکھ وصول کرنے کے بعد اس کے نام کیا ہے۔ آپ نے یہ ظلم کیوں کیا۔۔۔ کیوں؟“

شاہ جی کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ وکیل صفائی حق نمک ادا کرتے ہوئے بولا۔ ”شاہ جی نے کسی پر کوئی ظلم نہیں کیا۔ ہر معاہدے کے کچھ قواعد وضوابط ہوتے ہیں، ان کی پاس داری لازمی ہوتی ہے۔ شاہ جی نے خلاف اصول کوئی عمل نہیں کیا۔“

”آپ کن قواعد وضوابط کی بات کر رہے ہیں؟“ میں نے سہا آواز میں استفسار کیا۔

”جن کی بنا پر آپ کا موکل خالد نیازی اس فلیٹ کی الاٹمنٹ کے سلسلے میں ڈیفالٹر ہو گیا تھا لہذا مذکورہ فلیٹ کسی بھی قیمت پر اسے الاٹ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ شاید آپ نے ایگریمنٹ کی پشت پر درج قواعد وضوابط کا مطالعہ نہیں کیا۔“

آخری جملہ اس نے زہر میں بچھے ہوئے الفاظ میں ادا کیا تھا۔ میں نے بھی اسی انداز میں جواب دیا۔ ”جی ہاں، میں نے سبکی فائنگ گلاس کی مدد سے دو شرائط نامہ یہ غور پڑھا ہے کیونکہ اس گلاس کے بغیر کوئی ”سکس بائی سکس“ نگاہ والا شخص بھی اس میں تحریر نہیں پڑھ سکتا۔“

”تو پھر آپ کو پتا چل گیا ہوگا کہ رقم کی ادائیگی کے دوران میں آپ کا موکل چار مرتبہ ڈیفالٹر ہو گیا تھا۔“ وہ فخریہ لہجے میں بولا۔ ”دو مرتبہ ماہانہ اقساط کے سلسلے میں، تیسری مرتبہ شش ماہی قسط کے سلسلے میں اور چوتھی مرتبہ آخری بڑی پے منٹ کے سلسلے میں۔۔۔۔۔ اس صورت حال میں اگر شاہ جی نے آپ کے موکل کا فلیٹ کینسل کر کے کسی اور شخص کے ہاتھ فروخت کر دیا ہے تو وہ حق بہ جانب ہیں۔“

”اپنے موکل کی طرح آپ بھی غلط بیانی کے ماہر نظر آتے ہیں میرے فاضل دوست۔“ میں نے ترش لہجے میں کہا۔ ”میرا موکل چار بار نہیں، صرف دو بار ڈیفالٹر ہوا تھا اور آفس کے عملے نے اس پر اسے چھوٹ دے دی تھی۔“

”یہ بات آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ وہ صرف دو بار ڈیفالٹر ہوا تھا؟“ وکیل صفائی نے طنزیہ انداز میں کہا۔

”انہی قواعد وضوابط کو پڑھنے کے بعد جن کو سبکی فائنگ گلاس کے بغیر سمجھنا ممکن نہیں۔“ میں نے بڑی رمان سے جواب دیا۔ ”شرط نمبر ایک کے مطابق اگر ماہانہ قسط مسلسل دو ماہ تک ادانہ کی گئی تو فلیٹ کی بکنگ خود یہ خود کینسل ہو جائے گی۔ میرا موکل صرف دو بار ماہانہ قسط کے سلسلے میں لیٹ ہوا۔ ایک بار دس دن اور دوسری مرتبہ بارہ دن لہذا اس شرط کے مطابق وہ ڈیفالٹر نہیں کہلائے گا البتہ شش ماہی قسط اور آخری بڑی قسط کے سلسلے میں وہ ڈیفالٹر ہو گیا تھا تاہم اس سلسلے میں جب اس نے متعلقہ عملے سے بات کی تو ان کا کہنا یہ تھا کہ معنی یہ ہے قواعد وضوابط پھڑے باز قسم کے لوگوں کو قاتل کرنے کے لیے رکھے ہوئے ہیں۔ آپ جیسے شریف لوگوں پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا لہذا آپ بالکل بے فکر ہیں۔ یہ فلیٹ آپ ہی کو الاٹ ہوگا۔“

”اول تو عملے کا کوئی شخص ایسی احقانہ بات کر نہیں سکتا۔“ وکیل صفائی نے کہا۔ ”اگر ایسا ہوا بھی تو آپ کا موکل اسے ثابت نہیں کر سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ خالد نیازی کمپنی کے قواعد وضوابط کی رو سے ڈیفالٹر ہو چکا تھا لہذا شاہ جی نے وہ فلیٹ کینسل کر کے کسی اور شخص کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ اللہ اللہ خیر سلا!“

”یوں آپ کے کہہ دینے سے“ اللہ اللہ، خیر سلا“ نہیں ہو جاتا میرے فاضل دوست!“ میں نے مستحکم انداز میں کہا۔ ”آپ نے قواعد وضوابط کی روشنی میں جو حقیقت بیان کی ہے، وہ ادھوری ہے۔“

”ادھوری ہے۔۔۔ کیا مطلب؟“ وہ الجھن زدہ نظر سے مجھ دیکھنے لگا۔

”مطلب یہ کہ جن قواعد وضوابط کی بنیاد پر آپ میرے موکل کو ڈیفالٹر قرار دے رہے ہیں انہی میں یہ بھی درج ہے کہ ڈیفالٹر شخص کی ادا کی ہوئی رقم پروجیکٹ کی تکمیل پر اسے واپس کر دی جائے گی۔ میرا موکل شاہ جی کے فراڈ کے کڑوے گھونٹ پی کر اس بات کے لیے بھی راضی تھا کہ اب تو پروجیکٹ مکمل ہو چکا۔ اگر شاہ جی اس کے اتنی ہزار ہی واپس کر دیں تو وہ خوش ہو جائے گا مگر شاہ جی تو ایک بانی ادا کرنے کو تیار نہیں ہیں۔۔۔۔۔“ میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس خارج کی پھر جج کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

”جناب عالی! میں نے ایک لیگل ٹوٹس کے ذریعے اس معاملے کو اپنے آفس ہی میں منتقل کرنے کی کوشش کی تھی مگر شاہ جی اس بات کے لیے راضی نہیں ہوئے بلکہ انہوں نے مجھے رشوت دینے کی کوشش بھی کی تھی تاکہ میں اس کیس سے الگ ہو جاؤں۔“

”میں نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی۔“ شاہ جی احتجاجی لہجے میں بولا۔ ”آپ مجھ پر الزام لگا رہے ہیں۔“

”یہ الزام اس وقت حقیقت بن جائے گا جب آئندہ پیشی پر میں اس گفتگو کا ثبوت پیش کروں گا جو اس روز ہمارے بیچ ہوئی تھی۔“ میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔

”آپ بہت بد معاش ہیں وکیل صاحب!“ وہ نفرت آمیز نظر سے مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ ”میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آپ اس دن والی باتوں کو ریکارڈ کر لیں گے۔ بہت بچ حرکت کی ہے آپ نے۔۔۔۔۔ بچ بچ!“

”میں نے کوئی گری ہوئی حرکت کی ہے یا علی، اس

بات کی اب کوئی اہمیت نہیں رہی۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”آپ کے ردعمل نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ آپ نے اس روز مجھے رشوت کی پیشکش کر کے اس کیس سے الگ رہنے کی درخواست کی تھی۔ اب آئندہ پیشی پر مجھے کوئی ٹھوس ثبوت پیش کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔۔۔۔۔“

”میں آپ کو چھوڑوں گا نہیں۔“ وہ تھملا کر بولا۔

”پوائنٹ از ٹو بی نوٹڈ۔۔۔!“ میں نے روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے احتجاجی لہجے میں کہا۔ ”یور آنرا! شاہ جی مجھے دھمکی دے رہے ہیں۔“

جج نے کڑے الفاظ میں قربان شاہ کو سرزنش کی اور وکیل صفائی کو ہدایات دیں کہ وہ آئندہ پیشی پر اپنے موکل کی طرف سے بینک اور برٹس کے حوالے سے وہ تمام دستاویزات عدالت میں پیش کرے جن کا تھوڑی دیر پہلے ذکر کیا گیا ہے۔

اس کے بعد عدالت کا مقررہ وقت ختم ہو گیا۔ جج نے دس روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخواست کرنے کا اعلان کر دیا۔

”دی کورٹ از ایڈ جرنلڈ۔۔۔۔۔!“

☆☆☆

اگلی پیشی پر شاہ جی عدالت میں حاضر ہوا تو کافی ٹوٹا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ گزشتہ پیشی پر میں نے عدالت کی نظر میں اسے جھوٹا ثابت کر دیا تھا۔ اگر وہ خود کو سچا ثابت کرنے کے لیے وہ تمام دستاویزاتی ثبوت فراہم کر دیتا جن کے بارے میں عدالت نے پہلی پیشی پر اسے ہدایت کی تھی تو شاید کوئی بات بن جاتی مگر چونکہ وہ ایسا کر ہی نہیں سکتا تھا لہذا آج اس کا چہرہ اترا ہوا نظر آ رہا تھا۔ میں نے اس موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ کیسٹ عدالت میں پیش کر دیا جس میں، میں نے اپنی اور بڑے شاہ کی گفتگو ریکارڈ کر لی تھی۔ یہ گفتگو اس کے مجرم ہونے کا تین ثبوت تھی۔

اگرچہ ایک لحاظ سے یہ ایک غیر اخلاقی حرکت تھی لیکن اخلاقیات کا مظاہرہ صرف وہاں مناسب رہتا ہے جہاں آپ کے سامنے کوئی شریف انٹس انسان موجود ہو۔ بڑے شاہ جیسے حیثیت لوگوں سے منمنے کے لیے اس نوعیت کے ہیکٹروے آزمانا بالکل جائز ہوتا ہے۔ جب کبھی سیدی انگلی سے نکل رہا ہو تو پھر انگلی کو نیزہ کار کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہوتا۔

پچھلی پیشی پر جج نے وکیل صفائی کو جو ہدایات دی تھیں جب ان کی تعمیل نہیں ہوئی تو جج نے برہمی کا اظہار

کرتے ہوئے بڑے شاہ اور اس کے وکیل کو کھری کھری سنا ڈالیں۔ وکیل صفائی نے وعدہ کیا کہ وہ آئندہ پیشی پر عدالت کے احکامات کی تعمیل کرنے کی کوشش کرے گا۔

”جناب عالی!“ میں نے روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے کراری آواز میں کہا۔ ”مذکورہ دستاویزات اگر بغرض محال عدالت میں پیش کر دی گئیں تو بھی اس سے شاہ جی کے جرم کی تصدیق کم نہیں ہوگی۔ یہ محض اتنا ثابت کر سکیں گے کہ چھوٹے بھائی کے ساتھ ان کا کوئی پارٹنر شپ بزنس تھا اور وہ بھائی ان کے مطلب، کمپنی کے چھپس، بیس لاکھ لے کر فرو چکر ہو چکا ہے۔ اگرچہ یہ ثابت کرنا بھی ممکن نہیں لیکن اگر ایسا ہو بھی جاتا ہے تو یہ میرے موکل کے کسی کام نہیں آئے گا۔ میرے موکل کو اس کا حق ملنا چاہیے۔“

”آپ کیا کہنا چاہتے ہیں وکیل صاحب۔“ جج نے مجھ سے استفسار کیا۔ ”واضح الفاظ میں وضاحت کریں۔“

”یور آزا!“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میرے موکل کی فائل سے ثابت ہوتا ہے کہ اس نے ”شاہ بلڈرز“ کو چھوٹی بڑی اقساط کی شکل میں کل اسی ہزار روپے کی ادائیگی کی ہے جس کے بدلے اسے ”ڈائنمڈ پلازا“ کا قلیٹ نمبر تین سو تین مل جانا چاہیے تھا مگر اس وقت وہ قلیٹ کا مہران نامی ایک شخص کی ملکیت ہے کیونکہ شاہ جی کے مطابق میرا موکل ڈی فاکٹر ہو گیا تھا لہذا اس نے مذکورہ قلیٹ کنسل کر کے کامران کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ اگر ان تمام معاملات کو حصد فیصد درست بھی مان لیا جائے تو بھی میں نے لٹائی توقف کر کے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”تو بھی میرا موکل اپنے اسی ہزار روپے واپس لینے کا حق رکھتا ہے کیونکہ اسکی الائی کے ڈیفالٹر ہوجانے کی صورت میں قواعد و ضوابط کے مطابق کمپنی اس شخص کی ادا کی ہوئی رقم پروڈیکٹ کی تکمیل کے فوراً بعد ادا کرنے کی پابند ہے۔ مذکورہ پروڈیکٹ نہ صرف مکمل ہو چکا بلکہ اکثر مالکان اب اس میں رہائش پذیر بھی ہیں۔ معزز عدالت سے میری بس اتنی سی استدعا ہے کہ میرے موکل کو اس کا جائز حق دلا دیا جائے۔ ویش آل یور آزا۔“

جج نے میری طرف دیکھ کر گردن کو اٹھائی جنبش دی پھر اس فائل کے ورق اٹھنے لگا جس کے مطابق میرے موکل خالد نیازی نے ”شاہ بلڈرز“ کو اسی ہزار روپے ادا کیے تھے۔ فائل کے مطالعے کے بعد اس نے غصیلے انداز میں شاہ جی کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

”مشر شاہ! کیا آپ اس بات سے انکار کرتے ہیں کہ خالد نیازی نے آپ کی کمپنی ”شاہ بلڈرز“ کو ڈائنمڈ پلازا کے قلیٹ نمبر تین سو تین کی بجائے کے سلسلے میں اسی ہزار روپے ادا کیے ہیں؟“

”جناب! یہ ڈی فاکٹر ہو گیا تھا اور وہ قلیٹ میں نے۔۔۔۔۔!“

”عدالت نے جو سوال کیا ہے اس کا جواب دیں۔“ بڑے شاہ کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی جج نے اسے بری طرح ڈانٹ دیا۔ ”خالد نیازی نے آپ کی کمپنی کو اسی ہزار روپے دیے تھے یا نہیں۔۔۔۔۔؟“

”جی۔۔۔۔۔ جی۔۔۔۔۔ دیے تھے۔۔۔۔۔“ اسے اقرار کرتے ہی بی بی کیونکہ دور دور تک فرار کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔

”آپ خالد نیازی کی رقم کب واپس کر رہے ہیں؟“ جج نے مخصوص لہجے میں استفسار کیا۔

”جناب! ابھی تو میری مالی پوزیشن ٹھیک نہیں ہے۔“ وہ عذر لنگ پیش کرتے ہوئے بولا۔ ”اور میں بیمار بھی ہوں۔“ فرقان شاہ کے فراڈ نے مجھے تو چھوڑ کر رکھ دیا ہے۔

”یور آزا! شاہ جی جھوٹ اور غلط بیانی کا عالمی ریکارڈ قائم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔“ میں نے تیز آواز میں کہا۔ ”میں یہ ثابت کر سکتا ہوں کہ نہ تو ان کی مالی حالت اتنی تیلی ہے کہ یہ اسی ہزار ادا کر سکیں اور نہ ہی انہیں کوئی بیماری شیماری ہے۔ میری معلومات کے مطابق یہ بٹے کئے ہیں اور ابھی کچھ ہی عرصہ پہلے شاہ جی چار پانچ ملکوں کا دورہ بھی فرما کر آئے ہیں۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں شاہ جی۔۔۔۔۔؟“

آخری جملہ میں نے قربان شاہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ادا کیا تھا۔ وہ جڑ بڑ ہو کر رہ گیا تاہم ہونٹوں سے ایک لفظ ادا نہیں کیا۔

”آپ یہ سب کس طرح ثابت کر سکتے ہیں وکیل صاحب؟“ جج نے سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”جناب عالی! اگر معزز عدالت اپنے خصوصی اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے ”شاہ بلڈرز“ اور قربان شاہ کے بینک اکاؤنٹس چیک کر دے تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ ان اکاؤنٹس میں لاکھوں روپے موجود ہیں۔“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”باقی شاہ جی کی صحت کا پول میں ابھی کھول دیتا ہوں۔“

بات مکمل کرنے کے بعد میں جج کی اجازت سے

قربان شاہ والے کٹہرے کی جانب بڑھ گیا پھر اس کے چہرے پر نظر گڑتے ہوئے سوال کیا۔

”شاہ جی! کیا یہ درست ہے کہ چند ماہ پہلے آپ جج ادا کرنے سعودی عرب تشریف لے گئے تھے؟“

”جی ہاں، یہ درست ہے!“ اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

”اور آپ کی واپسی کوئی لگ بھگ چار ماہ بعد ہوئی تھی؟“

”جی، ساڑھے چار ماہ بعد۔“ اس نے جواب دیا۔

”جج کا فریضہ ادا کرنے میں اتنا زیادہ عرصہ نہیں لگتا۔“ میں نے چھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”آپ اس دوران میں اور کیا کیا کرتے رہے تھے؟“

”میں فریضہ جج ادا کرنے کے بعد سعودیہ سے ایران، عراق اور شام چلا گیا تھا۔“ اس نے بتایا۔ ”مقامات مقدسہ کی زیارت کرنے۔“

”ماشا اللہ!“ میں نے سناش انداز میں کہا مگر اس سناش کے اندر بڑی چھین چھی۔ ”یہ تو بڑے اعزاز کی بات ہے لیکن۔۔۔۔۔“ میں نے دانستہ بات ادھوری چھوڑ کر ایک گہری سانس خارج کی اور کہا۔ ”لیکن مجھے لگتا ہے، آپ یہاں بھی غلط بیانی سے کام لے رہے ہیں۔“

”کیا مطلب ہے، آپ کا؟“ وہ چونکا انداز میں مجھے دیکھتا رہا۔

”گھبراہٹ نہیں شاہ جی۔“ میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میرا مطلب یہ تھا کہ آپ سعودی عرب سے شام، عراق اور پھر ایران گئے ہوں گے۔۔۔۔۔ ہیں نا؟“

”اوہ۔۔۔۔۔!“ اس نے اطمینان کی سانس لی۔ ”ایک ہی بات ہے۔۔۔۔۔ ہاں، آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“

”یقیناً یہ سفر آپ نے پاپیورٹ اور ان ممالک کے ویزا کے بغیر تو نہیں کیا ہوگا۔“ میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

”جی۔۔۔۔۔ جی ہاں۔۔۔۔۔“ وہ جلدی سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

”شاہ جی!“ میں نے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ”کیا آپ خود کو سچا ثابت کرنے کے لیے وہ پاپیورٹ عدالت میں پیش کر سکتے ہیں جس پر سعودی عرب، شام، عراق اور ایران کے ویزا لگے ہوئے ہوں؟“

”کر دوں گا، اگر ضرورت پیش آئی تو۔“ وہ سرسری انداز میں بولا پھر پریشان نظر سے اپنے وکیل کی جانب

دیکھنے لگا۔

اس سے پہلے کہ وکیل صفائی اس کی مدد کو لیتا، میں نے جارحانہ لہجے میں کہا۔ ”شاہ جی! آپ ایسا نہیں کر سکیں گے۔۔۔۔۔ کبھی نہیں کر سکیں گے کیونکہ۔۔۔۔۔ آپ ان ممالک گئے ہی نہیں۔۔۔۔۔ آپ نے محض ان معصوم اور مظلوم الائیہ سے چھیننے کے لیے یہ ڈھونگ رچایا تھا جن کی قوم ہم کے بیٹے ہیں اور ان میں سے بیشتر کے قلیٹس آپ نے منگے داموں دوسری پارٹیوں کو فروخت کر دیے ہیں۔ جھوٹ کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے ان کے دماغ میں جھوٹ کی فیکٹری لگی ہوئی ہے۔۔۔۔۔؟“

وہ شکل سے برسوں کا تھکا ہوا دکھائی دینے لگا۔ میں نے اسی برس نہیں کی اور تیر لہجے میں دریافت کیا۔ ”اس نام نہاد دورے کے بعد جب آپ واپس اپنے ملک تشریف لائے تو پھر بیمار پڑ گئے تھے تاکہ مزید کچھ عرصے تک لوگوں کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“

”آپ بالکل غلط کہہ رہے ہیں۔“ وہ نیم احتجاجی لہجے میں بولا۔ ”پاکستان واپسی پر میں شدید بیمار پڑ گیا تھا۔ ایک ہفتے سے زیادہ تو میں ایک پرائیویٹ اسپتال میں داخل رہ کر علاج کراتا رہا ہوں۔“

”اس پرائیویٹ اسپتال کا نام بتائیں جس میں آپ زیر علاج رہے تھے۔“ میں نے جارحانہ انداز میں کہا۔

”اور یہ بھی بتائیں کہ آپ کو کون سی بیماری لاحق تھی، آپ کون کون سی ادویہ استعمال کرتے رہے ہیں؟“

”میں یہ سب آپ کو بتانا ضروری نہیں سمجھتا۔“ وہ روٹھی ہوئی بیوی کے سے انداز میں بولا۔

”مجھے نہ بتائیں، معزز عدالت کو بتادیں۔“ میں نے سادگی سے کہا۔ ”عدالت خود آپ کے بیان کا آپریشن کرالے گی، پھر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائے گا۔“

وہ آہیں، ہائیں، شائیں کرنے لگا۔

جج نے دیوار گیر کلاک پر نگاہ ڈالی۔ عدالت کا مقررہ وقت ختم ہونے میں دس منٹ باقی تھے۔ جج نے قربان شاہ کو اس بات کا پابند کیا کہ آئندہ پیشی پر وہ مذکورہ پاپیورٹ کو عدالت میں پیش کرے گا اور اس کے ساتھ ہی اس کی بیماری اور پرائیویٹ اسپتال کا نام بھی پوچھ لیا۔

شاہ جی نے ”نہ پائے رشت، نہ جائے ماندن“ کی سی کیفیت میں، جان چھڑانے کے لیے ایک پرائیویٹ اسپتال کا نام بتا دیا۔

قلورا کی پرسکون اور آراستہ خواب گاہ میں بیٹھ ہوئے دفعتاً فلپ پر یہ حیرت انگیز انکشاف ہوا کہ وہ نہایت مطمئن اور خوش ہے۔ اس کی عمر چالیس سال سے تجاوز کر چکی تھی، یہ ایک ایسی عمر ہے جو عام طور پر ذمہ داریوں اور...

چارہ گر

عبدالقیوم شاد

انسان اکثر بہت چالاک بننے کی خوش فہمی میں مبتلا ہو کر انتہائی احمقانہ قدم اٹھا لیتا ہے مگر... اس کا ادراک اس وقت ہوتا ہے جب اس کی عقلمندی کا جنازہ رسوائی کے کاندھوں پر اٹھتا ہے۔ زیر نظر تحریر میں بھی وہی پتہ ہوا ہے کتنے جن پر اس نے سر رکھا تھا۔ یہ حماقت اس سے کیسے سبز ہو گئی... اس نے اپنی باقی ماندہ زندگی بس یہی سراغ لگاتے گزار دی۔

ایک بے نسل و مرام کی فریب

نظر کا دلچسپ تماشا



کمال شرافت کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔ ”مگر آپ بھی مجھ سے ایک وعدہ کریں!“
بات کے اختتام پر اس نے امید بھری نظر سے نگاہ دیکھا۔ میں نے روکے کچھ نہیں کہا۔
”شاہ جی! میں آپ سے کوئی وعدہ کرنے کا پابند نہیں ہوں لیکن پھر بھی آپ بولیں... کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟“
اس نے کہا۔ ”آپ وعدہ کریں کہ ”ڈائمنڈ پلازا“ کے سلسلے میں اور کسی کا کیس نہیں لیں گے!“
”اوہ... تو یہ بات ہے۔“ میں نے سرسراہٹ ہوئی آواز میں کہا۔ ”وعدہ تو نہیں مگر میں آپ کی درخواست پر غور ضرور کروں گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور شکر گزاری کے انداز میں بولا۔ ”اب عدالت ہی میں ملاقات ہوگی۔“
”اور آپ خالی ہاتھ عدالت نہیں آئیں گے۔“ میں نے یاد دہانی کرانے والے انداز میں کہا۔ ”اس پیشی پر آپ نے میرے موکل کا حساب صاف کرنا ہے۔“
”جی جی... بالکل۔“ وہ جلدی سے بولا پھر مجھ سے گرم جوش مصافحہ کر کے رخصت ہو گیا۔ کچھ بات تو یہ ہے کہ میرا ایسا کوئی ارادہ بھی نہیں تھا کہ میں ڈھونڈ ڈھانڈ کر ”ڈائمنڈ پلازا“ کے کیس پکڑنے کی مہم میں لگ جاؤں۔ میں نے اپنی اننگی محض کئی نکالنے کی غرض سے میزبانی کی تھی اور میرا یہ حربہ صد فیصد کامیاب رہا تھا۔

آئندہ پیشی پر عدالت نے میرے موکل کے حق میں فیصلہ سنا دیا۔ اپنی صفائی میں کسی بھی قسم کا ثبوت پیش نہ کر کے شاہ جی نے خود کو ڈیفالٹر ثابت کر دیا تھا چنانچہ اسی روز مختلف عدالتی خانہ پڑی کے بعد میرے موکل خالد نیازی کو اس کے ڈوبے ہوئے اسی ہزار روپے حاصل ہو گئے۔
اس روز خالد نیازی بہت خوش تھا۔ اس نے میرا شکر یہ ادا کیا اور ڈیروں و دعا میں دینے کے بعد میرے دفتر سے رخصت ہو گیا۔

کسی نے بالکل ٹھیک کہا ہے۔ ”گروش ایام بڑی ظالم شے ہے۔ یہ بادشاہ کو گداگر اور گداگر کو بادشاہ بنا دیتی ہے۔ وقت کے دھارے سے ہمیشہ بچ کر رہنا چاہیے۔ یہ کسی کے ساتھ رعایت نہیں کرتا۔ جو بھی اس کے سامنے آتا ہے، اسے کاٹ کر رکھ دیتا ہے۔“
خدا ہم سب کو شاہ جی جیسے فراڈ لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے... آمین!

(تحریر: حسام بٹ)

”جناب عالی! یہ شخص سکہ بند دروغ گو ہے اور جھوٹ پر جھوٹ بولے جا رہا ہے۔“ میں نے جج کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس کے پاس اپنی باتوں کو ثابت کرنے کے لیے ایک بھی ثبوت نہیں ہے اور میں تو اب کچھ اور ہی سوچ رہا ہوں۔“
میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو شاہ جی بے چینی سے بول اٹھا۔ ”آپ کیا سوچ رہے ہیں؟“
میں نے اس کے سوال کا جواب دینا ضروری نہ جانا اور یہ دستور روئے سخن جج کی جانب رکھا۔ جج نے پوچھا۔ ”وکیل صاحب! آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟“
”جناب عالی! خالد نیازی کی طرح کے تین چار اور بھی متاثرین میرے دفتر کے چکر لگا رہے ہیں۔“ میں نے گہری تنجیدگی سے کہا۔ ”شاہ بلڈرز نے ان کے ساتھ بھی وہی ”ہاتھ“ کیا ہے جو میرے موکل خالد نیازی کے ساتھ ہوا ہے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ ان کے کیس بھی پکڑ لوں۔ اس طرح ان اے چاروں کی ڈوبی ہوئی رقم بھی مل جائے گی۔“
میری بات سن کر شاہ جی کی ٹانگوں سے جان نکل گئی اور وہ کنبہ بے کسارہا لیتے ہوئے تحیف سی آواز میں بولا۔
”پپ... بانی...“
اس کے ساتھ ہی عدالت کا وقت ختم ہو گیا۔

☆☆☆

ہمارا کیس بہت واضح تھا۔ میں نے عدالت کی نظر میں شاہ جی کو ہزار روپے سے جھوٹا اور دغا باز ثابت کر دیا تھا۔ اس نے اپنی صفائی میں کوئی بھی ثبوت نہ پیش کر کے اپنے تاہوت میں آخری میل ٹھونک دی تھی۔ گزشتہ پیشی پر میں نے جو ”تین چار اور کلانتس“ والی بات کی تھی اس میں کوئی حقیقت نہیں تھی۔ یہ ایک نفسیاتی حربہ تھا جو خاصا کارگر ثابت ہوا تھا۔ شاہ جی میرے سامنے کھٹے ٹھیکے پر مجبور ہو گیا تھا۔
اگلی پیشی سے پہلے وہ مجھ سے ملنے دفتر آیا اور درخواست آمیز لہجے میں بولا۔ ”بیگ صاحب! میں خالد نیازی کے اسی ہزار روپے ادا کرنے کو تیار ہوں۔ آپ اس کیس کو ادھر ہی ختم کر دیں۔“
”اب وقت بہت آگے بڑھ چکا ہے شاہ جی۔“ میں نے سناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”کیس عدالت میں ہے، فیصلہ بھی عدالت ہی کرے گی۔ آپ آئندہ پیشی پر میرے موکل کے اسی ہزار روپے لے کر عدالت میں پہنچ جائیں، کیس اسی روز ختم ہو جائے گا۔“
”ٹھیک ہے، میں آپ کی بات مان لیتا ہوں۔“ وہ

کہیں آپ کو اعصابی کمزوری تو نہیں؟

آجکل تو ہر انسان ذہنی تفکرات، ناقص غذاؤں بے صبری، بے احتیاطی اور بد پرہیزی کی وجہ سے اعصابی کمزوری کا شکار ہو چکا ہے۔ اعصابی طور پر کمزور لوگ تو ہمیشہ ندامت کی زندگی گزارتے ہیں۔ آپ کی اعصابی کمزوری ختم کرنے، بے پناہ اعصابی قوت دینے کیلئے دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں اور کستوری عطر زعفران سے ایک خاص قسم کا ہربلز اعصابی کورس مقوی اعصاب کورس کے نام سے تیار کیا ہے۔ اپنے ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کر کے لطف کو دو بالا کرنے کیلئے اور اپنے خاص لحاظ کو خوشگوار بنانے کے لئے آج ہی فون پر اپنی تمام علامات سے آگاہ کر کے گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک وی پی وی پی مقوی اعصاب کورس منگوائیں۔

المسلم دارالحکمت (جسٹڈ)

(دیسی طبی یونانی دواخانہ)
ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان

0300-6526061
0301-6690383

صبح 10 بجے سے رات 8 بجے تک

”ایسی کوئی بات نہیں ہوگی۔“ شوشار نے اعتماد کے ساتھ کہا۔ ”انہیں بھی اس بات کا پتا نہیں چلے گا کہ..... تمہاری بیوی کو قتل کیا گیا ہے۔ ہمارا طریقہ کار نہایت اطمینان بخش ہے۔“

”لیکن.....“

”سروس اتنا ہی کافی ہے۔“ شوشار نے ملاعت سے کہا۔ ”جب تم ہماری خدمات سے فائدہ اٹھانے کا پختہ ارادہ کر لو تو ہمارے دفتر میں آ جانا یا فون کر دینا تاکہ معاملے کے تمام پہلوؤں پر بات کی جاسکے۔“

شوشار دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ قلم چند لمحوں تک بند دروازے کو گھورتا رہا۔ ”نا قابل یقین، اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

کئی روز تک وہ تذبذب میں مبتلا رہا۔ شوشار کی پیشکش پر ظاہر بڑی پرکشش تھی۔ تھوڑے سے پیسے خرچ کر کے وہ اپنی جھگڑا لوبیوی سے چھٹکارا پاسکتا تھا، ناولوں اور کہانیوں میں تو اس نے ایسی بے شمار تفصیلات کے بارے میں پڑھا تھا لیکن اس وہم میں بھی نہیں تھا کہ عملی زندگی میں بھی ایسا ہو سکتا ہے۔ مسٹر شوشار کا پڑا اعتماد لہجہ خاصا اُمید افزا تھا۔

اُس نے نہایت محتاط انداز میں فلور سے اس معاملے کا ذکر کیا۔ اصل صورت حال کو پس پردہ رکھتے ہوئے یہ ظاہر کیا کہ معاملہ اس کے کسی دوست سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ اس بات پر خاصا سرور تھا کہ فلور اصلیت سے قطعی طور پر بے خبر ہے اور ہرگز یہ نہیں جانتی کہ وہ براہ راست اس معاملے سے تعلق رکھتی ہے، فلور کا شورہ بہت سیدھا سادا تھا۔

”میرے خیال میں تمہارے دوست کا تنظیم سے رابطہ قائم کرنے میں کوئی نقصان نہیں۔ اگر وہ واقعی اس کا مسئلہ حل کر سکتی ہے تو اسے ان کی خدمت حاصل کر لینی چاہیے۔ بشرطیکہ وہ ان کا معاوضہ ادا کر سکتا ہو۔“

ذاتی طور پر قلم کا بھی یہی خیال تھا، خاصی سوچ بچار کے بعد اس نے شوشار کو فون کیا اور ملاقات کے لیے وقت طے کر لیا۔

ان کا دفتر ایک پرانی وضع کی عمارت کے دسویں فلور پر واقع تھا۔ کمر نمبر 1012 کے دروازے پر پہنچ کر قلم نے ایک بار پھر تعارفی کارڈ پر نمبر دیکھا اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ کمر اتر بیا خالی تھا۔ وسط میں ایک بڑی سی میز پر بیٹھی تھی جس کے پیچھے مسٹر شوشار بیٹھا تھا۔

”تم نے جاسوسی کہانیوں میں خفیہ تنظیموں کا ذکر اکثر پڑھا ہوگا۔ ایسی تنظیمیں جو مقبول معاوضہ لے کر مخصوص افراد کو دیتا ہے غائب کر دیتے ہیں۔“

”قل! انڈیپنڈنٹ؟“ قلم نے کہا۔

”بہت بے دخلی تشبیہ ہے۔“ شوشار نے بھوین سیکڑ کر کہا۔ ”یہ تشبیہ کسی بوجہ خانے پر تو پوری اتر سکتی ہے، لیکن ہماری تنظیم پر نہیں۔ ہم نہایت جدید اصولوں کے مطابق کام کرتے ہیں۔ سیدھے سادے الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ ہم کسی بھی شخص کو صفحہ ہستی سے غائب کر دینے کی اہلیت رکھتے ہیں، طریقہ کار ایسا لوجواب ہے کہ دنیا کی کوئی پولیس سراغ نہیں لگا سکتی۔ پس آدمی غائب ہو جاتا ہے۔“

”نا قابل یقین.....؟“ قلم نے کہا۔

”کیا تم نے اخبارات میں ایسی خبریں نہیں پڑھیں؟“ شوشار نے کہا۔ ”دراصل میں نے ایک حیرت انگیز بات کو سیدھے سادے الفاظ میں پیش کر دیا ہے۔ اس لیے تمہیں تعجب ہوا ہے۔“

”لیکن.....“

”مجھے معلوم ہے۔“ شوشار نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”درحقیقت تم اتنا بڑا فیصلہ کرنے میں متاثر ہو۔ اگر اجازت ہو تو مجھے اپنے فیصلے سے آگاہ کر سکتے ہو، ہمارا دفتر صبح ساڑھے نو بجے سے پانچ بجے تک کھلا رہتا ہے۔“

اس نے جیب سے ایک پرس نکالا اور اس میں سے چھوٹا سا سفید تعارفی کارڈ نکال کر قلم کے سامنے رکھ دیا۔ پھر وہ اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔

”ایک منٹ۔“ قلم نے جلدی سے کہا۔ شوشار رک گیا اور مڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”تمہارا مطلب یہ ہے کہ..... کہ تم معاوضہ لے کر میری بیوی کو قتل کر سکتے ہو؟“

”ہیں؟“ شوشار نے حیرت سے آنکھیں پھیلانے ہوئے کہا۔ ”تمہیں غلطی ہوئی، مسٹر قلم! میں صرف سلازمین ہوں۔ اس ترقی یافتہ دور میں ہر کام ماہرین کے سپرد کرنا زیادہ بہتر ثابت ہوتا ہے۔ میں صرف سیل کے کام میں ماہر ہوں۔“

”اگر میری بیوی قتل ہوئی تو کیا یہ حقیقت نہیں کہ پولیس سب سے پہلے مجھ پر شک کرے گی۔“ قلم نے کہا۔

”اور اس طرح تمام راز کھل جائیں گے اور انہیں معلوم ہو جائے گا کہ میں نے تمہاری خدمات حاصل کی تھیں اور پھر.....“

”میں تمہیں جانتا ہوں۔“ پھر اس نے قلم کی میز پر رکھی ہوئی لائٹر سے میں راہ چھاڑتے ہوئے کہا۔ ”تاہم میں تمہیں ذاتی طور پر نہیں جانتا۔ تمہارے ساتھ میری واقفیت شخص کاروباری نوعیت کی ہے۔ میں بعض خانگی مشکلات میں تمہاری مدد کرتا چاہتا ہوں۔“ اس نے ایک آنکھ دبا کر کہا۔ ”تمہاری بیوی کے معاملے میں! میں ایک بہتر حل لے کر تمہارے پاس آیا ہوں۔“

”میری بیوی کا معاملہ قطعی طور پر نجی نوعیت کا ہے۔“ قلم نے سختی سے کہا۔

”اسی طرح مس فلور کا معاملہ بھی..... تمہیں کسی کے اندرونی معاملات میں دخل اندازی کا کوئی حق نہیں۔“

”شاید میں اپنا مقصد واضح نہیں کر سکا۔“ شوشار نے کہا۔ ”ہماری تنظیم کا مقصد ہی لوگوں کے خانگی مسائل حل کرنا ہے۔ اس سے قبل بے شمار افراد ہماری خدمت سے فیضاب ہو چکے ہیں۔ اب سکون کی زندگی گزار رہے ہیں۔ تمہارے پاس آنے کا مقصد بھی یہی ہے۔ میں تمہارے مسئلے کا بہتر حل لے کر آیا ہوں۔“

قلم کو اس کی باتوں میں تھوڑی تھوڑی دلچسپی پیدا ہو چکی تھی۔ ”میرے خیال میں میرے مسئلے کا کوئی حل نہیں۔“ قلم نے ہولے سے کہا۔

”پائلٹ ہے۔“ شوشار نے اعتماد کے ساتھ کہا۔

”ہم کسی ایسے کام میں ہاتھ نہیں ڈالتے جس میں ناکامی کا امکان ہو۔“

قلم آنکھیں جھپکاتے ہوئے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ ایک طویل وقفے تک خاموشی چھائی رہی۔ شوشار نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے مزید کہا۔

”مسٹر قلم! تم اکثر جاسوسی کہانیاں پڑھتے رہتے ہو؟“

”تمہیں کیسے معلوم ہوا؟“

”میں تمہاری بیوی کے بارے میں بھی جانتا ہوں۔“ شوشار نے کندھے پکاتے ہوئے کہا۔ ”اسی طرح مس فلور آرٹلڈ کے بارے میں بھی۔ یہ ہمارے شعبہ معلومات کا کمال ہے، ہماری تنظیم بجا طور پر اس شعبے پر فخر کرتی ہے۔“

”قلم نے حیرت سے آنکھیں پھیلانے ہوئے کہا۔

”شوشار نے فخریہ انداز میں سر کو تھوڑا سا مٹھ کر پھر اس نے نہایت احتیاط سے سگریٹ کا ٹکڑا ایش ٹرے میں سل دیا۔

”ہمارا تعلقات عامہ کا دفتر وقتاً فوقتاً تبدیل ہوتا رہتا ہے۔“ شوشار نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اس لیے ہم کسی قسم کی رہائش کا اہتمام نہیں کرتے، البتہ ہمارے پر کل آفس میں ہر قسم کی سہولتیں موجود ہیں۔ تاہم واضح وجوہات کی بنا پر ہم اپنے موکل کو پرسنل آفس کے بارے میں بتانا مناسب نہیں سمجھتے۔“

قلب خاموشی سے کرسی چھپکے کر بیٹھ گیا۔
”ویسے بھی ہم دوسروں کی توجہ کا مرکز بننا پسند نہیں کرتے۔“ شوشار نے مزید کہا۔ ”ہمارے کام کی نوعیت ہی کچھ اس قسم کی ہے۔“

”ظاہر ہے۔“ قلب نے بے خیالی میں کہا۔ پھر اس نے دل میں کہا۔ میں اس قسم کی پیش بندیوں کے بارے میں شاید اس سے زیادہ معلومات رکھتا ہوں۔ نامعلوم یہ شخص مجھے کیا سمجھ رہا ہے۔ ”میں تمہارے طریقہ کار کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔“

”محذرت چاہتا ہوں.....“ شوشار نے کہا۔ ”میں تمہیں طریقہ کار کی باریکیاں بتانے سے قاصر ہوں۔ یہ بات ہمارے کاروباری اصول کے خلاف ہے۔ ہم اپنے راز نہیں بتایا کرتے۔ امید ہے کہ تم میرا مطلب سمجھ گئے ہو گے۔“

”میں ایک انجانی بات پر کس طرح بھروسہ کر سکتا ہوں۔“

”تم پورے اعتماد کے ساتھ ہمارے اوپر بھروسہ کر سکتے ہو۔“ شوشار نے کہا۔ ”اگر تمہیں کسی قسم کی زحمت اٹھانی پڑی تو سب سے پہلے ہماری تنظیم بے نقاب ہو جائے گی۔ تمہارے مفاد کے علاوہ ہمارا مفاد ہی اسی بات میں ہے کہ کام پورے اطمینان بخش طریقے پر انجام پائے۔ ہمارے باہرین منصوبہ بناتے وقت ہر پہلو پر غور کر لیتے ہیں۔ بہر حال تم بالکل فکر نہ کرو۔“

”ٹھیک ہے۔“ قلب نے کہا۔ ”کیا تم اپنی گزشتہ کارکردگی کا کوئی حوالہ دے سکتے ہو؟“

”یہ بہت اچھا سوال کیا۔ میں خود بھی یہ بات کہنے والا تھا، شوشار نے کہا۔ ”مسز لسن کو جانئے ہو۔ مسٹر ایڈورڈ لسن کی بیوی.....“

”تمہارا مطلب ہے کہ؟“ شوشار نے معنی خیز انداز میں سر کو جنبش دی۔ ”لیکن اس کی موت تو بالکل طبعی طور پر واقع ہوئی تھی۔ ہارٹ ایکٹ کی وجہ سے!“
شوشار نے سر کو قدرے خم کرتے ہوئے کہا۔ ”یا

یوں کہہ سکتے ہیں کہ کارڈیوژنری رپورٹ کے مطابق اس کی موت ہارٹ ایکٹ سے ہوئی تھی، تاہم اسے اوپر پہنچانے کا سہرا ہمارے باہرین کے سر ہے۔ اب تمہیں یقین آگیا ہوگا کہ ہمارا طریقہ کار لا جواب اور شک و شبہ سے بالا ہے۔“
قلب نے ایک لمبا سانس لیا اور چند لمحوں تک خاموش بیٹھا سوچتا رہا۔

”پچھلی مرتبہ تم نے معاوضے کا ذکر کیا تھا۔“ بالآخر اس نے کہا۔ ”کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تمہارا معاوضہ کس قدر ہوگا؟“

شوشار بھوین سیکڑ کر میز کو گھورنے لگا۔ پھر اس نے سر اٹھا کر کہا۔
”معاوضہ ہر کیس میں مختلف ہوتا ہے۔ تمہارے معاملے میں دس ہزار ڈالر مناسب رہیں گے۔“

”دس ہزار ڈالر.....؟“ قلب نے آنکھیں پھیلاتے ہوئے کہا۔ ”ناممکن! انتہائی نامعقول! میں عملی طور پر اتنی بڑی رقم دینے کے قابل نہیں ہوں۔“
”یہ ہمارے شعبہ معلومات کا دوسرا کمال ہے۔“ شوشار نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔

”ہمارے پاس تمہارے سرمائے کا پورا ریکارڈ موجود ہے۔ ہمیں بہت اچھی طرح معلوم ہے کہ کئی الوقت تمہارے اکاؤنٹ میں کتنی رقم موجود ہے اور تم کتنا معاوضہ ادا کرنے کی اہلیت رکھتے ہو، تمہارے لیے دس ہزار ڈالر نہایت ہی معقول معاوضہ ہے۔“

قلب کچھ دیر تک سر جھکا کر سوچتا رہا۔
”اچھی بات ہے۔“ آخر کار اس نے سر اٹھا کر کہا۔ ”لیکن میں یہ رقم پیشگی نہیں دوں گا۔“

”بجائے ارشاد.....“ شوشار نے کہا۔ ”تنظیم کے ضوابط کے مطابق تمہیں پانچ ہزار ڈالر پیشگی اور پانچ ہزار ڈالر پیشگی تکمیل پر ادا کرنے ہوں گے۔“

”یہ بہت زیادہ ہے۔“ قلب نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔

”مجھے افسوس ہے۔“ شوشار نے کرسی پر ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ ”اس معاملے میں، میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ ذرا خیال رہے جاتے وقت دروازہ زور سے بند نہیں کرنا۔“

”لیکن.....“
”محذرت چاہتا ہوں، ہم سودے بازی نہیں کرتے۔“ شوشار نے سرد لہجے میں کہا۔

چند لمحوں تک کمرے میں خاموشی چھائی رہی۔ پھر قلب نے کہا۔ ”کیا آپ لوگ چیک بھی لے لیتے ہیں؟“
”صرف نقد!“ شوشار نے کہا۔ ”وجوہات بالکل واضح ہیں۔“

قدرے تامل کے بعد قلب نے پانچ پانچ سو ڈالر کے دس نوٹ جیب سے نکال کر میز پر رکھ دیے اور شوشار نے نہایت بے نیازی کے ساتھ انہیں اٹھا کر دراز میں ڈال دیا۔ اس کا لہجہ ایک بار پھر دوستانہ ہو گیا۔

”ہفتے کی شام جب تم گھر پہنچو گے تو تمہاری بیوی غائب ہو چکی ہوگی۔“

شوشار کے دفتر سے نکلنے کے بعد قلب عجیب سی خوشی محسوس کرنے لگا۔ اس نے سوچا، اب وہ فلورا کو ہمیشہ کے لیے اپنا نالے گا۔ ہفتے کی شام کو اس نے چند دوستوں کے ساتھ ایک بار میں شراب پی۔ وہاں سے نکلنے کے بعد دانستہ اپنی گاڑی غلط جگہ پر گھڑی کردی اور حسب توقع اس کا چالان ہو گیا۔ پھر اس نے کچھ خریداری کی۔ یہاں سے فارغ ہو کر سیدھے فلورا کے پاس پہنچ گیا۔ اسے امید تھی کہ اب تک اس کی بیوی ٹھکانے لگ چکی ہوگی۔ حسب معمول اسے دیکھ کر فلورا کے چہرے پر ایک دم رونق آگئی۔ اس نے قلب کی ہانپوں میں جموتے ہوئے کہا۔

”ادو ڈیز میں ابھی ابھی تمہارے بارے میں سوچ رہی تھی۔ تمہیں دیکھ کر میرا دل خوشی سے جھومنے لگتا ہے..... لیکن جب تم تہقویوں محسوس ہوتا ہے کہ میرے چاروں طرف تاریکی چھائی ہے۔“

”جان من اب ہمیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔“ قلب نے اس کے کال تھپ تھپاتے ہوئے کہا۔ ”چند دنوں کے بعد ہم ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے کے ہو جائیں گے۔“
فلورا حیرت اور مصحوبیت کے ساتھ اس کا منہ ٹکٹے لگی۔
”آج مجھے جلدی گھر پہنچنا ہے۔“ اس نے مزید کہا۔

”اس لیے اجازت چاہتا ہوں، کل پھر ملاقات ہوگی۔“
راستے بھر اس کا ذہن عجیب و غریب خیالات میں الجھا رہا۔ نامعلوم اس کی بیوی کی موت کس انداز میں ہوئی ہوگی۔ بہر حال یہ بہت ضروری بات تھی کہ اسے سخت حرمت اور افسوس کا اظہار کرنا چاہیے تاکہ کسی کو ذرا سماجی شہرہ نہ ہو۔ اس نے خود کو تسلی دیتے ہوئے کہا کہ یہ کوئی مشکل بات نہیں ہو پڑی عمدہ الیہ اداکاری کر سکتا ہے۔

چند منٹوں بعد وہ ہاتھوں میں خریداری کا سامان اٹھائے مکان میں داخل ہو رہا تھا۔ اس نے ہولے ہولے

سینٹی بجاتے ہوئے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ پتا نہیں محترمہ کہاں پڑی ہوگی؟ ہو سکتا ہے خواب گاہ میں ہو یا ڈرائنگ روم کے اندر کسی صوفے پر اوندھے منہ پڑی ہو۔ اس نے دروازے کو حسب معمول پر شور آواز کے ساتھ بند کر دیا اور سبق جلانے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

”قلب!“ وقتاً اس کے کانوں میں اپنی بیوی کی واضح آواز آئی۔ وہ اس غیر متوقع صورت حال سے بری طرح چونک گیا۔ تاہم اس نے جلد ہی اپنی حیرت پر قابو پایا اور سبق جلا کر اپنی بیوی کو گھورنے لگا۔ وہ ہمیشہ کی طرح تندرست و توانا اپنے بستر پر لیٹی تھی۔ اسے کل کر نہایت دور کی بات کسی نے آنکھ اٹھا کر بھی اس کی طرف نہیں دیکھا تھا۔

☆☆☆
ہین امریکن کا ٹرائی جیٹ ہوائی جہاز تیز رفتاری کے ساتھ ٹیویارک کی طرف بڑھ رہا تھا۔ شوشار نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے فلورا کی طرف دیکھا جو برابر والی سیٹ پر اطمینان کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔

”میرا خیال ہے کہ اب تک قلب گھر پہنچ چکا ہوگا۔“ شوشار نے کہا۔ ”اور پوری صورت حال سے آگاہ ہو چکا ہوگا۔“

”مجھے ڈر ہے کہ کہیں وہ پولیس کے پاس رپورٹ نہ درج کرادے!“ فلورائے کہا۔

”کس بات کی رپورٹ؟“ شوشار نے مطالبہ کیا۔
”اس بات کی رپورٹ کہ اس نے اپنی بیوی کو قتل کرانے کے لیے ایک شخص کو پانچ ہزار ڈالر دیئے تھے اور وہ قتل کے بغیر بھاگ گیا۔“

ناممکن! رپورٹ درج کرانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہمیں کسی قسم کا خطرہ نہیں۔ ویسے اگر اس کی بیوی کسی اتفاقی حادثے میں ہلاک ہو جاتی تو ہم مزید پانچ ہزار ڈالر کا مطالبہ کر سکتے تھے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ انسان کو قناعت پسندی سے کام لیتا چاہیے۔ زیادہ لاغ اچھا نہیں۔ بہر حال اب تو ہمارا آفس بھی بند ہو چکا ہے۔ خواہ مخواہ کے اخراجات کا بوجھ پڑ رہا تھا۔ مجھے تو ایک مہینے کا کرایہ بھی خاصا کھل رہا تھا۔ اب وہ کبھی ہماری شکل نہیں دیکھ سکے گا۔“

”تم واقعی لا جواب انسان ہو۔“ فلورائے کہا۔
”اصل کام تو تم نے کیا۔“ شوشار نے کہا۔ ”تمام ضروری معلومات مہیا کیں۔ آہ بے چارہ قلب، مجھے اُمید ہے کہ وہ اب بھی تمہاری یاد میں آجیں بھر رہا ہوگا۔“

مذہب شہر و سخن

محمد صفدر معاویہ..... خانیوال

ہزار جام لطف ہزار سے خانے
نگاہ یار کی لذت شرب کیا جانے

زابد چودھری..... چھوڑ کینٹ

بے کار خیالوں سے لپٹ کر نہیں دیکھا
جو کچھ بھی ہوا ہم نے پلٹ کر نہیں دیکھا
اس ڈر سے کہ نہ کٹ جائیں پیتائی کے ریشے
آنکھوں نے تیری راہ سے ہٹ کر نہیں دیکھا

عادل خان خٹک..... چارسدہ

خوشی میں بھی نکل آتے ہیں آنسو
ہر ایک آنسو ثبوتِ غم نہیں ہوتا



حماد اینڈ اعمار ملک..... سینٹرل جیل ساہیوال

زندگی جبرِ مسلسل کی طرح کافی ہے
جانے کس جرم کی پائی ہے سزا یاد نہیں

آبشار احمد..... سرگودھا

اک رونے سے تو مل جائے تو خدا کی قسم
اس دھرتی پہ ساون کی برسات لگا دوں

اعجاز احمد راجیل..... ساہیوال

بھول جاتے بننا ڈٹی چہرے
تم نے وہ سادگی نہیں دیکھی!

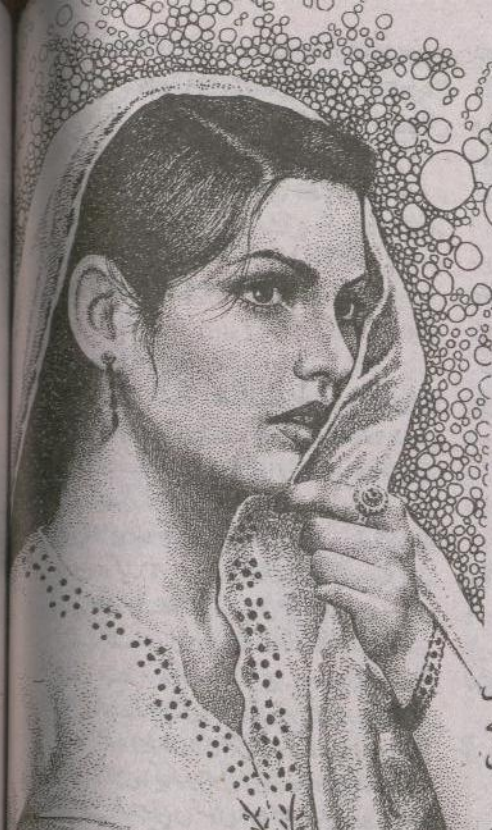
وہ اُجالا تھا میرے آنکھن میں
رات بھر تیرگی نہیں دیکھی

عائشہ اقبال..... کراچی

وہ کیسے لوگ تھے جنہوں نے پایا تجھ کو یارب
ہمیں تو ہو گیا اک شخص کا ملنا مشکل

اعجاز احمد تارڑ..... کوٹ قادر بخش

مل بھی جاتے ہیں تو کترا کے گزر جاتے ہیں
ہائے دوست موسم کی طرح بدل جاتے ہیں
وہ اپنی جفاؤں پہ بھی شرمندہ نہ ہوا
ہم سمجھتے رہے کہ پھر بھی پھل جاتے ہیں



محمد جاوید عباسی..... نیو سینٹرل جیل ملتان

اس کو چاہا بھی تو اٹھار نہ کرنا آیا
کٹ گئی عمر ہمیں بیار نہ کرنا آیا
اس نے مانگی تو فقط ہم سے جدائی مانگی
اور ہم تھے کہ ہمیں انکار نہ کرنا آیا

محمد عثمان انصاری..... نیو سینٹرل جیل ملتان

طوفان سے جو ڈر جائے وہ سمندر نہیں ہوتا
حالات سے جو گھبرائے وہ قلندر نہیں ہوتا
ہوتا ہے کوئی ایک ہی قسمت کا دھنی بھی
ہر کوئی مقدر کا سکندر نہیں ہوتا

طالب حسین طلحہ..... نیو سینٹرل جیل ملتان

وقت خود ہی بتائے گا کہ میں زندہ ہوں
کب وہ مرتا ہے جو زندہ رہے کردار کے ساتھ
آ میرے دوست ذرا دیکھ میں ہارا تو نہیں
میرا سر بھی تو پڑا ہے میری دستار کے ساتھ

ڈاکٹر انیس شیخ..... سرگودھا

وہ آج بھی صدیوں کی مسافت پر کھڑا ہے
ڈھونڈا تھا جسے وقت کی دیوار گرا کر

عاطف شاہین..... اردو سندیلپا ٹولی

وہ کب کا بھول چکا ہو گا یادوں کا قصہ
چیزوں کو کسی سے کسی کو کسی کا خیال کب رہتا ہے

بارون رشید..... کاٹنگ مراد

اب مگر کچھ بھی نہیں کچھ بھی نہیں ہو سکتا
اپنے جذبات سے رنگین شرارت نہ کرو
کتنی معصوم ہو، نازک ہو، حماقت نہ کرو
بارہا تم سے کہا تھا کہ محبت نہ کرو

محمد خواجہ..... کورنگی، کراچی

لفظ و معنی میں نہیں جلوہ و صورت میں نہیں
عشق ایک چیز ہے جو حرف و حکایت میں نہیں

انظہر حسین پچار..... ہزاری، ہتوتی

ایسر شہر میری جھوپڑی پہ طفر نہ کر
یہ تیرے طرف سے ہر حال میں بڑی ہوگی

افتخار حسین اعوان..... مظفر آباد آزاد کشمیر

آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں
تو ہائے گل پکار، میں پکاروں ہائے دل

مہرین ناز ڈوگر..... حیدر آباد

کتے اندھیروں کی راہ گزر پہ چراغ صبح جلا جلا کر
قسم ہے ہاتھیں بھی تھک گئی ہیں تمہارے آنسو چھپا چھپا کر
کیا خبر تھی کہ لڑک چہرے سے اتنے چہرے کشید ہو گئے
میں تھک گئی ہوں تمہارے چہرے کو اپنے میں چھپا چھپا کر

سوهاجی..... کراچی

میرے خوابوں کے گشتن میں خزانیں قفس کرتی ہیں
میرے ہونٹوں کی لرزش میں وہ فانی قفس کرتی ہیں
مجھے وہ لاکھ تڑپائے، مگر اس شخص کی خاطر
میرے دل کے اندھیرے میں دعائیں رقص کرتی ہیں

قاضی عرفان احمد عاجز، ندیم افضل..... آڑہ

وہ اس انداز کی مجھ سے محبت چاہتا ہے
میرے ہر خواب پر اپنی حکومت چاہتا ہے
وہ کہتا ہے میں اس کی ضرورت بن چکا ہوں
تو گویا وہ مجھے حسبِ ضرورت چاہتا ہے

حاجی خالد محمود خان..... سوہان اسلام آباد

سانسوں میں بھی شامل ہو لوہو میں بھی رواں ہو
لیکن میرے ہاتھوں کی کھیروں میں کہاں ہو

محمد قدرت اللہ نیازی..... حکیم ناؤن خانیوال

اس خوشی کا حساب کیسے ہو؟
تم جو پوچھو جنتاب کیسے ہو؟

شہیر ملک..... لاہور

نظر سے دور رہ کر بھی، یہ تیرا روبرو رہنا
میرے پاس رہنے کا سلیقہ کوئی تم سے سیکھے

حاجی محمد زاہد اقبال زرگر..... جی منڈی سکھیں

گھروں میں اپنے جو رہتے ہیں بے گھروں کی طرح
گزار دیتے ہیں عمریں قلندروں کی طرح

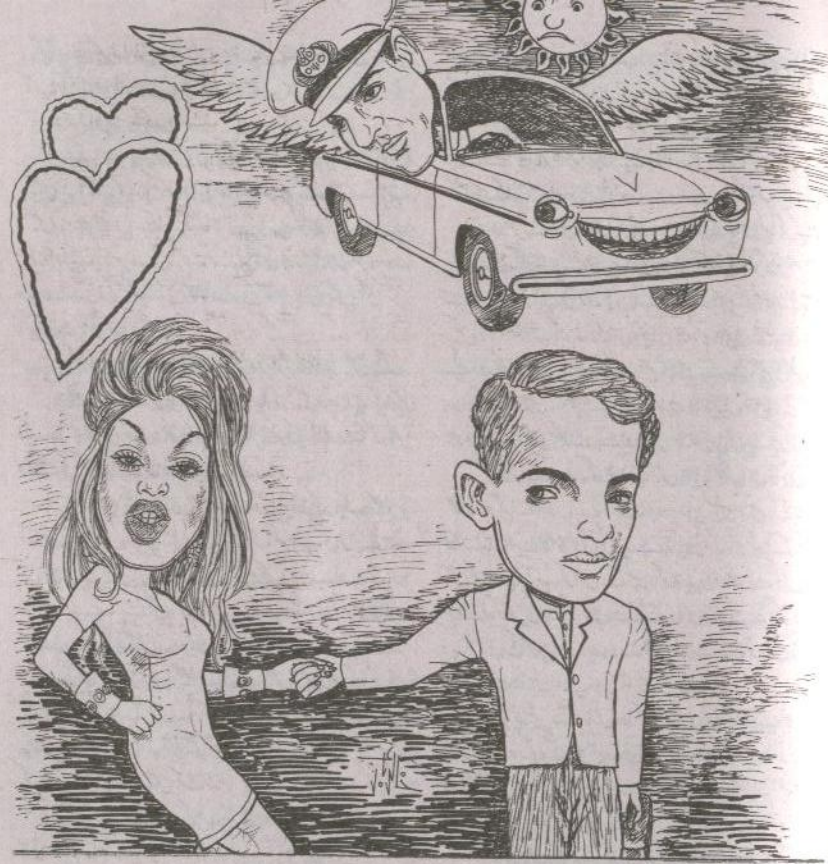
تم اپنا غم ہی میرے دل میں منتقل کر دو
سلوک کچھ تو کرو بندہ پوروں کی طرح

احمد حسن عرضی خان..... قبولہ شریف ہائی پاس

کیوں میں کروں یہ دعا کہ اسے میری عمر لگ جائے
ہو سکتا ہے آج آخری رات ہو میری زندگی کی

محمد امجد ریاض..... اقبال گرجہ چٹوٹی

اس کے رخسار پر ایک اشک کی آوارہ گردی
ہم نے یا قوت کے سینے پہ سمندر دیکھا



نشی الفیلہ

جس طرح لباس کے بدلنے سے صرف شخصیت میں تبدیلی آتی ہے لیکن روح وہی رہتی ہے بالکل اسی طرح پرانی کہانی کے کردار کے بدل جانے سے وہ کوئی نیا رخ اختیار ضرور کر لیتی ہے مگر پیغام میں کوئی تبدیلی نہیں آتی... زیر نظر تحریر بھی انہی جدتوں کے ساتھ حاضر ہے شاید کہ دے دل میں اتر جائے میری بات کے مصداق...

منظر امرا

پرانی تصویر میں نئے رنگوں کا عجیب امتزاج..... مصنف کی عہد حاضر پر گہری نظر

اردو ادب کا کلاسیک۔ جس میں ہزاروں چھوٹی بڑی دلچسپ کہانیاں ہیں۔ ان کہانیوں میں صرف حیرت اور دلچسپی کے پہلو نہیں ہیں بلکہ ان میں اخلاقی نصیحتیں بھی ہیں، جو ہر کہانی کے انجام پر سامنے آتی ہیں۔ ہم میں سے ہزاروں نے ان کہانیوں کو پڑھا ہوگا۔ ان کے ذہنوں کے گوشوں میں یہ کہانیاں دھندلی یادوں کی طرح محفوظ ہوں گی۔ میں نے الف لیلہ کی چند مختصر کہانیوں کو ماڈرنائز کرنے کی کوشش کی ہے لیکن اپنی کاوش سے پہلے بہتر ہے کہ

محمد اشفاق سیال..... شور کوٹ
لوگوں کو روشنی میرے کام سے ملی مگر
میں اپنی ذوات کے لیے بے نور ہو گیا
طاہرہ گزدار..... پشاور
میری طرف اٹھاتے رہے انگلیاں وہی
جو اپنی خامیوں کا احاطہ نہ کر سکے
حسب اللہ چٹانے..... انگلڈی کرک
بغیر اس کے اب آرام بھی نہیں آتا
وہ شخص جس کا مجھے نام بھی نہیں آتا
کروں گا کیا جو محبت میں ہو گیا ناکام
مجھے تو اور کوئی کام بھی نہیں آتا
نوشہ گزدار..... بھکر، سرانے مہاجر
اس کے نزدیک غم ترک و وفا کچھ بھی نہیں
مطمئن ایسا ہے وہ جیسے ہوا کچھ بھی نہیں
کل چھڑتا ہے تو پھر عہد وفا سوچ کے پاندھ
ابھی آغاز محبت ہے گیا کچھ بھی نہیں
طیب اسد..... ڈیرہ اسماعیل خان
راہوں پہ نظر رکھنا ہونٹوں پہ دعا رکھنا
آجائے کوئی شاید دروازہ کھلا رکھنا
احساس کی شمع کو کچھ اس طرح جلا رکھنا
اپنی بھی خبر رکھنا اس کا بھی پتا رکھنا
فیصل حسن برنس..... جھنگ
حرمت سب کوئے یار بھی لازم ہے
جسے ہو انا کا خیال محبت نہ کرے
منزہ بصیر..... کھاریاں
وابستہ ہو گئی تھیں کچھ امیدیں آپ سے
امیدوں کا چراغ بجانے کا شکریہ
راحیلہ رحمان..... پھالیہ، منڈی بہاؤ الدین
ماں تیرے بعد بتا کون لیوں سے اپنے
وقت رخصت میرے ماتھے پہ دعا لکھے گا
مرزا طاہر الدین..... میرپور خاص
بھاگ مسافر میرے وطن سے میرے چمن سے بھاگ
اوپر اوپر پھول کھلے ہیں سمیتر سمیتر آگ
رجیم سرور..... لاہور
پلٹ کے آئیں زمانے وہی محبت کے
کہ رنگ چلنے لگیں اور صبا ٹھہر جائے
عبدالغفور خان..... انک
ماتا کہ غم کے بعد مسرت ضرور ہے
لیکن جیسے گا کون تیری بے رخی کے بعد
سلیم کامریڈ..... کھاناں
حوادث سے اچھ کر مسکرانا میری فطرت ہے
مجھے ناکامیوں پہ اٹک برسانا نہیں آتا
احمد خان توحیدی..... اسٹیل ٹاؤن، کراچی
جو اک حرف کی حرمت نہ رکھ سکا محفوظ
میں اس کے ہاتھ میں ساری کتاب کیا دیتا
سیدہ مینا نقوی..... ملتان
چمچ کر مجھ سے اگرچہ اداس وہ بھی تھا
پتا چلا کہ زمانہ شناس وہ بھی تھا
میرے زوال سے پہلے ہی مجھ کو چھوڑ گیا
غضب کا ستارہ شناس وہ بھی تھا
ریاض بٹ..... حسن ابدال
قاتل نے کیا صفائی سے دھوئی ہے آستین
اس کو خبر نہیں کہ لہو بولتا بھی ہے
بشیر احمد بھٹی..... فوجی بستی، بہاولپور
مجھ سے وہ پوچھنے آیا ہے وفا کے معنی
یہ اس کی سادہ دلی مار نہ ڈالے مجھ کو
بلک ٹائیگر..... کرک تخت نصرتی
چھپ کے آتا ہے کوئی خواب چرانے میرے
پھول ہر شب کو چمکتے ہیں سرہانے میرے

محفل شعر و سخن

کوین
برائے
شمارہ
اپریل
2014

نام:

پتا:

وہ کہانیاں بھی سنا دی جائیں جو اہل لیلہ میں موجود ہیں تاکہ آپ کی یادداشت تازہ ہو سکے۔

کہانی نمبر ایک۔

ایک بار چند لومڑیاں کچھ کھانے کی چیز ڈھونڈ رہی تھیں کہ انہیں ایک مہربان اونٹ ملا۔ وہ کہنے لگیں۔ ”اب ہمیں بہت دنوں کے لیے کھانا مل گیا ہے لیکن ہمیں ڈر ہے کہ ہم ایک دوسرے پر ظلم نہ کرنے لگیں اور مضبوط کمزور کو نہ دبا لے۔“ (دیکھا! اس زمانے کی لومڑیوں میں بھی کتنی انسانیت پائی جاتی تھی)

انہوں نے کہا کہ ایسا ہوا تو کمزور ہلاک ہو جائیں گے۔ پھر ایک لومڑی نے مشورہ دیا کہ ہمیں چاہیے کہ ہم ایک حاکم تلاش کریں جو ہمارا حصہ بخرہ کر دیا کرے تاکہ پھر طاقتور کی کمزور کے خلاف کچھ نہ چلے۔

ان میں یہی صلاح مشورہ ہو رہا تھا کہ ایک بھیڑیا آپہنچا۔ لومڑیاں آپس میں کہنے لگیں کہ اگر سب کی رائے ہو تو اس بھیڑیے کو اپنا حاکم بنا لیں۔ کیونکہ وہ سب سے زیادہ طاقت ور ہے۔ پہلے بھی اس کا باپ ہمارا بادشاہ ہوا کرتا تھا اور ہم خدا سے امید رکھیں کہ وہ ہمارے درمیان انصاف کرے۔ یہ کہہ کر لومڑیاں بھیڑیے کے پاس گئیں اور کہا کہ ہم تجھے اپنا حاکم بناتے ہیں۔ تو ہم میں سے ہر ایک کو ضرورت کے مطابق دے تاکہ ہم میں سے زبردست کمزور پر ظلم نہ کرے اور ہم آپس میں کٹ نہ مریں۔

بھیڑیے نے منظور کر لیا اور اس دن کے لیے ان میں کافی حصہ تقسیم کر دیا۔

لیکن دوسرے دن وہ اپنے دل میں کہنے لگا۔ ”اگر میں اس اونٹ کو اسی طرح ان کمزوروں میں بانٹتا ہوں تو مجھے بھی انتہائی ملے گا جتنا کہ انہوں نے میرے لیے مقرر کر رکھا ہے۔ اگر میں اونٹ کو اسی لایلائی کھالوں تو وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکیں۔ کیونکہ وہ میرے اور میرے گھر والوں کے لیے ایسے ہی ہیں جیسے بھیڑ بکریاں۔ میں کیوں نے خود قبضہ کر لوں۔ غالباً خدا نے اپنی طرف سے بیعت میرے لیے بھیج دی ہے پھر میں ان کا احسان کیوں اٹھاؤں۔ بہتر ہے کہ میں اونٹ کو اپنے لیے مخصوص کر لوں اور ان کو کچھ نہ دوں۔“

صبح ہوئی تو لومڑیاں دستور کے مطابق بھیڑیے کے پاس اپنا حصہ لینے لگیں۔ بھیڑیے نے جواب دیا۔ ”جاؤ یہاں سے۔ میرے پاس نہیں دینے کے لیے کچھ باقی نہیں۔“ لومڑیاں پریشان ہو کر وہاں سے چل دیں اور کہنے لگیں۔ ”خدا نے ہمیں بڑی مصیبت میں مبتلا کر دیا۔ یہ

غیبت خائن خدا سے بھی نہیں ڈرتا اور ہم اس کا کچھ بگاڑ بھی نہیں سکتے۔“

ایک لومڑی بولی۔ ”ہوسکتا ہے کہ آج وہ بہت بھوکا ہو۔ اسے پیٹ بھر کر کھا لینے دو اور کل پھر اس کے پاس چلیں گے۔“

دوسرے دن لومڑیوں نے اس کے پاس جا کر کہا۔ ”ہم نہ تو تجھے اس لیے اپنے اوپر حاکم مقرر کیا تھا کہ تو ہم میں سے ہر ایک کو اس کی روزی دے، طاقت ور کے مقابلے میں کمزور کا انصاف کرے، جب یہ اونٹ ختم ہو جائے تو ہمارے لیے اور کھانا تلاش کرے اور ہم ہمیشہ کے لیے تیری فرماں بردار رہیں۔ ہم نے دو دن سے کچھ نہیں کھایا ہے۔ ہم بھوکے ہیں، ہمارا کھانا دے اور باقی کا جو تیری چاہے کر۔“ بھیڑیے نے کچھ جواب نہیں دیا۔ بلکہ اس کا دل اور سخت ہو گیا۔ انہوں نے اسے بہت سنا لیا لیکن اس نے نہ سنا تھا نہ سنا۔ اب لومڑیوں کی یہ رائے ہوئی کہ ہم شیر کے پاس چل کر اپنے آپ کو اس کے سپرد کر دیں اور اونٹ اس کے حوالے کر دیں۔ اگر اس نے ہمیں اس میں سے کچھ دے دیا تو اس کی مہربانی ہے، ورنہ اس غیبت سے تو وہی زیادہ سختی ہے۔

چنانچہ شیر کے پاس جا کر انہوں نے بھیڑیے کا سارا قصہ سنایا اور کہا کہ ہم تیرے غلام ہیں اور تجھ سے مدد لینے آئے ہیں، تو اس بھیڑیے سے ہماری جان چھڑا۔ ہم ہمیشہ تیرے فرماں بردار رہیں گے۔

لومڑیوں کی یہ باتیں سن کر شیر کی حیت جوش میں آگئی اور وہ ان کے ساتھ ہولیا۔ جوں ہی بھیڑیے کی نظر شیر پر پڑی۔ وہ بھاگ لیا لیکن شیر اس کے پیچھے دوڑا۔ پکڑ کر اس کی ٹکا بونی کر ڈالی اور لومڑیوں کا شکار ان کے حوالے کر دیا۔

یہی اہل لیلہ کی کہانی۔ اب ہماری کہانی کچھ یوں ہے۔ وہ چار بھائی تھے۔ عمران، نعمان، فرقان اور عدنان۔ ترتیب کے لحاظ سے عمران سب سے بڑا تھا، اس کے بعد بقیعہ تینوں تھے۔

ان کا باپ سلطان تھا، نام کا سلطان، دیے وہ ایک پیڑوں پپ پر کیشتر کی نوکری کیا کرتا۔ اس کی بیوی یعنی ان چاروں کی ماں کا انتقال ہو چکا تھا۔

سلطان بے چارہ محنت کر کے بوڑھا ہو چکا تھا۔ یہ سب دو کمروں کے ایک کوارٹر میں رہا کرتے تھے۔ بہت پریشان کرنے والی زندگی تھی ان کی۔ ایک دن وہ چاروں

موجود کر بیٹھ گئے۔

”عمران بھائی، ہمارا کیا بنے گا۔ کیا مستقبل ہے ہمارا؟“ نعمان نے پوچھا۔

”کچھ بھی نہیں۔“ عمران نے جواب دیا۔ ”سب سے بڑی پرالیم یہ ہے کہ بابا نے کچھ بھی نہیں کیا ہے۔ ساری زندگی کیشتر کی نوکری کر رہا ہے۔“

”ہم لوگ تو کیشتر بھی نہیں بن سکتے۔“ فرقان نے کہا۔ ”بھائیو! میرے ذہن میں ایک ترکیب ہے۔“ سب سے چھوٹا عدنان بولا۔ وہ اسی قسم کی جوڑو کر دیا کرتا تھا۔

”کیا ترکیب ہے؟“

”دیکھو، بابا پیڑوں پپ پر کیشتر ہے۔ شام کے وقت اس کے پاس پیڑوں روپے ہوتے ہیں، میں نے خود نوٹوں کی گڈیاں دیکھی ہیں۔“

”تو پھر اس سے کیا ہوا؟“

”کیوں نہ پیڑوں پپ پر ڈاکا ڈالا جائے۔“ عدنان نے اپنی ترکیب بتادی۔

”پاکل ہو گئے ہو۔“ ایک بھائی نے جھلک دیا۔ ”یہ کیسی ترکیب بتا رہے ہو۔ الٹا بے چارہ بابا مصیبت میں پھنس جائے گا اور وہی جیسے پیڑوں پپ والے ہم بھائیوں کو اچھی طرح پہچانتے ہیں۔“

”ہم سب نقاب پوش بن کر جائیں گے۔“

”نہیں، بے یے دھونی کی بات ہے۔“ عمران نے کہا۔

”کوئی اور ترکیب بتاؤ۔“

”اس کے بعد تو کسی بینک پر ڈاکارہ جاتا ہے۔“

”ہاں، یہ اچھا ہے۔“ نعمان نے تائید کی۔ ”مجھے بچپن سے بینک لوٹنے کا شوق ہے۔ میں اکثر خواب میں یہی دیکھتا ہوں۔“

”تو کیا خواب میں خود کو جیل جاتے ہوئے نہیں دیکھتے؟“ عمران نے پوچھا۔

”نہیں۔ جیل والا خواب بھائی عدنان دیکھتے ہیں۔“

”یہ سب بے کاری باتیں ہیں۔ دولت مند بننے کا کوئی اور طریقہ سوچو۔“

”پھر ایک اور طریقہ ہے۔“ عدنان نے کہا۔ ”وہ یہ ہے کہ ہم سب مل کر بابا کا انشورنس کروا دیتے ہیں۔ بابا کی موت کے بعد انشورنس کی رقم ہمیں مل جائے گی۔“

”ہاں یہ طریقہ ہے تو قانونی اور اس میں کوئی خطرہ بھی نہیں ہے لیکن مصیبت یہ ہے کہ بابا ابھی مرنے کے موڈ میں نہیں ہیں۔ ہر پختہ حکیم صاحب سے دوائی لے آتے ہیں،

صبح سویرے سیر کے لیے چلے جاتے ہیں۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ ہم سب نکل لیں گے اور بابا اپنی جگہ رہے گا۔“

”ہاں عمران بھائی، یہ تو ہے، پچھلے پختے بابا اپنی شادی کا پروگرام بھی بنا رہا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ دوسری شادی کروں تو زندگی بڑھ جائے گی۔ کیونکہ اس کے لیے اس عمر میں پہلی بیٹ کی بہت ضرورت ہے۔“

”تو پھر کیا کیا جائے؟“

”یہ ہو سکتا ہے کہ بابا کا انشورنس کرانے کے بعد ان سے ریکونٹ کی جائے کہ خدا کے لیے اپنی اولاد کی بھلائی کے لیے آپ انتقال فرما جائیں۔ لوگ تو اپنی اولادوں کے لیے کیا کیا نہیں کرتے۔ آپ اپنی جان بھی نہیں دے سکتے۔“

”بابا کا ماننا بہت مشکل ہے۔“

”ہم سب ایک وفد کی صورت میں ان سے مذاکرات کرتے ہیں۔“ عمران نے کہا۔ ”اس کے بعد سوچیں گے۔“

رات کے کھانے کے بعد وہ چاروں بابا کے گرد جمع ہو گئے۔

پروگرام کے مطابق عمران نے سلطان کا سردانا شروع کر دیا۔ نعمان اور عدنان اس کی ٹانگیں دبانے لگے جبکہ فرقان نے ہاتھ دبا شروع کر دیا۔

”کیا بات ہے، آج تو بڑی خوشامدیں ہو رہی ہیں۔“ سلطان نے پوچھا۔

”بابا تم پر پیارا رہا ہے ناں لیے۔“ عدنان نے کہا۔

”ایسا پیار پہلے کیوں نہیں آیا؟“

”آتا ہے بابا۔ لیکن تم تو مصروف رہتے ہونا۔ رات کو دیر سے آتے ہو۔ خدمت کا موقع نہیں ملتا۔ آج جلدی آگئے ہو اس لیے خدمت کر رہے ہیں۔“

”بابا۔ ایک بات تو بتاؤ۔ یہ انشورنس کیا ہوتا ہے۔“ عمران نے سرد باتے ہوئے پوچھا۔

”کیا اتم لوگوں کو نہیں معلوم؟“

”نہیں بابا۔ ہمیں دنیا کی کیا خبر! پیلیز، ذرا اس کے فائدے تو بتاؤ۔“

”اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ یہ بالکل ناجائز اور حرام چیز ہے، شریعت کے خلاف۔“

”بابا۔ کس شریعت کی بات کر رہے ہو۔ میں نے جہیں کبھی جمعہ کی نماز تک پڑھتے نہیں دیکھا۔“ ایک نے بلبلایا کہا۔

”اے وہ بات دوسری ہے۔ دل میں تو احترام ہے۔ نا۔“

”تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم اپنی اولادوں کا بھلا

نہیں چاہتے۔
 ”ابے، ایسا مت سمجھ، دیکھ لیتا میری موت کے بعد تم لوگ مال مال ہو جاؤ گے۔“
 ”وہ کس طرح ابا۔“ سب ہی سلطان کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔
 ”ابھی نہیں بتاؤں گا۔ بس جس وقت دم نکل رہا ہوگا۔ اس سے ایک گھنٹا پہلے بتا دوں گا۔“
 ”لیکن تمہیں کیسے پتا چلے گا کہ ایک گھنٹا کے بعد دم نکلے والا ہے؟“ عدنان نے پوچھا۔
 ”چل جاتا ہے پتا، اللہ والوں کو معلوم ہو جاتا ہے۔“
 چاروں بیٹے برا سامنہ بنا کر رہ گئے۔ ان کی یہ اسکیم بھی ناکام ہو گئی تھی۔ سلطان نے ان کی بات مذاق میں اڑا دی تھی۔

ایک رات وہ چاروں پھر ایک کمرے میں سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔

”بھائیو! یہ بابا تو ہم لوگوں کو مفلسی میں مارنا چاہتے ہیں۔“ فرقان نے کہا۔

”لیکن وہ بتا رہے تھے کہ ہم ان کی موت کے بعد مال مال ہو جائیں گے۔“

”یہ سب بہلاوے ہیں۔ ان کے پاس ہمیں مال مال کرنے کے لیے رکھا ہی کیا ہے۔“ عدنان منہ بنا کر بولا۔

”یہ تو ہے۔“

”ابھی ایک اور ترکیب میرے ذہن میں آرہی ہے۔“ عدنان نے اپنے بھائیوں کی طرف دیکھا۔

”چلو وہ بھی بتا دو۔“

”کیوں نہ ہم ابا کو کہیں بیچ دیں۔“

”بیچ دیں!“ سب ہی اچھل پڑے تھے۔ ”یہ کیا بکواس کر رہے ہو؟ کس کا دامخ خراب ہے جو ابا کو خریدے گا اور کیوں خریدے لگا؟“

”اور ابا کوئی صوفی تو ہیں نہیں کہ ہم نے اٹھا کر بیچ دیا اور وہ خاموشی سے بک گئے۔“

”سوال پھر وہی ہوتا ہے کہ آخر کوئی کیوں خریدے گا؟“

”میرے بھائیو، تم لوگوں نے اخباروں میں اس قسم کے اشتہار تو دیکھے ہوں گے کہ فلاں بے اولاد جوڑے کو ایک بچے کی ضرورت ہے جس کو وہ گود لے سکے۔“

”تو ابا کو کون گود لے گا؟“

”سنو تو، اسی طرح بعض خاندان ایسے ہوتے ہیں؟ جن میں کوئی بڑا بوجھ نہیں ہوتا۔ وہ چاہتے ہیں کہ گھر میں

کسی بزرگ کا سایا رہے، جس سے وہ دعائیں لیتے رہیں۔“
 ”اے تو ابا بزرگ کہاں ہیں۔“ عمران نے کہا۔
 ”اس گھر میں جا کر ہو جائیں گے۔ یہاں تو ہمارے سامنے چوتھے میں رہتے ہیں۔“
 ”یہ بالکل فالتو اسکیم ہے۔ کچھ اور سوچو۔“ عمران نے کہا۔

”چلو، کچھ دن کا موقع دو۔ کچھ اور سوچ لیتے ہیں۔“

اس رات سلطان نے کھانے کے بعد ان لوگوں کو ایک جگہ جمع کیا اور سستی خیر انداز میں بولا۔ ”دیکھو میرے بچو، مجھے یہ اندازہ ہو گیا ہے کہ تم سب میری موت کی خبر سننے کے لیے بے چین ہو رہے ہو۔“

”نہیں ابا۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ فرقان نے کہا۔

”اور اس کا ثبوت بھی ہے ہمارے پاس۔“

”اور وہ ثبوت کیا ہے؟“

”ثبوت یہ ہے کہ اولاد اس وقت اس قسم کے منصوبے بناتی ہے جب باپ کی موت کے بعد دولت ملنے کی امید ہو اور تمہارے پاس دھرا ہی کیا ہے، ابھی تو تم ہی ہم لوگوں کو پال رہے ہو۔ جاب کرتے ہو۔ اگر تم نہیں رہے تو ہم شاید بھیک مانگنے لگیں گے۔“

”نہیں میرے بچو، میں کنگال نہیں ہوں۔“ سلطان نے کہا۔

”میرے پاس پانچ کروڑ روپے ہیں، لیکن میں نے بھی تم لوگوں کو اس کی ہوائیں کتنے دی۔“

”کبھی بات کر رہے ہو ابا۔ کہاں سے آئے پانچ کروڑ؟“

”پانچ سال پہلے میں نے پچیس ہزار کا ایک بانڈ خریدا تھا۔ یہ اسی کا انعام ہے۔ میں نے وہ پیسے بینک میں جمع کرا دیے تھے اور آج تک بینک میں پڑے ہوئے ہیں۔“

”بیچ کہہ رہے ہو ابا۔“ وہ سب خوشی سے اچھل پڑے تھے۔

”ہاں میرے بچو بالکل سچ۔“ سلطان نے کہا۔ پھر فرقان سے مخاطب ہوا۔ ”جاؤ، میری الماری میں ایک چھوٹا سا بیگ ہے وہ لے آؤ۔“

فرقان جلدی سے اندر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد وہ بینک کے لیے ہوئے اندر آ گیا۔ سلطان نے اس میں سے بینک کی ایک سلپ نکال کر سب کے سامنے رکھ دی۔

اور اس سلپ کے مطابق سلطان نے واقعی پانچ کروڑ روپے بینک میں جمع کروائے تھے۔

”ابا۔“ فرقان نے سلطان کا ہاتھ تھام کر اسے چومنا شروع کر دیا۔

”بس۔ زیادہ خوشامد کی ضرورت نہیں۔“ سلطان نے کہا۔ ”میں اس طرح یہ رقم تم لوگوں کے حوالے نہیں کرنے والا۔“

”تو پھر کس طرح دیں گے ابا۔“ عمران نے پوچھا۔

”دیکھو بچو۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ یہ رقم تم چاروں میں ایمانداری اور انصاف کے ساتھ تقسیم کر دوں، لیکن میں جانتا ہوں کہ دولت بہت بری چیز ہے۔ اس کی وجہ سے رشتے ختم ہو جاتے ہیں۔ آپس میں خوں ریزی ہو جاتی ہے، طاقت ور کمزور کا حق مار لیتا ہے۔ کسی نہ کسی بہانے دوسرے کی رقم اپنے قبضے میں کر لیتا ہے۔“

”ابا تو پھر کیا چاہتے ہو؟“

”میں نے بین بھائی سے بات کر لی ہے۔“ سلطان نے بتایا۔

”میں ماموں۔“ سب چیخ اٹھے۔ ”ابا بین ماموں کیا کریں گے؟“

”بیٹا، ہمارے خاندان میں ایک ہی ایماندار آدمی ہے۔“ سلطان نے کہا۔ ”میں بھائی تم لوگوں کے درمیان مکمل انصاف کریں گے۔ ہر ایک کو اس کا حصہ برابر دے دیں گے۔“

”ابا اتنے جھنجٹ کی کیا ضرورت ہے؟“ فرقان نے کہا۔

”آپ تو زندہ ہیں نا۔ تو خود ہی کیوں نہیں تقسیم کر دیتے۔“

”نہیں بیٹا، یہ میرے بس سے باہر ہے۔“ سلطان دھیرے سے بولا۔ ”میں تم میں سے کسی کا نام نہیں لینا چاہتا۔ لیکن یہ سچ ہے کہ میں تم چاروں میں سے کسی دوسرے زیادہ محبت کرتا ہوں۔ نام اس لیے نہیں لے رہا کہ دوسرے دو ناراض ہو جائیں گے اور میں پھر چاروں کے درمیان انصاف نہیں کر سکوں گا۔“

”تو ابا۔ بین ماموں کون سا انصاف کر دیں گے۔“

”میں جانتا ہوں اس کو۔ وہ بہت ہی ایماندار اور انصاف پسند انسان ہے۔“ سلطان نے کہا۔

”چلیں۔ اگر آپ ایسا ہی سمجھتے ہیں تو بلا لیں بین ماموں کو۔“

سلطان نے بین کو بلوایا۔ وہ بھی شاید یہاں آنے کے لیے ادھار کھائے بیٹھا تھا۔ وہ ایک ادیب عمر انسان تھا جس نے اپنی زندگی پینک بازی اور کبوتر بازی میں گزار دی تھی۔

”ہاں بھئی، ایسی کون سی افتاد آن پڑی جو مجھ غریب کو بلوایا۔“ بین نے کہا۔ ”وہ تو بھی بھول کر بھی یاد نہیں کیا

ہوگا۔ لیکن جب پولیس پیچھے پڑی ہے تو بین یاد آ گئے۔“

”پولیس، کون سی پولیس؟“ سلطان نے حیرت ظاہر کی۔

”ارے سب سمجھتا ہوں میں، تم لوگوں کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ میرا انگلیو پٹا پولیس کا سپاہی ہے، اس لیے تم لوگوں پر جب آفت آئی تو مجھے بلایا۔“

”ارے نہیں بین بھائی۔“ سلطان نے کہا۔ ”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم پر کوئی آفت نہیں آئی ہے۔ سب خیر سے ہیں۔“

”حیرت ہے بھائی۔ تو پھر کیوں بلایا ہے؟“

”بین بھائی، ہم آپ کے ذریعے انصاف کروانا چاہتے ہیں۔“ سلطان نے بتایا۔ ”یہ بات میں جانتا ہوں کہ آپ میں انصاف کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔“

”ایسا ویسا۔“ بین نے اپنی گردن اٹھالی۔ ”دو دروڑ سے لوگ میرے پاس انصاف کے لیے آتے ہیں۔“

”اور آپ ایماندار بھی بہت ہیں۔“

”خیر۔ اس کا تو پوچھنا کیا ہے۔ جس جس کے کبوتر بھیک کر میری چھت پر آ جاتے ہیں، کتنی کر کے واپس کر دیتا ہوں۔ لیکن بات کیا ہے؟“

”بین بھائی، آپ کو میرے چاروں بیٹوں میں انصاف کرنا ہوگا۔ جس جس کو جو رقم بتاؤں گا۔ وہ رقم آپ ہر مہینے اس کو دے دیا کریں گے، نہ کم نہ زیادہ۔“

”ارے بھائی، دس پانچ ہزار ہوں گے، اس کے لیے اتنا جھنجٹ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ویسے ہی بانٹ دو۔“

”نہیں بین بھائی، پیسے کچھ زیادہ ہیں۔“

”آخر کتنے زیادہ؟“

”پانچ کروڑ۔“ سلطان نے بتایا۔

”بین یہ سن کر بے ہوش ہو گیا تھا۔“

تقسیم کچھ اس طرح ہوئی تھی۔ عمران کو ہر مہینے تیس ہزار۔ فرقان کو پچیس ہزار، نعمان کو پچیس اور عدنان کو بائیس ہزار۔

یہ تقسیم کچھ مہینوں تک ہوئی تھی، اس کے بعد عمران کو ایک حصہ اور فرقان، نعمان اور عدنان کو دس دس لاکھ کم کر کے دینا تھا۔

اور دس لاکھ روپے جو بیچ جاتے وہ بین بھائی کی ایمانداری اور انصاف کے لیے تھے۔

پہلے تو بین کو ان باتوں پر یقین ہی نہیں آیا تھا۔ لیکن بعد میں یقین آتا چلا گیا۔ بین بھائی کے لیے دس لاکھ بہت بڑی رقم تھی، وہ دل و جان سے اس فرض کو ادا کرنے کے

ڈبل فلور ایڈ ڈبل طاقت



25 روپے کی یقینی بچت

”ہاں بیٹا۔“ بین نے ایک گہری سانس لی۔
 ”بزرگوں کی یہی نشانی ہوتی ہے۔“
 ”لیکن ماموں، اب تو تو نماز روزے سے کوئی واسطہ
 ہی نہیں تھا۔ پھر وہ اچانک بزرگ کیسے ہو گئے؟“
 ”اے بزرگی کا تعلق دل سے ہوتا ہے۔“ بین نے کہا۔
 یہ گفتگو سوئم کے بعد ہو رہی تھی۔ پورے محلے میں اس
 بات کا چرچا تھا کہ مرحوم سلطان موت سے پہلے اپنے مرنے
 کی خبر دے چکا تھا۔ دن اور تاریخ تک بتادی گئی۔
 پندرہ بیس دنوں تک یہی ہوتا رہا۔
 بیس دنوں کے بعد بین نے چاروں کو بلا کر ان کے
 درمیان اتنی رقم تقسیم کر دی، جتنی سلطان نے بتائی تھی۔ اس
 دن چاروں کو احساس ہوا کہ اس کا باپ سلطان شکیک ہی کہتا
 تھا۔ بین واقعی ایک انصاف پسند شخص ہے۔
 وہ بین کی خدمت کرنے لگے۔
 اس کی ہر فرمائش پوری کرنا ان چاروں کا فرض
 بن گیا تھا۔
 بین کو تازہ بالائی کھانے کا شوق تھا۔ ان چاروں
 میں سے کوئی ایک کہیں نہ کہیں سے ان کے لیے بالائی لے
 کر آ جاتا۔ بالائی کے علاوہ بین کو بدایوں کے بیڑے بھی
 پسند تھے۔
 عمران نے کراچی ہی میں ایک ایسا کارنگر تلاش کر لیا
 تھا جو اسی انداز کے بیڑے بنایا کرتا تھا، بین روزانہ ایک کلو
 کے قریب بیڑے بھی کھا جایا کرتا۔
 پھر دوسرے مہینے جب بین نے پھر پوری ایمانداری
 کے ساتھ چاروں میں پیسے تقسیم کر دیے تو سب کو ان کی
 ایمانداری اور انصاف پسندی پر مکمل یقین آ گیا۔
 وہ چاروں جب آپس میں بیٹھے تو بین ہی کے بارے
 میں گفتگو ہوئی۔ ”بھائیو، یہ بین ماموں تو ولی اللہ نکلے۔“
 ”ہاں بھائی، کون کس روپ میں چھپا ہوتا ہے یہ کسی کو
 نہیں معلوم۔“
 عمران نے کہا۔ ”بھائیو، میں نے تو یہ سوچ لیا ہے کہ
 بین ماموں کو اب اس گھر سے جانے نہیں دوں گا۔“
 ”ہاں بھائی۔“ عدنان نے بھی تائید کی۔ ”جب سے
 وہ اس گھر میں آئے ہیں، برکت ہی برکت ہو رہی ہے۔“
 لیکن بین ماموں کی بزرگی اس وقت سامنے آ گئی۔
 جب اس نے تیسرے مہینے پیسے دینے سے انکار کر دیا۔
 ”ارے بچو، اب میرے پاس پیسے کہاں رہے۔ وہ تو سب
 ختم ہو گئے۔“

لیے تیار ہو گیا تھا۔
 پھر بین بھائی نے کچھ سوچ کر وہی سوال کیا جو سب
 کے ذہنوں میں تھا۔ ”سلطان میاں، تم تو ابھی زندہ ہو اور نہ
 جانے کب تک زندہ رہو۔ تو میں کیا تمہاری موت کے انتظار
 میں ہی بیٹھا رہوں۔“
 ”نہیں بھائی، آپ کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔
 میں مرنے ہی والا ہوں۔“
 ”میاں، اچھے خاصے بٹے کئے ہو۔ ہاں اگر خود کشی کا
 ارادہ ہے تو بات دوسری ہے۔ ویسے فی الحال تو تمہارے
 نکلنے کے آثار نہیں نکلتے۔“
 ”میں روز خواب میں موت کے فرشتے کو اپنی طرف
 آتے ہوئے دیکھتا ہوں۔“ سلطان نے بتایا۔
 ”ابا، وہ دو نمبر فرشتہ ہو گا۔“ نعمان نے کہا۔ ”ورنہ
 موت کا فرشتہ پہلے سے اتفاق نہیں کرتا۔“
 ”نہیں بے، وہ ایک نمبر ہی تھا، میں نے اس سے
 پوچھا بھی تھا۔ تب ہی تم لوگوں کو تفریق کر رہا ہوں۔“
 ”اچھا چلو۔ آگے بتاؤ، کیا کہا اس فرشتے نے۔“ بین
 نے پوچھا۔
 ”اس نے بتایا کہ وہ پندرہ جولائی کو مجھے اپنے ساتھ
 لے کر جائے گا۔“
 ”نہیں بھی بتایا؟“
 ”نہیں، بن تو نہیں بتایا۔“
 ”ابا، ابھی دو ہزار تیرہ ہے، ہو سکتا ہے پندرہ جولائی
 سن 2040 ہو، 2030 ہو۔“
 ”ہو سکتا ہے لیکن میرا دل کہہ رہا ہے کہ وہ یہی سال
 ہے، مجھے اسی سال کی پندرہ جولائی کو اوپر جانا ہے۔“
 ”چلو یہ بھی دیکھ لیتے ہیں۔“ بین نے کہا۔ ”آج دس
 جولائی ہے۔ صرف پانچ دن رہ گئے ہیں، ہاتھ لگن کو آ رہی کیا۔“
 ”بین بھائی، تم اب یہیں رہنا۔“ سلطان نے کہا۔
 ”میری موت کے بعد ان بچوں کو سنبھالنے والا تو کوئی ہو۔“
 ”فکر مت کرو۔ میں بھی اپنا یوریا بستر لے کر ہی
 آیا ہوں۔“
 کسی کو امید نہیں تھی کہ سلطان کی بات درست ہی
 نکلے گی لیکن چودہ جولائی کو اچانک اس کی طبیعت خراب
 ہونے لگی اور پندرہ جولائی کو اس کا انتقال ہو گیا۔
 ”بین ماموں، ابا تو واقعی اللہ والے نکلے۔“ عمران
 نے بین سے کہا۔

”ختم ہو گئے۔“ ان چاروں کے ہوش اڑنے لگے تھے۔ ”کسے ختم ہو گئے۔ ابھی آپ نے دیا ہی کتنا ہے، پورے پانچ کروڑ تھے۔“

”ختم لوگ کیا سمجھتے ہو کہ میرے پاس پورے پانچ کروڑ آئے تھے۔“

”تو پھر کتنے آئے تھے؟“

”پنچ، ٹیکس وغیرہ کاٹ کر صرف بیس لاکھ ملے تھے۔ جو میں تم کو دے چکا ہوں۔“

”ارے کس چیز کا ٹیکس۔“

”سیلز ٹیکس، لی بی آئی، اینف ٹی آئی، ائر پورٹ ٹیکس، روڈ ٹیکس، واٹر بورڈ والوں کا ٹیکس۔“ بین نے درجنوں ٹیکس گنوا دیے۔

”بین ماموں، یہ ایئر پورٹ ٹیکس اور روڈ ٹیکس وغیرہ ہم پر کیوں لگتے لگا؟“

”میرے بچو! تم کیا جانو سرکاری دھندوں کو۔ بس ایک بار پتا چل جائے کہ فلاں کے پاس پیسے ہیں۔ بس پچھتہ جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔“

چاروں اس وقت سکتے کے عالم میں تھے۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ بین ان کے ساتھ اتنی بے ایمانی کرے گا (یہاں سے الف لیلہ کی کہانی کا وہ حصہ یاد کریں، جب بھیڑیے نے لومڑیوں کو حصہ دینے سے انکار کر دیا تھا)۔

”اچھا۔ اگر آپ نے اتنے ٹیکس ادا کیے ہیں تو کوئی رسید تو ہوگی آپ کے پاس۔“ فرقان نے پوچھا۔

”کیوں بچوں جیسی بات کر رہے ہو۔ اس قسم کے لین دین کی رسید کہاں ہوتی ہے۔ وہ تو خاموشی سے دیا جاتا ہے۔“

”بین ماموں، دیئے تو تمہیں ماموں کہتے ہوئے بھی شرم آرہی ہے۔“ عمران نے کہا۔ ”ابا کے پیسے حرام کے نہیں تھے۔ پر انرا بنڈ میں نکلے تھے۔“

”لیکن یہ تو دیکھو کہ تمہارے باپ نے وہ پر انرا بنڈ چوری کیا تھا۔“

”چوری کیا تھا؟ جھوٹ ہے یہ، بکواس ہے، کیا ثبوت ہے آپ کے پاس؟“

”اگر ثبوت چاہیے تو جاؤ اپنے مرحوم باپ سے جا کر پوچھ لو۔“

اب ظاہر ہے کہ مرحوم باپ سے کون جا کر پوچھتا۔ اسی لیے سب بھنا کر خاموش ہوئے لیکن ان کے سینوں میں آگ لگی ہوئی تھی، بہت بڑی رقم تھی، پورے پانچ کروڑ، جو

بین ہضم کر گیا تھا۔

کئی تجویزیں ان کے ذہنوں میں آئیں، بین پر تشدد کیا جائے۔ اس کے خلاف پولیس میں رپورٹ کرا دی جائے لیکن اس کے لیے پھر ثبوت کی ضرورت ہوتی اور ان کے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا۔

”بینک والے تو بتا دیں گے کہ ہمارے ابا کے اکاؤنٹ میں پانچ کروڑ تھے۔“ نعمان نے کہا۔

”ہاں، بتا تو دیں لیکن ہم یہ کہاں سے ثبوت کریں گے کہ ابا نے وہ پانچ کروڑ بین کے حوالے کیے تھے۔“

”یہی تو پرانہلم ہے کہ اس آدمی نے بہت ہوشیاری سے کام کیا ہے۔“ عمران نے کہا۔ ”اس نے رقم بینک میں رکھی ہی نہیں، بلکہ اپنے پاس رکھی ہے اور کہاں رکھی ہے، یہ کسی کو نہیں معلوم۔“

”کیوں نہ اس پر تشدد کیا جائے۔“ عدنان نے تجویز پیش کی۔ ”تھوڑی سی مار پیٹ کے بعد راستہ پر آجائے گا۔“

”ارے بھائی، ہم لوگوں کو کسی پر تشدد کا تجربہ ہی کہاں ہے۔“

”اس کے لیے میرے ذہن میں ایک ترکیب ہے۔“ عدنان نے کہا۔

”پھر کوئی ایسی سیدی ترکیب ہوگی۔“

”نہیں تو۔ بالکل سیدی ترکیب ہے۔ تم لوگ بھی فوراً ہاں کہہ دو گے۔“

”تو بتاؤ کیا ترکیب ہے۔“

”ہائیکے دادا۔“ عدنان نے بتایا۔ ”سب جانتے ہیں وہ کتنا خطرناک آدمی ہے، اس کی ایک دھمکی سے بین کے ہوش اڑ جائیں گے۔“

”لیکن ہائیکے دادا ہمارے لیے ایسا کام کیوں کرے گا؟“

”ارے بھائیو۔ وہ کرائے پر اسی قسم کے کام اپنی پوری ایمانداری سے کرتا ہے، چاہے کسی کو قتل بھی کراوا، بس شرط یہ ہے کہ اس کے ساتھ جتنے پیسوں کا اگیری منٹ کیا ہے۔ وہ اس کو ملنے چاہئیں۔“

”عدنان کہتا تو خشک ہی ہے۔“ فرقان نے کہا۔

”ہائیکے دادا ہی اس قسم کا کام کر سکتا ہے۔ وہ خطرناک آدمی ہے، بین کے تو ہوش اڑ جائیں گے۔“

(یہاں سے پھر یاد کریں الف لیلہ کی کہانی، جب لومڑیوں نے بھیڑیے سے نجات کے لیے ایک شیر کا خدمات حاصل کی تھیں)

ہائیکے بھائی ایک خطرناک آدمی تھا، کئی بار جیل چاچکا

تھا۔ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ کرائے کا قاتل بھی ہے اور چھوٹے موٹے جرائم اس کے ہائیکے ہاتھ کا کھیل ہے۔

یہ چاروں ایک وفد بنا کر ہائیکے بھائی کے پاس پہنچ گئے۔ ہائیکے اس وقت اپنی بیٹھک میں اپنے کمرگوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔

اس نے بہت کڑی نگاہوں سے آنے والوں کو دیکھا تھا۔ ”کیا بات ہے، کون ہو تم لوگ۔“

”ہائیکے بھائی، ہم آپ کے پاس ایک بہت ضروری کام سے آئے ہیں۔“ عمران نے بتایا۔

”اوئے۔“ ہائیکے نے اپنے ایک آدمی سے پوچھا۔

”ان لوگوں کی تلاشی کی؟“

”ہاں ہائیکے بھائی، کچھ بھی نہیں ہے ان کے پاس۔“

”چلو خشک ہے، اب بتاؤ۔“

”ہائیکے بھائی، آپ سے اکیلے میں بات کرنی ہے۔“

نعمان نے کہا۔

”چکر کیا ہے۔“

”کوئی چکر نہیں ہے ہائیکے بھائی۔ ہم ایک سودا لے کر آئے ہیں۔ کاروباری بات ہے۔“

ہائیکے نے کچھ سوچ کر اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا۔ وہ سب کمرے سے باہر چلے گئے تھے۔ ”ہاں، اب بتاؤ۔ کیا کہانی لے کر آئے ہو۔“

عمران نے اسے تفصیل سے سب کچھ بتا دیا۔ یہ سب سن کر ہائیکے کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔ ”واہ، اگر ہو تو مار کر ڈال دوں سالے کو۔“

”نہیں ہائیکے بھائی، اس کو مار ہی دیا تو پھر پیسوں کا پتا کہاں سے چلے گا۔“ عمران نے کہا۔ ”اس کی تھوڑی سی توڑ پھوڑ کرو ڈالو، پھر سب کچھ بتا دے گا۔“

”لیکن اب میرا معاوضہ بتاؤ۔“

”بیس لاکھ۔“ عمران نے کہا۔

”نہیں، بیس لاکھ بہت کم ہیں۔“ ہائیکے نے انکار میں گردن ہلا دی۔ ”کچھ بڑھانا پڑے گا۔“

بہر حال تھوڑی بہت بحث کے بعد چالیس لاکھ میں یہ معاملہ طے پا گیا تھا۔ ہائیکے کو چالیس لاکھ دینے کے بعد بھی ان چاروں کے پاس اتنی رقم قمع جاتی، جس سے وہ اپنی زندگی آرام سے گزار سکتے تھے۔

”اب تم لوگ مجھ پر چھوڑ دو۔“ ہائیکے نے کہا۔ ”تم یہ بتاؤ کہ وہ پتا کہاں ہے؟“

”آج کل تو وہ ہمارے ہی یہاں رہ رہا ہے۔“

”خشک ہے، اس کام میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ کیا وہ اس وقت ہوگا؟“

”ہاں ہائیکے بھائی، جس وقت ہم چلے تھے۔ وہ سو رہا تھا۔“

”بس تو میں جا رہا ہوں تمہارے گھر کی طرف۔“

ہائیکے نے بتایا۔ ”تم چاروں آدھے گھنٹے کے بعد پہنچ جانا۔ تمہارا کام ہو چکا ہوگا۔“

وہ لوگ بہت خوش خوشی ہائیکے بھائی کے ہاں سے نکل کر ایک پارک میں آکر بیٹھ گئے۔ انہیں آدھے گھنٹا ادھر ادھر گزارنا تھا۔

”بھائیو۔“ عمران نے کہا۔ ”حالانکہ چالیس لاکھ بہت بڑی رقم ہوتی ہے۔ ہائیکے کو دیے ہوئے دل دکھے گا لیکن اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں تھا۔“

”یہ ضروری تھا عمران بھائی، ورنہ ہم پوری رقم سے چلے جاتے۔ ابھی بھی بہت کچھ آ رہا ہے ہمارے پاس۔“

آدھا گھنٹا گزار کر وہ چاروں گھر پہنچ گئے۔

ہائیکے اور بین ایک ساتھ بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ زور زور سے ہنس رہے تھے۔ ایسا نہیں لگ رہا تھا کہ ہائیکے نے بین کے ساتھ کوئی سختی وغیرہ کی ہوگی۔

”ہائیکے بھائی، یہ..... یہ کیا تماشا ہے، تم نے پوچھا اس سے ہمارے پیسے کہاں رکھے ہیں؟“

”ہاں پوچھ لیا، اور اس نے بتا بھی دیا ہے۔“ ہائیکے نے کہا۔

”خدا یا۔ تیرا شکر ہے۔“

”لیکن تم لوگوں کو اس میں سے ایک پائی نہیں ملے گی۔“

”کیا یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“

”ایسا ہی ہونے والا ہے۔ بین۔ مجھے ایک کروڑ دے رہا ہے۔ باقی کچھ اس کے ٹیکس ختم۔ اب تم لوگ میرا کچھ بگاڑ سکتے ہو تو بگاڑ لو۔“

ان چاروں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور بے ہوش ہو کر گر پڑے۔

(کہانی کا یہ انجام الف لیلہ کا نہیں ہے۔ کیونکہ الف لیلہ میں شیر نے بھیڑیے کو مار کر سارا اونٹ لومڑیوں میں تقسیم کر دیا تھا)

وہ الف لیلہ کے زمانے کا شیر ہوگا۔ آج کے شیر ہائیکے بھائی کے مزاج کے ہوا کرتے ہیں۔ گویا اپنے معاملات خود نمٹانے کی کوشش کر دے۔ باہر والوں کو درمیان میں نہ لاؤ۔ ورنہ وہی حشر ہوگا جو ان چاروں کا ہوا۔



محی الدین نواب

چوتھی قسط

اگر کوئی کائنات کے رمز کو سمجھنے کی سعی کرے تو سب سے پہلے اسے انسان کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ خاموش صحرا کی ویرانی ہو یا پرجوش لہروں کی روانی... سمندر کی گہرائی ہو یا آسمان کی بلندی... چاند ستاروں کا حسن ہو یا قوس قزح کے رنگ... تہ در تہ زمین کی پرتیں ہوں یا بلند آسمان کے سات پرے... ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے ہوں یا بادوباراں کی طوفانی گرج۔ کبھی ہلکی ہلکی بوندوں کی پھوار کا ترنم اور کبھی بجلی کی چمک، کبھی پھولوں کی مہک، کبھی کانٹوں کی کسک... اللہ تعالیٰ نے یہ سب چیزیں اس کائنات میں جگہ جگہ بکھیر دیں اور... ہر شے کو ایک مقام بھی عطا کیا، مگر... جب انسان کو بنایا تو اس پوری کائنات کو جیسے اس کے اندر کہیں چپکے سے بسا دیا اور یہ بھی عجب کھیل ہے کہیں نام یکساں ہیں مگر تقدیریں الگ اور کہیں چہرے حیران کن حد تک ایک جیسے ہیں مگر ان کی تقدیر کا لکھا کہیں ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتا۔ اس داستان کی ماروی وہ نہیں جو سندھ کی دھرتی پر عزت و احترام کی ایک علامت کے طور پر جانی جاتی ہے، اسے یہ بھی پتا نہیں کہ اس کا نام ماروی کس نے اور کیوں رکھا... شاید اس کے بڑوں نے سوچا ہو کہ نام کی یکسانیت سے مقدر کی دیوی اس پر بھی مہربان ہو جائے... جدید ماروی بہت عقیدت کے ساتھ اپنی ہم نام پر رشک کرتی ہے... یہ جانتے ہوئے کہ وہ کبھی اس مقام کے قریب بھی نہیں پھٹک سکے گی... ورق ورق، سطر سطر دلچسپی، تھیر اور لطیف جذبوں میں سموئی ہوئی ایک کہانی جس کے ہر موڑ پر کہیں حسن و عشق کا ملن ہے تو کہیں رقابت کی جلن... آج کے زمانے کے اسی چلن میں رنگین و سنجین لمحات کی لمحہ لمحہ روداد کو سمیٹتے، نئے رنگ و آہنگ کا تحیر خیز سنگم۔

ایک چہرہ کئی روپ، کبھی چھاؤں کبھی دھوپ، محبت کی عنایتوں، رقابتوں اور رقابتوں کا ایک دل رہا سلسلہ



محبوب وہی طور پر کچھ نہ زیادہ ہی اُلجھ گیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ماروی کو بھی سے باہر جائے اور شادی بیاہ جیسی تقریبات میں آزادی سے وقت گزارے۔ وہ شہمت جلالی کی کم ظرفی کو خوب سمجھتا تھا۔ اب عقل یہ کہہ رہی تھی کہ پارٹی کا چیز میں بھی انتقام اس کے خلاف ہو کر جلالی کا ساتھ دے گا اور اس عاشق کو ذہنی تکلیف پہنچانے کے لیے ماروی کو نقصان پہنچانے گا۔

محبوب تو بہت چھوٹی سی بات سوچ رہا تھا کہ چیز میں اسے نقصان پہنچانے گا۔ جب کہ وہ بڑی بے رحمی سے ماروی کو گولی مار دینے کا حکم دے چکا تھا۔ وہ ان کی بے رحمانہ سازشوں کو نہ جاننے کے باوجود سمجھ رہا تھا کہ ماروی کو اغوا کرنے والے اس کے ساتھ کیسا غیر انسانی سلوک کریں گے؟ بہت دور تک سمجھنے کے باوجود اس نے ماروی کی خوشیوں کو اہمیت دی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ مراد کی جدائی میں ادا اس رہنے والی اپنی سہیلیوں کے ساتھ کھڑی دو گھڑی نہں بول لے۔ یہ اس کے عشق کا مطالبہ تھا کہ وہ اپنی ماروی کے لبوں پر مسکراہٹیں لاتا رہے۔

اب کیا کیا جاسکتا تھا کہ آنسو پونچھنے والے کا سکون برباد ہو گیا تھا۔ وہ اس کے لیے حفاظتی انتظامات کر رہا تھا۔ لنگڑا جانی اور اس کے سہل ساجھی جی جان سے ماروی کی نگرانی کرنے والے تھے۔ انہیں دشمنوں سے شینے کا پیشہ وارانہ تجربہ تھا۔ اس کے باوجود اسے اطمینان حاصل نہیں ہو رہا تھا۔

کچھ روز پہلے رحمت جلالی، ماروی کی ٹوہ میں اس کی کوشش کی طرف گیا تھا۔ محبوب سے برداشت نہ ہوا۔ اس نے لنگڑے جانی سے اس پر حملہ کر لیا تھا۔ اس روز بھی اسے اطمینان نہیں تھا کہ جانی، رحمت کو عبرت ناک سزا دے سکے گا۔ وہ اپنے اطمینان کے لیے خود واردات کی جگہ سے کچھ دور چھپ کر اپنی کار میں بیٹھا آنکھوں سے دیکھتا رہا تھا تب مطمئن ہوا تھا۔

اب بھی دل یہی کہہ رہا تھا کہ شادی کی رات ماروی وہاں رہے گی تو وہ بھی وہاں چھپ کر رہے گا۔ اپنے طور پر بھی اس کی حفاظت کرے گا۔ کسی کی نظر میں نہ آنے کے لیے اپنی دوسری گاڑی میں جائے گا اور ہیملٹ کے ڈریلے اپنا چہرا چھپائے رکھے گا۔

اسی کو دباؤ لگائی یا نادانی کہتے ہیں۔ اس کی بے چینی کسی قدر کم ہو گئی تھی۔ یہ تو کوئی نہیں جانتا کہ اگلے لمحے کیا ہونے والا ہے۔ اس

ہونے کے لیے ہی انسان نادانیاں اور جذباتی فیصلے کرتا رہتا ہے۔ وہ بڑی دیر سے ٹھل رہا تھا۔ ذرا اطمینان ہوا تو آرام سے ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ وہ تنہائی پسند ہو گیا تھا اور تنہا ہوتے ہی وہ اسے سامنے بٹھا کر سوچتا رہتا تھا۔

ایک ملازم نے آکر کہا۔ ”سیر اصاحہ تعریف لائی ہیں۔“ سیرا اسے تھوڑی آنکھوں سے دکھائی دی۔ وہ اس کے کاروباری معاملات میں مصروف رہنے لگی تھی۔ اس قدر ذمے داریوں کا بوجھ اٹھا رہی تھی کہ محبوب سے ملنے کا بھی وقت نہیں ملتا تھا اور محبوب تو خود اپنے آپ کو وقت نہیں دے پا رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ، میں آتا ہوں۔“

ملازم چلا گیا۔ وہ خیالوں کی گہری میں رہنے کا ایسا عادی ہو گیا تھا کہ وہاں سے آکر کسی سے بولنا بھاری لگتا تھا۔ اس کے باوجود سیرا بہت اہم تھی۔ وہ اسے نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔

وہ ڈرائنگ روم میں آیا تو وہ سلام کرتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے سلام کا جواب دیتے ہوئے صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”بیٹھو کیسی ہو؟“

وہ بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”شاید اچھی ہوں۔“ ”شاید کیوں کہہ رہی ہو؟ تمہیں اپنے بارے میں پوری طرح یقین ہونا چاہیے۔“

”آپ نے اس قدر مصروف کر دیا ہے کہ میں آئینے میں بھی خود کو دیکھ نہیں پاتی ہوں۔“

وہ سنجیدگی سے بولا۔ ”اس سے بڑا ظلم ہو ہی نہیں سکتا کہ ایک جوان لڑکی کو آئینہ دیکھنے سے محروم کر دیا جائے۔“ ”آپ دفتر آتے رہیں گے۔ مجھے گاؤں کرتے رہیں گے تو یہ ظلم نہیں ہوگا۔“

”میں تھوڑی دیر کے لیے سبکی دفتر اینڈ کرتا رہتا ہوں۔“ ”ایسے وقت جب میں فیلڈ ورک میں یا دوسرے دفتری معاملات میں مصروف رہتی ہوں۔ جب ملنے آتی ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ جا چکے ہیں۔“

”ہاں تم سے ملاقات نہیں ہوتی لیکن تمہارے بارے میں عمل رپورٹ ملتی رہتی ہے۔ تم میری توقعات سے زیادہ تمام ذمے داریوں کو سنبھال رہی ہو۔“

”شکریہ۔ ذمے داریاں اس قدر ہیں کہ کوئی مجھے سنبھالنے والا نہ ہوا تو بیمار ہو جاؤں گی۔“

اس کی یہ بات دور تک سمجھ میں آگئی۔ وہ انجمن بن کر بولا۔ ”ایسا کرو کہ قابل افراد کو انٹرویو کے لیے کال کر

اور اپنے لیے دو معاون رکھ لو۔ کام کچھ ہلکا ہو جائے گا۔“ سیرا نے اسے دیکھا۔ پھر کہا۔ ”آپ نہیں سمجھیں گے۔ بلکہ سمجھ کر بھی نہیں سمجھتا چاہیں گے۔“

”کیا کہنا چاہتی ہو؟“ ”میں غلطی پر ہوں۔ آپ کے متعلق خوش فہمی میں مبتلا رہتی ہوں۔“

”انسان کی زندگی میں کئی راستے انتخاب کے لیے ہوتے ہیں۔ اگر ایک راستہ مناسب نہ ہو یا آگے بڑھنے میں رکاوٹ ہو تو دوسرا تیسرا راستہ اختیار کر لینا چاہیے۔“

وہ بولی۔ ”دل بہت ضدی ہوتا ہے۔ ہماری نہیں مانتا۔ اسی ایک راستے پر چلنے کے لیے چلتا ہے۔“

”اس کو دیوانگی کہتے ہیں۔ میں نہیں کیا ہوں خود ہی دیکھ رہا ہوں کہ میرے راستے میں کانٹے ہی کانٹے ہیں اور بہت دوڑ میری ہے۔ بہت دور ایک پھول کھلا ہے اور میں کچھ سوچے سمجھے بغیر کاٹوں سے گزر رہا ہوں۔ میری جان جاتی رہے گی اور وہ ہے کہ دل سے نہیں جائے گا۔“

”میرے دل کا بھی یہی آخری فیصلہ ہے۔ جان جائے۔ وہ پیار نہ جائے جو رگ میں سا گیا ہے۔“

وہ ذرا چپ رہا پھر بولا۔ ”ہم سب اپنے دل سے مجبور رہتے ہیں۔ جب دل مجبور کرتا ہے تو دماغ کسی کام کا نہیں رہ جاتا۔ کسی کی نصیحت اثر نہیں کرتی۔ کسی کا مشورہ قابل قبول نہیں ہوتا۔“

”آپ درست کہہ رہے ہیں۔ میرے ساتھ بھی یہی ہو رہا ہے۔ اس دل میں جو پیار سا گیا ہے وہی پہلا اور آخری ہے۔ کوئی اور وہاں بھی نہیں مانتا گے۔“

”پھر میری طرح تمہاری توجہ کاروباری مسائل سے اور اپنی ذمے داریوں سے کم ہوتی چلی جائے گی۔ ہو سکتا ہے میری طرح تم بھی کسی کام کی نہ رہو۔“

اس نے بڑے اعتماد سے محبوب کو دیکھا پھر کہا۔ ”ایسا نہیں ہوگا۔ ماروی آپ سے بہت دور ہے۔ اسے بھی کبھی دیکھنے کے لیے آپ کو بڑی قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔“

میرے ساتھ ایسا نہیں ہے۔ میں نے تو آپ کا پورا کاروبار سنبھالا ہے۔ میں تو آپ کے سامنے میں رہتی ہوں۔“

میرے اندر یہ جذبہ ہے کہ آپ کو قائل کرنے کے لیے کاروبار کو بھی ڈوبنے نہ دوں۔ آپ کی عزت، شہرت، عظمت اور شخصیت کو بحال رکھوں اور ایسا کرتے کرتے کسی دن بوسہ ہو جاؤں گی۔ آپ بولیں اس سے اچھی اور سچی محبت اور کیا ہوگی؟“

اس کی سوچ نے کہا۔ ”واقعی یہ میرے اربوں کے کاروبار کو ڈوبنے نہیں دے گی۔ یہی تو پیار کی عظمت ہے۔“ وہ دل سے متاثر ہو کر بولا۔ ”اور میں بھی خالی ہاتھ بوڑھا ہو جاؤں گا۔ وہ جس کی امانت ہے اسے ملے گی۔“

”آپ کی دیوانگی سے میں نے سمجھا ہے اپنے محبوب کو پالینا ضروری نہیں ہے۔ اس کے نام رہنے اور اس کے کام آتے رہنے سے عجیب طرح کا روحانی سکون حاصل ہوتا ہے۔“

”تم بہت اچھی ہو میرا! میرا خیال ہے کہ میں سب سے زیادہ تمہیں پسند کرتا ہوں اور تمہاری عزت کرتا ہوں۔“ ”شکریہ۔ یہ سن کر مجھے خوشی ہو رہی ہے۔ کیا آپ میری ایک خواہش پوری کریں گے۔“

اس نے ایک ذرا سوچتے ہوئے اسے دیکھا وہ بولی۔ ”میں ماروی کا کوئی حق نہیں مانگوں گی۔“

وہ مطمئن ہو کر بولا۔ ”پھر تو چل کر بولو۔ میں تمہاری ہر خواہش پوری کروں گا۔“

”کیا آپ کا جی نہیں چاہتا کہ ماروی کے ساتھ باہر کہیں تھوڑا وقت گزاریں؟“

”بہت دل چاہتا ہے۔“ ”آپ میرے ساتھ نکل کر سیں گے تو آپ کے ساتھ بھی نکلے گی۔ آپ میرا دل رکھیں گے تو وہ بھی آپ کی دلی خواہش کو ضرور سمجھے گی۔“

وہ ذرا توقف سے بولی۔ ”میں چاہتی ہوں ہر ہفتہ کی کوئی ایک شام میرے ساتھ گزاریں۔ ہو سکے تو میرے ساتھ ڈنر کریں۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں چاہوں گی۔“

وہ سر ہلا کر بولا۔ ”تم سچ ہو۔ میں تمہارے ساتھ ہر ہفتے کی کوئی شام گزاراؤں گا۔“

وہ وال کلاک کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ”آپ دل سے وعدہ کر رہے ہیں تو ابھی شام کے پانچ بجے ہیں۔“

دوسرے دن ماروی سینک ٹو گھنٹے جانے والی تھی۔ وہ دوسو اور اندیشوں میں مبتلا تھا۔ سیرا کے ساتھ سکون سے شام نہیں گزار سکتا تھا۔ اس نے بچکاہٹ سے بولے کہا۔ ”آج نہیں۔ کیا بتاؤں، کل تک بڑی الجھنیں ہیں۔“

”کیا کل کے بعد الجھنیں نہیں رہیں گی؟“ ”ہاں۔ پھر دو دنوں کے بعد جیل میں ملاقات کی تاریخ ہے۔ وہ مراد سے ملنے جائے گی۔“ وہ سوچتے ہوئے بولا۔ ”ایسے وقت اس کی سکیورٹی کے انتظامات کرنے ہوں گے۔“

”یوں پہلے وعدہ کا پہلا ہفتہ گزر جائے گا۔ آپ میرے ساتھ شام نہیں گزاریں گے۔“

”گزاروں گا۔ زبان دی ہے تو ہر ہفتہ کی ایک شام تمہیں ضرور دوں گا۔ سیرا.....! ابھی میں بیان نہیں کر سکتا کہ میرا ہن کس بڑی طرح اچھا ہوا ہے۔“

”میں سمجھا دوں گی۔ میں آپ کو ماروی سے نہیں ملا سکتی لیکن اس کی پرچھا میں سے ملا دوں تو آپ ابھی چلیں گے؟“

وہ ایک دم سے صوفہ پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ حیرانی سے بولا۔ ”ماروی کی پرچھا میں.....؟“

”ہاں۔ آئرس کونسل میں عمر ماروی کا ڈراما اسٹیج ہو رہا ہے۔ میں مکمل اعتماد سے دو ٹوٹیں لے آئی ہوں۔ میرا دل کہہ رہا تھا آپ انکار نہیں کر سکیں گے۔“

وہ صوفہ سے اٹھ کر بولا۔ ”تمہیں انتظار کرنا ہوگا۔ بس میں ابھی چنچ کر کے آ رہا ہوں۔“

وہ تیزی سے پلٹ کر چلا گیا۔ وہ بڑے دکھ سے مسکراتے لگی۔ دکھ اس بات کا تھا کہ وہ ماروی کے نام سے جا رہا تھا۔ مسکراہٹ اس لیے تھی کہ اس نے محبوب کی قربت کو آج شام اپنے نام کر لیا تھا۔

وہ فوراً ہی لباس تبدیل کر کے آ گیا۔ اس نے عمر ماروی کی داستان بھی پڑھی تھی پھر اس کی زندگی میں ماروی آئی تو اس نے کئی بار سوچا کہ اس کی وہ داستان ضرور پڑھے گا۔ اس نے ٹوٹی سے باہر آ کر سیرا کے لیے اگلی بیٹ کا دروازہ کھولا۔ وہ خوش ہوئی ایک مدت کے بعد اسے محبوب کے برابر بیٹھنا نصیب ہو رہا تھا۔

ویسے برابر بیٹھنے والے کا مزاج اس کے برابر نہیں تھا۔ وہ فطرتاً خاموش رہتا تھا۔ وہ ونڈا اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے یوں ڈرائیو کر رہا تھا۔ جیسے دور جان حیات کے پاس پہنچ گیا ہو۔ وہ بولی۔ ”محبوب صاحب.....! یہ درست نہیں ہے۔“

اس نے خیالات سے چونک کر پوچھا۔ ”کیا.....؟“

”ڈرائیو کرنے کے دوران میں وہاں نہیں جانا چاہیے؟“

اس نے تعجب سے پوچھا۔ ”کہاں.....؟“

”ماروی سے کہہ دیں جب کہیں آرام سے بیٹھیں گے تو اس کے پاس آ جائیں گے۔“

وہ مسکرا کر رہ گیا۔ سیرا نے کہا۔ ”عشق کیا عجیب ہوتا ہے جو غائب ہوتی ہے اسے حاضر کر دیتا ہے اور جو حاضر نہیں ہے اسے غائب کر دیتا ہے۔“

وہ عاجزی سے بولا۔ ”پلیز مائٹ نہ کرو۔ میں نہ

چاہوں تب بھی وہ دماغ میں آ جاتی ہے۔“

”وہ بہت اچھی ہے۔ آپ مجھ سے بولتے رہیں گے تو میرا لحاظ کرے گی۔ یہاں نہیں آئے گی۔“

جب باتیں کرتے رہو تو کسی طرح کی سوچ نہیں آتی۔ ذہن باتیں کرنے والے یا والی کے ساتھ لگا رہتا ہے۔ سیرا نے اسے اپنی طرف متوجہ رکھنے کا ایک نفسیاتی پہلو پیش کیا تھا۔

وہ مسکرا کر بولا۔ ”بے شک تم بہت ذہین ہو۔ مجھے خود سوچنا چاہیے جو موجود ہے اسے پوری توجہ سے دیکھ دی جائے۔“

وہ مسکرائی۔ ”تھینک یو۔“

”اچھا یہ بتاؤ گھر میں تمہارے والدین کے علاوہ اور کتنے رشتے دار ہیں؟“

”صرف والدین ہیں۔ ویسے رشتے دار تو بہت ہیں۔ وہ سب رسی طور پر آتے جاتے رہتے ہیں۔“

”تم کھانا پکاتی ہو؟“

”نہی پکاتی ہیں اور ایسا لذیذ پکاتی ہیں کہ ہم انھیں چاہنے لگتے ہیں۔ سی فوڈز کو زیادہ اہمیت دیتی ہیں۔ آج انہی نے فرائش اور جھنگے کیاز کا سانس پکایا ہے۔“

”اوہ۔ میں تو جھنگے بہت شوق سے کھاتا ہوں۔“

”تو پھر آئرس کونسل کے بعد میرے گھر چلیں۔ پہلی بار گھر چلنے کو کہہ رہی ہوں۔ پلیز..... انکار نہ کریں۔“

”میرے وعدے کے مطابق آج کی شام تمہاری ہے۔ جہاں لے جاؤ گی جاؤں گا۔“

اس کے حلق سے سرت بھری چیخ نکلی۔ اس نے فوراً ہی فون نکال کر اپنی والدہ کے نمبر پر کیے۔ رابطہ ہونے پر کہا۔ ”انی! آج میں بہت خوش ہوں۔ محبوب صاحب آج رات کا کھانا ہمارے ساتھ کھائیں گے۔ ابھی آئرس کونسل جا رہے ہیں۔ ہم شاید گیارہ بجے تک آئیں گے۔“

اس نے محبوب کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ بھی جھنگے بہت شوق سے کھاتے ہیں۔ میں نے آپ کے پچوان کی بڑی تعریفیں کی ہیں۔“

وہ خوشی کے مارے بولی جا رہی تھی۔ محبوب چپ چاپ ڈرائیو کرتے ہوئے نہ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کسی کے دل میں خوشیاں بھر دینے سے ہمیں کیسی فخریہ سرسبیل حاصل ہوتی ہیں؟ ابھی سیرا کو خوش ہوتے دیکھ کر مجھے اچھا لگ رہا ہے۔

پھر وہ سوچتے سوچتے بہک گیا۔ خیال آیا کہ جب میں ماروی کو آرام داسائن اور خوشیاں دیتا ہوں تو کیا وہ بھی

اسی طرح خوش ہوتی ہوگی؟ کیا میری بے غرض اور بلا معاوضہ محبت کے بارے میں بھی سوچتی ہوگی؟

وہ خیالات سے چونک گیا۔ سمیرا فون بند کر کے پوچھ رہی تھی۔ ”آپ پھر وہاں چلے گئے؟“

وہ فوراً ہی بولا۔ ”لو آ گیا۔“

وہ ہنسنے لگی۔ محبوب نے اپنی ایک شام دے کر اسے مسرتوں سے مالا مال کر دیا تھا۔ یہ سچ ہے کسی کے منہ پر مسکراہٹ لانے کے لیے ایک پیسا بھی خرچ نہیں ہوتا۔ پھر پتا نہیں کیوں مفت کی چیز کو کسی کو نہیں دیتا۔

وہ آڈیو میں پہنچے تو ڈراما شروع ہو رہا تھا۔ پس منظر سے ماروی کا تعارف لوگ کیٹوں کے ذریعہ پیش کیا جا رہا تھا۔ سب سے اگلی قطار میں ان کی دوستیں تھیں۔ وہ وہاں جا کر بیٹھ گئے۔

ماروی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ بہت خوبصورت تھی۔ اتنی حسین تھی کہ جو اسے دیکھتا وہ اس کا عاشق ہو جاتا۔ پہلے منظر میں ماروی اسٹیج پر آئی۔ ایک بہت ہی حسین لڑکی کو ماروی کا رول دیا گیا تھا۔ جیسا ماروی کے حسن و جمال کو بیان کیا گیا تھا۔ ویسی تو نہیں تھی مگر اپنی خوبصورت تھی۔ کسی حد تک ماروی کی جھلک پیش کر رہی تھی۔

اور محبوب کو اپنی ماروی دکھائی دے رہی تھی۔ اس وقت تھر کے ایک گاؤں میں تھی۔ وہاں ماں باپ کے کھیت اور کلیان تھے۔ ایک چرواہا ان کے مویشی چرایا کرتا تھا۔ وہ ماروی کا عاشق ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے آقا سے اس کی بیٹی کا رشتہ مانگا تو آقا نے اسے نوکری سے نکال دیا اور بیٹی کا رشتہ اپنے برابر والے ایک نوجوان سے ملے کر دیا۔

وہ چرواہا عمر کوٹ کے شاہ عمر کے گل میں پہنچا۔ وہاں اس نے ماروی کے حسن و جمال کی تعریف ایسے دل کھینچنے والے الفاظ میں کی کہ عمر اسے حاصل کرنے کے لیے پاگل ہو گیا۔

اگلے منظر میں ماروی عمر کے گل میں تھی۔ وہ اسے اپنی طرف مائل کرنا چاہتا تھا اور وہ انکار کرتی تھی کہ کبھی بھی میرا سمیتر ہی میرا محبوب ہے، میری زندگی ہے۔ میں اس کے سوا کسی اور کا نہیں دیکھوں گی۔

سمیرا بڑی توجہ سے ڈراما دیکھ رہی تھی۔ اس نے محبوب کی طرف جھک کر کہا۔ ”آپ نے ماروی کو قید نہیں کیا ہے۔ حالات نے اس کے مراد کو قیدی بنا دیا ہے۔ یہ ماروی اپنے منگیتر سے بچھڑ گئی تھی۔ اور وہ اپنے مراد سے نامعلوم مدت کے لیے جدا ہو گئی ہے۔“

سچی دوستی

باپ۔ ”رات کو کہاں تھے؟“

بیٹا۔ ”دیر ہو گئی تھی، دوست کے گھر ہی رک گیا تھا۔“ (باپ نے اسی وقت فون اٹھایا اور اس کے دس دوستوں کو کال کی)

چھ دوستوں نے کہا۔ ”ہاں اگلے وہ رات میرے پاس ہی تھا۔“

تمن نے کہا۔ ”اگلے وہ سو رہا ہے۔ آپ کہیں تو اٹھا دوں۔“

ایک نے تو حد کر دی۔ ”جی ابو، پولیس۔“

بے وقوف

بیٹے نے کہا۔ ”ابو مجھے اسکول میں جرمانہ ہو گیا ہے۔“

ابو۔ ”اچھا وہ کیسے؟“

بیٹا۔ ”ابو میں کل اسکول میں لیٹ گیا تھا اس لیے۔“

باپ نے غصے سے کہا۔ ”تلاش کریں کہ میں تمہیں اسکول پڑھنے کے لیے بھیجتا ہوں لیٹنے کے لیے نہیں بھیجتا، بے وقوف انسان۔“

مرسلہ: افتخار حسین اعوان، مظفر آباد، آزاد کشمیر

محبوب سوچ رہا تھا۔ ”ہاں میں نے بھی ماروی کو کروڑوں کی ٹوٹی دی ہے۔ ایک جیسے حالات ہیں۔ لاکھوں روپے دیے ہیں پھر بھی وہ مائل نہیں ہو رہی ہے۔“

وہ سوچ رہا تھا۔ ”مجھ میں اور عمر میں یہ فرق ہے کہ اس نے ماروی کو جبراً قیدی بنا کر رکھا تھا۔ میں نے ایسا نہیں کیا ہے۔ لیکن وہ میرے احسانات کی ان دیکھی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے۔“

ڈرامے کا یہ آخری کلاس تھا کہ عمر اسے آزاد کر دیتا ہے۔ وہ اپنے گاؤں واپس آتی ہے تو بدنام ہوتی ہے کہ کل سے داغدار ہو کر آئی ہے۔

اس کا محبوب اس کا سمیتر بھی اس پر شبہ کرتا ہے۔

ایسے وقت سمیرا اور محبوب نے ایک دوسرے کو کون انکھوں سے دیکھا۔ یہاں بھی ماروی اس کے ساتھ بدنام ہو رہی تھی۔

آرٹس کونسل سے سمیرا کے گھر جاتے وقت کاری محمد و فضا میں تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ پھر محبوب نے کہا۔ ”پچھلے دنوں گارمنٹس فیکٹری میں آگ لگ گئی تھی۔ درجنوں کام کرنے والی عورتیں اور مرد بڑی طرح جل کر مر گئے۔ کیا وہ عرب مزدور گناہ گار تھے؟ اگر نہیں تھے تو آگ نے انہیں کیوں جلایا؟“

سمیرا نے کہا۔ ”آگ پھر آگ ہے۔ شیطان ہوا یا فرشتہ سب کو جلاتا ہے۔“

”اگر میں اور ماروی اپنی ہتھیلیوں پر آگ رکھیں تو جل جائیں گے۔ سب ہمیں گناہ گار کہیں گے۔ یہ صرف خدا جانتا ہے کہ ہم بے داغ ہیں۔“

”آپ کی عینیاں اور مہربانیاں آگ بن گئی ہیں۔ ہزار قسمیں کھانے کے باوجود تمام عمر رسوائیاں جلاتی رہیں گی۔“

وہ چپ رہا۔ سوچنے لگا کہ وہ ماروی کے عشق سے باز آجائے تب بھی بدنامی کا داغ کبھی نہیں ڈھلے گا۔ وہ تو لگ چکا ہے۔ نیک نامی کو زخمی کر کے ناسور کی طرح اندر جا کر بیٹھ گیا ہے۔ موت کے بعد وہ قبر کے اندر رہیں گے۔ اس وقت بھی بدنامی باہر ہی پھٹی رہے گی۔

سمیرا نے کہا۔ ”پھر کبھی کوشش کی جاسکتی ہے کہ کھوئی ہوئی نیک نامی بحال ہو جائے۔“

وہ بولا۔ ”ناممکن ہے۔“

وہ بولی۔ ”ممکن ہے۔ جہاں بدنامی ہو رہی ہے وہ جگہ چھوڑ دی جائے۔ خدا کی زمین بہت بڑی ہے۔ ماروی کسی دوسرے علاقہ میں جا کر نئے سرے سے نیک نامی کے ساتھ رہ سکے گی۔“

”وہ کہیں بھی جائے، جب تک مراد رہا ہو کہ اسے اپنی منکوحہ بنا کر اس کے ساتھ نہیں رہے گا۔ اس وقت تک دنیا اس تنہا جوان لڑکی پر انگلیاں اٹھاتی رہے گی۔“

”وہ تنہا نہیں ہوگی۔ اس کے چاچا اور چاچئی سرپرست کے طور پر رہیں گے۔“

کسی دوسرے صوبے یا شہر میں جا کر چھپ کر رہنا چاہیے گی تو محبوب اس کے بغیر نہیں رہ سکے گا۔ اسے کہیں جانے نہیں دے گا۔ طرح طرح کے بہانوں سے روک لے گا اور یہی ہو رہا تھا۔

☆☆☆

محبوب کا وکیل احمد صدیقی فائل کھولے مراد کے کس کی اسٹڈی کر رہا تھا۔ معروف جج نے کھلے ہوئے دروازے پر دستک دے دی تھی۔ ”اندرا آسکا ہوں؟“

صدیقی نے سر اٹھا کر دیکھا۔ پھر مسکراتے ہوئے اٹھ کر کہا۔ ”تشریف لائیں جناب! یہ تو آپ ہی کا دفتر ہے۔ اور ہم بھی آپ ہی کے ہیں۔“

معروف نے قریب آ کر مصافحہ کیا۔ پھر ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا ہو رہا ہے؟“

”آپ ہی کے کس کی اسٹڈی کر رہا ہوں۔“

وہ مسکرا کر بولا۔ ”خدا نہ کرے کہ میرا کوئی کس ہو۔ بھی قتل کا الزام مجھ پر نہیں مراد کی منگی پر ہے۔“

صدیقی نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”جی ہاں الزام مراد پر ہے۔ لیکن مقدمہ آپ لڑ رہے ہیں۔“

”مقدمہ میں نہیں وہ دیوانہ محبوب علی چاٹھ پلڑ رہا ہے۔“

”اور ان کی نمائندگی آپ کر رہے ہیں۔“

”ہاں۔ یہی دیکھنا ہے کہ نمائندگی کرتے کرتے کتنے برسوں تک جوتے گھستے رہیں گے۔“

”کورٹ سے سن آیا ہے۔ بائیس تاریخ کو پیشی ہے۔“

”گو یا یہ پہلی پیشی آغاز جنگ ہے۔ اس روز معلوم ہو گا کہ ہوا کا رخ کیوں ہوگا؟“

”ایسا نہ کہیں۔ وہ ایک سیدھی سادی سی دیہاتی لڑکی ہے۔ کسی پر جال پھینکنا نہیں جانتی اور چچی بات یہ ہے کہ وہ محبوب کی طرف مائل نہیں ہے۔“

”پھر محبوب صاحب کس امید پر عشق کر رہے ہیں؟“

”وہ کہتا ہے معشوق ملے یا نہ ملے عاشق اس سے پیار کیے جاتا ہے۔ عشق کا ساز ایسا ہی ہوتا ہے۔ ایک ہاتھ سے تالی بجاتی رہتی ہے۔“

”اور آپ یقیناً چاہتے ہوں گے کہ یہ تالی نہ بچے۔ کاروبار پر برا اثر پڑ رہا ہوگا؟“

”ہاں۔ اسے پہلے کی طرح پورے دل و دماغ سے بزنس کی طرف توجہ دینی چاہیے اور وہ دل و دماغ ہی ہارتا جا رہا ہے۔“

”میں تو وکیل ہوں۔ اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں؟“

”یہی کر سکتے ہیں کہ مراد کی جلد سے جلد رہائی کی کوشش کر سکتے ہیں۔ وہ باہر آئے گا۔ ماروی کو اپنی منکوحہ بنائے گا۔ محبوب اپنی آنکھوں سے دیکھے گا کس کی دلہن بن کر پرانی ہو گئی ہے۔ تب شاید اس کا عشق ٹھنڈا پڑ جائے گا۔“

”جو عشق بائیس برسوں کو ٹھنڈا کر رہا ہو وہ بھی ٹھنڈا نہیں ہوگا۔ عشق کا حاصل تو بس یہی ہے کہ محبوب صاحب کو ماروی حاصل ہو جائے۔ میری عقل تو یہی کہتی ہے۔“

”یہ تو اپنا بھی ذہن پتھر پر کہتا ہے۔ وہ محبوب کی زندگی میں آ کر اسے نارل بنادے گی۔ پھر وہ پہلے کی طرح تازہ دم ہو کر بزنس کروال دواں رکھے گا۔“

”تو پھر لڑکی کو راضی کریں۔ اسے سمجھائیں مراد دو چار برسوں سے پہلے رہائی پانے والا نہیں ہے۔ میں تو وکیل ہوں یہی ہوں گا کہ رہائی پانے والا ہے۔ وہ اوپر بھی لنگ سکتا ہے۔ اگر وہ اوپر چلا جائے گا تب وہ کیا کرے گی؟“

”تب عورت مجبور ہو جاتی ہے۔ ہوں پرستوں کی اس دنیا میں تنہا نہیں رہ سکتی۔ کسی کو سہارا بننا پڑتا ہے۔ جب وہ نہیں آئے گا۔ تب ماروی ضرور مان جائے گی۔“

صدیقی نے کہا۔ ”تب مان جائے گی نا؟“

اس بات پر دونوں نے خاموش نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ صدیقی نے کہا۔ ”اسے اسی طرح منوائیں۔ پہلی پیشی کے بعد ماروی کے سامنے بولتے رہیں کہ مراد کا مقدمہ کمزور ہے۔ اسے رہائی نہیں ملے گی۔ دوسری پیشی کے بعد بولیں کہ اسے عرقیہ سزا دی۔ وہ بھی باہر نہ آ سکے گا۔ وہ بھی اس کی دلہن نہیں بن سکے گی۔“

معروف نے کہا۔ ”ہاں۔ اس کے باوجود وہ مراد کے

بغیر ساری زندگی بن بیانی محبوب کے رحم و کرم پر رہے گی اور محبوب کے ساتھ بدنام ہوتی رہے گی۔“

یہ کہہ کر وہ چپ ہوا پھر کچھ سوچ کر بولا۔ ”عورت جلدی نہیں مانتی۔ ماروی انتظار کرے گی کہ شاید آگے جا کر عمر قید میں بھی ہو جائے اور وہ آجائے۔ پیار کے معاملہ میں غریبوں کا عشق بہت پختہ رہتا ہے۔ وہ باؤلی ہے۔ کئی برسوں انتظار کرے گی۔ تب تک محبوب پاگل ہو جائے گا۔“

”پھر تو اس لڑکی کو یہ کہہ کر شک پھینچا جائے کہ مراد کو سزائے موت ہونے والی ہے۔“

”عدالتی فیصلہ اس سے چھپا نہیں رہے گا۔ اسے معلوم ہو جائے گا ہم جھوٹ بول رہے ہیں۔“

”کیا مشکل ہے؟ محبوب صاحب کو اور کوئی لڑکی نہیں ملی تھی عشق کرنے کے لیے؟ اس کے پیچھے بڑے گئے ہیں جو پہلے ہی کسی کے پیچھے بڑی ہوتی ہے۔ وہ مراد کو نہیں چھوڑے گی۔ یہ ماروی کے عشق سے باز نہیں آئیں گے۔“

”یہی سوچ کر ذہن جھنجھلا جاتا ہے۔“

”جھنجھلا نے اسے اپنا خون خشک ہوتا رہے گا۔ مسئلہ تو اپنی جگہ جوں کا توں رہے گا۔“

”بس ایک ہی صورت سے حل ہو جائے گا۔ جب مراد کو جج سزائے موت ہوگی۔“

انہوں نے گہری تنہید کی سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ معروف نے وکیل صدیقی کی طرف جھک کر دھیسے راز دارانہ لہجے میں پوچھا۔ ”کیا ایسا ہو سکتا ہے؟“

وہ بولا۔ ”ہونے کو کیا نہیں ہو جاتا۔ جب انسان کو زندہ درگور کیا جاسکتا ہے تو اس زندہ کو تختہ دار تک بھی پہنچایا جاسکتا ہے۔“

وہ صدیقی کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے سرگوشی میں بولا۔ ”میں بہت مجبور ہو کر کہہ رہا ہوں۔ یہ بات میرے اور آپ کے درمیان رہے۔ محبوب کو بھی معلوم نہ ہو۔“

وہ بولا۔ ”جرائم کے ایسے راز جو دنیا کے کسی ریکارڈروم میں نہیں رہ پاتے وہ وکیلوں کے سینے میں محفوظ رہتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔ آپ قبر کھودنے کی فیس بتائیں۔“

”دس لاکھ۔۔۔۔۔ نہ کم نہ زیادہ۔“

سے مل گئے۔

☆☆☆

ماروی کا دل اچانک ہی گھبرانے لگا۔ جہانیوں میں مراد ہی اس کے سامنے آ جاتا تھا۔ وہ اس سے باتیں کرتی رہتی تھی اور پہلے ہی رہتی تھی۔ لیکن اس وقت اچانک ہی دل گھبرانے لگا تھا۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ دھڑکتے ہوئے دل پر ہاتھ رکھ کر سوچنے لگی۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟ مراد تو ٹھیک ہے؟ کہیں بیمار تو نہیں ہو گیا؟ وہاں کون اسے دیکھنے والا ہے؟

اس بات نے اسے ٹلا دیا کہ وہ جیل میں بے یارو مددگار پڑا ہے۔ محبوب باہر سے مددگار ہے۔ اس کے اندر کے دکھ کو تو صرف وہی سمجھتی تھی۔

وہ بیٹھ کر پہلو بٹلتے ہوئے بولی۔ ”یا خدا! وہ ٹھیک تو ہے؟ وہ کسی تکلیف میں تو نہیں ہے؟“

وہ ایسے وقت قبلہ رو ہو کر بیٹھ جاتی تھی۔ یہ نہیں جانتی تھی کہ پریشانی اور گھبراہٹ کے وقت کون سی دعا پڑھنی چاہیے۔ اسے نماز پڑھنے کے لیے کلام پاک کی چند آیتیں یاد تھیں۔ وہ انہیں بار بار پڑھتی رہتی تھی۔

جب کہیں سے کوئی مدد نہ ہو۔ کسی کا سہارا نہ ہو اور مراد کی طرف سے چلنے والی ہوا بھی نہ آئی ہو تو خدا کو یاد کر کے بیک گونہ سکون ملتا تھا۔ دل کہتا تھا، مراد کی سفارش اوپر تک پہنچ گئی ہے۔

پتا نہیں وہ کتنی دیر تک پڑھتی رہی۔ پھر بیٹھ سے اتر گئی۔ اب بھی یہ چہنچہاں ہے۔ وہ بہت یاد آ رہا تھا۔ اس نے تصور کی آنکھوں سے دیکھا تو وہ نگاہوں کے سامنے سکرانے لگا۔

ایسے وقت وہ ذرا الجھ جاتی تھی۔ پہلے اچھی طرح یقین کرتی تھی کہ کسے دیکھ رہی ہے؟ مراد کو یا محبوب کو.....؟

اس وقت اس نے دیکھا کہ اس کی مسکراہٹ بیمار ہے۔ وہ کسی تکلیف میں ہے۔ اس کے پاس آ کر رسوا مسکرا رہا ہے۔

یوں یقین ہوا کہ وہ اپنے مراد کو ہی دیکھ رہی ہے۔ وہ جیج تکلیف میں ہے۔ اسی لیے اس کا دل گھبرا رہا ہے۔ ”یا اللہ! کیسے معلوم ہو کر وہ کس حال میں ہے؟“

خدا کے بعد مشکلیں دوڑ کرنے والا اب اس ایک محبوب ہی تھا۔ اچانک بیمار مسکراہٹ گم ہو گئی۔ اب اس چہرے پر زندگی سے بھرپور مسکراہٹیں تھیں۔ سامنے صورت وہی تھی۔ دلدار بدل گیا تھا۔

یوں سمجھ گئی کہ محبوب کو دیکھ رہی ہے۔ اس نے مشکل

میں اسے یاد کیا تو وہی سامنے آ گیا۔ وہ تھوڑی دیر تک سوچتی رہی پھر اس نے فون کو بیڈ سے اٹھا کر نمبر شیج کیے۔ رابطہ ہونے ہی اس کی آواز سنائی دی۔ ”ہیلو رادی! خیریت تو ہے؟“

وہ دھیمی آواز میں بولی۔ ”جی آپ کی مہربانیاں ہیں۔ خیریت سے ہوں۔“

”پھر کیا بات ہے کہ جاگ رہی ہو۔ گھڑی دیکھو رات کے دو بج رہے ہیں؟“

”آں..... ہاں!“ وہ فوراً جواب نہ دے سکا۔ بیڈ روم میں زیرو پاؤڈر کی دھیمی سی روشنی تھی اور سامنے بڑے سے ٹی وی اسکرین پر ماروی دکھائی دے رہی تھی۔ اسکرین پر اندھیرا سا تھا۔ اس ماحول میں یوں لگتا تھا کہ وہ اندھیرے میں اس کے پاس آ گئی ہو۔ وہ بولا۔ ”ہاں میں بھی جاگ رہا ہوں۔ یہ غرومیاں بڑی ظالم ہوتی ہیں۔ سوئے نہیں دیتیں۔“

وہ محرومی کا مطلب سمجھ گئی۔ اشارہ اسی کی طرف تھا۔ وہ بولا۔ ”مراد یاد آ رہا ہے نا؟“

اس نے درد بھری آواز میں کہا۔ ”ہاں.....!“ اس کے منہ سے ہاں ایسے نکلی جیسے دل سے آہ نکلی ہو۔ محبوب نے بھی کہا۔ ”آہ.....! بہت یاد آتی ہے۔ یہ یادیں بہت تڑپاتی ہیں۔“

وہ اس کے حوالے سے اپنی بات کر رہا تھا اور یہ صاف سمجھ میں آ رہا تھا۔ ادھر ماروی کی جدائی ستا رہی تھی۔ ادھر مراد کی جدائی زلزلہ مچ رہی تھی۔

”میں کچھ کہنا چاہتی ہوں۔“

”ہاں کہو۔ سن رہا ہوں۔“

”کیا کہوں؟ کیسے کہوں؟ آپ خود گھمے ہوئے ہیں۔“

”یہ تقدیر کا قاتل ہے۔ ہم دونوں کی آنکھیں ایک ہی ہیں۔ میری بات نہ کرو۔ اپنی تکلیف بیان کرو۔ یقیناً تم نے بہت مجبور ہو کر مجھے کال کی ہے۔“

”ہاں میرا دل گھبرا رہا ہے۔ بار بار یہی بات دماغ میں آ رہی ہے کہ مراد بیمار ہوگا یا کسی مشکل میں ہوگا۔“

”خدا نہ کرے وہ کسی مشکل میں ہو۔ میں نے جیل کو اپنی مٹھی میں رکھا ہے۔ مراد کو کوئی پریشانی ہوگی تو وہ دور کرے گا۔ خدا نہ کرے کوئی بڑا مسئلہ ہوگا تو مجھے کال دے گا۔“

وہ بولی۔ ”جیل والا اس کی تکلیف کو نظر انداز کر سکتا ہے۔“

جہانگیر بکس

معروف دانشور اور سیاسی رہنما لاجپت سنگھ کی سرگت حیات



افغان جیل پہلے چھ مہینے بیتے لاجپت سنگھ کی درد انگیز زوداد موت کے منہ سے واپسی

499/-

معروف اسکالر سر فراز شاہ کی نئی کتاب



دل کی گہرائیوں سے نکلی روحانی گفتگو

575/-

نسیم مجازی کے شاہکار تاریخی ناول

آخری معرکہ

350/-

اورنگزادہ ٹوٹ گئی

400/-

اندر میری رات کے مسافر

350/-

ثقافت کی تلاش

150/-

پر دہلی و رخت

400/-

یوسف بن تاشین

350/-

معظم علی

350/-

خاک اور خون

450/-

کلیسا اور آگ

350/-

قافلہ حجاز

425/-

محمد بن قاسم

350/-

پورس کے ہاتھی

199/-



جہانگیر ادولفت

(جامع ترین) مروج و قدیم الفاظ، مرکبات، محاورات، ضرب الامثال اور فنی اصطلاحات کا مستند ترین لغت

انسان اور یوتا

350/-

آخری چٹان

350/-

سورماں بعد

150/-

سفید جزیرہ

240/-

شاہین

350/-

Buy online: www.jbdpress.com

042-37220879 051-5539609 061-4781781 041-2627568 021-32765086 022-2780128

جہانگیر بک ڈپو

”ٹھیک ہے۔ میں تمہاری پریشانی سمجھ رہا ہوں۔ کل صبح اس سے فون پر مراد کی خبریت معلوم کروں گا۔“ وہ ڈوبتی ہوئی آواز میں بولی۔ ”کل صبح؟“

”ہاں۔ اتنی رات کو وہ سو رہا ہوگا۔“

دوسری طرف ڈرا خاموشی رہی۔ پھر وہ بولی۔ ”یہ کہتے ہوئے اچھا تو نہیں لگتا مگر کیا کروں؟“

”کیا کہنا چاہتی ہو یو؟“

”میں اس سے بات کرنا چاہتی ہوں۔ آپ پر.....“

پھر یو جھڈا لٹا جاتی ہوں۔“

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ”مجھ پر یو جھکیسا؟“

”کیا کہوں؟ یہ سوچ کر ندامت ہی ہوتی ہے کہ آپ میری سہولتوں کے لیے پانی کی طرح دولت بہا رہے ہیں۔ وہ جیلز مراد سے بات کرانے کے پھر پیسے لے گا۔“

وہ بڑے ہی شہرے ہوئے انداز میں بولا۔ ”اتنا تو تم سمجھ رہی ہو کہ میری دولت نہیں بہہ رہی ہے۔ میں بہتا جا رہا ہوں۔“

یہ بات سمجھنے کی تھی اور وہ سمجھ رہی تھی۔ یہ دیکھتی آ رہی تھی کہ اسی کی سمت بہتا آ رہا ہے۔ وہ ساحل کی اور وہ لہر لہر اس سے ٹکرا کر اوپس چلا جاتا تھا۔ کیا وہ اسی طرح بہتے بہتے ڈوب جائے گا؟ یہ تو ظلم ہوگا۔ کیسی بیدردی ہوگی کہ اسے کسی تنکے کا بھی سہارا نہیں ملے گا۔

وہ کچھ بول نہیں پاری تھی۔ محبوب نے کہا۔ ”میں تمہارا آرام تمہاری نیند چاہتا ہوں۔ سو جاؤ۔ صبح پوری کوشش کروں گا کہ مراد سے تمہاری بات ہو جائے۔“

”یا اللہ! میں اس کی آواز سنوں گی؟“

”میں جو کہتا ہوں کرو۔ ابھی فون بند نہ کرو۔ اسے کان سے لگائے رکھو اور بیڈ پر جا کر لیٹ جاؤ۔“

ماروی نے خیالی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ وہ سامنے تھا اور اسے سونے کے لیے کہہ رہا تھا۔ وہ بیڈ پر آ کر لیٹ گئی۔

اس نے پوچھا۔ ”میں جو کہہ رہا ہوں وہ کد رہی ہو؟“

وہ فون کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ”ہاں۔“

”اب فون بند کر کے آنکھیں بند کرو۔ اللہ نے چاہا تو کل صبح تمہاری مراد پوری ہوگی۔“

اس نے فون بند کر کے دیکھا۔ صبح جس سے بولنے والی تھی وہ نظر آ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر بیماریا سکر اہٹ تھی۔ اس کی سماعت میں محبوب کی آواز سنائی دی۔

”سو جاؤ۔!“

اس نے بڑے سکون سے آنکھیں بند کر لیں۔

☆☆☆

وہ آہنی سلاخوں کے پیچھے فرش پر بستر پر سو رہا تھا۔ خواب گہری نیند میں آتے ہیں۔ وہ آگئی تھی۔ وہ خیالوں میں دن رات رہتی تھی۔ خوابوں میں کبھی کبھی آتی تھی۔ اور جب بھی آتی تھی۔ اس کی نگاہ پریشانیوں بڑھا دیتی تھی۔

اس نے پچھلی بار خواب میں دیکھا تھا کہ اس کا رہن سہن اور اس کا انداز بدل گیا ہے۔ وہ اونچی سوسائٹی کی ایک حسین دوشیزہ دکھائی دے رہی تھی۔ بڑے لوگوں کی محفلوں میں اس کی پذیرائی ہو رہی ہے۔ اس محفل میں مراد اس کے آگے پیچھے تھا۔ اسے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ محبوب نظر آ رہا تھا۔ اس نے تاج محل کا قلعہ اسے پیش کیا تھا۔ اکثر خواب اشارہ دیتے ہیں کہ کیا ہونے والا ہے؟ نہ ہو تب بھی دھڑکا لگا رہتا ہے کہ جو دیکھا ہے وہ ہونے والا ہے۔

اب بھی وہ فرش پر بستر پر پڑا دل توڑنے والا خواب دیکھ رہا تھا۔ ماروی رو رہی تھی اور کہہ رہی تھی۔ ”میں کیا کروں؟ محبوب صاحب اپنی مہربانیوں سے حواس پر چھا گئے ہیں۔“

وہ بولا۔ ”مہربانیاں متاثر کرتی ہیں۔ رلاتی نہیں ہیں۔“

”میں اس لیے رو رہی ہوں کہ محبت اور شرافت کے تقاضے پورے نہیں کر سکتی۔ مہربانیوں کا جواب مہربانیوں سے نہیں دے سکتی۔ میں انسانیت سے خالی ہو گئی ہوں۔ میں ان کے سامنے منہ پھیر کر رہتی ہوں جیسے ان کی کوئی اہمیت نہ ہو۔ جبکہ اہمیت ہے۔ میری عزت اور شرافت کا وہ محافظ سب سے اہم ہو گیا ہے۔ وہ نہ ہوتا تو میں کہاں ہوتی؟ میں تو اس معاشرے کی ایک لٹی پٹی لڑکی کہلاتی۔“

وہ بالکل اکیلے ہیں۔ میری طرف آنے والے پتھروں کو روک رہے ہیں۔ مجھے تو ان کی پاؤں کی جوتی بن جانا چاہیے۔ لیکن میں تمہارے حقوق انہیں نہیں دے سکتی۔ دل سے مجبور ہوں۔ تمہارے ہی نام سے جیوں گی۔ لیکن میرا ضمیر.....؟“ وہ بڑی ندامت سے بولی۔ ”میرا ضمیر مجھے جتنے نہیں دے گا۔ یہ ضمیر کہتا ہے انسان کو اس کی انسانیت کا اور نیکیوں کا صلہ دو۔ نہیں دو کی تو یہ تمہاری خود غرضی اور بے حسی ہوگی۔“

وہ دونوں ہاتھوں سے سر قہام کر بولا۔ ”یہ کھلی ہوئی سچائی ہے کہ سائیں ہم پر رحم کر رہے ہیں اور ہم ان پر ظلم کر رہے ہیں۔ ہم ان کے لیے کچھ نہیں کر سکتے۔ کیوں نہیں کر سکتے؟ کم از کم یہ تو کر سکتے ہیں کہ ان پر ظلم نہ کریں اور یہی مجھ

میں نہیں آتا کہ ایسا کیا کریں کہ ان پر ظلم نہ ہو۔ کچھ تو انہیں صلہ دیں۔“

وہ بولی۔ ”سیدھی سی بات ہے۔ ایک ہی صلہ ہے کہ وہ مجھے چاہتے ہیں۔ میں ان کی ہوجاؤں۔“

اور یہ کوئی بڑی بات تو نہیں ہے۔ بڑی آسانی سے ہوجاؤں گی۔ لیکن پھر کیا ہوگا؟

انہیں میرا بدن ملے گا۔ روح نہیں ملے گی انہیں میری خدمت گزاری ملے گی۔ پیار میں پھنسی ہوئی ماروی نہیں ملے گی اور جب پوری کی پوری خود کو نہیں دے سکوں گی۔ اندر سے تمہاری رہوں گی تو یہ سائیں سے سراسر بے ایمانی ہوگی۔“

وہ روتے روتے بولی۔ ”میں کیا کروں؟ میں کیا کروں؟ کہیں جا کر چھپ جاؤں؟ نظر نہ آؤں تو میری طلب نہیں رہے گی۔ پھر مجھے مطلوب رہوں تو مر جاؤں۔“

اچانک آنکھ کھل گئی۔ وہ کونھری کی تاریکی میں فرش بچھونے پر پڑا ہوا تھا۔ فجر کی اذان سنائی دے رہی تھی۔ وہ فوراً ہی کلمہ پڑھتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کے خیالوں میں وہ اب تک رو رہی تھی۔

دل کو کچل لیتے والے خواب اکثر فجر کو اس وقت آتے ہیں۔ جب رات دم توڑتی ہے۔ وہ تھوڑی دیر تک تاریکی میں آنکھیں میچاڑے سوچتا رہا۔ پھر سپاہی نے معمول کے مطابق آکر نماز کے لیے دروازہ کھول دیا۔

اس نے پچھلے روز نماز کے بعد پیش امام کے سامنے اپنا مسئلہ پیش کیا تھا اور انہوں نے دینی احکامات کے مطابق مشورہ دیا تھا کہ قتل کا مقدمہ برسوں چلتا رہے گا۔ اس لڑکی کو اپنے بھروسے پر بن جانا نہ رہتے دو۔

مراد نے کہا تھا۔ ”میں کیا کر سکتا ہوں؟ وہ میرے سوا کسی اور کی منکوحہ نہیں بنے گی۔“

انہوں نے کہا تھا۔ ”کسی سے نکاح نہیں کرے گی تو مگر وہ ہوجائے گی یا مگرہ کر دی جائے گی۔ کمزور عورت جبر اور تشدد کے آگے ہار جاتی ہے۔ آبرو لٹا کر ہار جانے سے پہلے ہی ایک محافظ مدد کی منکوحہ بن جاتا چاہیے۔“

وہ نماز پڑھنے کے بعد قیدیوں کے ساتھ بیٹھ کر کلام پاک کی تلاوت کر رہا تھا۔ کوئی بھی مسئلہ حل نہ کیا جائے تو وہ عبادت کے دوران میں الجھتا ہے۔ اور یہ غلطی ہو رہا تھا کہ وہ تلاوت کے دوران میں بھی بار بار آ رہی تھی۔ اس نے پڑھنا ہو کر کتاب کو چوم کر آنکھوں سے لگا کر بند کر دیا۔ کیا کرے؟ دماغ میں پچھل کی پٹی تھی۔ سوتے وقت خوابوں

میں اور جاتے وقت خیالوں میں محبوب کی نیکیاں اور احسانات تھے کہ ان کے سیر سے صلہ مانگ رہے تھے۔

وہ صلہ نہیں دے سکتی تھی اس لیے رو رہی تھی۔ مراد پر فرض تھا کہ اس کے آنسوؤں کو پونچھے۔ وہ بچک رہی تھی۔ اسے اس راہ پر لگائے جہاں اس کی سلامتی تھی۔

مسئلہ ایک نہیں تھا۔ مسائل کا انبار تھا۔ وہ جیل کی چار دیواری میں رہ کر نہیں جانتا تھا کہ باہر ماروی کے لیے خطرات بڑھتے جا رہے ہیں اور آج رات وہ ایک دہن کھلی کو رخصت کرنے مین کوٹھ کے میدان جنگ میں جانے والی تھی۔

عبادت کے بعد اس کی ڈیوٹی جیل کے باورچی خانے میں ہوتی تھی۔ وہ ادھر جانے لگا تو ایک سپاہی نے آکر کہا۔ ”ادھر چلو۔ جیلر صاحب نے بلایا ہے۔“

وہ اس کے پیچھے آفس میں آیا۔ وہاں جیلر میز کے پیچھے ریوالونگ چیئر پر ادھر سے ادھر گھوم رہا تھا۔ اسے دیکھ کر بولا۔ ”تمہاری نوکری ہی ایسی ہے۔ ادھر سے ادھر ہوتے رہتے ہیں۔ بھی قانون کی طرف، بھی مجرموں کی طرف۔ تیری لگائی کیا چیز ہے؟ وہ چانڈیو صاحب کو دوڑاتی ہے۔ چانڈیو صاحب ہمیں دوڑاتے ہیں۔ تیری کال آنے والی ہے۔“

مراد کے دل کی دھڑکنیں کچھ تیز ہو گئیں۔ وہ اپنی ماروی کی آواز سننے والا تھا۔ جیلر نے کہا۔ ”پتا نہیں کتنی دیر میں کال آئے گی۔ تجھے کہاں بٹھائیں؟ قیدی ہمارے سامنے زمین پر انکڑوں بیٹھے ہیں۔ مگر تو قیدی آئی ہی ہے۔ مگر قیدی تو پھر قیدی ہی ہوتا ہے۔ تجھے سر تو نہیں بٹھا سکتے۔“

اس نے ایک سپاہی سے کہا۔ ”آج ایک نیا حوالاتی آیا ہے۔ اسے لے آ۔“

سپاہی دوسرے کمرے میں گیا اور جیل میں آنے والے ایک ڈبل پتے سے بوڑھے قیدی کو پکڑ کر لے آیا۔ جیلر نے کہا۔ ”اے بڑے! اچل کھڑا بن جا۔“

وہ تھرتھراتے ہوئے دونوں کھٹے اور دونوں ہاتھ فرش پر یک کر کھڑا بن گیا۔ جیلر نے ہتھوڑے مراد سے کہا۔ ”لے بھی دی آئی ہی تیرے لیے کرسی بن گئی۔ دیکھ کیسی ریڈی میڈ ہے۔ بیٹھ جا۔“

مراد پریشان ہو گیا۔ اس بوڑھے کو دیکھتے ہی اسے اپنا مقتول باپ دکھائی دیا تھا۔ وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر عاجزی سے بولا۔ ”حضور! میں ایسے ہی ٹھیک ہوں۔“

جیلر دلا در جان کی پیشانی پر ٹھٹھیں پڑ گئیں۔ ”اور میں

جو کہہ رہا ہوں بیٹھے کے لیے؟

”آپ ہمارے حاکم ہیں۔ ہم غلام ہیں۔ آپ کے کسی حکم سے انکار کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ مگر یہ بہت بوڑھے ہیں۔ باپ کی جگہ ہیں۔“

اس نے کہا۔ ”تو قاتل ہے تو تیرا یہ باپ چور ہے۔ بہت بڑی چوری کے الزام میں آیا ہے۔“

مراد نے کہا۔ ”جیسے میں جھوٹے الزام میں آیا ہوں۔“

”زیادہ نہ بول۔ بیٹھ جا۔“

وہ پھر دونوں ہاتھ جوڑ کر اس کے آگے سر جھکا کر بولا۔ ”حضور! شرم سے سر جاؤں گا۔ مجھے کھڑا رہنے دیں۔“

وہ میز پر سے فون اٹھا کر بولا۔ ”میں زیادہ نہیں بولتا۔ میرے فون پر کال آنے والی ہے۔ اس کا سوچ آف کر دوں گا۔ تیری لنگائی وہاں ہیلو بلیو جتنی رہے گی۔“

مراد نے تڑپ کر فون کو دیکھا۔ یوں لگا کہ جسم سے کچھ نکل لی گئی ہے۔ وہ پھر ہاتھ جوڑ کر عاجزی سے بولا۔ ”میں سر جاؤں گا۔“

”گھوڑے پر بیٹھ کر زندہ رہے گا اور اب تو اس پر بیٹھ کر ہی فون پکڑے گا۔ نہیں تو کوئی بات نہیں ہوگی۔“

وہ دیدے پھیلا کر بوڑھے قیدی کو دیکھنے لگا۔ تصور میں دکھائی دیا۔ وہ تھر تھراتے ہوئے بوڑھے کی پیٹھ پر بیٹھا اپنی محبوبہ سے، اپنی جان حیات سے پیار بھری باتیں کر رہا ہے۔

اس نے انکار میں سر ہلایا۔ ایسے وقت تو محبت بھری گفتگو ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ پیٹھ پر تو گالیاں دینے کے لیے بیٹھا جاتا ہے۔

پیٹھ پر وہ بیٹھے ہیں جو مغرور اور بد دماغ ہوتے ہیں۔ دیکھا جائے تو لوگ تہذیب کی پیٹھ پر سوار ہو کر جیلوں میں آتے ہیں۔

مراد نے اس کو رد بوڑھے کو دیکھا۔ کسی کی پشت پر بیٹھنا تہذیب کی وجہاں اڑانا ہے۔ کیا وہ ایک بزرگ کی پشت پر سوار ہو کر اپنی ماروی کے دکھ درد کو اور مسائل کو سمجھ سکے گا؟

”نہیں۔“ وہ انکار میں سر ہلا کر بولا۔ ”میرے منہ سے آواز نہیں نکلے گی۔ یہ ماروی سے پیار نہیں ہوگا۔ اس کی تو جین ہوگی۔“

اور میں نے اس کی آواز نہ سنی تو کیا جیل کو کوٹھری میں سکون سے رہ سکوں گا؟

دلاور جان نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”تمہارے جیسے

چور بد معاش اور قاتل یہاں آتے ہیں۔ تم سے بھی زیادہ خطرناک قیدیوں کے ساتھ تماشے کرنے کا حزمہ آتا ہے۔

ہم تمہاری اوقات دکھاتے ہیں کہ دیکھو تم سب جوتوں کی ٹوک پر رہنے والے بد معاش ہو۔ یہاں تمہاری دہشت اور بد معاشیاں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔“

”میں بد معاش“ قاتل اور دہشت گرد نہیں ہوں۔ میں باہر بھی سر جھکا کر چلتا رہا ہوں۔ یہاں بھی سر جھکا رہتا ہے۔ آپ میری گردن کاٹ کر پھینک دیں۔ لیکن فون بند نہ کریں۔ میری ویران زندگی میں وہی ایک آواز ہے جو مجھے زندہ رکھتی ہے۔“

”تو انی دیر سے بھوک رہا ہے اور حکم نہیں مان رہا ہے۔ قسمت کا دعویٰ ہے کہ میں چاندیو صاحب کا لٹا کر رہا ہوں۔ ورنہ اب تک پٹائی شروع ہو جاتی۔“

”میں آپ کو خدا اور رسول کا واسطہ دیتا ہوں۔ خدا کے لیے مجھے ایسا حکم نہ دیں۔ میں آپ کے پاؤں پکڑتا ہوں۔“

وہ میز کے دوسری طرف جیلر کے قدموں میں چاندیو صاحب کو دیکھا۔ دو سپاہیوں نے اسے پکڑ کر پیچھے دھکا دیا۔ وہ ٹوٹ کر پھر اس بوڑھے کی طرف آ گیا۔ وہ اب بھی تنک فرش پر گھوڑا بنا ہوا تھا۔

اچانک جیلر کے فون سے کالنگ ٹون ابھرنے لگی۔ اس نے نمبر پڑھ کر مسکراتے ہوئے فون کو فضا میں بلند کیا پھر کہا۔ ”چاندیو صاحب کال کر رہے ہیں۔ اب بول کیا بولتا ہے؟“

مراد نے پریشان ہو کر بوڑھے قیدی کو دیکھا۔ جیلر نے کہا۔ ”اس پر بیٹھ گا تو اسے آن کر دوں گا۔ بات کراؤں گا۔ ورنہ یہ بھی بند ہو جائے گا۔“

اس کا دل فون کی طرف کھینچا جا رہا تھا۔ اس فون کے پیچھے محبوب تھا اور محبوب کے بعد ماروی بولنے والی تھی۔ وہ پھر ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ”حضور یہ بزرگ ہے۔ میرے ہی نہیں آپ کے والد کے بھی برابر ہے۔“

وہ ایک دم سے گرجتے ہوئے گالیاں دیتے ہوئے بولا۔ ”کتے! میں تیرا منہ توڑ دوں گا۔ یہ تیرے جیسے جرائمیوں کا باپ ہے۔ تو اسے میرے باپ کے برابر کہہ رہا ہے؟ تیری شامت آگئی ہے۔ اب میں چاندیو صاحب سے لین دین نہیں رکھوں گا۔“

اس نے فون والا ہاتھ فضا میں بلند کرتے ہوئے کہا۔ ”اے کتے!...! یہ دیکھ۔“

یہ کہتے ہی اس نے فون کا گلا دبا دیا۔ کالنگ ٹون کا دم

گھٹ گیا۔ کال کٹ گئی۔ مراد جیسے سانس لینا بھول گیا۔ ماروی آتے آتے واپس چلی گئی تھی۔

جیلر نے کہا۔ ”یہاں میری حکومت ہے۔ تمام قیدی اس فون کی طرح میری بھی رہتے ہیں۔ ابھی پھر کال آئے گی۔ میں پھر بند کر دوں گا۔“

وہ خالی خالی نظروں سے جیل کے حاکم اعلیٰ کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے غرور فون کو دیکھ کر کہا۔ ”ماروی! ہم نے بزرگوں کی گود میں بیٹھ کر پیار کرنا سیکھا ہے۔ پیٹھ پر بیٹھ کر تو فرعون بولتے ہیں۔ ہماری محبت کیسے بولے گی؟“

رنگ ٹون پھر چننے لگی۔ جیلر نے فون کو میز پر سے اٹھا کر اسے دکھایا پھر کہا۔ ”وہ چاندیو بھٹی تیری لنگائی کا دیوانہ ہے۔ اسے خوش کرنے کے لیے اور کھٹنی بجاتا رہے گا۔“

وہ فون بند کر کے بولا۔ ”ابھی پھر کھٹنی بیچے گی۔ یہ بھی خوب تماشا ہے۔ دیکھتا ہوں کب تک ہوتا رہے گا؟“

وہ کم صم سا تھا۔ ذہن پر دھندلی چھا گئی تھی۔ اس دھند میں ماروی کی سمت جانے کا راستہ کم ہو گیا تھا۔ وہ اس کے راس پھرے بیٹھے لیجے سے محروم ہو رہا تھا۔

کھٹنی پھر بچنے لگی۔ جیلر نے فون اٹھا کر دکھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ بند ہونے والا ہے۔“

مراد نے بوڑھے کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے پھر دونوں ہاتھ ٹیک کر بولا۔ ”بابے! ہمیں آج نہیں توکل کرنا ہی ہے۔ بہت عمر گزار لی۔ ہم خود مر جائیں یا یہ مار ڈالیں۔ مگر اس سے پہلے ایک ٹنکی کرنا چاہیے۔ میری پیٹھ پر سوار ہو جا۔ میری محبت کو سر بلند کر دے۔“

بابے نے دیر نہیں کی۔ فرش سے اٹھ کر اس کے پاس آیا۔ اس کا بوڑھا جسم ہمیشہ ہی ہولے ہولے لرزتا رہتا تھا۔ وہ لرزتے ہوئے اس کی پشت پر سوار ہوا تو جیلر کرسی سے اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ مراد نے صرف حکم عدولی نہیں کی تھی جیل کی سلطنت کے بادشاہ سلامت کی تو جین بھی کی تھی۔

اس نے غصہ سے گرجتے ہوئے گالیاں دیتے ہوئے میز پر سے ایش ٹرے کو اٹھایا۔ پھر اسے پتھر کی طرح کھینچ کر مارا۔ بوڑھے کے سر پر دھاتی پتھر کی طرح لگا۔ بے چارہ مراد کی پشت پر سے ٹوٹ کر فرش پر گر کر پکڑ پکڑاٹنے لگا۔

دلاور جان دوڑتے ہوئے آکر مراد کو لاتیں مارنے لگا پھر ایک سپاہی سے ڈنڈا لے کر اس کی ہڈیاں توڑ ڈانا چاہتا تھا۔ ایسے وقت سپاہی نے پیچ کر کہا۔ ”سر! بدھارنے والا ہے۔“

دلاور جان کے جیل کے بادشاہ سلامت کے ذہن کو

جھکا سا لگا۔ جیل میں قیدی مر جائے تو اس کی ساری ذمہ داریاں جیلر پر ڈالی جاتی ہیں۔ شاید اس کی شامت آگئی تھی۔

اس نے جھک کر بوڑھے کو دیکھا۔ وہ ابھی زندہ تھا۔ اس کی پیشانی سے ابھ رہا تھا۔ آئندہ یہ جو ابھی لازمی تھی کہ وہ قیدی جیل میں جان یواحد تک زخمی کیسے ہوا تھا؟

ایک سپاہی جیل کے ڈاکٹر کو بلانے بھاگتا ہوا گیا تھا۔ جبکہ اسے اسپتال پہنچانا ضروری تھا۔ لیکن یہ ایسا سنگین معاملہ تھا کہ دلاور جان اسے اندر ہی اندر غمنا لینا چاہتا تھا۔ ابھی اس آفس کے باہر کی کوئی من لٹنے والی نہیں تھی۔

وہ بری طرح جھنجھلا گیا تھا۔ بیٹھے بیٹھے اسے اس پر قانونی عذاب نازل ہونے والا تھا۔ وہ بوڑھے کے پاس سے اٹھ کر پھر مراد کو لاتوں سے مارنے لگا۔ اور کیا کرتا ہی پر غصہ اتار رہا تھا۔ اس نے ہماری بھر کم جوتے پہنے ہوئے تھے۔ یقیناً مار کھانے والے کو ہتھوڑے کی طرح لگ رہے ہوں گے۔

لیکن نہیں لگ رہے تھے۔ اس نے ایک بزرگ کی تو جین نہ کر کے پیار کو عزت اور وقار دیا تھا۔ ایسے عاشق فدا ہوجاتے ہیں۔ تب ہی عشق کو لافانی کر دیتے ہیں۔

☆☆☆

محبوب پریشان ہو گیا تھا۔ وہ اپنے خاموش فون کو دیکھ کر حیرانی سے سوچ رہا تھا۔ ”بات کیا ہے؟ کال کر رہا ہوں اور جیلر اسے کال کر رہا ہے۔ کیا مجھ سے بات کرنا نہیں چاہتا؟“

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر ٹیبلے لگا سوچنے لگا۔ ”کیا جیلر کا مزاج بدل گیا ہے؟ یا وہ رشوت کا بھڑا بڑھانا چاہ رہا تھا؟ کیا جیج مسلمان ہو گیا ہے؟ ایسا تو ہو نہیں سکتا کہ وہ رشوت خور سدھر جائے۔“

اس نے انکار میں سر ہلا کر سوچا۔ ”نہیں۔ حرام کی کمائی ایسے لوگوں کے خون میں رچی بسی رہتی ہے۔ یہ لوگ سرکاری تنخواہ سے ہی نہیں پاتے۔ جیلر حرام نہیں کھائے گا تو چرپی پھل جائے گی۔ سوکھ کر کاٹنا ہو جائے گا۔ پھر بات کیا ہے۔ وہ بار بار کیوں میری کال کاٹ رہا ہے؟

اچانک کالنگ ٹون ابھری۔ وہ ایک کرفون کے پاس آیا۔ اسے بیڈ پر سے اٹھا کر دیکھا۔ کئی سے اسکرین پر ماروی کا نام روشن تھا۔ وہ اپنی کوئی میں مراد کی کال کی منتظر تھی۔ محبوب نے بین دبا کر فون کو کان سے لگا یا پھر کہا۔ ”ہاں۔ بولو ماروی؟“

کھٹنی سر ملی سی آواز سنائی دی۔ ”آپ نے وعدہ کیا تھا۔“

”ہاں مجھے یاد ہے۔ میں بڑی دیر سے رابطہ کر رہا ہوں۔ جیلر اپنی سیٹ پر نہیں ہے۔ رائڈ پر نکلا ہوا ہے۔ ایک آدھ گھنٹے میں اس سے بات ہو سکے گی۔“

اس نے جھوٹ کہہ دیا کہ جیلر سیٹ پر نہیں ہے۔ اگرچہ کہتا کہ وہ فون پر بات نہیں کر رہا ہے تو وہ ہاؤس ہو جاتی۔ اس کے چہرے پر جوروٹی آئی ہے۔ وہ لوٹ جاتی۔

اس کے باوجود اس نے مایوسی سے پوچھا۔ ”بات ہوگی نا؟ جیلر پریشان تو نہیں کرے گا؟“

”نہیں کرے گا۔ میں نے دو گھنٹے پہلے اسے فون کیا تھا۔ تمام معاملات طے کیے تھے۔ وہ راضی ہو گیا تھا۔ لیکن ڈیوٹی ایسی آڑی ہوئی کہ وہ مجبور ہو گیا ہوگا۔ تم اطمینان سے رہو۔ گھنٹے دو گھنٹے میں ضرور مراد سے باتیں کر سکو گی۔“

وہ مطمئن ہو گئی۔ اس عرصہ میں محبوب پر آنکھیں بند کر کے بھروسہ کرنے لگی تھی۔ وہ جوتھتا تھا، کرا تا ضرور تھا۔

اور اب محبوب کو یہ لگ رہی تھی کہ مراد سے کیسے بات کرائے؟ آخر وہ جیلر کیوں اس کی کال کاٹ رہا ہے؟

اس نے پھر اسے کال کیا۔ دوسری طرف دیر تک تیل سنائی دیتی رہی پھر پہلے کی طرح بند ہو گئی۔ اب ماٹھا ٹھنکا۔ عقل نے کہا۔ مراد سے وہاں کوئی غلطی ہوئی ہے۔ جیلر کسی وجہ سے ناراض ہے۔ یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ مجرموں کی دنیا میں رہنے والے نے رشوت خوری سے توبہ کر لی ہو۔

اس نے فیصلہ کیا کہ وہاں جانا ہی ہوگا۔ اسے تو جیسے اور کوئی کام ہی نہیں تھا۔ ماروی ایک مین دیوٹی اور وہ کھلونے کی طرح چل پڑتا تھا۔ وہ بیگ میں ایک بڑی رقم رکھ کر باہر اپنی کار میں آکر بیٹھ گیا۔ تیز رفتاری سے ادھر جانے لگا۔ اربوں روپے کا روادار کرنا بھی بھلا کوئی کام ہے؟ کام تو یہی تھا اس کے آنسو پو پھٹا اور اس کے لبوں پر مسکراہٹیں لانا۔

جیلر دلاور جان واقعی مشکل میں پڑ گیا تھا۔ قسمت اس حد تک ساتھ دے رہی تھی کہ وہ بوڑھا مرتے مرتے بچ گیا تھا۔ اسے آسجین ماسک پہنا کر اس کی سانسیں بحال کی جا رہی تھیں۔

صرف ایک پریشانی یہ تھی کہ پیشانی پر زخم کا گہرا نشان ابھی تازہ تھا۔ وہ زخم بھرنے کے بعد بھی نظر آتا رہتا۔ کبھی وہاں مجسٹریٹ کی ٹیم آتی تو وہ بوڑھا اس جیلر کے خلاف بول سکتا تھا۔

محبوب وہاں پہنچا تو دلاور جان گھبرا یا ہوا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ”دلاور صاحب! کیا بات ہے؟ آپ ہم سے

ناراض ہیں؟“

وہ ناگواری سے بولا۔ ”سوری جان بڑا صاحب! میں آپ کے ذیل قیدی کے بارے میں کوئی بات نہیں کروں گا۔“

”پلیز اس کا غصہ مجھے نہ دکھائیں۔ آپ سمجھ دار ہیں۔ غصہ میں بھی یاد رکھیں کہ میری ذات سے آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا ہے۔ فائدہ ہی فائدہ پہنچ رہا ہے اور آئندہ بھی پہنچتا رہے گا۔“

”آپ کے آدمی سے تو نقصان پہنچ رہا ہے۔ آپ کو پتا نہیں ہے۔ میں اس کی وجہ سے مشکل میں پھنس گیا ہوں۔ قانون کے شکنجے میں پھنس سکتا ہوں۔“

محبوب نے شدید حیرانی سے پوچھا۔ ”مراد نے ایسا کیا کیا ہے؟ آپ اس کی وجہ سے قانونی گرفت میں کیسے آئیں گے؟“

”اس کی نافرمانی کی وجہ سے۔ میں نے اسے حکم دیا تھا کہ وہ ایک بوڑھے آدمی کی پشت پر بیٹھ جائے۔ لیکن اس نے حکم ماننے سے انکار کر دیا۔“

”کیوں انکار کر دیا؟“

”کہنے لگا۔ میرے ابا کا چالیسواں نہیں ہوا ہے۔ وہ بوڑھا میرے باپ جیسا ہے۔ میں اس پر نہیں بیٹھوں گا۔“

”جان صاحب! اس نے آپ کا حکم نہیں مانا یہ غلطی کی ہے۔ لیکن آپ ایک مقول باپ کے بیٹے کے دلی جذبات کو سمجھیں جو بوڑھا اسے باپ نظر آتا ہو وہ اس پر کیسے چڑھ کر بیٹھے گا۔“

وہ ہاتھ بچا کر بولا۔ ”کوئی باپ بیٹے کے جذبات نہیں سمجھتا۔ عاشق مثنوی کی بات سمجھتا ہے۔ میں نے کہا۔ اسے اس کی لگائی سے باتیں کرنے کے لیے اس وقت فون دیا جائے گا جب وہ میرے حکم کی تعمیل کرے گا۔“

محبوب نے حیرانی سے کہا۔ ”آپ کیسا حکم دے رہے تھے؟ وہ ایک بزرگ کی پیٹھ پر بیٹھ کر اپنی ماروی سے کیسے باتیں کر سکتا تھا۔ کوئی محبت کرنے والا ایسا کر ہی نہیں سکتا۔“

”ایسی محبت کرنے والے لات جوتے بھی کھاتے ہیں۔“

اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ”مراد کہاں ہے؟ میں اس سے مل سکتا ہوں؟“

وہ بولا۔ ”آج نہیں مل سکتے۔ میں بہت پریشان ہوں۔“

”آپ پریشانی بتائیں۔ میں دور کروں گا۔“

وہ بولا۔ ”مجھے مراد پر غصہ آیا تھا۔ میں نے اس پر حملہ کیا تھا۔ بوڑھا قیدی زخمی ہو گیا ہے۔ اگر جانکاب یہاں مجسٹریٹ چیکنگ ہوئی تو میں پھنس جاؤں گا۔ وہ بوڑھا

میرے خلاف بیان دینے سے باز نہیں آئے گا۔“

”اس بوڑھے کو خرید جا سکتا ہے۔“

”وہ ابھی مرتے مرتے بچا ہے۔ قبر میں پاؤں لٹکا ہوا ہے۔ خود کوچ کر تم کہاں چھوڑ کر جائے گا۔“

”مرنے والوں کی ضرورتیں دنیا میں رہ جاتی ہیں۔ ہو سکتا ہے اس کی کوئی آخری ضرورت رہ گئی ہو۔ اگر ایسا ہے تو میں اس کی ضرورت پوری کروں گا۔ اس شرط پر تم دوں گا کہ آپ مراد کو معاف کر دیں گے اور ابھی ایک گھنٹے کے اندر ماروی سے اس کی بات کرائیں گے۔“

جیلر نے اسے سوچتے ہوئے دیکھا۔ پھر کہا۔ ”میں ابھی اس بوڑھے پیارے معاملے کے آتا ہوں۔ آپ آرام سے بیٹھیں۔ چائے شائے پیئیں۔“

وہ چلا گیا۔ محبوب نے اسے ناگواری سے جاتے ہوئے دیکھا اور سوچا۔ ”ادنیہ! ان سرکاری افسروں کا کوئی دین ایمان نہیں ہوتا۔ میں خوب سمجھتا ہوں یہ ابھی آئے گا۔ بڑی رقم ملے گی تو ساری فرعونیت بھول کر مراد کو معاف کر دے گا جبکہ مراد نے کوئی غلطی نہیں کی ہے۔ ایک بزرگ کا لحاظ بھی کیا ہے اور محبت کرنے والوں کی عظمت کو بھی برقرار رکھا ہے۔“

اور واقعی دلاور جان نے آفس کے باہر آکر سوچا۔ ”بوڑھا قیدی آج ہی یہاں آیا ہے۔ انٹری رجسٹر میں صرف ایک بات کا اضافہ کروں گا کہ وہ زخمی حالت میں یہاں آیا تھا۔ وہ زخم گہرا ہے۔ بعد میں بھی اس کا نشان رہے گا۔“

وہ ہر پہلو پر غور کرتے ہوئے سوچ رہا تھا اور سر ہلارہا تھا۔ ”ہاں۔ اس طرح مجھ پر الزام نہیں آئے گا کہ میں نے اسے زخمی کیا ہے اور میرے دیے ہوئے زخم سے وہ بعد میں مر گیا ہے۔ ہر حال ابھی تو زندہ ہے۔ بعد میں دیکھا جائے گا۔“

وہ آفس میں آکر اپنی کرسی میں بیٹھ گیا۔ پھر محبوب سے بولا۔ ”آپ نے ٹھیک کہا تھا۔ اس بوڑھے کی کوئی آخری ضرورت ہوگی۔ دراصل اس کے بیٹے نے گرجیشن کیا ہے۔ اسے سعودی عرب میں اچھی نوکری مل رہی ہے۔ ایجنٹ پچاس ہزار روپے مانگ رہا ہے۔ اسی لیے رقم حاصل کرنے کے لیے بوڑھے نے چوری کی گئی اور پکڑا گیا تھا۔“

محبوب نے کہا۔ ”میں سمجھ گیا۔ آگے نہ بولیں۔ میں ابھی پچاس ہزار روپے دے رہا ہوں اور جو فون پر باتیں کرائیں گے اس کے دس ہزار الگ سے دے رہا ہوں۔ آپ مراد کو بلا لیں۔“

جیلر نے سپاہی کو حکم دیا۔ ”مراد کو یہاں لے آؤ۔“

سپاہی چلا گیا۔ محبوب نے بیگ سے رقم نکال کر اس کے سامنے رکھ دی۔ اس نے مسکرا کر شکر یہ ادا کرتے ہوئے رقم کو میز کی ایک دراز میں رکھ دیا۔

تھوڑی دیر بعد ہی مراد سپاہی کے ساتھ آیا تو اسے دیکھتے ہی محبوب کے دل کو چوٹ سی گئی۔ وہ زخمی تھا۔ اس کی مرہم پٹی کی گئی تھی۔ کئی جگہ مرہم لگ ہوا تھا اور کئی جگہ چھوٹی بڑی پٹیاں چسپی ہوئی تھیں اور چہرہ ہوجا ہوا تھا۔

وہ فوراً ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ مراد کے دونوں شانوں کو تمام کر جیلر سے بولا۔ ”دلاور صاحب! یہ آپ نے کیا کیا ہے؟ میں اس کی حفاظت اور سلامتی کے لیے آپ کے منہ سے نکلی ہوئی رقم دیتا ہوں۔ اور آپ ایسی حفاظت کر رہے ہیں؟“

”جان بڑا صاحب! میں نے آج تک اسے ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ لیکن کچھ بھی ہو حکم کر رہا ہوں اس میں ماننا پڑتا ہے اور اس نے ماننے سے انکار کر دیا تھا۔“

”خدا کے لیے آپ اس سے ایسا حکم تو نہ منوائیں جو انسانیت اور تہذیب کے خلاف ہو۔“

”آپ ادا نہیں کیے ہیں۔ میں آپ کی بات مان لیتا ہوں۔ آئندہ آپ کو شکایت نہیں ہوگی۔“

محبوب نے مراد کے شانے کو تھپک کر کہا۔ ”دلاور صاحب زبان کے پتے ہیں۔ آئندہ تمہارے ساتھ ایسا نہیں ہوگا۔“

”سائیں! آپ کی مہربانیوں کے باعث ایسا نہیں ہوگا۔ آپ ہمارے لیے جو کر رہے ہیں ایسا تو صرف خدا ہی اپنے بندوں کے لیے کرتا ہے۔“

محبوب اس کے زخموں کو اور اس کے سوچے ہوئے چہرے کو بڑی تشویش سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”دلاور صاحب! یہ زخم اور گہرے ہو سکتے ہیں۔ چہرے کی سوچن اور بڑھ سکتی ہے۔ جیل کا ڈاکٹر عام سی پانی ملی ہوئی دوائیں دے گا۔“

”جان بڑا صاحب! آپ فکر نہ کریں۔ اسے پانی ملی ہوئی دوائیں نہیں دی جائیں گی۔ میں توجہ سے علاج کراؤں گا۔“

”کوئی ایسی صورت ہو سکتی ہے کہ میں اس کے لیے یہاں کسی اسپتال کو لے کر آؤں اور وہ اس کا علاج کرے۔“

وہ انکار میں سر ہلارہا کر بولا۔ ”سوری۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ یہ جیل کے قوانین کے خلاف ہے۔“

”آپ بہت سے کام قوانین کے خلاف کر گزرتے ہیں۔“

”ابھی یہ باتیں چھوڑیں۔ مراد کی لگائی سے فون پر

بات کراہیں۔“
 ”ہاں۔“ اس نے مراد کو دیکھ کر کہا۔ ”وہ بہت دیر سے انتظار کر رہی ہے۔ پریشان ہو رہی ہے۔ کیا تم اسے بتاؤ گے کہ یہاں کیا ہو چکا ہے اور تم بہت زخمی ہو؟“
 ”نہیں سائیں! وہ اور زیادہ پریشان ہو جائے گی۔ فون پر ہی رونے لگے گی۔“
 ”میں بھی یہی چاہتا ہوں۔ وہ صدمہ پہنچانے والے حالات سے بے خبر رہے تو اچھا ہے۔“
 وہ اپنا فون نکال کر نمبر سچ کرتے ہوئے جیلر سے بولا۔ ”پلیز اسے واش روم میں جانے دیں۔“
 وہ بولا۔ ”میری طرف سے اجازت ہے۔“
 محبوب نے فون مراد کو دیا۔ اس نے اسے لے کر کان سے لگا یا۔ اسی وقت اس کے دل میں اتر جانے والی آواز سنائی دی۔ ”ہیلو سائیں! میں انتظار کر رہی ہوں۔“
 وہ واش روم کی طرف جاتے ہوئے بولا۔ ”ماروی!.....! میں مراد بول رہا ہوں۔“
 اس نے واش روم میں آ کر دروازے کو اندر سے بند کر لیا۔
 وہ ذرا چپ ہو گئی پھر اس نے بے یقینی سے پوچھا۔ ”تم۔ مراد ہو؟“
 ”میری پہچان کے لیے دل سے سنو۔“
 اس نے کورڈ روڈز ادا کیے۔ ”میری ماروی کسی عمر کے شکستے میں نہیں آئے گی۔“
 وہ خوش ہو کر بولی۔ ”ہاں تم میرے مراد ہو۔ یا اللہ! میں کل رات سے انتظار کر رہی ہوں۔ سائیں نے کہا تھا صبح بات کراہیں گے اور اب صبح سے یہ وقت ہو گیا ہے۔“
 ”کوئی بات نہیں۔ بات تو ہو رہی ہے نا؟“
 ”ہاں خدا کا شکر ہے۔ سائیں کی مہربانی ہے۔ کل میرا دل گھبرا رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ تم بیمار ہو۔ دل ایسے ہی تو نہیں گھبرا رہا تھا۔ تم پر ضرور کوئی مصیبت آئی ہے۔“
 وہ اپنے ایک زخم کی پٹی کو چھو کر بولا۔ ”کوئی مصیبت نہیں آئی ہے۔ میں بالکل ٹھیک ہوں اور مجھے یہ نہیں پوچھنا چاہیے کہ تم کیسی ہو؟ سائیں کے ساتھ تمہیں کوئی فکر اور پریشانی ہو رہی نہیں سکتی۔ وہ تو دن رات تمہارا خیال رکھتے ہوں گے۔“
 ”پھر مجھے فکر اور پریشانی رہتی ہے۔ کیا تم سمجھتے ہو تمہاری فکر نہیں رہتی ہے۔ میں تمہارے لیے پریشان نہیں رہتی ہوں؟“

”یہ تمہارے دل کے معاملات ہیں۔ مجھے جب تک رہائی نہیں ملے گی تم پریشان رہو گی۔“
 ”کب رہائی ملے گی مراد؟ کبھی سوچتی ہوں کہ جیل توڑ کر چلے آؤ۔ ہم یہاں سے بھاگ کر دور بہت دور دنیا کے آخری سرے میں چلے جائیں گے۔“
 ”ایسی نادان سوچیں میرے دماغ میں بھی آتی ہیں اور میں لوہے کی مضبوط سلاخوں کو قہام کر رہا ہوں۔“
 ”آج مین گوشت میں میری سبیلی رومانی کی شادی ہے۔ میں تو کسی خوشی میں شریک نہیں ہوتی لیکن سبیلی نے ضد کی ہے۔ نہیں جاؤں گی تو مغرور کہلاؤں گی۔ ہمارے اس غریب علاقے کی کچھ عورتیں اپنے مردوں کے ساتھ کوٹھی میں آئی تھیں۔ میں ان کی نظروں میں بہت اونچی امیر زادی ہو گئی ہوں۔“
 ”اس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے۔“
 ”تم بھی یہی کہہ رہے ہو؟ اس کوٹھی میں اس امیرانہ شہادت باٹ میں کیا ہے میرا؟ اور کس رشتے سے میں یہاں رہتی ہوں؟“
 ”ماروی! یہ سوال میرا سر جھکا دیتا ہے۔“
 ”اسی لیے میں نے یہاں سے دور چلے جانے کا جو فیصلہ کیا ہے اس پر ضرور عمل کروں گی۔ میں تاریخ کو تم سے جیل میں ملاقات کروں گی پھر اسی رات یا دوسرے دن چاچا چاچی کے ساتھ یہاں سے چھپ کر نکل جاؤں گی۔“
 ”سائیں! کوڈھو کا دے کر نہیں جانا چاہیے لیکن مجبوری ہے۔ وہ احسانات کا بدلہ نہیں چاہتے اور ہم دے بھی نہیں سکیں گے۔ ادائیگی بڑی مہنگی پڑے گی ماروی!.....! کیونکہ ان کا دل ان کی دیوانگی نہیں چاہتی ہے۔“
 ”ہاں۔ یہاں سے دور چلے جانے سے ہی بات بنے گی۔ نہ میں ان کی نظروں کے سامنے رہوں گی۔ نہ وہ مہربانیاں کریں گے نہ میرے ضمیر پر بوجھ پڑے گا۔“
 ”تم بعد میں ان سے فون پر معافی مانگ لیتا۔“
 ”ہاں۔ میں دل کی گہرائیوں سے ان کا شکریہ ادا کروں گی اور وعدہ کروں گی کہ جس دن تمہیں رہائی ملے گی۔ اس دن تمہاری گھر والی بن کر ان سے ملنے کے لیے واپس آ جاؤں گی۔“
 ”ماروی! میں تاریخ کو تم یہاں ملے آؤ گی۔ اس کے ایک دن بعد بائیس تاریخ کو عدالت میں میری پہلی پیشی ہے۔“
 ”یہ تو اچھی خبر سنا رہے ہو۔ کیا اس دن فیصلہ ہو جائے گا۔ تمہیں رہائی مل جائے گی؟“

دانتوں کے درد، مسوڑھوں سے
 نحون آنا، ٹھنڈا اگر ملگنا اور
 دیگر تکالیف کے لیے

10 پیرا بلیم
 کا 1 حل

MEDICAM

Dr. Atta-ur- Rehman

Dental Surgeon
 ALTAMASH INSTITUTE OF DENTAL MEDICINE

مریض کا بھروسہ ڈاکٹر پر

ڈاکٹر کا بھروسہ 25 سال سے میڈی کی ایم ڈینٹل کلیم

”فیصلے اتنی جلدی نہیں ہوتے۔ پہلی پیشی میں مقدمہ کی ابتدائی کارروائیاں ہوں گی۔ دیکھیں گے کیا ہونے والا ہے۔“ محبوب بھی جیلر کے آفس میں تھپا بیٹھا بھی سوچ رہا تھا کہ عدالت میں پہلی سنوائی ہے۔ پتا نہیں مقدمہ کون سا رخ اختیار کرے گا۔ مجھے اس کے آنسو تکلیف پہنچاتے ہیں۔ مراد کو رہائی ملے گی۔ باروی کو دی مراد ملے گی تو میں اسے ہمیشہ ہتھ پوتے دیکھتا رہوں گا۔ یا خدا.....! مجھے کتنی آسودگی حاصل ہوگی۔

پھر اس عاشق کے ذہن میں پیار کا دوسرا پہلو آیا۔ کسی کو ٹھٹھ کر چاہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہمیں مل جائے۔ اس کے حسن کی تاڑ کی اور دلکشئی اس کی اداؤں کا بلیکین ہمارے لیے ہو۔

اس کے دل سے ایک مرد آہ نکلی۔ ”ہاں۔ میں اس کے پورے وجود کو اپنے اندر سیٹ لینا چاہتا ہوں۔ اور یہ اس وقت ممکن ہے جب مراد نہ ہو۔

اور وہ کیسے نہ ہو؟

ایسے کہ مقدمہ کمزور ہو جائے۔ اسے سزائے موت ہو جائے۔ موت اسے کم کر دے گی تو وہ مجھ میں اپنے مراد کو دیکھے گی۔ وہ محبوب کو نہ بھی مراد کی ہی صورت دیکھ کر آئے مگر آئے گی۔ میری زندگی میں آجائے گی۔“

وہ گونگا تلکار تھا۔ زبان سے طلب نہیں کرتا تھا۔ اسے پالینے کے لیے اندر ہی اندر ٹوٹا کھرتا رہتا تھا۔ اپنے بہترین اعمال پر اعتقاد تھا کہ وہ ایک دن اس کی طرف پہنچی آئے گی یا حالات خود ہی اس کی جھولی میں اسے لاکر ڈال دیں گے۔

وہ خیالات سے چونک گیا۔ آفس کا بیرونی دروازہ کھلا تھا۔ ایک جوان حیدر اور ایک برج پوش خاتون نظر آئیں۔ جیل کے اندرونی دروازے سے ایک سپاہی نے آکر ایڑی بجاتے ہوئے انہیں سلوٹ کیا۔ وہ حیدر محبوب کو دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے سپاہی سے پوچھا۔ ”پاپا کہاں ہیں؟“

سپاہی نے کہا۔ ”ریٹ روم میں ہیں۔“ پتا نہیں کیا بات تھی۔ اس حیدر نے پھر محبوب کو ایک ذرا سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ دوسری عبا اور نقاب میں تھی بالکل کم ہو گئی تھی۔ نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ نقاب کے پیچھے سے بولی۔ ”چلو اپنے باپ کے پاس۔“

وہ دونوں اس دفتر کی کمرے سے گزرتے ہوئے دوسرے دروازے سے ریٹ روم کی طرف جانے والی تھیں۔ اس وقت بھی وہ چور نظروں سے محبوب کو دیکھتی جا

رہی تھی۔ اس نے دروازے پر رک کر کہا۔ ”موم! آپ جاگیں۔ میں ابھی آتی ہوں۔“

موم کہلانے والی خاتون چلی گئی۔ محبوب اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ بھی سنجیدگی سے اسے دیکھتے ہوئے جیسے ٹھٹھ کے انداز میں چلتے ہوئے جیلر کی کرسی پر آکر بیٹھ گئی۔ پھر انگریزی میں بولی۔ ”مجھے یاد آتا ہے۔ میں نے کوئی دس ماہ پہلے تمہیں بریڈ فورڈ میں دیکھا تھا۔“

وہ سر ہلا کر بولا۔ ”ہاں میں برنس کے سلسلے میں برطانیہ اور امریکا جاتا رہتا ہوں۔“

وہ بولی۔ ”بریڈ فورڈ ساؤتھ میں پولیس اور ایک مفرد کے درمیان کاؤنٹر فائرنگ ہو رہی تھی۔ ٹریفک ڈک مگنی تھی۔ تم ایک اسٹریٹ میں اپنی کار روک کر کہیں سے لٹکنے کا راستہ دیکھ رہے تھے۔ اور پریشان ہو رہے تھے۔“ محبوب نے کہا۔ ”او گاڈ.....! تمہاری یادداشت بہت شارپ ہے۔ ایسی فائرنگ کے وقت تم نے مجھے کہاں سے دیکھ لیا تھا؟“

وہ بولی۔ ”تمہاری یادداشت کمزور ہے۔ یا پھر حسین لوکیاں تمہیں یاد نہیں رہیں۔ میں نے ہی تمہیں وہاں سے نکالا تھا۔“

محبوب نے اسے شدید حیرانی اور توجہ سے دیکھا۔ پھر کہا۔ ”ہاں۔ کچھ یاد آ رہا ہے۔ وہ لیڈی انسپکٹر تھیں۔ وردی میں تو تمہاری برستگی ہی بدل گئی تھی۔“

”میں برنس مسلم کمیونٹی سے تعلق رکھنے والی پولیس میں ایم پی ہوں۔ اس روز اسکاٹ لینڈ یارڈ کے سینئر سرورنگ پولیس آفیسر کو اسٹ کر رہی تھی۔“

وہ یاد کرنے لگا۔ اس نے ایک اسٹریٹ میں اپنی کار روکی تھی۔ وہ پولیس کی وردی میں چھپ چھپ کر فائر کرتے ہوئے ایک شخص کے لیے ڈھال بننے ہوئے اس کے پاس آئی تھی۔ اس سے کہا تھا۔ ”یہ شخص بیمار ہے اور خوفزدہ ہے۔ اسے اپنی کار میں لے جاؤ۔“

وہ شخص پچھلا دروازہ کھول کر گاڑی کے اندر آ گیا تھا۔ اس لیڈی انسپکٹر نے آگے والی گاڑیوں کا راستہ کھیر کر یا تو محبوب کو بھی وہاں سے پیچھے ہٹنے کا موم مل گیا تھا۔ وہ بولا۔ ”تم نے جس شخص کو پیچھے بٹھا تھا۔ وہ آگے پیچھے کی سیٹوں کے درمیان منہ چھپا کر پڑا ہوا تھا۔ وہ سہا ہوا نہیں تھا۔ اس نے آگے جا کر کار روکنے کو کہا۔ میں نے بریک لگائے تو وہ دروازہ کھول کر میرا شکر یہ ادا کر کے بھاگتے ہوئے دوسری گاڑی میں جا کر بیٹھ گیا۔ میں نے

حیرانی سے دیکھا۔ وہ گاڑی جیسے اسی کے انتظار میں تھی۔ خزانے بھرتی ہوئی کہیں چلی گئی۔“

وہ ہنسنے لگی۔ پھر بولی۔ ”میرا نام مرینہ ہے۔“ وہ جیلر کی کرسی کے ہتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے بولی۔ ”یہ میرے پاپا ہیں۔ میں دس برس کی تھی تب سے لندن میں ہوں۔ وہیں تعلیم حاصل کی۔ وہیں پولیس ٹریننگ بھی حاصل کی۔ تمہارا نام کیا ہے؟“

”محبوب علی چانڈو..... مجھے بتاؤ وہ کون تھا؟“ مرینہ نے پوچھا۔ ”کون؟“

”وہی جسے تم نے میری گاڑی میں بٹھا یا تھا۔ اس کے لیے آگے دوسری گاڑی تیار کھڑی تھی۔“

وہ ہتھ ہوئے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر بولی۔ ”یہ نہ پوچھو۔ یہ پولیس کے مکمل تماشے ہیں۔“ ”میں پولیس والا نہیں ہوں لیکن مکمل تماشے جانتا ہوں۔ وہ مجرم تھا۔ تمہاری مدد سے فرار ہو گیا تھا۔“

وہ ہتھ ہوئے بولی۔ ”رات گئی باقی مٹی۔ دس مہینے گزر گئے۔ میں ایسی باتیں یاد نہیں کرتی۔ تمہیں دیکھا تو یاد آیا کہ اس روز میں نے چالیس ہزار پونڈ زکمائے تھے۔“

”تم مجھ سے بول رہی ہو۔ کیا ایسی باتیں کسی کے سامنے کھل کر بولی جاتی ہیں؟“

”میں کسی کے باپ سے بھی نہیں ڈرتی۔ ابھی تم نے سنا ہے۔ پولو میرا کیا گاڑی ڈلو گے؟“

”کچھ نہیں۔“ وہ دوسری طرف دیکھنے لگا۔ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ”سنا ہے کہ میں بہت خوبصورت ہوں۔ آنکھ والے مجھے آنکھ بھر کے دیکھتے ہیں۔“

اس نے توجہ نہیں دی۔ سنی ان سنی کر دی۔ وہ بولی۔ ”ایک بات سمجھ میں نہیں آتی۔ تمہارا چہرہ مجھے یاد کیوں رہ گیا؟“

وہ طنز یہ انداز میں بولا۔ ”اس لیے کہ اس روز چالیس ہزار پونڈ زکمائے تھے۔“

”کمائی تو ہوتی رہتی ہے۔ اسی لیے میں پاپا جیسی ملازمت کر رہی ہوں۔ لیکن تم دوسروں سے کچھ الگ ہو۔ تم یقین کرو گے میں نے تمہیں خواب میں بھی دیکھا تھا۔ صبح پریشان ہو گئی تھی کہ کیوں دیکھا ہے۔ پھر بھول گئی۔“

وہ اسے سنجیدگی سے دیکھنے لگی۔ پھر بولی۔ ”چپ کیوں ہو؟ بولتے کیوں نہیں؟“

”بولنے کے لیے کچھ ہوتو بولوں گا۔“

”یہ تو کہہ سکتے ہو کہ لوگ درست کہتے ہیں یا نہیں۔“

میں حسین ہوں یا نہیں؟“

”لوگ درست کہتے ہیں۔“

”تم کیا کہتے ہو؟“

وہ لندن سے آئی تھی۔ بہت بے باک تھی۔ اس کے پیچھے پڑ گئی تھی۔ ویسے بے بیچ کہا تھا کہ اسے خواب میں دیکھ چکی ہے اور اب سوچ رہی تھی کہ وہ دوسروں سے الگ کیوں لگ رہا ہے؟

ایک سپاہی نے آکر واش روم کے دروازے پر دستک دی۔ پھر کہا۔ ”ایک گھنٹا ہو گیا ہے۔ باہر آؤ۔“

تھوڑی دیر میں دروازہ کھل گیا۔ مراد باہر آیا تو مرینہ نے حیرانی سے دیکھا۔ وہ محبوب جو کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہی قیدی کے لباس میں واش روم کے دروازے پر کھڑا تھا۔

وہ دوہم شکل کو دیکھ کر اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ مراد نے محبوب کے پاس آکر نون اسے دیتے ہوئے کہا۔ ”آپ کی مہربانی سے خوب باتیں ہوئیں۔ وہ بہت خوش ہے۔ آپ کو دعا میں دے رہی ہے۔“

وہ خوش ہو گئی تھی۔ محبوب کے چہرے پر بھی رونق آ گئی تھی۔ وہ بھی مسکرانے لگا۔ سپاہی نے مراد سے کہا۔ ”اندر چلو۔“ صاحب نے کہا ہے بہت تاخیر ہو چکا ہے۔“

محبوب نے اس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ”پھر کسی دن ملاقات ہوگی۔ میں تاریخ کو یہاں ماروی آئے گی۔ پھر اس سے جی بھر کر باتیں کر سکو گے۔“

وہ اسے تسلیاں دے کر مرینہ کی طرف دیکھے بغیر وہاں سے چلا گیا۔ مرینہ نے بھی اسے جاتے ہوئے نہیں دیکھا۔ وہ مراد کو دیکھے جا رہی تھی۔ دونوں ایک ہی تھے۔ وہ سپاہی کے ساتھ جانے لگا تو اس نے حکم دیا۔ ”رک جاؤ۔“

وہ دونوں رک گئے۔ وہ سپاہی کو اشارے سے جانے کے لیے بولی۔ وہ باہر چلا گیا۔ مراد نے اب اسے توجہ سے دیکھا تو مرینہ بھی اسے گہری سنجیدگی سے دیکھنے لگی۔ ذہن میں بات آئی کہ اس نے خواب میں محبوب کو نہیں قیدی کو دیکھا تھا۔ اس کے خواب میں وہ قیدی کے لباس میں تھا۔

اگرچہ دونوں ہم شکل تھے۔ دونوں میں کوئی فرق نہیں تھا پھر بھی وہ محسوس کر رہی تھی کہ کوئی نامعلوم سی کشش ہے۔ وہ اس کی طرف بہت دھمے دھمے سے چھی جا رہی تھی۔

اس نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں پوچھا۔ ”کیا نام ہے؟“

”مراد..... مراد علی مکی۔“

”تم زخمی ہو اور زخم تازہ ہیں۔ میں سمجھ رہی

ہوں۔ یہاں تمہارے ساتھ زیادتی ہوئی ہوگی؟“
وہ اپنے باپ کی کرسی میں بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”کیا جرم کیا ہے؟ کب سے یہاں ہو؟“
وہ بولا۔ ”جلانی گوٹھ کا ڈیرا میرا دشمن ہے۔ اس نے اپنی بیٹی کے قتل کا جھوٹا الزام مجھ پر لگا دیا ہے۔ میں بے گناہ ہوں۔ میں نے آج تک کسی کو ایک حق نہیں مارا ہے۔ کسی کی بیٹی کو بھلا کیوں ماروں گا۔ میں پریشان ہوں کہ عدالت میں میری بے گناہی ثابت ہو سکے گی یا نہیں؟“
”تمہارا سب سے بڑا قصور یہی ہے کہ تم نے کبھی کسی کو طعنا نہیں مارا۔ جو کسی کو مارے نہیں ہیں۔ وہ گویا مار کھانے کے لیے پیدا ہوتے ہیں۔“
وہ کرسی پر ادھر سے ادھر گھوم کر بولی۔ ”یہ میرے اصول ہیں۔ چلو تو آگے والوں کو چلتے ہوئے چلو۔ جیو تو اوروں کی جان چلاتے ہوئے جیو۔ تب ہی یہ دنیا نہیں بنتے بولتے جینے دے گی۔“
وہ بولا۔ ”جیسے آپ کے اصول ہیں دیے ہمارے نہیں ہو سکتے کیونکہ ہم غریب ہیں اور کمزور ہیں۔“
”وہ مرد ہی کیا جو غریبی کا رونا روتا رہے اور اپنی کمزوریاں دور نہ کر سکے۔ تم دیکھنے میں تو فواد کی دکھائی دیتے ہو۔ حالات سے ہارنے والے نہیں لگتے۔“
”مجھے دنیا والوں سے ہارنے کی پروا نہیں ہے۔ میں صرف اپنی ماروی کو جیتنا چاہتا ہوں۔“
”یہ کون ہے؟“
”میری محبت ہے۔ میری زندگی ہے۔“
وہ ہنستے ہوئے بولی۔ ”ارے واہ.....! کیا بات ہے۔ مجنوں کے خاندان سے ہو؟ یہ تو جانتے ہو کہ عشق کرنے والے سب ہی ہارے رہے ہیں اور مرتے رہے ہیں۔“
”محبت میں مرنے والے ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔“
”محبت میں مرنے کے بعد تمہاری محبوبہ کا کیا بنے گا؟ وہ محبت ہی کیا جو اپنی محبوبہ کو بھی مار ڈالے۔ بھی سوچا ہے کہ جسے زندگی کہتے ہو اور جان سے زیادہ چاہتے ہو۔ وہ تمہارے بعد کیسے جیے گی؟ کس کے ہاتھوں میں جائے گی۔“
یہ ٹھیس پچھانے والا سوال تھا۔ سیدھا سا جواب سمجھ میں آتا تھا کہ محبوب کے ہاتھوں میں جائے گی۔
مرینہ نے پوچھا۔ ”چپ کیوں ہو گئے۔ اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر سوچو کہ محبت میں مرنے کے بعد بھی نام کرنا چاہتے ہو۔ ارے واہ.....! مرنے کے بعد اس کی عزت آبرو کی سلامتی نہیں چاہتے۔ مجھے سمجھاؤ یہ کیسی محبت ہے؟“

مرینہ کی باتوں نے ایک ذرا چکرا دیا۔ اس نے کہا۔ ”آپ نہیں جانتیں۔ میرے پاس نہ دولت ہے نہ ہتھیار ہے نہ طاقت ہے۔ میں تو یہ مقدمہ لڑنے کے قابل بھی نہیں ہوں۔ سائیں محبوب میرے لیے لڑ رہے ہیں۔“
”دوسرے کا احسان لے رہے ہو۔ کیا یہ نہیں جانتے کہ کوئی مفت میں احسان نہیں کرتا۔“
یہ بات بھی ہتھ کی طرح لگی۔ وہ مرینہ سے یہ نہ کہہ سکا کہ محبوب بھی اس کی ماروی کا عاشق ہے۔ کہنے کے لیے منہ نہیں کھلتا تھا۔ بڑی سی محسوس ہوتی تھی۔
وہ بولی۔ ”میں یقین سے کہتی ہوں کہ احسان لے رہے ہو۔ ورنہ یو لو کیا احسان کرنے والا تمہارا کوئی رشتہ دار ہے۔ رشتہ دار بھی کچھ وصول کیے بغیر انہوں کے کام نہیں آتے اور مقدمات میں تو لاکھوں روپے پانی کی طرح بہتے رہتے ہیں۔“
وہ چپ رہا۔ وہ بولی۔ ”تمہاری کوئی کمزوری ہے۔ تم نہیں یو لو گے۔ میں دماغ کی تارکیوں میں مہم کراندر کے بھید نکال لاتی ہوں۔ تمہاری کوئی بات مجھ سے چھپی نہیں رہے گی۔“
”بہتر ہے۔ کچھ نہ چھپاؤ۔ اپنی پوری ہسٹری سناؤ۔ اگر تم قتل نہیں کیا ہے تو یقین کر لو کہ تمہاری بے گناہی ثابت کرنے والی آئی ہے۔ تم نہیں جانتے کہ میں کون ہوں؟“
مراد نے سراٹھا کر اسے دیکھا۔ اس سے نظریں ملیں تو دل نے کہا۔ وہ بڑی بچی ہے۔ جو کہتی ہے وہ کر گزرنے والی ہے۔ اس نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”بیٹھ جاؤ۔“
وہ بولا۔ ”ہم قیدیوں کو کرسی پر بیٹھنے کی اجازت نہیں ہے۔“
وہ سخت لہجے میں بولی۔ ”میں کسی کی اجازت کی محتاج نہیں ہوں۔ حکم دے رہی ہوں۔ بیٹھ جاؤ۔“
وہ ہچکچاتے ہوئے آگے بڑھ کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ پھر بولا۔ ”میں جلانی گوٹھ میں پیدا ہوا۔ وہیں چلا بڑھا۔ دس جماعتیں پاس کیں۔ وڈیرے شہت جلانی کی بیٹی زلیخا ان کے خالما نہ دستور کے مطابق بن بنائی بیٹی تھی۔ وہ اور کیا کرتی؟ فطری جذبات سے مغلوب ہو کر ایک رات میرے پاس آ گئی۔ میں نے گناہ سے انکار کیا تو اس نے دھمکی دی۔“
مرینہ نے کلکھلا کر ہنستے ہوئے کہا۔ ”ارے واہ رے سادھو سنیاں! عورت تمہارے پاس آئی تھی اور تم مرد ہو کر انکار کر رہے تھے۔ ایسا پہلی بار نہ رہی ہوں۔“

وہ آگے سنانے لگا۔ وہ اسے تنہی کی دیکھ رہی تھی۔ اس کی سادگی اور شرافت متاثر کر رہی تھی۔ اس پولیس والی کی زندگی میں جو آتے رہے تھے وہ جیسے ہوئے بد معاش ہوتے تھے۔ اس نے ایسے بد معاشوں کے کل پرزے ڈھیلے کر کے انہیں توبہ کرنے اور کان پکڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔
اس نے پوری روداد سننے کے بعد مراد سے کہا۔ ”یہ جو محبوب ابھی یہاں آیا تھا۔ یہ تمہاری ماروی سے لائن مارتا ہے اور تم کہتے ہو کہ اس کا ہاتھ بھی نہیں پکڑتا ہے۔“
وہ میز پر اس کی طرف جھکتے ہوئے بولی۔ ”یا تو تم سیدھے سادے مٹی کے مادھو ہو یا پیدا کی گدھے ہو۔ کیا اس نے یوں ہی اسے پاؤں لاکھ روپے دیے ہیں جبکہ وہ ماڈل نہیں ہے۔ کیا تمہاری محفل گھاس چرنے کی ہے؟ تم سمجھ رہے ہو کہ اس نے کروڑوں روپے کی کوئی رہنے کو دی ہے اور اس کے ساتھ سوتا نہیں ہے؟ عمارت کرتا رہتا ہے؟“
وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ”خدا کے لیے ایسے الفاظ منہ سے نہ نکالو۔ ماروی مر جائے گی لیکن میرے سوا کسی دوسرے کام نہ نہیں دیکھے گی۔“
”اس اندھ سے اعتماد نہ جہیں سچ عقل کا اندھا بننا دیا ہے۔ چلو میں ابھی بات نہیں کروں گی۔ تم ہی بتاؤ۔ اس دوسرے عاشق کے لاکھوں کروڑوں روپے کس کھاتے میں جا رہے ہیں؟ کیا دنیا کا کوئی ایک آدمی ان کی پارسانی پر یقین کرے گا؟“
”آپ پولیس والی ہیں۔ آپ نے چور بد معاش اور گناہ گار دیکھے ہیں۔ ابھی ہماری دنیا میں ایمان اور شرافت ہے۔ آپ یقین کریں یا نہ کریں۔ انہیں گالی نہ دیں۔“
مرینہ نے اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ سوچ یہ تھی کہ یہ درست کہہ رہا ہے۔ میرا واسطہ چور بد معاشوں سے پڑتا ہے اور میں لندن سے شادی کرنے یہاں کسی شریف آدمی کی تلاش میں آئی ہوں اور یہ جو گناہوں کے سامنے آ گیا ہے اپنی سادگی اور شرافت سے متاثر کر رہا ہے۔
پھر وہ کرسی پر ڈرا سیدھی ہو کر دل میں بولی۔ ”ارے ہاں۔ یہ تو سمجھ میں آتا چاہیے کہ میں نے اسے خواب میں کیوں دیکھا تھا اور وہ بھی قیدی کے لباس میں..... یہ تو عجیب کیا بات ہے۔ جان پہچان تھی نہ کہیں اس کی تصویر دیکھی تھی۔ پھر یہ خواب میں کیسے آ گیا تھا؟“
ابھی ایک ایسی سمجھ میں نہ آنے والی بات تھی جس سے وہ متاثر ہو رہی تھی اور اس سے دلچسپی لے رہی تھی۔ دراصل اس نے محبوب کو پہلے بریڈ فورڈ میں دیکھا تھا۔ اس کے کچھ

دونوں بعد وہی صورت خواب میں نظر آئی تھی۔ لیکن یہ عجیب سی بات تھی کہ وہ جو محبوب کی صورت والا تھا وہ قیدی کے لباس میں تھا اور ان لحاظ میں بھی اس کے سامنے وہی خواب والا قیدی تھا۔
ایسی کوئی عجیب سی بات ہو تو دل کو جکڑ لیتی ہے کہ اس معاملے میں ضرور کوئی قدرتی عیب ہے۔
☆☆☆
ماروی بہت خوش تھی۔ مراد سے باتیں کرنے کے بعد اس نے فون پر محبوب کا شکریہ ادا کیا تھا۔ پھر گھر کی نیند سونے لگی۔ پچھلی رات سے جاگ رہی تھی اور شام کو کینٹی کی شادی میں جانا تھا۔ اسے یہ مصروفیات اچھی لگ رہی تھیں۔ بڑے دنوں بعد زندگی میں پہلی پہلی محسوس ہو رہی تھی۔
شام کو چابی مفتی نے پوچھا۔ ”کیا ہمارے ساتھ بدعق والے جا میں گئے؟“
ماروی نے کہا۔ ”نہیں۔ غریبوں کی ہستی میں خواہ نام نہاد ہوگی کہ بڑے لوگ آئے ہیں۔“
چاچا جھمر وٹے کہا۔ ”ہم کوئی میں رہتے ہیں۔ کیا بڑے لوگ نہیں ہیں؟“
”یہ کس کی کوٹھی ہے چاچا؟ یہ سب خیراتی مال ہے۔ ہم اپنی اوقات میں رہیں گے۔ چابی میں کہنا بھول گئی تھی۔ ہم سونے کے زیور پہن کر نہیں جائیں گے۔“
مفتی نے کہا۔ ”ٹھیک کہتی ہو مینی! ہم نمائش نہیں کریں گے۔ مین گوٹھ کے لوگ سب ہی جانے پہچانے ہیں۔ انہوں نے ہمارا بڑا وقت دیکھا ہے۔ ہم انہیں شان و شوکت نہیں دکھا سکیں گے۔“
محبوب کا ڈرائیور ان کے لیے گاڑی لے کر آیا۔ ماروی نے فون پر کہا۔ ”سائیں! ہم ابھی خوبصورت مہنگی کار میں نہیں جائیں گے۔ یہ بچارے غریبوں کو غرور دکھانے کے برابر ہوگا۔ ہم سونے کے زیور بھی پہن کر نہیں جا رہے ہیں۔“
محبوب نے کہا۔ ”تم بہت سمجھ دار ہو۔ بہت اچھا کر رہی ہو۔ میں دوسری گاڑی بھیج رہا ہوں۔“
”کوئی گاڑی نہ بھیجیں۔ ہم کسی میں چلیں جائیں گے۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ میں کینٹی کو زخمت کرتے ہی جلد سے جلد واپس آنے کی کوشش کروں گی۔“
وہ پریشان کیسے نہ ہوتا۔ دونوں سے یہی فکر کھا رہی تھی کہ وہاں شادی کی رات کیا ہوگا؟ وہ چابی چاچا کے ساتھ کسی سی جا رہی تھی۔ ادھر یہ بھی تیار بیٹھا تھا۔ اس نے

سیاہ جست چلتوں، سیاہ شرٹ اور فل بولس پہنے تھے۔ یمن کوٹھ کے قریب پہنچ کر ہیملٹ پہننے والا تھا۔ یوں اسے چہرے سے کوئی پہچان نہ پاتا۔

اس وقت قد آدم آئینے کے سامنے وہ کسی ایکشن فلم کا ہیرولگ رہا تھا۔ لباس کے اندر بھرا ہوا رپوڈ اور تھا۔ بلیٹس سے بھرا ہوا ایک ڈبا کار میں رکھا ہوا تھا۔ اس نے احتیاطاً فرسٹ ایڈ باکس بھی گاڑی میں رکھا تھا۔

لنگڑے جانی نے دوپہر کو فون پر کہا تھا کہ اس کے ایک ایک دو دو آدمی یمن کوٹھ جاتے ہیں اور کھوم پھر کر وہاں کا جائزہ لے کر آجاتے ہیں۔ اندھیرا ہونے کے بعد وہ سب شادی والے گھر کے چاروں طرف مورچے بنائیں گے۔

شام چھ بجے یمن کوٹھ میں شوراٹھا کہ ماروی آ رہی ہے۔ اس علاقہ کے بچے اس کی ٹیکسی کے آگے پیچھے، دائیں بائیں دوڑتے آرہے تھے۔ دکانوں میں کھڑے ہوئے لوگ اس ٹیکسی کو دیکھ رہے تھے۔ عورتیں گھروں سے نکل آئی تھیں۔ وہاں ایسی دھوم مچتی تھی جیسے کسی ریاست کی رانی ہاتھی پر بیٹھ کر آ رہی ہو۔

اس کی سبکی رومانہ کے گھر کو اندر اور باہر سے کاغذ کی رنگین جھنڈیوں سے سجایا گیا تھا۔ بڑے بڑے ڈیک کے ذریعہ فلی گیت دور تک گونج رہے تھے۔ گھر کے اندر اور شامیانے میں عورتیں آتی جانی دکھائی دے رہی تھیں۔

رومانہ کو بہن کی طرح سجایا جا رہا تھا۔ اس کی سہیلیوں نے بڑی محبت سے ماروی کا استقبال کیا۔ اسے لے کر رومانہ کے پاس آئیں۔ دو سہیلیوں کو گلے ملے دیکھ کر عورتیں خوش ہو رہی تھیں۔ انہیں دعائیں دے رہی تھیں۔

زندگی کتنی خوشیاں دیتی ہے اور کتنا رلائی ہے؟ عورتیں چاچی مٹی کو بھی ہاتھوں ہاتھ لے رہی تھیں اور ان کی نئی گل کھلائی ہوئی زندگی کے متعلق کرید کرید کر سوالات کر رہی تھیں۔ یہ ظاہر بھی دکھائی دے رہا تھا کہ شادی کی اس تقریب میں خوشیاں ہی خوشیاں اور محبتیں ہی محبتیں ہیں۔

وہاں صدو کی بیوی، جوان بہن اور جوان بیٹیاں بھی تھیں۔ دو دن پہلے ہی ان سب کی مضیاں گرم کر دی گئی تھیں۔ انہیں سمجھا دیا گیا تھا کہ وہ سب ماروی کے آس پاس رہا کریں گی اور خواہ کرنے والوں کو رازداری سے ماروی کی نشاندہی کرنی رہیں گی۔

صدو مل مین بیلو شاہ کا پرانا ملازم تھا۔ پارٹی کے غنڈے گامے نے بیلو کو یقین دلایا تھا کہ آج رات ماروی

اس کے خفیہ اڈے میں پہنچ جائے گی۔ بیلو نے صدو کو حکم دیا تھا کہ وہ گامے کے احکامات کی تعمیل کرتا رہے۔ یوں صدو بیلو کا تابعدار تھا اور گامے، چیئر مین بابر بشیر کا نمک خور تھا۔

ان میں سے ایک ماروی کو رنگ رلیوں کے لیے طلب کر رہا تھا۔ دوسرا آن دی اسپاٹ اسے کوئی ماروی کا حکم دے چکا تھا اور یہ دونوں ہی کام دونوں کے مشترکہ غنڈے کرنے والے تھے۔

عجب تماشا ہونے والا تھا۔ ماروی ایک ہی تھی وہی ایک اغوا ہونے سے پہلے ماری جانے والی تھی اور وہی ماری جانے سے پہلے اغوا بھی ہونے والی تھی۔

صدو کا گھر شادی والے گھر سے ایک گلی پیچھے تھا۔ تین گن مین صدو کے مہمان بن کر آئے تھے۔ چوتھا گن مین اس علاقہ کی ایک پختہ سڑک پر ایک وین میں ان کا منتظر تھا۔ واردات کے وقت وہاں سے ایکشن میں آنے والا تھا۔ انہوں نے طے کر لیا تھا کہ صدو کے گھر سے نکل کر

کون کس سمت سے دہن کے گھر آئے گا۔ ایسے وقت صدو کی بیوی، بہن اور بیٹیاں، ماروی کو ان کے آگے کر دیں گی پھر وہ ایک لمحہ بھی ضائع کے بغیر اسے کوئی مارکر فائر کرتے ہوئے وہاں سے فرار ہونے لگیں گے تو گولیوں کی پوچھا میں کوئی انہیں روکنے نہیں آئے گا۔

محبوب ایک پرانی سی گاڑی میں آیا تھا۔ واردات کرنے والوں کے لیے اندھیری رات موافق تھی۔ صرف دہن کے گھر کے آس پاس روشنیاں تھیں۔ وہ ایک جگہ تاریکی میں آکر رک گیا تھا۔ گاڑی میں بیٹھ کر لنگڑے کا انتظار کرنے لگا۔

اس کے ساتھ والی سیٹ پر ہیملٹ رکھا ہوا تھا۔ وہ منہ چھپانے کے لیے ضروری تھا۔ ایک بڑی مشکل یہ تھی کہ یمن کوٹھ کا بچہ پھر مراد کو صورت سے پہچانتا تھا۔ اگر کوئی اسے دیکھ لیتا تو شور مچاتا کہ مراد جیل سے آگیا ہے۔ یوں دشمن سمجھ لیتے کہ وہ ادب اپنی عاشق اپنی ماروی کی خاطر ان سے ٹکرانے اور جان پر کھینچے آیا ہے۔

اس نے فون کی آواز بند کر دی تھی۔ اس کی اسکرین روشن ہوئی تو کالنگ ٹون سنائی نہیں دی۔ وہ معروف گلی کی کال گئی۔ اس وقت انیڈر کرنا مناسب نہیں تھا۔ لیکن وہ اپنے اس بزرگ کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ وہ ہمیشہ اس کی بھری کی باتیں کرتا تھا۔

اس نے آواز بڑھا کر فون کو کان سے لگایا۔ پھر کہا۔

”معروف صاحب! میں ابھی مصروف ہوں۔ ایک گھنٹے بعد آپ سے بات کروں گا۔“

”ابھی تم کہاں ہو؟“

”ایک پرانا دوست مل گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہوں۔“

”جھوٹ موت بولو۔ تم اور ماروی کو بھول کر کسی دوست کے ساتھ رہو گے.....؟ نہیں؟ تم اس وقت یمن کوٹھ میں ہو۔“

”بعض اوقات آپ میرے بارے میں وہ سوچتے لگتے ہیں جو میں نہیں سوچتا۔ مجھے وہ سبکی کی شادی میں تھی ہے۔ آجائے گی۔ میں وہاں نہیں ہوں۔ پلیز پھر کسی وقت کال کروں گا۔“

اس نے فون کا سوچ آف کر دیا۔ لنگڑے جانی نے کار کی کھڑکی کے پاس آکر سلام کیا۔ پھر کہا۔ ”آپ وہاں لائیں دیکھ رہے ہیں۔ باجی (ماروی) اس گھر میں ہیں۔ وہاں اندر اور باہر پچاس عورتیں ضرور ہوں گی۔ ان میں ہماری دو عورتیں ہیں۔ وہ باجی کے ساتھ گلی ہوئی ہیں۔“

”میں اس گھر کے قریب کیسے رہ سکتا ہوں؟“

”ادھر روٹنی ہے۔ آپ میرے ساتھ چھٹی گلی میں چلیں۔ وہاں نہ کوئی دیکھے گا نہ آپ کو پہچانے گا۔“

وہ آگے کار میں برابر والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ محبوب اسے دھبی رفتار سے ڈرائیو کرتا ہوا چھٹی گلی میں اس جگہ آکر رک گیا جہاں سے ایک پتلی گلی کو پار کرتے ہی رومانہ کا مکان تھا۔

ایسے ہی وقت عورتوں کے چہنچہ چلانے کی آوازیں سنائی دیں۔ محبوب اچھل پڑا۔ گاڑی سے نکلے ہوئے، ہیملٹ بیٹھتے ہوئے اس نے دوڑ لگائی پھر دو مکانوں کے درمیان گلی تکی سے گزرا ہوا رومانہ کے گھر تک پہنچ گیا۔ لنگڑا اس سے پہلے چھلانگیں لگاتا ہوا گیا تھا۔ کئی عورتیں اپنے بچوں کو سینے مکان سے باہر نکل کر ادھر ادھر بھاگ رہی تھیں۔

پھر ایک فائر کی آواز ابھری۔ محبوب کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس کے حلق سے چیخ نکلی۔ ماروی.....!

اور انہیں گولی چلانے کا موقع نہیں دے رہے تھے۔ محبوب پارٹی کے غنڈوں کو پہچانتا تھا۔ انہیں دیکھ کر پہچان گیا کہ ان میں سے کتنے دشمنوں کی طرف سے آئے ہیں۔ وہ دو غنڈوں پر گولیاں چلاتا ہوا ماروی کے پاس پہنچ گیا۔ وہ بھی ہوئی ایک دیوار سے لگی کھڑی تھی۔ وہ اس کی طرف جھک کر بولا۔ ”میں محبوب ہوں، چلو یہاں سے۔“

وہ اسے پہنچ کر لے جانے کے لیے سامنے آتا تو ایک گولی اس کے بازو کا گوشت اڑھیرتی ہوئی گزر گئی۔ لنگڑے نے پلٹ کر فائر کرنے والے پر فائر کیا۔ محبوب بھول گیا تھا کہ موت کیا ہوتی ہے اور گولی لگنے کی تکلیف کیا ہوتی ہے۔ وہ یکبارگی ماروی کو اٹھا کر اپنے کاندھے پر لا دکر وہاں سے دوڑتا ہوا باہر گیا۔

گولیاں چل رہی تھیں۔ لنگڑا اور اس کے ساتھی محبوب کو شیلٹر دیتے ہوئے فائر کرتے جارہے تھے۔ اس نے پتلی گلی سے گزر کر گاڑی کے پاس آکر ماروی کو کاندھے سے اتارا پھر دروازہ کھول کر اسے اندر کی طرف دھکا دیتے ہوئے بولا۔ ”فوراً سیٹ کے نیچے دیک جاؤ۔ جلدی کرو۔“

وہ دروازہ بند کر کے تکلیف سے کراہتے ہوئے ڈرائیوگ سیٹ پر آگیا۔ اس نے بڑی بھرتی سے گاڑی اسٹارٹ کی۔ پھر دوسرے ہی لمبے میں وہ گاڑی دوڑتی ہوئی اس علاقہ سے دور ہوئی چلی گئی۔

ماروی اگلی سیٹ کے نیچے سر جھکائے بیٹھی ہوئی تھی اور اس کی ہلکی سی کراہیں سن رہی تھیں۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ باہر اور اندر تاریکی تھی، پہلے تو کچھ نظر نہیں آیا۔ پھر اس نے گزرتی ہوئی اسٹریٹ لائٹس میں محبوب کا بایاں بازو دیکھا تو یکدم سے لرز گئی۔

اس کی آستین ہوسے بیٹھی ہوئی تھی اور بازو کی اڑھیر ہوئی جگہ سے بھر بھر رہا تھا۔ وہ فوراً ہی اٹھ کر سیٹ پر آکر بولی۔ ”گاڑی روکیں۔ ڈاکٹر کے پاس چلیں۔“

وہ کراہتے ہوئے بولا۔ ”دن ہمارے تعاقب میں ہوں گے۔ ہمیں سب سے پہلے چھپنا ہے۔“

وہ سیٹ پر آکر اس کے بازو کو تھام کر بولی۔ ”نہیں چھپنا ہے۔ پہلے علاج ہوگا۔ آنے دیں دشمنوں کو..... مر جانے دیں مجھے۔ گاڑی روکیں۔ اسپتال چلیں۔“

وہ گاڑی کی رفتار بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”چلاؤ مت۔ میں نہیں مروں گا۔ جو کہتا ہوں کرتی رہو ابھی خون بند ہو جائے گا۔“

”میں ایسا کیا کروں۔ جلدی بتائیں۔“

”بیچھے سیٹ پر فرسٹ ایڈ باکس ہے اسے اٹھا کر لاؤ۔ اس میں دو انگلیں ہیں۔“
وہ فوراً ہی جھک کر بیچھے گئی پھر ابتدائی لمبی امداد کا سامان اٹھا کر لے آئی۔ ان حالات میں محبوب کی طرف دل کھینچا جا رہا تھا۔ وہ اس کے لیے کیا نہیں کرتا آ رہا تھا۔ آج اس نے زندگی داؤ پر لگا دی تھی۔ ماروی نے صاف دیکھا تھا کہ اس کی طرف گولی چلائی گئی تھی اور اسی لمحہ میں وہ ڈھال بن گیا تھا۔

اس نے تھوڑی دیر کے لیے گاڑی کو سڑک کے کنارے روک کر اپنی پوری آستین بچھا دی۔ پھر اسے بتایا کہ کون سی دوا زخم پر پہلے لگا کر بہتے ہوئے خون کو روکنا ہے اور کس طرح کالٹن سے زخم کو صاف کرنا ہے۔ وہ اس کی ہدایات پر عمل کر رہی تھی۔

وہ وہاں زیادہ دُک نہیں سکتا تھا۔ یہ اندیشہ تھا کہ بیچھے دشمن آ رہے ہیں۔ وہ شاید ٹریفک کے جھم میں بیچھے رہ گئے تھے۔ اس نے گاڑی کو دھبی رفتار سے آگے بڑھا دیا۔

ماروی نے اس کی ہدایت کے مطابق دو انگلیں اس پر استعمال کرتے ہوئے انتہائی ”یا اللہ.....! بہت خون بہہ چکا ہے۔“ گاڑی روک دیں پولیس کو فون کریں۔ پولیس آئے گی تو بیچھے کرنے والے دشمنوں کو گرفتار کر لے گی۔“

وہ گراہتے ہوئے بولا۔ ”دشمن گرفتار نہ ہوئے تو تمہیں گولی مار کر چلے جائیں گے۔ ہمیں چلتے رہنا ہے۔ میں بیچھے دیکھ رہا ہوں۔ وہ آ تو رہے تھے۔ اب نظر نہیں آ رہے ہیں۔ مجھے محفوظ جگہ بیچھے تک اطمینان نہیں ہوگا۔“

حالات اچانک ایسے بدلتے ہیں جن کی توقع پہلے نہیں کی جاتی۔ وہ محبوب سے ہمیشہ فاصلہ رکھتی تھی۔ اس کی حیا کا تقاضا بھی تھا کہ اسے چھونے کا بھی موقع نہیں دے گی اور اب وہ بڑی دیر سے خود ہی اسے چھو رہی تھی۔

اسے یاد آیا۔ وہ ایک بار زخمی کر کے گری گئی تھی۔ گھٹنے پر معمولی سی خراش آئی تھی تو اس کی جلن برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ وہ اپنے زخم کو ہاتھ نہیں لگا رہی تھی۔ جب اس خراش پر ہر ہم لگا گیا تو وہ تکلیف سے چیختے لگی تھی۔

اب وہ سوچ رہی تھی کہ محبوب گولی کے زخم کی تکلیف کیسے برداشت کر رہا ہوگا اور اس کے اپنے ہاتھ دو انگلیں لگاتے وقت کانپ رہے تھے۔ کسی اور کا زخم ہوتا تو وہ چھونے سے انکار کر دیتی۔

زندگی میں پہلی بار نرس کا کام کر رہی تھی۔ اپنے محسن کے احسانات کا صلہ دینے کی یہ صورت نکل آئی تھی۔ وہ اس

کے زخم پر ہر ہم رکھ رہی تھی۔ اس کی سچائی گئی تھی۔ وہ بڑھ گھٹنے بعد ایسے علاقے میں پہنچے۔ جہاں بڑی بڑی گھنٹیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ ماروی نے بھی پورا کراچی شہر نہیں دیکھا تھا۔ یہ نہیں جانتی تھی کہ کہاں آگئی ہے؟ محبوب تکلیف سے نڈھال ہو رہا تھا۔ ماروی نے اتار ڈی پن سے ہی سبھی ہر ہم پٹی کر دی تھی۔ اس نے ایک کٹھی کے بڑے گینٹ کے سامنے گاڑی روکی۔ ایک سڑج گارڈ نے قریب آ کر محبوب کو دیکھا پھر سیلوٹ کرتے ہوئے دوسرے گارڈ سے بولا۔ ”گینٹ کھولو۔“

ماروی نے پوچھا۔ ”آپ مجھے کہاں لے آئے ہیں؟“ وہ گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔ ”یہاں فی الحال کوئی دشمن نہیں آ سکا ہے۔ میں دیکھتا آ رہا ہوں کوئی ہمارا پیچھا نہیں کر رہا تھا۔“

گینٹ کھل گیا۔ وہ احاطے کے اندر ڈرائیو کرتا ہوا پورچ میں آیا۔ وہاں ایک ملازم کو چاہیاں دیں۔ کٹھی کے اندر تاریکی تھی۔ تھوڑی دیر میں ملازم نے دروازے کھول کر روشنی کر دی۔ اس نے ماروی سے کہا۔ ”آؤ۔ اندر چلو۔“ وہ دونوں گاڑی سے باہر آئے۔ محبوب ایک گارڈ کے سہارے چلتے ہوئے بیڈ روم میں آیا۔ گارڈ نے کہا۔ ”سر! آپ زخمی ہیں۔ یہ پولیس کیس ہے۔ ہم کیا کر سکتے ہیں؟“

وہ بیڈ کے سرے پر بیٹھے ہوئے بولا۔ ”کچھ نہیں کرو گے اور کسی سے ذکر نہیں کرو گے کہ میں اس حالت میں یہاں آیا ہوں۔“

”سر! کیا ادھر حملے کا خطرہ ہے؟“ ”نہیں ہے۔ میں پوری طرح محتاط ہوں۔ کسی نے میرا تعاقب نہیں کیا ہے۔“

ماروی اس کٹھی کٹھی کی اندرونی سجاوٹ کو دیکھ رہی تھی۔ سوچ رہی تھی۔ میں ان کے ساتھ یہاں تنہا آئی ہوں۔ آئی نہیں لائی گئی ہوں۔ وہ بیڈ روم کے باہر کھڑی سوچ رہی تھی۔ ”مجھے خواب گاہ میں ان کے پاس جانا چاہیے یہ زخمی ہیں اور میری خاطر زخمی ہوئے ہیں۔ بہت خون بہہ چکا ہے۔ ڈاکٹر کا علاج ضروری ہے۔ اور کسی ڈاکٹر کے آنے تک مجھے ہی ان کے پاس تیمارداری کے لیے رہنا ہوگا۔ یہ میرا فرض ہے۔“

میں کیا کروں؟ اندر ایک ہی جوان ملازم ہے۔ کوئی بوڑھی عورت بھی نہیں ہے۔ میں اب سے پہلے ان سے دور رہ کر بدنام ہوتی

رہی۔ اب تو فاصلہ مٹ گئے ہیں۔ یا اللہ.....! میں ان کے پاس ایک ہی صحت کے نیچے آگئی ہوں۔ یہ فیصلہ تو کر چکی ہوں۔ جا چا چاہی کے ساتھ یہاں سے سیکڑوں میل دور چھپنے چل جاؤں گی اور مراد سے جیل میں ملاقات کرنے کے بعد تو ضرور جاؤں گی۔“

وہ کٹھی کے در و دیوار کو دیکھتے ہوئے بیچھے ہٹ کر نکلتی خود رہ کر زیر لب بولی۔ ”میں جتنی دیر جانے والی تھی۔ اتنی ہی قریب آ کر مجبور اور بے بس ہو گئی ہوں۔ ایک زخمی کو تنہا چھوڑ کر جانے کی بات نہیں کر سکو گی۔“

میرے مقدرمیں کسی وجہ کے بغیر رسوائی ہے۔ کیا میں کبھی ان سے دور نہیں جاسکوں گی؟“

وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بیٹھ گئی۔ ایسے وقت کانگ ٹون نے اسے متوجہ کیا۔ اس نے فون کی اسکرین کو دیکھا۔ سمجھ میں نہیں آیا کس کا نمبر ہے۔

اس نے فون دبا کر اسے کان سے لگا یا۔ چاچی فنی کی آواز سنائی دی۔ وہ پریشان تھی۔ رونے کے انداز میں بول رہی تھی۔ ”بیٹی ماروی! تو کہاں ہے؟ اپنی آواز سنا دے۔ میری جان لگی جا رہی ہے۔ ہائے بیٹی! تجھے کون اٹھا کر لے گیا ہے؟“

”چاچی! پریشان نہ ہو۔ میں ٹھیک ہوں۔ وہاں کیا ہو رہا ہے؟ کیا رومان کی رخصتی ہو گئی؟“

”کیا رخصتی ہو گئی؟ شادی کا گھر میدان جنگ بن گیا تھا۔ ایک عورت اور دو مرد زخمی ہوئے ہیں۔ کہتے ہیں وہ دونوں زخمی غنڈے بد معاش ہیں۔ پولیس انہیں لے گئی ہے۔ تم کہاں ہو؟ کیا ہم یہاں انتظار کریں۔“

”نہیں چاچی! وہاں کسی سے نہ بولو کہ مجھ سے فون پر بات کر چکی ہو۔ دشمنوں کو معلوم ہوگا تو میرا پتا پوچھنے کے لیے وہ تمہارے بیچھے پڑ جائیں گے۔ تم چاچا کے ساتھ کٹھی میں جاؤ۔ میں کسی وقت آ جاؤں گی۔ یہ تم کس کس فون سے بول رہی ہو؟“

”میں بی بی اے سے بول رہی ہوں۔“ ”ٹھیک ہے یاد رکھنا۔ کسی سے نہ کہنا کہ تم میری خیریت معلوم کر چکی ہو۔“

اس نے فون کو بند کر دیا پھر وہاں سے اٹھ کر خواب گاہ کے دروازے پر آئی۔ وہ دوسری طرف منہ کیے فون پر بول رہا تھا۔ ”آپ ہی میرے معاف ہیں۔ میں آپ پر بھروسہ کرتے ہوئے کہہ رہا ہوں کہ میرے بازو میں گولی لگی تھی۔ بازو کا تھوڑا سا گوشت اُدھر گیا ہے۔ خون بہت بہہ

چکا ہے۔ میں جہاں بلا رہا ہوں وہاں آپ تیمارداری سے علاج کرنے آئیں گے۔“

ماروی کو اطمینان ہوا کہ وہ کسی ڈاکٹر کو بلا رہا ہے۔ دوسری طرف سے کہا گیا۔ ”میں ابھی آؤں گا۔ آپ کہاں ہیں؟“

”میں ابھی مکمل پتا فون پر Send کر رہا ہوں۔“

مجھے خون کی ضرورت ہے۔ آپ میرا بلڈ گروپ جانتے ہیں۔ خون پہنچانے کے تمام سامان کے ساتھ آئیں۔“

ڈاکٹر نے کہا۔ ”ایک اسسٹنٹ لازمی ہوگا۔“

”بھروسے کے آدمی کو لے آئیں۔ میں بہت کمزوری محسوس کر رہا ہوں۔ جلدی آنے کی کوشش کریں۔“

آپ کے آنے تک مجھ پر بے ہوشی طاری ہو سکتی ہے۔“

”میں جلد سے جلد آنے کی کوشش کرتا ہوں۔“

محبوب نے فون بند کر کے سر تھما کر ماروی کو دیکھا۔ وہ دروازے پر کھڑی تھی۔ نظریں ملنے ہی سر جھکا کر اندر آگئی۔ پریشان ہو کر بولی۔ ”آپ بیہوش ہونے والے ہیں؟“

سپینس، سرگزشت، پاکیزہ، جاسوسی

مسول ایجنٹ بڑا تے یو۔ اے۔ ای

ویکم بک شاپ

پی او بکس: 27869 کراچہ، دبئی

فون: 04-3961016 فیکس: 04-3961015

موبائل: 050-6245817 ای میل: welbooks@emirates.net.ae

محیاری کتابوں کا اعلیٰ مرکز

ویکم بک پورٹ

ریٹیل، ہول سیل، ڈسٹری بیوٹر، پبلشر، ایکسپورٹر

مین اردو بازار کراچی

فون: 32633151, 32639581 (92-21) فیکس: 32638086 (92-21)

ای میل: welbooks@hotmail.com

ویب سائٹ: www.welbooks.com

”ہوسکتا ہے۔ لیکن تمہیں پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ قسمت کی قسم طریقہ دیکھو کہ تم اور زیادہ بدنام ہونے کے لیے یہاں تنہائی میں ایک چھت کے نیچے آئی ہو۔“

”میں کیا کہوں۔ اپنی تقدیر سے نہیں لڑ سکتی گی۔“

”میں تمہارے لیے لڑتا رہوں گا۔ اطمینان رکھو یہاں تمہیں بدنام ہونے نہیں دوں گا۔“

وہ فون پر نمبر سچ کرتے ہوئے بولا۔ ”پتا نہیں دشمنوں کی کیا پوزیشن ہے اور وہ کیا کر رہے ہیں۔ تمہارے ہاتھ نہ آنے سے تمہارا رہے ہوں گے۔“

رابطہ ہونے ہی سیرا کی آواز سنائی دی۔ وہ حیرت سے اور مسرت سے بول رہی تھی۔ ”سر! آپ نے مجھے فون کیا ہے؟ آپ خیریت سے ہیں نا؟“

”خیریت سے نہیں ہوں۔ تم سے بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ کیا تمہارے آس پاس کوئی ہے؟“

”میں اپنے بیڈروم میں تنہا ہوں۔“

”جو کہہ رہا ہوں اسے توجہ سے سنو۔ مجھے کوئی لگی ہے۔“

وہ سچ بڑی۔ ”کیا کہہ رہے ہیں؟“

”یہ بات تمہارے کمرے سے اور تمہارے منہ سے باہر نہ نکلے اور تم سچ رہی ہو۔“

”معافی چاہتی ہوں۔ میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گی۔ آپ کہاں ہیں۔ میں ابھی آؤں گی۔“

”اپنے والدین کو بھی نہیں بتاؤ گی کہ یہاں آ رہی ہو۔“

”نہیں بتاؤں گی مجھ پر بھروسہ کریں۔“

”بھروسہ اسی لیے تمہیں بلا رہا ہوں۔ یہاں ایک کوٹھی میں ماروی میرے ساتھ ہے۔ یہ بیچاری پھر بدنام ہونے والی ہے۔ ہم دونوں اسے بدنامی سے بچا سکتے ہیں۔ یہاں تم موجود رہو گی تو اس پر الزام نہیں آئے گا کہ وہ میرے ساتھ تھا ہے۔“

سمیرا نے کہا۔ ”بے شک صرف اسی نہیں آپ کو بھی بدنامی سے بچانا میرا فرض ہے۔ آپ میرا مشورہ مانیں تو کہتی ہوں میرے والدین بھی آپ کے گھر ماروی کی نیک نامی کے لیے پوری ایک چٹائی دیاں رہے گی۔“

”مجھے اعتراض نہیں ہے لیکن ہم دشمنی اور خون خرابے سے گزر رہے ہیں۔ تمہارے والدین پریشان ہو جائیں گے۔“

”نہیں ہوں گے۔ آپ ان کی فکر نہ کریں۔“

”تو پھر ان کے ساتھ آؤ۔ خون زیادہ بہنے کے باعث میں کمزوری محسوس کر رہا ہوں۔“

اس نے فون بند کر کے وہاں کا پتہ Send کر دیا۔

ماروی بے اختیار اسے دیکھ کر جا رہی تھی۔ اس سے نظریں چرائی۔ اس نے کتنا ابا بھول گئی تھی۔ دل دھڑک دھڑک کر رہا تھا۔ کتنا عظیم انسان ہے۔ زخمی ہے۔ شاید بے ہوش ہو جائے گا۔ ایسی حالت میں میری عزت آبرو اور نیک نامی کی فکر میں مبتلا ہے۔ آج میں اعتراف کرتی ہوں۔ یہ میرا سچا عاشق ہے۔

☆☆☆

وڈیرا شمس علی چیز میں بار بیشر اور بیلو شاہ سب ہی تملار ہے تھے۔ نہ ماروی ہاتھ آئی تھی۔ نہ اسے قتل کیا جا سکا تھا۔ اسے کوئی اور لے آؤ تھا۔

غنڈا پارٹی کے لیڈر گامے نے چیز میں سے کہا۔ ”وہاں ہمارے مقابلے میں لنگڑا جاتی تھا۔ ہم نے اس کے ساتھیوں کو بھی دیکھا ہے۔ انہوں نے ہم سے پہلے وہاں مورچے بنار کھے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ہم سے مقابلہ ہوگا اور ہم امتحان تھے اس لیے ان پر حاوی نہ ہو سکے۔“

چیز میں نے کہا۔ ”ہمیں بہت پہلے اطلاع ملی تھی کہ لنگڑا جانی چاندیو کے لیے کام کر رہا ہے۔ میں یقین سے کہتا ہوں کہ لنگڑے نے ماروی کو چاندیو کے پاس پہنچا دیا ہے۔“

گامے نے کہا۔ ”جناب.....! پولیس نے ہمارے زخمی ساتھیوں کو گرفتار کر لیا ہے۔“

چیز میں نے کہا۔ ”پولیس کو اپنی ڈیوٹی کرنے دو۔ ہم بعد میں انہیں چھڑا لیں گے۔ وہ ماروی اب ہماری ضد بن گئی ہے۔ اسے ہر حال میں اور پہنچا کر چاندیو کو بچا دینا ہے۔“

اُدھر بیلو شاہ اپنے غنڈوں سے کہہ رہا تھا۔ ”اسے اوپر نہیں نیچے ہمارے پاس لانا ہے۔ اس پر نظر رکھو۔ چاندیو اسے بار بار نہیں بچا پائے گا۔“

اور شمس علی توجہ سے انگاروں پر لوٹ رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اپنی پارٹی کے غنڈے آسانی سے اسے اٹھا لیں گے۔ یہ نہیں جانتا تھا کہ جن بے شکہ تھا وہی پٹے ہو ا دے گئے۔ گامے نے یہ پہلے طے کر لیا تھا کہ ڈیرے سے اچھی رقم کھائے گا بعد میں اسے ناکامی کی خوش خبری سنائے گا۔

اب وہ سننے کے بعد گامے پر شبہ نہیں کر رہا تھا۔ محبوب کو گالیاں دے رہا تھا۔ اپنے دونوں بیٹوں کو بھی گالیاں سن رہا تھا کہ وہ کام کے نہیں ہیں۔ نہ شریف ہیں نہ بد معاش ہیں۔ بد معاش ہی ہوتے تو اپنے باپ کے لیے ماروی کو اٹھا لاتے۔

اس ہنگامے کے بعد سب ہی کو یہ کھوج لگی تھی کہ چاندیو ماروی کو کہاں لے گیا ہے؟

اس چیز کی طلب کتنی شدید ہو جاتی ہے جو بار بار گرفت سے بچل جاتی ہے۔ اب تو سب ہی کے لیے آسمان سے تارے توڑ لٹانے والی بات تھی۔

ان کی طرف سے سراغ سراں چھوڑے جا رہے تھے۔ سب ہی کا خیال تھا کہ ماروی کو اسی شہر میں نہیں چھپا کر رکھا گیا ہے۔ آج نہیں تو کل اس کا سراغ مل جائے گا۔ فی الحال وہ محفوظ تھی۔

ڈاکٹر اپنے اسسٹنٹ کے ساتھ علاج معالجے کا تمام سامان لے آیا تھا۔ اس وقت محبوب پر نیم بیوشی طاری تھی۔ وہ ابتدائی ٹریٹمنٹ کے بعد اسے خون پہنچانے لگا۔

محبوب کی آنکھیں بند تھیں۔ ماروی ایک طرف کھڑی اسے بڑی اپنائیت سے دیکھ رہی تھی۔ اس کا بکی کر رہا تھا کہ اس کے قدموں کے پاس جا کر بیٹھ جائے۔ وہ متاثر کرنے کی اور دل چیتنے کی انتہا کر چکا تھا۔

وہ بیڈروم سے باہر آکر سوچنے لگی۔ اس نیک انسان سے دور ہونا بہت ضروری ہو گیا ہے۔ میں نگاہوں کے سامنے رہوں گی تو یہ اور زیادہ پاگل ہوتا چلا جائے گا پھر کسی دن اپنی جان سے بھی جائے گا۔

وہ ایک صوفہ پر بیٹھ کر پھر اپنے دل میں جھانک کر بولی۔ ”میں اعتراف کرتی ہوں۔ اب اس سے کتنی ہی دور چلی جاؤں۔ اسے سبھی بھلا نہیں سکوں گی۔ مراد میری رگ رگ میں سایا ہوا ہے۔ آج پہلی بار یہ دیوانہ بھی میرے اندر لہو کی طرح دوڑ رہا ہے۔

یہ نئی بات کیا ہو رہی ہے؟ دل ایک ہے اور دھڑکنیں دو طرفہ ہیں۔ دل ترازو ہو گیا ہے۔ دو پہلو بے ہو گئے ہیں۔ آہ! ایسا لگ رہا ہے کہ گولی مجھے لگی ہے۔ ایسی لگی ہے کہ کبھی نہیں نکلے گی۔ اور یہ اچھی بات نہیں ہے۔ میرا دل دماغ، میرا بدن میری روح صرف مراد کے لیے تھی۔ یہ کیا ہو گیا ہے کہ سب اچانک ہی تقسیم ہو رہے ہیں؟

بے شک محبت میں بڑی محاکش ہے۔ یہ ہمیشہ تقسیم ہوتی رہتی ہے۔ جب بھی انسانوں کے درمیان چھٹکی ہے تو پھٹتی چھوٹی رہتی ہے لیکن عشق.....؟

عشق کسی ایک سے ہوتا ہے۔ یہ تقسیم نہیں ہوتا۔ عورت سے پیار کرو یا عشق کی انتہا کرو۔ وہ ہر حال میں حاصل کرنے کے لیے ہوتی ہے۔

آج تک کسی عاشق نے عورت کو سامنے بٹھا کر صرف اس کی پوجا نہیں کی ہے۔ میرے دونوں چاہنے والے بھی میری صرف پوجا نہیں کریں گے۔ ان میں سے ہر ایک کے

اندر میرے حصول کی تمنا چلتی رہے گی اور ایک عورت کی فطرت بھی چاہے گی کہ وہ کسی ایک کے وجود میں سا جائے۔ یا اللہ.....! مسئلہ کو سمجھنا چاہیے تھا۔ یہ اور الجھ گیا ہے۔“

کانگ ٹون سنائی دی۔ اس نے بن دیا کرفون کو کان سے لگایا۔ دوسری طرف سے میڈم روزی کی آواز سنائی دی۔

”ماروی! تم خیریت سے ہو؟“

وہ بولی۔ ”ابھی تک خیریت سے ہوں۔“

”تمہاری چاچا جی اور چاچا رورہے ہیں۔ کہہ رہے ہیں کہ اس شادی کے گھر میں تمہیں اغوا کیا گیا ہے۔ کیا یہ سچ ہے؟“

”ہاں سچ ہے۔ آج مین کوٹھ میں رومانہ کے گھر میں خوب گولیاں چلی ہیں۔“

”تم کہاں ہو جلدی بتاؤ۔ محبوب صاحب پریشان ہوں گے۔ میں انہیں اطلاع دوں گی۔“

”میں نہیں جانتی کہ یہ کیوں ی جگہ ہے اور یہ بھی نہیں جانتی کس نے اغوا کیا ہے۔ یہاں کوئی نظر نہیں آ رہا ہے۔“

”اچھا میں ابھی محبوب صاحب سے بات کرتی ہوں۔“

”میڈم.....! میں چاچا سے بات کرنا چاہتی ہوں۔ ان کے پاس فون نہیں ہے۔“

”میں ابھی اپنے فون سے بات کراؤں گی انتظار کرو۔“

کال ختم ہو گئی۔ روزی نے محبوب کے فون پر رابطہ کیا ہوگا۔ اس کا سوچ آف تھا۔ پھر اس نے معروف بجلی کو اطلاع دی۔ اسے بتایا کہ مین کوٹھ میں کیا ہو چکا ہے۔ یہ قیامت ہوئی ہے کہ ماروی کو اغوا کیا گیا ہے اور محبوب صاحب کا فون بند پڑا ہے۔ ان سے رابطہ نہیں ہو رہا ہے۔

معروف نے کہا۔ ”میرا خیال ہے محبوب نے اپنے فون کو بند رکھا ہے۔ وہ میرے متح کرنے کے باوجود مین کوٹھ گیا ہوگا۔ پتا نہیں یہ دیوانہ کیا کرتا پھر رہا ہے؟ اگر دشمنوں نے ماروی کو اغوا نہیں کیا ہے تو پھر وہی اسے نہیں لے گیا ہے۔“

”آپ بے گناہ جانتے ہیں کہ محبوب صاحب ماروی کو کہیں لے گئے ہیں۔ لیکن ماروی تو ایسی نہیں ہے۔“

”جو ایسی نہیں ہوتی ویسی ہو جاتی ہیں۔ مانتا ہوں کہ وہ مراد کی دیوانی ہے۔ محبوب کی آج سے نہیں پھٹکی۔ لیکن حالات انسان کو اس کے مزاج کے خلاف بدل کر رکھ دیتے ہیں۔“

”آپ جیسا سمجھ رہے ہیں ویسا نہ ہو۔ سر.....! یہ بھی تو سوچیں کہ ماروی کو واقعی اغوا کیا گیا ہو اور محبوب صاحب کا

فون کسی مجبوری یا مصیبت کی وجہ سے بند ہوتا؟“
 ”تو ہم کیا کر سکیں گے؟ اس کے دوستوں اور
 شناساؤں سے پوچھتے پھر سگے کہ وہ کہاں ہے؟ شاید کسی
 کے ذریعے ہم اس کے پاس پہنچ جائیں۔“
 ”میں ابھی ان کے شناساؤں کو فون کرتی ہوں۔“
 ”کہو اور یہ سوچو کہ وہ اگر کوئی نالک کر رہا ہے تو ہم
 اس کی بہتری چاہنے والوں میں سے ہیں۔ وہ ہمیں اتنی
 رات کو خواہ مخواہ کیوں دوڑا رہا ہے؟“
 روزی نے چانچلی مٹی سے کہا۔ ”کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا
 ہے کہ کیا ہو رہا ہے؟ ماروی تم سے بات کرنا چاہتی ہے۔ میرا
 فون ابھی بڑی رہا ہے۔ تم لیٹی سی ایل سے بات کرو۔“
 اس نے ریسپونڈر اٹھا کر ماروی کے نمبر پر فون کر کے
 ریسپونڈر کو دیا پھر اپنے فون پر نمبر پر فون کرتے ہوئے وہاں
 سے چلی گئی۔ رابطہ ہونے پر فون نے کہا۔ ”ہی! میں بول رہی
 ہوں۔ یہاں میڈیم روزی اور معروف صاحب سب ہی
 پریشان ہیں۔ مجھے تو چپ چاپ بتاؤ تم کہاں ہو؟ کب
 آ رہی ہو؟“

ماروی نے پوچھا۔ ”کیا تمہارے آس پاس کوئی ہے؟“
 ”نہیں۔ میں اکیلی ہوں۔“

”مجھے اتنا ہی کہنا ہے کہ ہم یہاں کسی حال میں نہیں
 رہیں گے۔ چاہے کچھ ہو جائے۔ مراد سے خیل میں ملاقات
 کرتے ہی تمہارے اور چاچا کے ساتھ وہ کوشی اور یہ شہر چھوڑ
 دوں گی۔“

”یہ تو ہم پہلے ہی فیصلہ کر چکے ہیں۔ تم پریشان کیوں ہو؟“
 ماروی نے اس بیڈروم کی طرف دیکھا جہاں محبوب کو
 خون پہنچایا جا رہا تھا۔ اس عاشق نے لہو کا نذرانہ دیا تھا۔ وہ
 پریشان ہو کر بولی۔ ”چانچلی! سائیکس کی محبتیں اور مہربانیاں
 حد سے گزر گئی ہیں۔ مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا ہے۔
 میرے بس میں ہو تو آج ہی یہاں سے بھاگ جاؤں۔“

”پریشان کیوں ہوتی ہے؟ میں ہوں نا تو جب
 چاہے گی تیری چانچلی ساتھ ہو جائے گی۔“

”اور ایک بات سنو۔ جتنی رقم ہے اسے اپنے ساتھ
 باندھ کر رکھو۔ پیسہ کڑھتی نہیں۔ حالات نے سمجھا دیا ہے
 کہ کسی وقت بھی کچھ بھی ہو سکتا ہے۔“

”مجھے پتہ ہی نہیں کہ کرو تم اپنی چانچلی کو ہر دم تیار پاؤ گی۔“
 ماروی نے فون بند کر دیا۔ اچانک ہی سمیرا دروازہ
 کھول کر آئی تھی۔ اس کے والدین بھی تھے۔ اس نے ایک
 نظر ماروی پر ڈالی پھر تیزی سے چلتے ہوئے بیڈروم کا

دروازہ کھول کر اندر چلی آئی۔

محبوب بیڈ پر آنکھیں بند کیے چاروں شانے چت
 پڑا ہوا تھا۔ اسے خون پہنچایا جا رہا تھا۔ اسٹنٹ جاگ رہا
 تھا اور ڈاکٹر ایک ایزی چیئر پر سو رہا تھا۔ اس نے ایک ذرا
 سخت آواز میں مخاطب کیا۔ ”ہیلو ڈاکٹر!“

وہ فوراً ہی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ بولی۔ ”میں مسٹر چانڈیو
 کی پٹی اسے بھی ہوں اور بیٹی اسے بھی۔ پرسنل اسٹنٹ اینڈ
 بزنس اسٹنٹ۔ آپ یہاں سو رہے ہیں؟“

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر بولا۔ ”اور میں ان کا فیملی
 ڈاکٹر ہوں۔ اپنی ذمے داریاں پوری کر چکا ہوں۔ مرہم
 پٹی ہو چکی ہے۔ انکسشن اور دواؤں میں دی جا چکی ہیں۔ خون دیا
 جا رہا ہے۔ تشویش کی کوئی بات نہیں ہے۔ دو اہم دواؤں
 بازار سے منگوائی ہیں۔ ایک گاڑ لیتے کیا ہے۔“

وہ بولی۔ ”حتیٰ تک یو ڈاکٹر! یہ بتائیں کہ یہ سو رہے
 ہیں یا بیہوشی کی حالت میں ہیں؟“
 ”میں نے کہا نا..... تشویش کی بات نہیں ہے۔ کمزوری
 کے باعث دواؤں کے اثر سے سو رہے ہیں۔ میرا مشورہ ہے
 کہ یہاں باتیں نہ کی جائیں۔ خاموشی رہے تو بہتر ہے۔“

وہ باہر چلا گیا۔ سمیرا نے بیڈ کے قریب آ کر محبوب کو
 گہری سنجیدگی سے اور اپنائیت سے دیکھا۔ دل میں
 کہا۔ ”آپ کیسے ضدی ہیں۔ ایک لڑکی کو پالنے کی ضد میں
 تمام کاروبار ڈبو رہے ہیں اور زندگی کو بھی داؤ پر لگا رہے
 ہیں۔“

اس نے ایک سرد آہ بھر کر سوچا۔ ”کاش! یہ محبتیں
 مجھے دیتے۔ میں تو ہر لمحہ خوشی سے مر رہی رہتی خوشی سے جیتی
 رہتی۔ کوئی میرے جیسی خوش نصیب نہ ہوتی۔ پھر بھی خوش
 نصیب ہوں کہ آپ اپنے دوسرے تمام اہم معاملات میں
 مجھے اہمیت دیتے ہیں۔ آج اتنے سنگین معاملے میں بھی پہلے
 مجھ پر بھروسہ کیا ہے۔ مجھے یہاں بلا یا ہے۔“

اسی وقت فون بولنے لگا۔ اس نے فوراً ہی اسے
 خاموش کر دیا۔ رنگ ٹون کی آواز سے محبوب کی آنکھ کھل گئی
 تھی۔ وہ فون لے کر باہر آئی۔

باہر لاؤنچ میں ماروی اور اس کے والدین بیٹھے
 ہوئے تھے۔ اس نے ماں سے کہا۔ ”ممی! وہ خبریت سے
 ہیں۔ گہری نیند سو رہے ہیں۔ ڈاکٹر نے کہا ہے تشویش کی
 کوئی بات نہیں ہے۔“

پھر اس نے ماروی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے
 پوچھا۔ ”تم یقیناً ماروی ہو۔ میں پہلی بار دیکھ رہی ہوں۔“

ماروی نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا۔ ”ہاں۔ میں ہی
 ماروی ہوں۔ میں بھی نہیں پہلی بار دیکھ رہی ہوں۔“
 سمیرا نے آگے بڑھ کر اس سے مصافحہ کرتے ہوئے
 کہا۔ ”محبوب صاحب کی ذاتی دنیا سے لے کر کاروباری دنیا
 تک تمہارا ہی ذکر ہوتا رہا ہے۔“

وہ بڑے دکھ سے بولی۔ ”میں نہیں جانتی یہ عذاب
 کب تک مجھ پر نازل رہے گا۔“

سمیرا اچھٹکنا جانتی تھی پھر کالنگ ٹون ابھرنے لگی۔
 معروف جی کال کر رہا تھا۔ اس نے بین دبا کر فون کو کان
 سے لگاتے ہوئے کہا۔ ”السلام علیکم معروف صاحب!“
 معروف نے کہا۔ ”ولیکم السلام۔ تم نے ابھی کال
 کاٹ دی تھی۔ کہاں ہو تم؟ پتا ہے؟ محبوب پھر مجھے پریشان کر
 رہا ہے۔ پتا نہیں کہاں کم ہو گیا ہے؟ وہ بھی نہیں صبر کرے
 گا۔ کہیں آرام سے ہوگا۔ میری نیند حرام کر رہا ہے۔“

وہ بولی۔ ”محبوب صاحب! آپ کو باپ کی جگہ
 مانتے ہیں۔ آپ کی سخت باتیں بھی سن لیتے ہیں۔“
 ”اسی لیے کوئی غلطی کر کے چھپ گیا ہے تاکہ میں
 اسے باتیں نہ سنا سکوں۔“

”آپ درست سمجھ رہے ہیں۔ وہ غلطی کرنے کے
 بعد ایک کوشش میں دشمنوں سے چھپے ہوئے ہیں۔“

”کیا کہہ رہی ہو؟ کیا تم جانتی ہو کہ وہ کہاں ہے؟“
 ”جی ہاں۔ میں ان کے ساتھ ہوں۔“

معروف نے ایک لمبی سانس کھینچ کر کہا۔
 ”یا خدا!..... تیرا شکر ہے۔ تم اس کے ساتھ ہو۔“

وہ بولی۔ ”ماروی بھی ہے۔“
 پھر اس کا اطمینان غارت ہوا۔ وہ چونک کر بولا۔ ”تم
 بھی ہو۔ وہ بھی ہے؟“

اس نے کہا۔ ”میرے می اور ڈیڈی بھی ہیں۔“
 ”یہ تو توڑ کر باتیں کیوں کر رہی ہو؟ سیدھی بات
 بولو..... محبوب ماروی کو تمہارے گھر لے آیا ہے۔“

سمیرا نے کچھ سوچا پھر کہا۔ ”معروف صاحب! آپ
 تمام پریشائیاں ذہن سے نکال دیں۔ آرام سے سو جائیں۔
 محبوب صاحب کل صبح آپ سے بات کر لیں گے۔“

”ٹھیک ہے۔ اب میں آرام سے سو جاؤں گا۔“ وہ
 تمہارے گھر میں ہے..... مجھے اطمینان ہو گیا ہے۔“
 اس نے فون بند کر دیا۔ گھر گھر ماروی کو دیکھا پھر
 اپنے والدین سے کہا۔ ”آپ کسی کمرے میں جا کر
 سو جائیں۔ صبح محبوب صاحب سے باتیں ہوں گی۔“

وہ دونوں اٹھ کر وہاں سے چلے گئے۔ وہ ماروی کے
 پاس آ کر بیٹھ کر پھر بولی۔ ”ہماری پہلی ملاقات ہے۔ ویسے
 تمہارے بارے میں بہت کچھ سن چکی ہوں۔“
 وہ بولی۔ ”نہیں کیا؟ میری حیثیت کیا؟ ایک غریب
 لڑکی کی باتیں کچھ کی طرح اچھلی جارہی ہیں۔“

سمیرا نے ہاں کے انداز میں سر ہلا کر کہا۔ ”یہ دنیا کا
 دستور ہے۔ لڑکی تنہا ہو۔ کوئی یار و مددگار نہ ہو تو پتھر مارے
 لے لے کر اسے بدنام کیا جاتا ہے۔“

ماروی نے بیڈروم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اور
 کوئی مددگار نہ ہو تو اسے بھی نہیں بخشتے۔“

”مرا کا خیال جانا۔ تمہارا تمہارے محبوب صاحب کی
 امداد قبول کرنا۔ یہ اس باتیں ہیں کہ لوگوں کی الزام تراشی
 درست لگتی ہے۔ جبکہ ہم جانتے ہیں کہ تم ہی حیوادالی ہو اور
 بے داغ ہو۔“

”شکر ہے۔ دو چار سے جو نیک نامی ملتی ہے۔ وہ
 رسوائیوں کے جہنم میں گم ہو جاتی ہے۔ ہمیں تو ہر حال میں
 پتھر مارنے والی دنیا میں جینا پڑتا ہے۔“

”ابھی مین گوشت میں کیا ہوا تھا؟“
 ”میں سبیل کی شادی میں گئی تھی۔ اندیشہ تھا کہ دشمن
 میری تاک میں ہیں لیکن سوچا بھی نہیں تھا کہ وہاں گولیاں
 چلیں گی اور میری خاطر محبوب صاحب زخمی ہو جائیں گے۔“

”بہی دیکھو کہ وہ تمہاری خاطر جان پر کھینے کو تیار
 رہتے ہیں۔ کیسے چاہنے والے ہیں۔ تمہارے ساتھ نیکیاں
 کرتے ہیں اور بدنامیاں مول لیتے ہیں۔“

”جب سے ان کی نیکیاں شروع ہوئی ہیں۔ تب سے
 بدنامیاں ساتھ ساتھ چل رہی ہیں۔ میں کیا کروں؟ مجھ میں
 نہیں آتا بھاگ کر کہاں جاؤں؟“

سمیرا نے اسے ٹٹوٹی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے
 کہا۔ ”وہ تم پر کروڑوں لٹا رہے ہیں۔ یہ کیوں نہیں
 سوچتیں کہ ان کی منکوحہ بن جاؤ تو اربوں کی جائیداد کی مالک
 بن جاؤ گی؟“

”بہت بڑی مالک بن کر بھی تین ہی وقت کی روٹیاں
 کھاؤں گی۔ چوتھے وقت کھاؤں گی تو بدبھنی ہو جائے
 گی۔ پھر یہ کہ میں صرف اپنے خیمہ کی سستی ہوں اور ضمیر کہتا ہے
 میں ایک غریب سے اس کی محبت چھین کر دوستانہ کوندوں۔“

دوسری طرف یہ سچ ہے کہ محبوب صاحب بھی
 مہربانیاں کر رہے ہیں اور جیسی قربانیاں دے رہے ہیں۔
 انہیں دیکھ کر دل ان کی طرف مائل ہو چکا ہے۔“

برنارڈ کا دم جھرنائی سے کھل گیا۔ اس نے فون لے کر کان سے لگا کر کہا۔ ”سر! برنارڈ اسٹینک“ دوسری طرف سے پوچھا گیا۔ ”کیا تمہیں مرنے کے لیے پاکستان کی زمین پسند آتی ہے؟“

”نوسر!.....! آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ فیڈرل بورڈ آف انٹیلی جنس میں میری ہر ضرورت پوری کی جاتی تھی تاج کی طرح سر پر پہنا جاتا ہے۔“

”بے شک ہم نے تمہارے کارنامے سنے ہیں۔ اس کے باوجود تمہیں سمجھاتے ہیں۔ مرینہ سے دور رہنا۔“

اس نے مرینہ کو گھور کر دیکھا پھر پوچھا۔ ”کیا ہے یہ؟ آپ کیوں ڈر رہے ہیں؟“

”ہم سمجھا رہے ہیں۔ ایف بی آئی اور سٹینک ریڈ الارٹ سے ہمارا معاہدہ ہے کہ تمہیں وہاں سے ہجرت نکال لائیں گے۔ میں تمہارے اعلیٰ افسران سے ابھی بات کرتا ہوں۔ تمہارے بڑے جانتے ہیں۔ تم بھی یہ جان لو کہ ہمارے ڈیپارٹمنٹ میں تھری مونٹرس (تین بلائیں) ہیں۔ ان میں سے ایک بلا ابھی تمہارے سامنے کھڑی ہے۔“

وہ سن رہا تھا اور بے یقینی سے مرینہ کو دیکھ رہا تھا۔ فون پر کہا جا رہا تھا۔ ”تمہاری سلامتی اور واپسی اسی میں ہے کہ اس بلا سے دور رہو۔ ورنہ وہ تمہیں واپس نہیں آنے دے گی۔“ وہ ٹالنے کے انداز میں بولا۔ ”اوکے میں سوچوں گا۔“

مرینہ نے اپنا فون واپس لے کر جیلر سے کہا۔ ”پاپا! آپ ہمیں ایسے قیدی سے ملائیں جو بہت ڈنچرس ہیں۔ ہم ان سے الگ باتیں کریں گے اور ان سے کام لیں گے۔“

وہ سب برنارڈ کے سیل سے باہر آ گئے۔ اس دروازے کو لاگ کر دیا گیا۔ جیلر نے اسٹینٹ جیلر سے کہا۔ ”ان تینوں کو بدنام قیدیوں کے پاس لے جاؤ اور حفاظت رکھو کوئی گڑبڑ نہ ہونے پائے۔“

مرینہ نے دارا اور بہرام سے کہا۔ ”تم جاؤ ان سے ملاقاتیں کرو۔ میں ابھی آکر جوائن کروں گی۔“

وہ اسٹینٹ جیلر کے ساتھ چلے گئے۔ بیٹی نے کہا۔ ”پاپا! میں مراد سے ملوں گی۔“

اس نے تعجب سے پوچھا۔ ”اس سے کیوں ملو گی؟“

وہ بولی۔ ”ہم ابھی باپ بیٹی نہیں ہیں۔ ہمارے سلسلے میں اوپر سے جو احکامات آئے ہیں۔ آپ ان پر عمل کریں۔“

اس نے ہتھ پٹے ہوئے کہا۔ ”اچھا تو میری بیٹی نہیں

کمرے میں رکھا گیا تھا وہاں آرام دہ بیڈ، صوفے، ریفریجریٹر اور ٹی وی جیسی آرام و آسائش کی چیزیں موجود تھیں۔

انہوں نے برنارڈ کو اس کے ملک سے آیا ہوا ایک خفیہ خط دیا۔ برنارڈ کا تعلق ایک خطرناک تنظیم سٹینک ریڈ الارٹ سے تھا۔ وہ خط پڑھ کر اسے یقین ہوا کہ وہ تینوں انگلیڈ اور اسکاٹ لینڈ یا رڈ سے اس کی سلامتی اور رہائی کے لیے آئے ہیں۔

اس نے خوش ہو کر ان سے مصافحہ کیا اور کہا۔ ”مجھے یقین ہو گیا ہے کہ میں قانون کے پھندے سے نکل جاؤں گا۔“

بہرام نے پوچھا۔ ”تمہیں اور کس چیز کی ضرورت ہے؟“

وہ بولا۔ ”مپورنڈ ہسکی ختم ہو گئی ہے۔“

دارا نے جیلر سے کہا۔ ”مشر دلاور اشام سے پہلے اس کی ضرورت پوری کر دیں۔“

مرینہ نے پوچھا۔ ”اور تمہیں کچھ چاہیے۔“

برنارڈ نے مسکرا کر کہا۔ ”تم بہت حسین اور دل نشین ہو۔ پوچھتی کیا ہو؟ شراب کے ساتھ شاپ لازمی ہو جاتا ہے یہاں رگ جاؤ۔ ان دونوں کو جانے دو۔“

جیلر باپ نے اسے غصہ سے دیکھا۔ مرینہ نے ہتھ پٹے ہوئے کہا۔ ”بچے! میں جس کے بیڈ پر جاتی ہوں۔ اسے چار کاندھے اٹھا کر لے جاتے ہیں۔“

وہ بولا۔ ”اور جس پر میری نیت آ جاتی ہے۔ اسے میں ہر قیمت پر حاصل کر کے رہتا ہوں۔ یوں بھی تم تینوں کی ڈیوٹی ہے کہ میری ضرورتیں پوری کرتے رہو۔“

دارا نے کہا۔ ”اپنے دماغ سے یہ خناس نکال دو کہ ہم تمہاری غلامی کرنے آئے ہیں۔“

بہرام نے کہا۔ ”ہماری ڈیوٹی ہے تمہیں صحیح سلامت اس ملک سے لے جانا۔ ہم تمہیں ملک عدم میں بھی پہنچا سکتے ہیں۔“

مرینہ فون پر نمبر شیخ کر رہی تھی اور کہہ رہی تھی۔ ”برنارڈ! اگر تم مجھے ہر قیمت پر حاصل کر لو گے تو تمہاری ماں کو دودھ پلانے کا انعام دوں گی۔“

اس نے فون کو کان سے لگا یا پھر کہا۔ ”سر! آپ نے برنارڈ کو زندگی دینے کے لیے بھیجا ہے اور یہ میرے بیڈ پر آکر مرنے چاہتا ہے۔ کیا حکم ہے سر؟“

دوسری طرف سے کہا گیا۔ ”اسے فون دو۔“

مرینہ نے برنارڈ کی طرف فون بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”ڈائریکٹر جنرل آف ایس او فکشن ایٹنی ٹرٹرسکوڈ لندن.....“

اس کی حمایت میں مداخلت کرنے آئیں۔

حکمران ان طاقتوں کے زیر اثر تھے۔ انہوں نے ان حضرات کو حکم دیا کہ کسی بھی طرح سٹینک ریڈ الارٹ کے خلاف مقدمہ کو کمزور بنایا جائے اور کسی طرح اسے رہا کر کے اس کے ملک اسے واپس جانے دیا جائے۔

پاکستانی سرافراں اسے چھوڑنے والے نہیں تھے۔ پوری قوم چاہتی تھی کہ اس دشمن ایجنٹ کو سزائے موت ملے لیکن حکومت کی اہم کرسیوں پر بیٹھنے والے چند سیاست دان بیرونی طاقتوں کی جی جنسوری میں لگے رہتے تھے اور آٹار بتا رہے تھے کہ پاکستانی اس ایجنٹ کو یہاں سے زندہ جانے نہیں دیں گے۔ اس کے حامیوں نے فیصلہ کیا کہ ناکامی کی صورت میں اس ایجنٹ کو بڑی رازداری سے جیل سے نکال کر فرار کرایا جائے گا۔

اس مقصد کے لیے انگلیڈ اور اسکاٹ لینڈ کی کرائم برانچ سے تین پاکستانی جاسوسوں کا انتخاب کیا گیا۔ وہ تینوں انگلیڈ اور اسکاٹ لینڈ کے وفادار تھے اور اپنے ہی ملک پاکستان کے خلاف کچھ بھی کر سکتے تھے۔ ان میں سے ایک کا نام دارا اکبر دوسرے کا نام بہرام اور تیسری کا نام مرینہ تھا۔

کس ملک میں ضمیر فروش نہیں ہوتے؟ ہر ملک میں ہوتے ہیں۔ پاک و طن میں بھی ہیں۔ یہاں پولیس اور انٹیکس ڈیپارٹمنٹ سے بھی ایسے افسران کو ترغیب دی گئی جو سٹینک ایجنٹ برنارڈ کے فرار ہونے کا راستہ ہموار کر سکتے تھے۔

ابھی کو شیش کی جارہی تھی کہ مقدمہ کو کمزور بنا کر اسے عدالت سے رہائی دلائی جائے۔ اس دور ان میں مرینہ دارا اور بہرام رازداری سے فرار کے راستے ہموار کر رہے تھے۔

ان دنوں برنارڈ، سکھر جیل میں تھا۔ جب اسے کراچی سینٹرل جیل میں منتقل کیا گیا تو مرینہ اس روز وردی پہن کر جیلر باپ کے آفس میں آئی۔ اس کے ساتھ دارا اور بہرام بھی تھے۔ انہوں نے اپنے کاغذات جیلر کے آگے رکھے۔

وہ کاغذات اعلیٰ حکام کی جانب سے تھے۔ جیلر کو حکم دیا گیا تھا کہ غیر ملکی انٹیلی جنس ڈیپارٹمنٹ سے آنے والوں سے تعاون کیا جائے۔ ان کے کسی معاملہ میں مداخلت نہ کی جائے اور ان کی تمام ضروری ہدایات پر عمل کیا جائے۔

جیلر ان تینوں کو جیل کے اس حصے میں لے گیا جہاں برنارڈ کو رکھا گیا تھا۔ پہلے ہی اوپر سے آنے والے احکامات کے مطابق اسے وی آئی پی ٹی ٹرینٹ دیا گیا تھا۔ اسے جس

یہ ایسی بات تھی کہ سمیرا پریشان ہو گئی۔ ماروی نے کہا۔ ”آخر میں انسان ہوں۔ میرے سینے میں عورت کا دل ہے اور عورت بے لوث محبت کرنے والوں سے متاثر ہوتی ہے۔ میں محبوب صاحب کی محبت اور انسانیت کا صلہ دینے پر آئندہ مجبور ہو سکتی ہوں۔ اس سے پہلے ہی ان سے بہت دور چلی جانا چاہتی ہوں۔“

سمیرا نے قائل ہو کر کہا۔ ”تمہارے سامنے یہی ایک راستہ ہے کہ محبوب صاحب سے دور چلی جاؤ۔ ان کی نظروں سے ہمیشہ کے لیے چھپ جاؤ۔ لیکن.....“

وہ ڈرا چپ ہوئی پھر بولی۔ ”تم نہیں جاؤ گی تو تمہارا مراد یہاں مقدمہ جھگڑنے کے لیے رہ جائے گا۔ دوسرے لفظوں میں تم صرف محبوب صاحب سے ہی نہیں مراد سے بھی دور ہو جاؤ گی۔“

وہ بولی۔ ”مجھے یہ امید رہے گی کہ مراد رہائی پاتے ہی جہاں میں رہوں گی وہاں چلا آئے گا۔“

سمیرا نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”عورت وہی ہے جو شرم و حیا سے جھجکتی ہے اور کسی ایک چاہنے والے پر مرنے لے۔ تمہیں دولت کی ہوس نہیں ہے۔ مجھے تم سے مل کر خوشی ہو رہی ہے۔ تم بہت اچھی، بہت جلی لڑی ہو۔“

پھر وہ اس کی طرف جھک کر جیمس سرگوشی میں بولی۔ ”محبوب صاحب کو ان کی نیکیوں کا صلہ اسی طرح دے سکتی ہو۔ ان کے کاروبار کی سلامتی کے لیے دور چلی جاؤ۔ جانے کے سلسلے میں کوئی رکاوٹ ہوگی تو میں دور کروں گی۔“

سمیرا نے اس کا ہاتھ مانگا۔ ماروی نے ہاتھ بڑھایا۔ پھر دونوں ہاتھ ایک دوسرے سے ہتھیلیوں کی طرح مل گئے۔

☆☆☆

اس دنیا میں سیدھی سادی پیار بھری زندگی گزارنے والے کثیر تعداد میں ہیں لیکن ایسے معصوم لوگوں کی سماجی زندگی میں شر پسند اور مجرمانہ زندگی گزارنے والے کسی نہ کسی بہانے سے آہی جاتے ہیں۔

ان دنوں سمندر پار سے ایک سٹینک ایجنٹ پاکستان آیا ہوا تھا۔ ایک بہت ہی اہم فوجی راز چھرا کر لے جانے کی خوش بھی میں تھا۔ جلد ہی اسلام آباد کے سرافراںوں کی نظروں میں آ گیا تھا۔ ان سے جان چھرا کر فرار ہونا چاہتا تھا۔

ایسے وقت اس نے فائرنگ کی تو دوسرا سرافراں مارے گئے اور وہ مگر فرار ہو گیا۔

اس پر غیر ملکی ایجنٹ ہونے جاسوسی کرنے اور دو سرافراںوں کو ہلاک کرنے کا مقدمہ چلنے لگا تو بڑی طاقتیں

جاؤ گے تو میرا کام کر سکو گے۔“

”میں باہر جا سکوں گا.....؟“ اس نے تصور میں دیکھا، وہ جیل سے باہر نکلتے ہی ماروی کو گلے لگا رہا تھا۔

وہ بولی۔ ”ہاں۔“ میں تمہیں یہاں سے نکالوں گی۔“

اس نے بے یقینی سے پوچھا۔ ”کیا عدالتی فیصلہ ہوتا رہے گا اور تم مجھے یہاں سے باہر لے جاؤ گی؟“

بعض حالات میں یوں ضروری نہیں ہوتا۔ سمجھنا لازمی ہوتا ہے۔ وہ سر جھکا کر دوسری طرف گھوم گئی۔ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے آہنی سلاخوں والے دروازے سے گزر کر باہر چلی گئی۔ مراد نے آگے بڑھ کر سلاخوں کو تھام کر اسے دیکھا۔ وہ ٹھہر ٹھہر کر جاتے جاتے کوریڈور کے مونڈ پر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

☆ ☆ ☆
اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اسے فوراً یاد نہیں آیا کہ کہاں آکر سونے کے بعد آٹھ گھنٹے کی ہے؟ وہ چاروں شانے چت پڑا تھا۔ خواب گاہ کی چھت دکھائی دے رہی تھی۔ پنکھا تیزی سے گھوم رہا تھا۔ اس نے سرگھا کر دیکھا۔ کچھ قاصلے پر سمیرا نظر آئی۔ وہ ایک ایزی چیئر پر گہری نیند میں تھی۔
جب اسے یاد آیا کہ وہ اپنی ایک پرائیویٹ کوشی میں ہے۔ پچھلی رات زخمی ہو کر ماروی کے ساتھ وہاں آیا تھا۔ اس نے دوسری طرف سرگھا کر زخمی بازو کو دیکھا۔ ڈاکٹر نے اچھی طرح مرہم پٹی کی تھی۔ بیڈ کے قریب خون کی خالی بوتل اسٹینڈ سے لٹک رہی تھی۔ وہ آرام سے تھا کسی طرح کی تکلیف نہیں تھی۔

”اسی طرح آگے کی بات نہیں جان سکو کہ یہاں سے اچانک ہی باہر کیسے نکل جاؤ گے۔“

وہ اس کے کشادہ سینے پر دو ہاتھ پھیلیاں رکھتے ہوئے بولی۔ ”تم پر بڑا پیار آرہا ہے۔ بدعا شوں اور مجرموں کے ایسے دور میں ایسی سادگی اور معصومیت مجھے ڈوٹ رہی ہے۔“

اس نے پھر سر ہٹھا کر زیر آکھینچا۔ وہ وہاں آکر گھر دار بن گئی تھی اور تیار داری کرتے کرتے وہیں سو گئی تھی۔ نیند کی حالت میں بہت اچھی لگ رہی تھی۔ وہ بڑی عقیدت سے اسے دیکھ رہا تھا۔

بے شک اسے دیکھ رہا تھا لیکن اسے دیکھتے وقت بھی ہر جاتی بن تھا۔ وہ ماروی کو سوچ رہا تھا کہ وہ کہاں ہے؟

اس نے اپنی ہتیلیاں ایسے انداز سے، ایسے جذبے سے اس کے سینے پر رکھی تھیں کہ وہ گرڈ بڑ گیا۔ ایسا بھی بھولا ورنہ نادان نہیں تھا۔ مرینہ کی گوری اور گلرانی رنخت دیمی دیمی ہو سکتا تھا۔

اس نے سوچا کاش وہ میری پیادواری کرتے کرتے یہاں ٹھکی ہوئی سی سوچا جاتا تو مجھے کئی اپنایت سی مل جاتی۔

وہ انکچلاتے ہوئے ذرا پیچھے ہوا۔ وہ ساتھ ساتھ آگے
 وہ جا کر سوئی۔ ایسی بھی کیا ہے جسی اور لا تعلقی؟

میں آئی۔ سینے کا کناٹا پر ہتھیلیاں سلتی رہیں۔ پھر کیا ہوا
 کہ خود ہی جو تک گئی۔ اس سے ایک قدم دور ہو گئی۔ اس نے
 وہ مایوس ہو رہا تھا پھر ہی تصویر کی آنکھ سے اسے ہی
 دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے دیکھا۔ اس کی سے دروازہ کھلا۔ وہ

ہٹا کیسیویں کود لیا پھر پٹیلں اشا کر مراد کود لیا اور دونوں
 جھانک کر اسے دیکھ رہی تھی۔ طرس پٹیلں تو وہ ذرا ٹھنک لئی
 پھر دروازہ پوری طرح کھول کر اندر آئی۔ اس کی آنکھیں کبہ

سے دیکھ رہا تھا۔ چمچہ بھنے کے باوجود چمچہ اور بھنے لورہ کیا تھا۔ وہ انتظار کر رہا تھا، کچھ بولے لی۔

رہی میں کہ وہ سوئی نہیں ہے۔ بے کس نہیں ہے۔ جاگ رہی تھی اور شاید پہلے بھی آکر اسے سوتے ہوئے دیکھ کر مرنی ہے۔

سکرا سکا پھر بیٹی کے گال پر ہلکی سی چٹکی دی اور چلا گیا۔ جیل کے اسی حصے میں کوئی دوسرا سیل نہیں تھا۔ وہاں خاموشی اور ایرانی محسوس ہر اداسے بڑی دیر سے دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ مجھے سے کیوں ملنے آئی ہے اور آج تو اس نے پولیس والوں جیسی وردی پہنی ہے۔ کوئی بڑی افسر لگ رہی ہے۔“ وہ دروازہ کھول کر اندر آگئی۔ سیل کا جائزہ لینے کے لیے۔ وہاں فرش پر بچھوتا تھا۔ بیٹھنے کے لیے ایک چھوٹی سی پٹائی تھی اور دیوار کے ساتھ لگی ہوئی سیٹ کی ایک بچ بچ ہوئی تھی۔

وہ مراد کے چاروں طرف آہستہ آہستہ چکر لگاتے ہوئے
اسے تیز نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”تم مجھے دیکھ رہے

اس نے پوچھا۔ ”آپ کوئی سرکاری آفیسر ہیں؟“

”ہاں۔ میری رشتے داری مجرموں سے رہا کرتی ہے۔“
”میں نے اپنے ملک میں ایسی وردی کسی کی نہیں دیکھی۔“

”میں لندن سے آئی ہوں۔ ہم لے دس جمائیں
پڑھی ہیں۔ کنویں کے مینڈک ہو۔ اپنے ملک سے باہر کی

وہ متاثر ہو کر اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے بالکل روبرو

ہو کر لہا۔ انسان کو کہ ایک ڈیجر سن پرانی ہوں اور تین ماہ کی چھٹی بھی لی ہے۔ شادی کرنے اور برڈھونڈنے میں

پھر اس نے سرگوشی میں پوچھا۔ ”تین مہینے بہت ہیں نا؟“

”تم ہی تو سب کچھ ہو۔ یہاں تمہارا منہ دیکھنے نہیں

وہ حیرانی سے بولا۔ ”میں..... کہاں سے لاؤں
 صابن؟“

وہ سلاخوں والے دروازے کی طرف اشارہ کرتے

”آج کل کے زمانے میں اگرچہ کچھ بچے ہو سکتے ہیں۔“

”میں باپ کی بھی محتاج نہیں رہتی ہوں۔ اپنے

ڈالو۔ یہ نہ سوچو کیا کرنے والی ہوں۔“

لاؤں گا؟ کیسے لائوں گا؟“

”ایک موٹی عقل سے سمجھ سکتے ہو کہ یہاں سے باہر

ہو۔ لندن سے آئی ہوئی بلائے جان ہو۔“ وہ اس کے رخسار کو ٹھیکتے ہوئے بولا۔ ”کہاں ملو

”جہاں پر ایسی ہو اور آپ بھی نہ ہوں۔“

”تو پایا.....!“

کے پاس آئے۔ محبوب بھاری رشوتیں دے رہا تھا۔ اس

بہن کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ مرینہ نے کہا۔ ”پاپا! دروازہ کھلا رکھ۔“

وہ بولا۔ ”سوری۔ میں تمہارے لائے ہوئے کاغذ۔ کے مطابق عمل کر رہا ہوں لیکن جیل کے قانون

”میں اس سے آفریں میں ملنا چاہتی تو آپ اسے وہاں کے خلاف سیل کا دروازہ نہیں کھولیں گے۔“

”مجھ سے بحث نہ کرو۔ ماہ سے زیادہ کوئی نہیں

جانتا کہ تم سر پھری ہو۔ وہاں اپنی ٹر اسکوڈ میں تمہیں
خطر ناک ملا، کسی وجہ سے ہی کہا جاتا ہے۔“

”پلیز یہاں کچھ نہیں ہوگا۔ میں اپنے پاپا کی ملازمت کو خطرے میں نہیں ڈالوں گی۔“

وہ باپ کی گردن میں بائیس ڈال کر لپٹ گئی۔ وہ بولا۔ ”کچھ معلوم تو ہو اس سے ملنے کیوں آئی ہو۔ یہ ایک

معمولی سادیہاتی عاشق مزاج آلو کا پٹھا ہے۔ جھوٹے الزام میں آیا ہے اور پھانسی پر چڑھنے والا ہے۔ ایسے گدھے سے

کیوں ملنے آئی ہو؟“ وہ کان کے پاس منہ لے جا کر بولی۔ ”جوان بیٹیوں

سے نہیں پوچھتے کہ وہ کسی گدھے سے کیوں ملنے جا رہی ہیں؟
وہ بے بسی سے بولا۔ ”تم لندن سے کیوں آئی ہو؟“

”اپنے پاپا کو پیار کرنے۔“
اس نے باپ کے گال پر بوسہ لیا۔ وہ بے بسی سے

سپاہی کو دیکھ کر بولا۔ ”دروازہ کھول دو۔“
وہ باپ سے الگ ہو گئی۔ سپاہی نے آکر دروازہ

کھول دیا۔ ”تھینک یو پاپا!“
وہ بولا۔ ”میں آدھے گھنٹے کے اندر آؤں گا۔“

”پینز پاپا! جی کے لیے بیئر نہ ہیں۔ میں کال کروں گی۔ تب آئیں گے۔“

Italiano®

Permanent Hair Colour Cream

Free Developer Inside



01 Natural Black

02 Dark Brown

03 Medium Brown

04 Light Brown

**Nourishment for Hair With
Silk Protein, Vitamin E & Hair Conditioner**

اس نے ناگواری سے سوچا۔ ”بچھلی رات ماروی نے کہا تھا وہ بدنامی سے گھبرا گئی ہے۔ اب یہاں نہیں رہے گی۔ جلد ہی محبوب سے دور نہیں چلی جائے گی۔“

وہ منہ ہاتھ دھوتے ہوئے زیر لب بولی۔ ”اوند! سب دکھاوا ہے۔ دل تو صاحب پر اٹکا ہوا ہے۔ اپنی خدمت گزار کی دکھانے کے لیے ایک ٹانگ پر کھڑی تھی۔ اب وہاں کھڑی ناشتا کر رہی ہے۔ دل جیتنے کا کام کر رہی ہے اور ابھی سے صرف اپنے مراد کی ہے۔ کسی اور کا منہ نہیں دیکھے گی۔ جھوٹی کہیں گی۔“

اس نے واش بین کے آئینے میں خود کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”بڑے انتظار کے بعد محبوب نے اپنے قریب بلا یا ہے یہاں صرف مجھے ہی ان کے قریب رہنا چاہیے۔ ایسا کیا کیا جائے کہ ماروی یہاں سے چلی جائے؟“

وہ تولیے سے منہ پونچھتے ہوئے بولی۔ ”مشکل تو یہ ہے کہ محبوب اسے نہیں چھوڑ رہے ہیں۔ دونوں ایسے بدنام ہو رہے ہیں۔ جیسے بدنامی ان کے لیے دلچسپ مشغلہ بن گئی ہو۔“

وہ کمرے میں آئینے کے سامنے آکر خود کو دیکھنے لگی۔ لباس پر شکنیں پڑی تھیں۔ چہرے پر بھی لائٹ میک اپ ضروری تھا۔ یہی تو موقع تھا کہ زیادہ سے زیادہ پرکشش بن کر رہے۔

اور وہاں جانے کی جلدی بھی تھی۔ ماروی کو ادھر تنہائی اور قربت زیادہ سے زیادہ مل رہی تھی۔ ایسے وقت ذہن الجھ کر رہ جاتا ہے کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے؟

اچھا پہننا اور اوڑھنا تو ضروری تھا۔ وہ بڑے سے بیگ میں ملبوسات اور دیگر ضروری چیزیں لے آئی تھی۔ لباس پر استری پھیرنے اور پینے میں وقت لگا پھر لائٹ میک اپ نے اسے نکھار دیا یوں کسی حد تک جیتا جاسا اور چلتا پھرتا تاج محل بن گئی پھر محبوب کی خواب گاہ میں آئی تو وہ نہیں تھا۔

اچانک یوں لگا جیسے ماروی اسے لے آئی ہو۔ اگرچہ یہ محض حاسدانہ سوچ تھی۔ وہ کیا کرتی؟ دل کہہ رہا تھا کہ محبوب کے ساتھ لگے رہنے کا بھی موقع ہے۔ وہ جب تک اس کوٹھی میں چسپا رہے گا اسے بھی اس کے ساتھ دن رات رہ کر اسے جیتنے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے۔

وہ تیزی سے چلتی ہوئی ڈرائنگ روم میں آئی۔ محبوب وہاں بیٹھا فون پر کہہ رہا تھا۔ ”میں مانتا ہوں سیرا نے میرے کاروباری معاملات کو بڑی ذہانت سے کیری آن

اور محبت کیا ہوتی ہے؟ یہی تو ہوتی ہے۔ محبوب کا دل مسرتوں سے بھر گیا۔ اس نے سیرا کی موجودگی کے باعث دھیمی آواز میں پوچھا۔ ”تم جاگ رہی ہو؟“

وہ بھی قریب آکر دھیمی آواز میں بولی۔ ”آپ بہت کمزور ہو گئے ہیں۔ بھوکے سو گئے تھے۔ میں نے سوچا کسی وقت بھی آنکھ کھلے گی۔ ڈاکٹر کہہ گیا ہے آپ کو مکھن تھوس اور ہاف فرائی انڈا ضرور دیا جائے۔ انہی تیار کر کے لے آئی ہوں۔“

وہ پہلی بار اس کے ہاتھ کا پکایا ہوا کھانے والا تھا۔ خوش ہو کر بولا۔ ”ہاں مجھے بھوک لگ رہی ہے۔“ وہ کمرے سے چلی گئی۔ اسے پہلی بار ماروی سے ایک گھریلو عورت کی اپنائیت اور توجہ مل رہی تھی۔ بازو کا زخم خاموش تھا کسی طرح کی تکلیف نہیں تھی۔ اس نے فون کو آن کر کے وقت دیکھا۔ صبح کے چھ بجتے والے تھے۔ وہ بیڈ سے اتر کر واش روم میں چلا گیا۔

بچھلی رات خطرات سے کھیلنے کے بعد دوسری صبح بڑی خوشگوار ہوئی تھی۔ آنکھ کھلنے کے بعد ماروی کی قربت اور خدمت گزار کی مل رہی تھی۔ وہ واش روم سے واپس کمرے میں آیا تو وہ بڑی سی ٹرے میں ناشتا لے آئی تھی۔ اس نے ٹرے کو بیڈ پر رکھ کر پوچھا۔ ”یہ ناشتا کہاں کریں گے؟“ وہ بولا۔ ”بیمیں رہنے دو اور میرے ساتھ شروع ہو جاؤ۔“

وہ بیڈ پر بیٹھ گیا۔ ماروی نے کہا۔ ”آپ کھائیں۔ میں سیرا کے ساتھ ناشتا کروں گی۔“

اسی وقت سیرا کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے دونوں کو دیکھا۔ پھر جلدی سے کمری پر سیدی ہو کر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”اوگاڈ!..... امیری آنکھ لگ گئی تھی۔“

محبوب نے کہا۔ ”تم میری خاطر کرسی پر پڑی رہی تھیں۔ آرام سے بیڈ پر سونا چاہیے تھا۔“

وہ ماروی کو دیکھ کر بولی۔ ”یہ تم نے اچھا کیا۔ انہیں جاگتے ہی کھانے کو دے رہی ہو۔ میں ابھی واش روم سے ہو کر آئی ہوں۔“

وہ اس کمرے سے نکل کر دوسرے کمرے کے واش روم میں آئی۔ وہ رات کو محبوب کے پاس جاگتی رہی تھی۔ اس کی آنکھ کسی وقت بھی کھلتی تو وہ دیکھتا کہ سیرا اس کی خدمت کے لیے جاگ رہی ہے۔ لیکن وہ سوتا رہا تھا۔ اور وہ جب جاگا تو یہ سوئی تھی۔ ماروی نے خدمت گزار کی کا اعزاز حاصل کر لیا تھا اور یہ اچھا نہیں ہوا تھا۔

اس نے سیرا سے کہا۔ ”یہ گھبرا گئی ہے۔ ہماری لاعلمی میں کہیں جانے کی تو بری طرح پھپھتا نے گی۔ اسے سمجھاؤ۔“ بدنامیوں نے اسے تو ذکر رکھ دیا ہے۔ کل رات رو رہی تھی۔ میرے بھانے سے نہیں بچھی۔“

”پھر بھی کوشش تو کرو۔“ آپ کہتے ہیں تو ایک بار نہیں بار بار اسے سمجھاؤں گی۔ لیکن آپ اس کے مزاج کو دیکھیں اور سمجھیں۔ یہ اوپری دل سے مان جانے اور پھر وری کرے جو اس کے دماغ میں سما گیا ہے تو پھر آپ اسے کہاں ڈھونڈتے پھر میں گے؟“ وہ پھر دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ سیرا نے کہا۔ ”میری ایک بات مان لیں۔ اس کی تسلی کے لیے اس کی بات عارضی طور پر مان لیں۔ ابھی یہاں سے آفس جائیں۔ دوستوں اور دشمنوں کی نظروں میں آئیں۔ اور ماروی کی تلاش میں اپنے لوگوں کو دوڑاتے رہیں۔ یہ ثابت کریں کہ آپ ماروی کے ساتھ نہیں ہیں۔“

دشمن دیکھیں گے کہ آپ خود اسے تلاش کر رہے ہیں تو انہیں یقین ہو جائے گا کہ یہ آپ کے پاس نہیں ہے۔ آپ دو چار روز ادھر نہ آئیں۔ اس میں آپ کا اور ماروی کا فائدہ ہے۔ جب آپ کا دل نہ مانے تو کسی رات چھپ کر یہاں آجائیں۔“

وہ سر جھکا کر سوچنے لگا۔ ابھی منظر عام پر آکر دشمنوں کو دھوکا دیا جاسکتا تھا۔ اس بدنامی سے بچ سکتا تھا کہ ماروی کے ساتھ کہیں دن رات گزار رہا ہے۔ اس بیچاری کو بھی بدنامیوں سے بچا سکتا تھا۔

اور..... اس نے سوچا۔ ”جب میرا دل نہیں مانے گا۔ ماروی کو قریب سے دیکھنا چاہوں گا تو کسی وقت بھی یہاں چلا آؤں گا۔“

وہ صوفہ کی پشت سے ٹیک لگا کر بولا۔ ”ٹھیک ہے ماروی سے بولو۔ میں ابھی جا رہا ہوں اور اس لیے جا رہا ہوں کہ وہ خوش ہو جائے گی۔ میں اس کی خوشی چاہتا ہوں۔“ یہ خوش خبری پہلے معروف علی کو سنائی گئی تھی۔ خبر پورے کاروباری حلقے میں پھیلی کہ چاندیو صاحب آفس انٹینڈ کریں گے۔ ان کے اہم کلائنٹ فون پر رابطہ کر سکیں گے۔ یوں یہ خبر دشمنوں تک پہنچی کہ محبوب نے نہ ماروی کو اغوا کیا ہے نہ کرایا ہے اور نہ ہی اس کے ساتھ کہیں روپوش ہے۔ وہ تو خود ہی اس کے کم گھومنے سے پریشان ہے۔ اس کے آدمی اسے تلاش کر رہے ہیں۔

چیز زمین بابر بشیر بیلو شاہ اور شرمست جلالی حیران ہو کر

جانتی ہو۔ یہ سارے انتظامات مجھے ہی کرنے ہوں گے۔“ وہ بولی۔ ”انتظامات ہو جائیں گے۔ آپ فکر نہ کریں۔ میں مراد سے مل کر آ جاؤں گی۔“

”کیسی بچوں جیسی باتیں کر رہی ہو؟ کیا اسکی ملنے جاؤ گی؟“ اس نے سیرا کو دیکھا پھر کہا۔ ”میں ساری رات سوچتی رہی ہوں اور اب اچھی طرح سوچ سمجھ کر پول رہی ہوں۔ میں میں تاریخ کو سمیرا کے ساتھ جاؤں گی۔ ہم دونوں برقع میں رہیں گی۔ کوئی ہمیں نہیں دیکھ سکے گا۔“

محبوب تھوڑی دیر تک کچھ بول نہ سکا۔ اس کا منہ تکتا رہ گیا۔ سیرا نے دل میں کہا۔ ”جیو ماروی اتم بہت دور تک سوچتی ہو اور سمجھتی ہو۔ اپنے مراد کی خاطر بڑی ذہانت سے بول رہی ہو۔ تم محبوب کی طرف بھی نہیں جھگوگی۔“

وہ بولا۔ ”تم دو لڑکیاں کسی مرد کے بغیر جیل جاؤ گی۔ وہ جیل جیے گا۔ جانتی ہو۔ میں اس کی اجازت نہیں دوں گا۔“

وہ بولی۔ ”میں نے پچھلی ملاقات میں وہاں دیکھا ہے۔ تمہارا تھیں اپنے قیدی مردوں سے ملنے آئی تھیں۔ وہ جگہ عورتوں کے لیے بہت محفوظ ہے۔ وہاں تو کوئی بد معاشی ہو نہیں سکتی۔ کیونکہ تمام بد معاشی سلاخوں کے پیچھے ہوتے ہیں۔“

وہ حیرانی سے اسے دیکھنے لگا۔ یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ ہمیشہ چپ رہنے والی ایسی مدلل گفتگو کرنی ہوگی۔ وہ انکار میں سر ہلا کر بولا۔ ”پھر بھی میرا دل نہیں مانے گا۔ میں تمہاری سیکورٹی کا انتظام خود کروں گا۔ تب میری تسلی ہوگی۔“

”سیکیورٹی والے کیا کر لیں گے؟ پچھلی رات آپ دیکھ چکے ہیں۔ آپ میری بات نہیں مانتیں گے تو میں بھی نہیں مانوں گی۔“

محبوب نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ فیصلہ کن لہجے میں بولی۔ ”میں یہاں نہیں رہوں گی۔“

”پاکل ہوئی ہو؟“ ”پاکل ہو جاؤں گی۔ کچھ سوچے سمجھے بغیر یہاں سے نکل جاؤں گی۔ آپ کے گاڑ بھی مجھے روک نہیں سکیں گے۔“ وہ قریب آئی اس نے جھک کر دودھ کا خالی گلاس اور ٹرے اٹھائی اور کوئی جواب نہ بغیر چلی گئی۔ محبوب کم صم سا اس دروازے کو دیکھتا رہ گیا جہاں سے وہ گئی تھی۔ اس کے فیصلہ کن لہجے نے اسے فکر میں مبتلا کر دیا تھا۔

میں معروف رہیں گے تو انہیں یقین ہو جائے گا کہ واقعی آپ بھی میرے لیے پریشان ہیں اور مجھے تلاش کر رہے ہیں۔“

”تمہاری کیسی؟ یہاں سمیرا اور ان کے والدین رہیں گے۔ یہاں مجھے کسی چیز کی کمی نہیں ہوگی۔ آپ فون کے ذریعے میری خبریت معلوم کرتے رہیں گے۔“ وہ بڑی ذہانت سے مشورہ دے رہی تھی۔ محبوب کا دل نہیں مان رہا تھا۔ قسمت سے ایک جھٹ کے نیچے چھپ کر رہنے کا موقع ملا تھا۔ وہاں وہ دن رات ایک دوسرے کے قریب رہتے یوں ماروی اس کی قربت سے اور اس کی طرف مائل ہوتی رہتی۔

وہ اپنے جذبات کے مطابق سوچ رہا تھا کہ ماروی کو وہاں چھوڑ کر نہیں جائے گا۔ سمیرا کو ماروی پر پیارا رہا تھا۔ وہ اس کے دل کی بات کہہ رہی تھی۔ محبوب کو اپنے سے دور کر رہی تھی۔

اگر یہی مشورہ وہ دیتی تو محبوب سمجھتا کہ وہ حد اور جلاپے سے ماروی کو اس سے دور کر رہی ہے۔

محبوب نے کہا۔ ”میں ڈنڈی ہوں، مجھے آفس نہیں جانا چاہیے۔ جب تک دشمن نہ بھرے، گھر میں آرام کرنا چاہیے اور میں یہاں آرام سے رہوں گا۔“

ماروی نے کہا۔ ”ڈاکٹر نے کہا ہے کہ دشمن گہرا نہیں ہے۔ جلد ہی بھر جائے گا۔ آپ آرام سے یہاں ہیں تو آفس میں بھی وقت گزار سکتے ہیں۔ اس طرح کئی مسئلے حل ہو جائیں گے۔ آپ کے کاروبار کو نقصان نہیں پہنچے گا۔ دشمنوں کو یقین ہو جائے گا کہ میں آپ کی پناہ میں نہیں ہوں۔“

ذرا سوچے انہیں میری ضرورت ہے وہ صرف مجھے تلاش کرتے رہیں گے۔ آپ کو نظر انداز کر دیں گے۔ آپ کا دشمن لباس میں چھپا رہے گا کی کو نظر نہیں آئے گا اور.....“ وہ ذرا چپ ہوئی۔ محبوب نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ بولی۔ ”اور آپ مجھ سے دور رہیں گے تو کوئی مجھے آپ کے ساتھ بدنام نہیں کرے گا۔ عارضی طور پر ہی سہی۔ آپ بھی نیک نام رہیں گے۔“

رکھا ہے۔ اب وہ غیر حاضر رہے گی تو مسائل پیدا ہوں گے لیکن معروف صاحب مسئلہ یہ ہے کہ سمیرا میرے ذاتی معاملات میں بھی اہم ہے۔ موجودہ حالات میں اس کے سوا کسی پر بھروسہ نہیں کروں گا۔“

یہ ایسی باتیں تھیں کہ وہ سن رہی تھی اور خوشی سے لہرا رہی تھی۔ اسے اپنی خوشیوں کا انعام مل رہا تھا۔

محبوب فون پر کہہ رہا تھا۔ ”پلیز آپ ایک آدھ روز دفتری معاملات سنبھالیں۔ میں ماروی کے لیے عملی حفاظتی انتظامات کرنے کے بعد سمیرا کے ساتھ آ جاؤں گا۔“

اس نے نظریں اٹھا کر سمیرا کو دیکھا پھر کہا۔ ”ہاں میں ابھی سمیرا سے باتیں کرتا ہوں۔ پھر یہ آپ سے باتیں کریں گی۔“

اس نے فون بند کرتے ہوئے کہا۔ ”معروف صاحب ہم دونوں کی غیر حاضری سے پریشان ہیں اور ان کی پریشانی بچا ہے تم نے بہت سی ذمے داریاں سنبھالی ہیں اور میں نے تمہیں بھی یہاں بلا لیا ہے۔ وہ اکیلے ہو گئے ہیں۔“

ماروی نے ایک چھوٹی سی ٹرے میں دودھ سے بھرا ہوا گلاس لاکر محبوب کے سامنے رکھا۔ پھر سمیرا کے پاس آکر کھڑی ہو گئی۔ محبوب نے کہا۔ ”معروف صاحب یہاں آنا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا دشمن آپ کے پیچھے یہاں چلے آئیں گے۔ میں نہیں چاہتا کسی کو کسی کا پتا معلوم ہو۔ تم یہاں سے آفس انٹینڈ کرنے جاؤ گی تو ماروی کو اور مجھ کو ڈھونڈنے والے تمہارے بھی پیچھے لگ جائیں گے۔“

سمیرا نے کہا۔ ”ہم دشمنوں سے بے خبر نہیں لیکن اتنا تو سمجھ رہے ہیں کہ وہ ماروی کو ڈھونڈتے پھر رہے ہوں گے اور یہ جانتے ہوں گے کہ آپ اسے کہیں لے گئے ہیں۔“

ماروی نے کہا۔ ”میری چھوٹی سی عقل میں ایک بات آ رہی ہے، کیا میں بولوں؟“

سمیرا نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”یہ تمہارا معاملہ ہے تم بھی ابھی ہوئی ہو۔ تمہیں بولنا چاہیے۔“ وہ بولی۔ ”دشمنوں کو یقین دلانا چاہیے کہ کل رات سامنے مین گولڈ میں نہیں تھے۔ یہ مجھے وہاں سے نہیں نہیں لے گئے ہیں۔ میں بتا نہیں کہاں کم ہو گئی ہوں۔“

وہ محبوب سے بولی۔ ”آپ ابھی دفتر جائیں گے تو اپنوں کو اور غیروں کو سب ہی دشمنوں کو معلوم ہوگا کہ آپ میرے ساتھ نہیں ہیں۔ وہ چھپ کر آپ کی عمرانی کرتے رہیں گے۔ آپ میری طرف نہیں آئیں گے اپنے کاروبار

طور پر یوں سنجیدگی سے سوچنے لگے جیسے سر جھکائے رابعہ خاتون کے لیے چنے پڑھ رہے ہوں۔

وہ اپنی خوابگاہ میں آگئی تھی۔ بھائی نے دروازے کو اندر سے بند کرتے ہوئے کہا۔ ”میں نے بات کی ہے۔ ٹھیک دس بجے کال آئے کی بس دو منٹ رہ گئے ہیں۔“ وہ بیڈ کے سرے پر بیٹھ کر اپنے خاموش فون کو دیکھ کر بولی۔ ”بھال فون پر یوں پڑا ہے تو ایسا لگتا ہے اس کے پیچھے میری زلیخا بول رہی ہے۔ ہائے میری بچی کیسے گھر سے بے گھر ہو کر دنیا سے گئی ہے۔ میں ان باپ بیٹوں کو کبھی معاف نہیں کروں گی۔“

”آپا! اکثر نے آپ کو سمجھایا ہے جو بھی صدمات ہیں انہیں بھلانے کی کوشش کریں۔ ان باپ بیٹوں پر مٹی ڈالیں۔ ایسے لوگوں کو کسی دنیا میں سزا میں ہی ہیں۔ دیکھ لیتا انہیں عبرت کا سزا میں ضرور ملیں گی۔“

کالنگ فون ابھرنے لگی۔ رابعہ نے سیدھی ہو کر بیٹھتے ہوئے فون کاٹن دیا۔ پھر اسے کان سے لگا کر دھبی آواز میں بولی۔ ”ہیلو بیٹے بھال! میں بول رہی ہوں۔“

وہ نہیں جانتی تھی کہ آواز کمرے کے باہر ان باپ بیٹوں تک پہنچے۔ وہ بند دروازے کے پاس آ کر بھی سن سکتے تھے۔ وہ دادا سے باتیں کرتے وقت بہت محتاط تھی۔

دوسری طرف سے بھال نے سلام کرتے ہوئے خیریت دریافت کی پھر کہا۔ ”مجھے چار ماہ بعد ایک ماہ کی چھٹی ملنے والی ہے۔ میں پاکستان آؤں گا۔ وہاں مجھے اپنے سر اور دونوں سالوں سے چھپ کر رہنا ہوگا۔ آپ سے نہ حوصلے میں ملاقات کر سکوں گا نہ شہر والے مکان میں آسکوں گا۔ مگر ہاں ماموں عفت شاہ کے گھر جا کر آپ سے مل سکوں گا۔“

”ہاں بیٹے! جس دن تم آؤ گے۔ میں عفت شاہ کے مکان میں رہوں گی۔ تمہارے پاس زلیخا کی اور بچوں کی جتنی تصویریں ہیں انہیں لے آنا۔“

وہ بولا۔ ”میرا بچہ تو ہوتے ہی ماں کے ساتھ چلا گیا تھا۔ مراد سے ہونے والا بیٹا میرے پاس ہے۔ اس بچے کی پرورش میرے لیے مسئلہ بن گئی ہے۔ میرے دس گھنٹے کی ڈیوٹی ہوتی ہے، ایک بوڑھی خاتون کو کچھ رقم دیتا ہوں تو وہ اسے سنبھالتی ہے۔“

رابعہ نے کہا۔ ”تمہیں ایک شریک حیات کی ضرورت ہے۔ شادی کرلو۔ بچے کو ماں مل جائے گی۔“

”وہ سوتیلی ماں ہوگی۔ زلیخا نے مجھ سے وعدہ لیا تھا

لیے دو ادا دی ہیں اور مہرج سالے کے کھانوں سے پرہیز کرنے کو کہا ہے۔“

رحمت نے کہا۔ ”یعنی امی کے لیے آج سے الگ پرہیزی کھانے پکوانے چاہیں گے۔“

رابعہ نے کہا۔ ”فکر نہ کرو بیٹے! مجھے پکانا آتا ہے۔ میں اپنا کھانا خود پکایا کروں گی۔“

رحمت نے کہا۔ ”نہیں ربی آ.....! باورچی کس لیے رکھا ہے۔ جو کوئی دیتا کرے گا۔ آؤ بیٹھو۔ باتیں کرو۔“

”پھر کبھی وقت باتیں ہوں گی۔ میں کمزوری محسوس کر رہی ہوں۔ ذرا کمر سیدھی کروں گی۔“

وہ جواب سے بغیر بھائی کے ساتھ اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ وہ تینوں تھوڑی دیر تک خاموش رہے پھر برکت نے کہا۔ ”یہ کہنے کو تو ایک ہی چھت کے نیچے رہتی ہیں مگر ایک کمرے کی دو دیواروں کی طرح ہم سے دور دور رہتی ہیں۔“

”جب سے زلیخا بھاگی ہے۔ تمہاری ماں کا مزاج بدل گیا ہے۔ ہمیں دشمن سمجھتی ہے۔“

اپنا.....! یہ عدالت میں وہی بولیں گی تا جو آپ نے اور وکیل نے انہیں سمجھایا ہے۔“

”ہاں ہماری حمایت میں نہیں بولیں گی تو ہم سے دشمنی کر کے چائیں گی کہاں؟“

”ہمارے نانا ایسی وصیت لکھ کر مرے ہیں کہ ہم ان کے مرنے تک ان کی زمینوں کے لیے ترستے رہیں گے۔“

”ہم بھی اس عورت کی بد مزاجی مجبوراً برداشت کر رہے ہیں۔ لیکن اب وقت آگیا ہے۔ یہ اچھا ہے کہ ڈاکٹر نے اسے پرہیزی کھانے کو کہا ہے۔ ہماری مشکل آسان ہوگئی ہے۔“

ان تینوں نے ایک دوسرے کو گہری سازشی نظروں سے دیکھا۔ پھر برکت نے باپ سے دھیمی سرگوشی میں پوچھا۔ ”کوئی گزرتو نہیں ہوگی؟“

رحمت نے کہا۔ ”نہیں۔ میں نے اپنے ڈاکٹر سے اچھی طرح سمجھ لیا ہے۔ ایک وقت کے کھانے میں صرف ایک قطرہ پکا یا جائے۔ پھر تین چار مہینوں کے بعد نتیجہ سامنے آئے گا۔“

رحمت نے کہا۔ ”تین چار مہینوں میں مقدمہ کا بھی فیصلہ ہو جائے گا۔ مراد کو پچاسی ہوگی۔ پھر امی کی ضرورت نہیں رہے گی۔“

وہ تینوں پھر خاموش ہو گئے۔ سر جھکا کر اپنے اپنے

پتی بہت مکار ہے۔ میں نہیں مانتا کہ وہ ماروی سے محروم ہو کر آفس جا کر کاروبار سے لگ گیا ہے۔“

بیٹوں نے قائل ہو کر سر ہلایا۔ ایک نے پوچھا۔ ”کیا اس نے کسی دوسری جگہ سے چھپا کر رکھا ہے؟“

”ہاں، اس مکار دشمن نے یہی کیا ہے۔ جب ہی آرام سے ہے۔ ہمیں اٹو بنانے کے لیے محض دکھانے کے لیے اپنے آدمیوں کو اس کی تلاش میں دوڑا رہا ہے۔“

”وہ بہت محتاط ہے۔ ہمیں کیسے معلوم ہوگا کہ اسے کہاں چھپا کر رکھا ہے؟“

رحمت نے کہا۔ ”ایک ہی امید ہے۔ اگر ماروی کہیں عزت آبرو سے محفوظ ہے اور اس کا محافظ چانڈیو ہے تو وہ جیل میں مراد سے ملے ضرور آئے گی اور کل میں تاریخ ہے۔“

بیٹوں نے دیوار سے لٹکے ہوئے کیلنڈر کو دیکھا پھر برکت جلائی نے کہا۔ ”اتنا.....! اچھی ہوئی چیز ایک ہی بار باہر آئے گی۔ ایک ہی موقع ملے گا۔ ہم کیا کر سکیں گے؟“

رحمت نے پریشان ہو کر کہا۔ ”سمجھ میں نہیں آتا کیا کریں؟ ہمیں گوشت سے انگو انہیں کرا سکے۔ یہ ہماری پارٹی کے غنڈے بھروسے کے قابل نہیں ہیں۔ ہم سے رقم لی اور کوئی کام نہ کر سکے اور ہم دوسرے غنڈوں بد معاشوں کو نہیں جانتے ہیں۔ کل بچہ نہ کیا تو پھر پتا نہیں کب موقع ملے گا۔“

”اتنا.....! ہمارے گوشت کے بد معاش یہاں بڑی واردات نہیں کر سکیں گے لیکن اسے دور سے گولی مار کر تو بھاگ سکیں گے۔“

”ہاں وہ ہمارے ہاتھ نہیں آئے گی تو اسے چانڈیو کے پاس بھی رہنے نہیں دیں گے۔ کیا کیا جائے مجبوری ہے۔ اس بار اپنے ہی آدمیوں سے کام لیں گے۔“

ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلا تو وہ تینوں چپ ہو گئے۔ رابعہ اپنے بھائی عفت شاہ کے ساتھ آئی تھی۔ اس نے ان باپ بیٹوں کو دیکھ کر کہا۔ ”معلوم ہوتا ہے کوئی بہت ہی اہم میٹنگ چل رہی ہے۔“

رحمت نے کہا۔ ”نہیں۔ کوئی اور معاملہ نہیں ہے تمہاری بیماری نے ہی ہمیں فکر میں مبتلا کیا ہے۔ ابھی میں ان سے تمہاری ہی باتیں کر رہا تھا۔“

برکت نے کہا۔ ”آپ ڈاکٹر کے پاس گئی تھیں۔ وہ علاج کر رہا ہے۔ کیا کہہ رہا ہے؟“

عفت شاہ نے کہا۔ ”لیبارٹری سے رپورٹ آئے گی تو باقاعدہ علاج شروع کرے گا۔ ابھی آرام پہنچانے کے

گامے سے پوچھ رہے تھے۔“ اگر ماروی کو محبوب علی چانڈیو نہیں لے گیا ہے تو پھر کون لے گیا ہے؟“

گامے نے کہا۔ ”دہن کے کمرے میں کئی عورتیں اور مرد بڑے تھے۔ ہمارا انکراؤنگٹلز اور اس کے ساتھیوں سے ہوا تھا۔ میں نے ماروی پر گولی چلائی تھی۔ ایسے وقت ایک شخص سامنے آ گیا تھا۔ گولی اسے لگی تھی۔“

بابر شیر نے پوچھا۔ ”وہ کون تھا؟“

”اس کا چہرہ ہیملٹ میں چھپا ہوا تھا۔ وہاں زندگی اور موت کا میل جاری تھا۔ کسی نے اسے نہیں پہچانا۔ وہ زخمی ہونے کے باوجود ماروی کو کاندھے پر لاد کر لے گیا۔“

”پھر تو اس شخص کی یہ پہچان ہے کہ وہ زخمی ہے۔“

”ہاں بدن کے کسی حصے میں گولی لگی ہے۔“

انہوں نے اپنے تجربے سے پوچھا۔ ”کیا چانڈیو کے بدن کا کوئی حصہ زخمی ہے؟“ جواب ملا۔ ”نہیں۔ شاید اس کے بدن پر خراش بھی نہیں آئی ہوگی۔ اگر اسے گولی لگتی تو وہ تن کر نہیں چلتا۔“

وہ اپنی کار خود ڈرائیو کرتا ہے۔ زخمی ایسے چاق و چوبند نہیں ہوتے جیسا وہ نظر آ رہا ہے۔“

یہ یقین ہو گیا کہ ماروی چانڈیو کے پاس نہیں ہے۔ پھر کہاں ہے؟ اسے کون لے گیا ہے؟ اس کا کوئی نیا عاشق کہاں سے پیدا ہو گیا ہے؟ اور وہ ہیملٹ والا کون تھا؟ اب وہ لوگ ابھ گئے تھے۔ ماروی کے سامنے کے پیچھے بھاگتے رہنے والے تھے۔

☆☆☆

خطرہ ابھی ٹلا نہیں تھا۔ میں تاریخ کو ماروی گرفت میں آنے والی تھی۔ اس واردات سے پہلے ہی رحمت جلائی کے وکیل نے اسے بتایا تھا کہ میں تاریخ کو ماروی اور مراد کی جیل میں ملاقات منظور ہوگئی ہے۔ اب وہ باپ اور دونوں بیٹے سر جوڑ کر سوچ رہے تھے۔ کیا وہ مراد سے ملنے آئے گی؟

رحمت جلائی نے کہا۔ ”جب کوئی اسے اٹھا کر لے گیا ہے تو کیسے آئے گی؟“

برکت جلائی نے کہا۔ ”انگو کرنے والا اتنا شریف آدمی نہیں ہوگا کہ اسے مراد کے پاس جانے کے لیے آزاد چھوڑ دے گا۔“

رحمت نے دونوں بیٹوں کو دیکھا۔ سوچا پھر کہا۔ ”چانڈیو زخمی نہیں ہے۔ وہ ہیملٹ والا چانڈیو نہیں تھا۔ لیکن اس کا کوئی آدمی ہو سکتا ہے۔ وہ صنعت کار ارب

کہ میں اس پر سوتیلی ماں نہیں لاؤں گا۔ دوسری شادی کرنے سے پہلے بچے کو اس کی تانی کے پاس یا اس کے باپ کے پاس پہنچا دوں گا۔

راجہ نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ ”وہ میری بیٹی کا جگر گوشہ ہے۔ میں اسے کیلئے سے لگا کر رکھتا چاہوں گی لیکن دشمنوں سے کیا کہوں گی کہ وہ کسی کی اولاد ہے؟“ وہ بولا۔ ”میں سمجھ رہا ہوں۔ یہ ناممکن ہے۔ آپ مانی میں رہ کر مگر چھوٹوں کے درمیان اس کی پرورش نہیں کر سکیں گی۔ زلیخا بھی یہ بات اچھی طرح سمجھتی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ میں دوسری شادی کرنے سے پہلے بچے کو مراد کے پاس پہنچا دوں گا۔“

وہ ذرا چپ ہو کر سوچنے لگی۔ بچے کو مراد کے پاس پہنچانے کا مطلب ہوتا کہ مراد کی شک و شبہ کے بغیر بے گناہ ثابت ہو جاتا۔ ایک برس کے بچے کو دیکھ کر حساب لگایا جاتا کہ جولا شہیت میں لگی تھی وہ زلیخا کی نہیں تھی۔ اس کے بعد بھی وہ زندہ تھی اور آٹھ ماہ بعد اس نے بچے کو جنم دیا تھا۔

اور جذہ جس کے اسپتال میں زچگی ہوئی تھی وہاں زلیخا کی ولادت و زوجیت اور پاکستانی شہریت کا ریکارڈ موجود تھا۔ اس نے نچھتوں میں ہونے والی ہلاکت کے آٹھ ماہ بعد وہاں کے اسپتال میں مراد کے بیٹے کو جنم دیا تھا۔ اس کا مقدمہ آئینے کی طرح صاف تھا۔ وہ پہلی بیٹی میں ہی با عزت طور پر بری کر دیا جاتا۔ اگر مخالفین کا ضمیر بیدار ہوتا اور راجہ کے دل میں مراد سے نفرت نہ ہوتی۔

وہ اپنی بیٹی زلیخا کے حوالے سے مظلوم تھی اور شوہر اور بیٹوں کے سامنے میں رہ کر اس کی بھی شامت آنے والی تھی۔ پھر بھی وہ ایک بہت بڑے وڈیرے کی مغرور بیٹی تھی۔ مراد جیسے حویلی کے نوکر نے اس کی بیٹی کی جو توہین کی تھی اسے وہ بھلا نہیں سکتی تھی۔

اس کے خیال کے مطابق مراد کے ٹھکانے کے باعث زلیخا گھر سے بے گھر ہوئی تھی۔ اگر وہ اس کے ساتھ گناہ گار بن کر رہتا۔ بات پردے میں رہتی۔ ایک نوکر حویلی کی عزت سے کھلتا رہتا۔ کسی کو خبر نہ ہوتی تو پھر توہین کا احساس نہ ہوتا۔ وہ مراد کو اپنی بیٹی کا صانع سمجھ کر برداشت کر لیتی۔ جھوٹے غیرت مند ایسے ہی ہوتے ہیں۔ برتری قائم رکھنے کے لیے اپنی فطرت سے مجبور ہوتے ہیں۔ اب مسئلہ تھا کہ مراد کے ننھے سے بچے کو کہاں رکھا جائے؟

راجہ نے کہا۔ ”اگرچہ مراد کا لہو ہے لیکن میری بیٹی کے خون میں نو ماہ تک پرورش پاتا رہا ہے۔ میری بیٹی نے

اس کے لیے اپنا لہو بھی نچوڑا ہے اور اسے دودھ بھی پلایا ہے۔ میں اسے سینے سے لگا کر رکھ سکتی ہوں۔ لیکن یہ ممکن نہیں ہے۔ تم اسے کسی یتیم خانے میں داخل کر دو۔“

جمال نے کہا۔ ”زلیخا نے سختی سے منع کیا ہے۔ اس نے آپ کے نام ایک خط لکھا ہے اور جو لکھا ہے اسے ایک ویڈیو کیسٹ میں ریکارڈ بھی کیا ہے۔ میں ایک ماہ کے لیے آؤں گا تو یہ چیزیں لے کر آؤں گا۔ آپ بیٹی کو اسکرین پر دیکھیں گی اس کی باتیں سنیں گی تو رو پڑیں گی پھر وہی کریں گی جو وہ کہہ گئی ہے۔“

جمال سے ٹھوڑی دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ پھر رابطہ ختم ہو گیا۔ وہ بچہ آئندہ مسئلہ بننے والا تھا۔ راجہ بھی نہ چاہتی کہ وہ اپنے باپ تک پہنچے اور اس کی بے گناہی ثابت کرے۔ جمال اپنی جگہ ضرورت مند تھا۔ وہ دوسری شادی کرنے کے لیے اس بچے سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اور وہ تھا اپنے قیدی باپ کی طرح بد نصیب تھا۔ اپنی ماں کی طرح تمام رشتوں سے ٹوٹ کر بے سہارا ہونے والا تھا۔

ویسے آدمی جو کرتا ہے اس کا اچھا یا بُرا نتیجہ اس کے سامنے ضرور آتا ہے۔ اس رات راجہ کا پرہیز کیا تھا تیار ہوا تھا۔ وہ کھانے سے پہلے منہ ہاتھ دھوئے واش روم میں گئی۔ اس وقت باپ بیٹے ڈانٹنگ ٹیبل پر بیٹھے ہوئے تھے۔ حشمت نے محتاط نظروں سے واش روم کی طرف دیکھا۔ وہ نظر نہیں آ رہی تھی اس نے جیب سے ایک شیشی نکال کر پرہیز کی کھانے میں ایک قطرہ چکا دیا۔

☆☆☆

مرینہ نے مراد کی زبان سے اس کی پوری روداد سنی تھی۔ ایک غریب آدمی کی سیدھی سادی ر روداد کوئی ایسا بھیرو بھیرو نہیں تھی۔ وہ قاتل نہیں تھا۔ صاف پتا چلتا تھا کہ وڈیرے حشمت جلالی نے بڑی چال بازی سے ایک غریب فشی کو پھنسا دیا ہے۔ اور حشمت جلالی جس طرح ماروی کو حاصل کرنے کے لیے اس کے پیچھے پر گیا تھا اس سے صاف پتا چلتا تھا کہ وہ مراد کو اپنا رقیب بھی سمجھتا ہے۔ اسے پھانسی کے تختے پر پہنچا کر ہی ماروی کو حاصل کر سکے گا۔ ماروی کو مردہ یا زندہ دیکھنے والے طلبکار اور بھی تھے۔ محبوب اس کے پیچھے پاگل ہو چکا تھا۔ مرینہ کو ان پاگل دیوانوں اور سازشیں کرنے والوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ البتہ ماروی اس وجہ سے اہم تھی کہ وہ مراد کی چھٹی تھی اور مرینہ کو یہ منظور نہیں تھا۔

یہ مراد کی بد نصیبی تھی کہ مرینہ اس پر مرمی تھی۔ اس بلا کی فطرت میں جھنجھٹے جھنجھٹے والی محبت تھی۔ اس کی چاہت کا تقاضا تھا کہ جسے وہ چاہتی ہے اسے کوئی دوسرا نہ چاہے۔ وہ ایسی ضدی تھی کہ آئندہ ماروی کو اس کے قریب سے گزرنے بھی نہ دیتی۔

وہ برنارڈ کو قانون کے شکنجے سے نکال کر لے جانے آئی تھی اور اپنے دل کے معاملے میں الجھ گئی تھی۔ اپنا ایک الگ یکم کھینے والی تھی۔ اس کے دماغ میں مراد کے لیے ضد سا گئی تھی۔ وہ چپ چاپ پلاننگ کر چکی تھی کہ جس دن جیل توڑ کر برنارڈ کو وہاں سے لے جائے گی۔ اسی دن مراد کو بھی ساتھ لے جائے گی۔

وہ اپنے ساتھیوں دارا اور بہرام کے ساتھ ہر دوسرے تیسرے دن جیل میں آتی تھی اور ان خطرناک قیدیوں سے ملتی تھی جو عظیم جرائم کے باعث عمر قید کی سزا پا رہے تھے یا پھر انہیں سزائے موت ملنے والی تھی۔ ایسے قیدی جیل کی آہنی دیواروں سے نکل کر بھاگنا چاہتے تھے۔

مرینہ اور اس کے ساتھی ان سے ملتے تھے اور بڑی رازداری سے جیل توڑ کر فرار ہونے کے منصوبے پکاتے رہتے تھے۔ اس سلسلے میں باہر سے ڈالرز اور پونڈ ڈالر ہے تھے۔ جیل کا عملہ خریدار چاہتا تھا۔ انہیں پورا یقین تھا کہ ان کا منصوبہ نامکمل نہیں ہوگا۔

مرینہ کے ذاتی منصوبے میں یہ باتیں تھیں کہ پہلے تو مراد ماروی کو دل و دماغ سے نکل کر صرف اس کا ہو جائے۔ دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ اسے جیل سے نکال کر لے جائے۔

یہ پلاننگ ڈین میں تھی کہ اسے برنارڈ کے ساتھ کیسے نکالے گی اور کہاں پہنچائے گی لیکن اس سے پہلے چاہتی تھی کہ اس پر سے جھوٹا الزام ختم ہو جائے اور وہ عدالت سے باعزت طور پر بری کر دیا جائے تو بھتر ہوگا۔ وہ ایک آزاد عزت دار شہری کی طرح رہے گا۔

اور ایسا اسی وقت ممکن تھا جب حشمت جلالی کا جھوٹ اور فریب پکڑا جاتا۔ اس سلسلے میں دشمن کا عاصیہ کرنا اور کسی بھی طرح اس کے منہ سے سچ اگوا ضروری تھا۔ وہ سینٹرل جیل تو جیسے اس کے باپ کا گھر تھا۔ وہ روز ہی کسی وقت مراد سے ملنے آتی تھی اور اس سے کہتی تھی۔ ”زندگی کی طرف آؤ موت کی طرف نہ جاؤ۔ میں تمہیں یہاں سے نکال کر نئی زندگی دینے والی ہوں تم باہر آ کر میرے ساتھ رہو گے۔“ ”میں ماروی کے بغیر نہیں رہ سکوں گا۔“ ”کیا وہ تمہیں سزائے موت سے بچا سکے گی۔ وہ

تمہارے بعد دوسرے عاشق کی گود میں کھیلے گی اور کبڑے تمہیں قبر میں کھاتے رہیں گے۔ کیا تم یہی چاہتے ہو؟“ ”میرے چاہنے نہ چاہنے سے کیا ہوتا ہے جو تقدیر میں لکھا ہے وہی ہوگا۔“

”جب تم آسانی سے تقدیر بدل سکتے ہو۔ سزائے موت سے بچ سکتے ہو اور اپنی باقی زندگی مجھے دے سکتے ہو تو تقدیر کا رونا کیوں رو رہے ہو؟“

صرف اس لیے کہ یہاں رہ کر ماروی کے نام سے سانس لے کر پھاسی پر چڑھ جاؤ گے تو سچے عاشق کہلاؤ گے کیا بعد میں وہ معشوقہ تمہارے نام سے کنواری رہے گی جس کا پہلے سے ایک ریڈی میڈ عاشق موجود ہے۔“

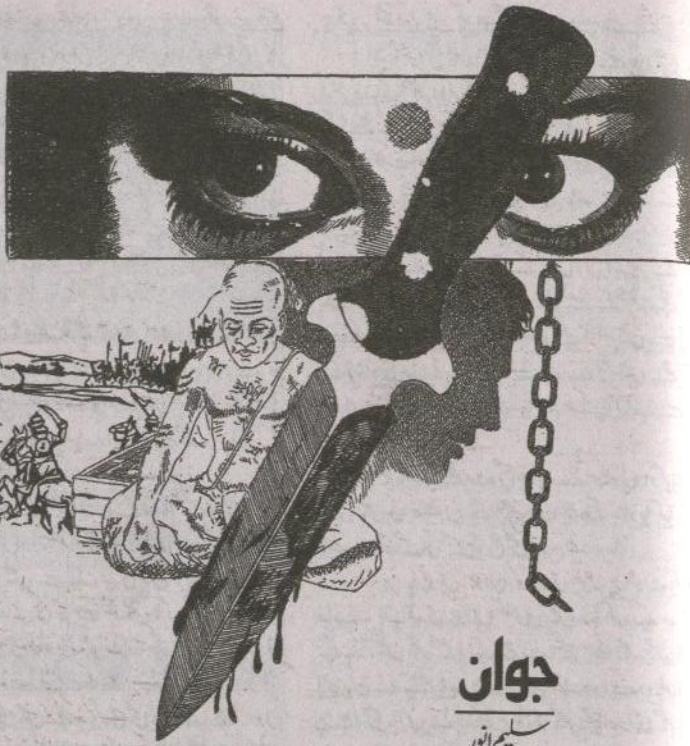
مرینہ کے جانے کے بعد وہ تنہا کھڑی میں بیٹھ کر سوچتا تھا۔ یہ درست کہتی ہے۔ ماروی محبوب صاحب کے احسانات تلے دبی ہوئی ہے۔ میرے بعد انہیں قبول کر لے گی اور یہ غلط نہیں ہوگا۔ اصولاً اپنی سلامتی کے لیے اسے یہی کرنا چاہیے۔

میں لوہے کی سلاخوں کو تھام کر سوچتا رہتا ہوں انہیں توڑ کر باہر چلا جاؤں۔ اگر یوں بھی چلا بھی گیا تو مفرو کہلاؤں گا اور ماروی کے ساتھ بھی نیک نامی سے زندگی نہیں گزار سکوں گا۔

میں خواہ مخواہ جیل سے بھاگنے کی احقانتہ باتیں سوچتا تھا۔ مگر یہی باتیں مرینہ کے لیے اخقانتہ نہیں ہیں۔ اسے یہاں جیسی آزادی ہے اسے دیکھ کر یقین ہوتا ہے کہ وہ مجھے یہاں سے کہیں دور لے جائے گی۔ کوئی اسے روک نہیں پائے گا۔ مرینہ نے کسی حد تک اس کے سوچنے کا انداز بدل دیا تھا۔ وہ سوچنے لگا تھا۔ میں مقدمہ ہار سکتا ہوں پھر مجھے سزائے موت سے کوئی نہیں بچا سکے گا۔ صرف مرینہ بچا سکتی ہے۔

وہ کھڑکی کی نیم تاری میں گھومتے ہوئے سوچنے لگا۔ میرے سامنے دو ہی منظر ہیں۔ ایک منظر یہ ہے کہ میں پھاسی پا کر مر چکا ہوں۔ سامین چاچا چاچی اور ماروی مجھے قبر میں سلا کر کچھ روز سوگوار رہنے کے بعد پھر معمول کے مطابق جتنے بولتے زندگی گزار رہے ہیں۔

دوسرا منظر یہ ہے کہ مرینہ نے مجھے جیل سے نکال کر ایسی زندگی دی ہے کہ میں محبوب کر ماروی کو اور سامین محبوب کو ایک ساتھ زندگی گزارتے دیکھ رہا ہوں۔ میں نے اس دوسرے منظر میں عشق کے نام پر موت قبول نہیں کی۔ اپنی زندگی نہیں ہاری۔ میرے بعد



جوان

سليم انور

میدان جنگ ہو یا زندگی کے رستے... معرکہ آرائی اور طویل مسافت کوئی نہ کوئی کہانی رقم کر جاتی ہے... ان چہروں میں بھی کئی چہرے چھپے تھے لیکن موت کا سامنا انسان اپنے اصل چہرے کے ساتھ کرتا ہے... جس کے پاس غضب کی ذہانت تھی حساب کتاب کی ذرا سی چوک نے اسے موت سے ہمکنار کر دیا اور وقت نے بھی بساط کچھ اس طرح پلٹی کہ اس کا اصل روپ سامنے آگیا... مگر اس چہرے پر تو بلا کی معصومیت تھی کہ موت کو بھی پیار آگیا۔

اعداد و شمار سے زندگی کے لمحات چرانے والے ایک عقلمند کا قصہ

آپ شاید حیران ہو رہے ہوں گے کہ جو کچھ ہوا اس کے باوجود میں کیونکر زندہ ہوں۔ یہ ایک خاصی اہم کہانی ہے۔ میری زندگی کے بچپن میں کوٹلیا کے شہروں، قصبوں، جنگلوں اور دیہاتوں میں گزرے تھے۔ یہ میرا وطن تھا اور اس کے چنے چنے کی خاطر جنگ کرنا اہمیت رکھتا تھا۔ اس کے ایک ایک اچھے کا دفاع ہمارا فرض بننا تھا۔ جلاوطنوں کے ساتھ میری ٹریننگ دو دو سال ہو چکے تھے۔ ہم حکومت کا تختہ الٹنا چاہتے تھے۔ سب ہی لوگوں کی طرح ہم بھی جانتے تھے کہ ناکامی کی صورت میں ہمیں کیا خمیازہ بھگتنا ہوگا۔ ہم نے مہینوں تک لڑائی، پھرا ٹرو پڑ ٹینگ اور دھماکوں کی مشق کی تھی۔ ہم اب اس عظیم دن کے لیے تیار ہو چکے تھے جب ہمیں کوٹلیا واپس جانا تھا۔ جہز ڈیام کی آمد کے ساتھ ہی ہم نے کوٹلیا چھوڑ دیا تھا لیکن اب ہم واپس جا رہے تھے۔ ہمارا پلان

”میں سمجھ گیا“ محبوب علی چاند یونے وہاں رشوت دی ہے۔ تب ہی تجھے فون سے بولنے کی اجازت مل گئی ہے۔“ تو کچھ بھی سمجھ لے۔ میں ایسی طاقت حاصل کر رہا ہوں کہ آئندہ جیل کی دیواریں مجھے باہر جانے سے نہیں روک سکیں گی میں کسی دن بھی تیری گردن دیوچنے آ رہا ہوں۔“

”تیرا باپ بھی قانون کے شکنجے سے نکل نہیں پائے گا۔“

مرینہ نے فون پر ہاتھ رکھ کر اسے سمجھایا کہ کیا کہنا چاہیے۔ پھر اس نے فون پر کہا۔ ”تجھے یقین دلانا ہی ہوگا کہ میں جب چاہوں جیل سے باہر آ سکتا ہوں۔ کل سے اپنے بیٹوں کو نہیں چھپا کر رکھ۔ ان میں سے کسی کو نقصان پہنچنے والا ہے۔“

یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ مرینہ نے سم بدل دی۔ مراد نے کہا۔ ”تمہارے کہنے سے میں نے بچوں جیسی دھمکیاں دی ہیں۔ وہ دھونس میں نہیں آئے گا۔“

وہ بڑے اعتماد سے بولی۔ ”کل اس کے کسی بیٹے پر آفت آئے گی تو تم اس کے لیے خطرناک دشمن بن جاؤ گے۔“

تم ایک سیدھے سادے لات جوتے کھانے والے نمک خوار ملازم رہے۔ آئندہ جوتے مارنے والے بن جاؤ گے۔

یہ دنیا صرف اسی کی ہے جولات جوتے مارنے کی طاقت رکھتا ہے۔ تمہیں ایک بھاری بھر کم حیثیت والا اور منہ توڑ جواب دینے والا دشمن بن کر رہنا ہوگا۔

میں تمہارے ساتھ ہوں۔ تمہاری زندگی کا رخ بدل دوں گی۔ تم گدھا گاڑی والے مراد کو بھول جاؤ۔ تم بہت جلد اینٹ کا جواب پتھر سے دینے والے بن جاؤ گے۔

تم آئندہ ہاتھ جوڑ کر کسی کو سامنے نہیں کھو گے۔ یہ جلد ہی دیکھو گے کہ لوگ تمہیں سامنے مراد کہیں گے اور اپنی سلامتی کے لیے نذرانے پیش کیا کریں گے۔“

مراد بن رہا تھا۔ اس کا سر گھوم رہا تھا اور وہ اپنے اندر چیخ رہا تھا۔ ماروی.....! میں آؤں گا۔ صرف تیرے لیے شہزور بن کر اپنی سلاخوں کو توڑ کر آؤں گا.....

حیرت انگیز واقعات، سحر انگیز لمحات اور سنسنی خیز گردش ایام کی دلچسپ داستان کا مزید احوال اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

دوسرے جی رہے ہیں تو میں بھی جی رہا ہوں۔ مرینہ عقل کی باتیں سمجھاتی ہے۔ یوں جیتا اور اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی زندگی نہ ہارنا دانشمندی ہے۔

مرینہ نے کہا۔ ”کل ماروی تم سے ملنے آئے گی۔ اسے میرے بارے میں کچھ نہیں بتاؤ گے اور یہ بھولے سے بھی نہیں کھو گے کہ اس جیل سے باہر نکلنے والے ہو۔“

”میں کہوں گا تو اسے یقین نہیں آئے گا۔ دیے وعدہ کرتا ہوں یہ بات اس سے نہیں کہوں گا۔“

”اس سے پہلے میں کوشش کر رہی ہوں کہ سیدھے راستے سے تمہاری بے گناہی ثابت ہو جائے۔ کسی طرح شہمت جلالی کا جھوٹ سامنے آ جائے۔“

”ایسا ہو جائے تو مجھے عزت سے رہائی ملے گی میں مفروضہ نہیں کھلاؤں گا۔“

”تم بھی اس کے منشی تھے۔ تمہیں اس کی حویلی کا اور اس کا ذاتی فون نمبر معلوم ہوگا۔“

”ہاں۔ میں تینوں باپ بیٹوں کے فون نمبر جانتا ہوں۔“

وہ اپنے فون کی سم بدلتے ہوئے بولی۔ ”مجھے نمبر بتاؤ۔ پھر میں جو کہتی ہوں وہی تم ان سے کہو گے۔“

اس نے باپ بیٹے کے نمبر اپنے فون میں Save کیے پھر کہا۔ ”ان سے بولو کہ تم سے دشمنی بہت مہنگی پڑے گی۔ تم جانتے ہو کہ نہ لیتا زندہ ہے اور کہاں ہے؟ اور جہاں ہے وہاں ابھی مجبور ہے۔ ابھی آئیں سکے گی تم جانتے ہو کہ وہ دوسری پیشی میں ضرور عدالت میں حاضر ہوگی۔“

مراد نے کہا۔ ”وہ وڈر اسکی یقین نہیں کرے گا۔“

”نہ کرے۔ میں فون پر اس کی جوانی باتیں سنتا چاہتی ہوں پھر اس کے خلاف کوئی چال چلوں گی۔“

اس نے شہمت کے نمبر پر چیخے۔ پھر فون کو کان سے لگایا۔ رابطہ ہونے پر اس کی آواز سنائی دی۔ اس نے آواز کو بھاری بھر کم بناتے ہوئے پوچھا۔ ”کون ہے؟“

مراد نے کہا۔ ”تیرا داماد بول رہا ہوں۔“

”کیا بکواس کر رہے ہو؟ کون ہو تم؟“

”کہانا داماد ہوں۔ تجھے ایک خوش خبری سنانا چاہتا ہوں۔ تیری بیٹی نہ لیتا زندہ ہے۔“

شہمت نے سوچنے کے انداز میں کہا۔ ”تیری آواز تیرے بولنے کا انداز مراد جیسا ہے۔ لیکن وہ تو جیل میں ہے۔ فون پر کیسے بول رہا ہے؟“

”دیکھ لے کہ کیسے بول رہا ہے اور ٹوٹ رہا ہے۔“

رات کی تاریکی میں پیراٹھوس کے ذریعے دارالحکومت کے نواح میں اترا تھا جہاں اسٹینی ڈیام ملٹری ہماری خطرہ کی گھنٹی بج رہی تھی۔ قاتحانہ انداز میں دارالحکومت میں داخل ہو جانا تھا۔ منصوبہ یہی تھا مگر حال کسی نہ کسی بنا پر ہمارا منصوبہ نتیجہ خیز ثابت نہ ہو سکا۔ ملٹری نے اس فوجی بغاوت کے معاملے میں اپنا ارادہ بدل دیا۔ اس لیے کہ جب ہم نے اپنے جہازوں سے پیراٹھوس کے ذریعے نیچے چلا گئیں لگا ہی تو ہمیں مختلف سمتوں سے جہزوں کی فوجوں کی گولہ باری کا سامنا کرنا پڑ گیا۔

ہمارے زمین تک پہنچنے سے قبل ہماری بیٹھہ افراد پر مشتمل حریت فوج کے نصف سے زیادہ افراد جان سے ہاتھ دھو چکے تھے اور جو باقی زندہ بچ رہے ان پر جہزوں کی فوج نے تیزی سے قابو پایا۔ رات ڈھلنے تک ہم ان کے قیدی بن چکے تھے۔

انہوں نے ہمیں خلیج ایزل کے قدیم عظیم الشان قلعے میں قید کر دیا۔ اس روز ہم گرفتار ہونے والوں کی کل تعداد تیس تھی اور ہم میں سے ایک قیدی جس کا نام تھا سس تھا، شدید زخمی تھا اور اس کی حالت تشویش ناک تھی۔ قلعے میں ہمیں ایک بڑی سی کوشری میں ایک جگہ اکٹھا رکھا گیا تھا جہاں ہم اپنی قسمت کے فیصلے کا انتظار کرنے لگے۔

اس کوشری میں بے حد گرمی تھی اور ہمارے جسموں سے خارج ہونے والے پسینے اور کمرے میں پھیلی ہوئی سلین کی بساند سے میرے ملحق میں کانٹے سے جھپٹنے لگے اور سانس اٹکنے لگا۔ میرا بچی چاہ رہا تھا کہ میں اپنی گول چمٹی سیاہ ٹوپی اور قمیض اتار چمٹکوں اور سخت پتھر لیے فرش پر دراز ہو جاؤں لیکن میں نے ایسا نہیں کیا اور خاموشی کے ساتھ اپنے بچنے یا قہقہوں کے مانند یہ سب کچھ برداشت کرنے میں ہی عافیت سمجھی۔

اس ملک میں ایک رواج تھا۔ یہ رواج صدیوں سے قائم تھا اور انقلاب کے موقعوں پر اس کی پوری طرح سے پاس داری کی جاتی تھی۔ اس رواج کا سامنا ہمیشہ شکست خوردہ حریف کو کرنا پڑتا تھا۔ ہر حکومت کے دور میں یہ حکم نامہ رواجی طور پر جاری کیا جاتا تھا جو باغیوں کے لیے ہوتا تھا۔ حکم نامہ یہ تھا۔

”ہر پانچویں جوان کو قتل کر دو اور باقیوں کو رہا کر دو۔“ یہ انصاف کا ایک سٹم تھا جس میں رحم کی ایک بڑی منجاش رکھی گئی تھی۔ یہ قانون کے خلاف ایک قسم کی مزاحمت تھی تاکہ ملک میں ایک اپوزیشن پارٹی کسی حد تک

قائم رہ سکے اور ملک میں مخالفین کا صفایا نہ ہو جائے۔ یقیناً جو اتنی فیصد باغی رہا ہو جاتے تھے ان میں سے اکثر دوبارہ متحد ہو کر ایک بار پھر انقلاب لانے کی کوشش کرتے تھے لیکن موت کے گھاٹ اتارے جانے کا خوف بعض اوقات ان کی سرگرمیوں کو معدوم کرنے کے لیے کافی رہتا تھا اور وہ اپنے ارادوں کو عملی جامہ پہنانے سے باز رہتے تھے۔

خلیج کے نیلے پانیوں کے پاس اس اندھیرے قلعے میں ہم تیس قیدی بھی اپنی قسمت کے فیصلے کے منتظر تھے۔ ہم سب کو زندگی کی آس بھی تھی۔ اس لیے کہ ہم میں سے بیشتر کے زندہ بچ جانے کے امکانات ہمارے حق میں تھے لیکن ہمارے قیاس جہزوں کی قیاس کا نہ تھا۔ حساب کتاب سے کسی طور مطابقت نہیں رکھتا تھا۔

حکم نامہ اگلے روز صبح سویرے موصول ہو گیا۔ یہ ہمیں جیل کی سلاخوں کے چبھنے سے بڑھ کر سنا دیا گیا۔ حکم نامہ وہی تھا جس کی ہمیں توقع تھی۔

”ہر پانچویں جوان کو فوری طور پر شوٹ کر دیا جائے۔“ بقیہ قیدی چوبیس گھنٹوں میں رہا کر دیے جائیں گے۔“ لیکن پھر ہمیں ایک حیرت انگیز جھٹکا لگا۔ جس افسر انچارج نے یہ حکم نامہ پڑھ کر سنایا تھا۔ وہ اسے دوبارہ بھی پڑھنے لگا۔ اس نے رکنے پر انکشاف نہیں کیا اور یہی حکم نامہ چار مرتبہ پڑھ ڈالا۔

جہزوں کی قیاس کے ایک جیسے مضمون کے باوجود حکم نامے ارسال کیے تھے۔ یہ ایگزیکٹو آرڈر تھے اور ان حکم ناموں کی رو سے ہم تمام قیدیوں میں سے کوئی بھی زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔

مجھے احساس تھا کہ مجھے کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا اور جلد ہی جب گارڈز نے ہماری کوشری کے دروازے کا قفل کھولا تو میں نے سیدھا افسر انچارج کی جانب رخ کیا۔ اپنی بھرا کی ہوئی آواز کا سہارا لیتے ہوئے میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”تم ہم سب کے سب تیس قیدیوں کو موت کے گھاٹ نہیں اتار سکتے۔ یہ حکم نامے کے برعکس ہوگا۔“

اس افسر انچارج نے حقارت سے میری طرف دیکھا اور بولا۔ ”بہادر بنو، چھوٹے سپاہی اور ایک سپاہی کے مانند موت کو گھٹے لگاؤ۔“

”لیکن پہلے حکم نامے میں کہا گیا ہے کہ ہر پانچویں جوان کو فوری طور پر شوٹ کر دیا جائے۔ اس کا مطلب بس یہی ہے جو لکھا ہوا ہے۔“ انہیں دوسرا حکم نامہ پڑھنے سے پہلے

شوٹ کرنا ہوگا۔“ یہ سن کر اس افسر انچارج نے ایک آہ بھری اور بولا۔

”اس سے کیا فرق پڑے گا اور دن بھی گرم ہے۔ بھلا کون کڑی دھوپ میں مرنا چاہتا ہے؟ اس وقت کم از کم ٹھنڈی سمندری ہوا تو چل رہی ہو۔“

”تمہیں احکامات کی پابندی کرنا ہوگی۔“ میں نے زور دیتے ہوئے کہا۔ ”ہر حکم کی لازمی طور پر علیحدہ علیحدہ تعمیل ہونی چاہیے۔“

یقیناً آپ نے اندازہ لگالیا ہوگا کہ میرے اس اصرار کی وجہ کیا تھی۔ اگر ان پانچویں ایگزیکٹو آرڈرز کو نیکٹا کر کے ان کی فوری طور پر تعمیل کی جاتی جیسا کہ بلاشبہ جہزوں کی قیاس کا مقصد تھا تو ہم سب کے سب تیس قیدی موت کے گھاٹ اتار دیے جاتے۔

لیکن اگر ہر حکم کی باری باری علیحدہ سے تعمیل ہوتی تو پھر ہم میں سے نو افراد زندہ بچ سکتے تھے۔ میری ریاضی ہمیشہ سے اچھی رہی تھی اور میں نے اپنے طور پر حساب لگایا تھا، وہ کچھ یوں تھا۔

جب ہم تیس قیدیوں میں سے ہر پانچویں قیدی کو علیحدہ کر دیا جائے گا تو ان کی تعداد چارہنے کی اور ان میں باقی رہ جائیں گے۔ جب یہ عمل دہرایا جائے گا تو مرنے والوں کی تعداد تین ہوگی اور سولہ باقی بچ رہیں گے۔ تیسرے راؤنڈ میں مزید تین موت کے منہ میں پہنچ جائیں گے اور تیرہ باقی رہ جائیں گے پھر دو کو شوٹ کر دیا جائے گا اور گیارہ باقی بچیں گے۔ آخر میں دو کا مقدر موت ہوگی اور ہم نو قلعے سے آزاد ہو کر باہر کی فضا میں سکون کا سانس لے سکیں گے۔

آپ کہتے ہیں کہ بچ نکلنے کا امکان اب بھی میرے حق میں نہیں تھا؟ قطعی نہیں بشرطیکہ افسر انچارج میرے مطالبے سے اتفاق کر لے۔ تب میرا بچ نکلنا یقینی تھا اس لیے کہ آپ خود سوچیں ہر مرتبہ پانچویں جوان کا انتخاب کس طرح کیا جائے گا؟

یقیناً قرعہ اندازی سے نہیں اس لیے کہ یہ ملٹری کا معاملہ تھا جہاں اصولوں کو فوقیت دی جاتی ہے۔ ہمیں ایک قطار میں کھڑا کر دیا جائے گا اور پھر گنتی ہوگی اور ہم کس ترتیب میں قطار بند ہوں گے؟ حرف بچنے کے لحاظ سے؟ یہ ممکن نہیں تھا کیونکہ وہ ہمارے ناموں سے واقف نہیں تھے۔

ہماری قطار بندی قدیم ملٹری رواج کے مطابق ہوگی، ہماری قامت کے لحاظ سے اور رات کال کوشری میں گزارنے کے دوران میں نے پہلے ہی اس بات کی تصدیق

دو دن کے کسی بھی گوشے میں اور ملک گھر میں

گھر بیٹھے

رسالے حاصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ سسٹمز ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ ماہنامہ سرگزشت

باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں، اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا رسالہ (بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 700 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 8,000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 7,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ تم اسی حساب سے ارسال کریں۔ فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

یہ آپ کی طرف سے اپنے پیادوں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا مینی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجئے پر ہماری بینک فیس عاید ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ شمر عباس (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C فیروز ٹرسٹ ہاؤس بائیسگ اتھارٹی میں نورنگی روڈ، کراچی
فون: 35895313 فیکس: 35802551



دنیا کے اندھیروں میں نور کی کچھ کرنیں اب بھی اس کائنات کو اپنے حصار میں لیے ہوئے ہیں اور ان کا ثبوت ولیوں کی وہ گراں قدر شخصیات میں جنہوں نے اپنی زندگی عبادت الہی اور خدمت خلق کے لیے وقف کر دی، اس کے باوجود تشنگی سے دوچار رہے۔ اپنے مقصد حیات کے ادھورے پن کا احساس انہیں مضطرب رکھتا اور اسی اضطراب نے انہیں کبھی یاد الہی سے غافل نہ ہونے دیا۔

پیدائش انسان کے رمز کو پانے والے ولیوں میں سے ایک انتخاب

شیخ محمد حضرت ولی اللہ شاہ دہلوی کے جد مادری تھے۔ اپنے آبائی وطن نارنول میں کچھ عرصہ رہ کر شیخ ابوالہٹا کی خدمت میں چلے گئے۔ وہیں ان کی ملاقات حضرت شاہ ولی اللہ کے والد شیخ عبدالرحیم سے ہوئی اور ان دونوں نے شیخ محمد بن تعلیم میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ نارنول چھوڑ کر دہلی کی سکونت اختیار کر دی اور شب و روز تحصیل علم میں مشغول رہے۔ چونکہ شیخ ابوالہٹا پر استغراق کا عالم طاری رہتا تھا اس لیے وہ اپنے نو عمر شاگرد پر مدینہ شیخ محمد پر تعلیم و تربیت کے سلسلے میں زیادہ وقت نہیں دیتے تھے اور اسحاق تھوڑے تھوڑے ہوتے تھے جبکہ شیخ محمد میں ہوسِ علم اور تحقیق عرفان کی یہ شدت تھی کہ زیادہ کی فکر میں ہر وقت مضطرب اور پریشان رہتے تھے۔ کئی بار بھی میں آئی کہ اپنے ہی مدرسہ اور استاد سے کہیں کہ ”حضرت! اس طرح قویہ خاکسار برسوں معلق رہے گا اور یہ عاجز مایہ آج آب کی طرح تر تپا رہے گا۔“ خدا کے لیے جو بتانا سکھانا ہے اس میں غلٹ اور شدت اختیار کیجئے ورنہ تاخیر اور تعویق تو اس ناچیز کے لیے برداشت سے باہر ہے۔“ شیخ ابوالہٹا نے منہ عرفان سے غمخوار آنکھوں سے اپنے مضطرب شاگرد پر مدینہ کی طرف دیکھا اور مسکرا دیے۔ شیخ محمد خورنگے کہ کہیں

اب گنتی گن کر قطار میں سے موت کا سامنا کرنے کے لیے قیدی کو نکالنے کا آخری مرحلہ باقی رہ گیا تھا۔ قطار میں اب ہم گیارہ باقی رہ گئے تھے اور ترتیب کے مطابق ہر ایک نے اپنا نام نمبر کیا کرنا تھا۔ ابھی قطار کے سب سے پہلے قیدی نے اپنا نمبر پکارا تھا کہ افسر انچارج بلند آواز سے بولا۔ ”نمبر جاؤ۔“

میں نے گردن گھما کر دیکھا تو خوف و وحشت سے میری آنکھیں پٹی ہو چکیں۔

قطار میں کھڑا دھنکی تھا جس کو خوش قسمتی سے اب تک بچ جانے والوں میں شامل تھا اچانک ہی زمین پر گر پڑا تھا اور اس کے پہلو سے خون ابل رہا تھا، اس کا جسم کوئی حرکت نہیں کر رہا تھا۔ وہ مر چکا تھا اور اب اچانک ہی ہماری تعداد گیارہ سے گھٹ کر دس ہو گئی تھی۔ اب میرا نمبر دسواں تھا۔ تب آخری گنتی شروع ہو گئی۔

پانچواں آدمی قطار میں سے نکل کر ایک قدم آگے بڑھ گیا پھر سب اپنا نمبر بکارنے لگے چھ۔ سات۔ آٹھ۔ نو۔ دس۔ میں نے اپنی جگہ سے کوئی حرکت نہیں کی جب کہ میرا نمبر دسواں تھا۔

”آگے بڑھو چھوٹو۔“ افسر انچارج نے کہا۔ ”اب تمہاری باری ہے۔“

آپ پوچھیں گے کہ میں یہاں زندہ سلامت کیوں
وجود ہوں جبکہ موت یقینی میرا مقدر بن چکی تھی۔ اس لیے
کہ میں نے اپنی پوری احتیاط کے ساتھ اپنی زندگی کی بچت
کے بارے میں جو غور کیا تھا وہ اب رانگال ہو گیا تھا۔
اس لیے موت مجھے اپنی آنکھوں کے سامنے رخص
کرتی دکھائی دینے لگی اور تب میں نے قطار سے قدم باہر
نکلانے کے بجائے وہ کرڈالا جس سے میں نے رات بھر اور
پھر صبح سے اب تک گریز کیا تھا۔

مجھے علم تھا کہ افسر انچارج جنرل ڈیام کے حکم پر جڑوا
جڑوا اعلیٰ کرے گا اور وہ حکم تھا۔
”ہر پنجویں جوان کو مار ڈالو۔“ اور اسی حکم نے
میری جان بخشی کروادی۔ اس کے باوجود کہ قطار میں میرا
نمبر سوال تھا۔

میں نے اپنے سر پر سے گول چٹائی سیاہ ٹوپی اتار دی اور اپنی زلفوں کو اپنے شانوں پر یکپھر لیا۔
 تپ میں نے یہ ظاہر کر دیا کہ میں کوئی جوان نہیں بلکہ
 ایک لڑکی ہوں۔

کر لی تھی کہ ہم تیس قیدیوں میں سب سے چھوٹا قدمیرا تھا۔
اگر وہ سب سے چھوٹے قدم کی جانب سے گنتی شروع کرتے
ہیں جس کا امکان کم تھا تو تب میری زندگی لازمی محفوظ تھی
کیونکہ اس طرح میرا نمبر پہلا بڑھتا۔

زیادہ امکان اس بات کا تھا کہ وہ گنتی لانے قدی
جانب سے شروع کرتے ہیں۔ اس صورت میں ہر پانچویں
فرد کی گنتی پر ہماری تعداد اس ترتیب سے گھٹتی جاتی۔

9 اور 11, 13, 16, 19, 23

اور ان میں سے کوئی بھی ہندسہ پانچ سے تقسیم نہیں ہوتا تھا۔ یوں میرا ان شامت زدہ قیدیوں میں شمار نہیں ہوتا تھا۔ وہ افسرانِ جارج مجھے دیر تک گھورتا رہا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وقت کی رفتار تھم گئی ہو۔ انتظار کی گھڑیاں بھی ختم نہ ہونے والی لگ رہی تھیں۔ تب بالآخر اس افسرانِ جارج نے ان انگریزیو آرڈر پر ایک بار پھر نظریں دوڑائیں جو اس نے اپنے ہاتھ میں تھامے ہوئے تھے۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے عیاں ہو گیا کہ وہ کسی نتیجے پر پہنچ چکا ہے۔ ”آل رائٹ!“ وہ گویا ہوا۔ ”ہم پہلے حکم کی تعمیل کر سگے۔“

ہم محن میں قطار بنا کر کھڑے ہو گئے۔ قامت کے لحاظ سے۔ ہمارے دوستوں نے زنجی تھامس کو سہارا دیا ہوا تھا پھر گفتی شروع ہو گئی۔

ہم تیس میں سے چار کو سمندر کے ساتھ کی دیوار کی جانب مارچ کرنے کا حکم دیا گیا پھر انہیں شوٹ کر دیا گیا۔ ہم باتوں سے کسی کی بھی بہت نہ ہوئی کہ ان کی طرف دیکھ سکیں۔

پھر مزید تین کو ہم میں سے علیحدہ کیا گیا اور سمندری دیوار کے پاس کھڑا کر کے گولیاں مار دی گئیں۔

اب جو باقی سولہ بچے تھے ان میں سے ایک نے رونا شروع کر دیا۔ اسے قطار میں اپنی پوزیشن کا اندازہ ہو گیا تھا کہ اگلی باری اس کی ہے۔ افسرانچارج نے رسماً تیسرا ایگریٹیوڈ آرڈر پڑھ کر سنایا اور ہم میں سے مزید تین سمندری دہاڑیوں کی طرف چلے گئے۔

چوتھا ایگریکیٹو آرڈر کے پڑھنے کے بعد تیرہ میں سے دو باہمی موت کو چھلکانے کے لیے سمندری دیواری کی جانب مارچ کر گئے۔ اب وہ فائرنگ اسکوڈ بھی گرمی سے پریشان اور بور ہونا شروع ہو گیا تھا۔ سورج ہمارے سر پر چڑھ چکا تھا۔

وہ ناراض تو نہیں ہو گئے۔ لیکن شیخ ابوالرمان نے بڑی نرمی اور ملامت سے کہا۔ ”شیخ محمد! تو کس بجلت اور ہوس کی بات کر رہا ہے؟ وہ بجلت جو تجھے اور ہر انسان کو اپنے دادا حضرت آدم علیہ السلام سے ورثے میں ملی ہے، اور وہی بجلت جو انسان کو شرمندہ و خجل کر دیا کرتی ہے، ہوس عرفان بڑی اچھی چیز ہے مگر چھوٹا ہوس ناقابل توجہ ہوتی ہے۔ میں تیرا مرشد بھی ہوں اور استاد بھی، میں جانتا ہوں کہ تو کتنے دنوں میں فارغ تحصیل ہو جائے گا۔ بس اس مدت کو ذہن میں رکھ کر تجھ پر محنت کی جارہی ہے اور توجہ دی جارہی ہے۔“

اس جواب نے شیخ محمد کو مطمئن نہیں کیا، وہ بدستور اس خلیان میں جھلا رہے کہ جس طرح بھی ممکن ہو جلد از جلد فارغ التحصیل ہو لیا جائے لیکن فی الحال اپنے بیرومرشد اور استاد سے اچھا مناسب نہ سمجھا اور سکوت اختیار کیا۔ بے چینی اور اضطراب میں کوئی کی نہ ہوئی۔ وہ آتش زیر پاخص کی طرح دہلی کے گلی کوچوں اور بازاروں کی شاہراہ روری میں مشغول رہے۔

ایک دن وہ شہر کے ایک ایسے مکان کے پاس سے گزرے جہاں طالب علموں کی بھجمنماہٹ بڑی دور تک گونج رہی تھی۔ شیخ محمد اس مکان کے دروازے سے کان لگا کر کھڑے ہو گئے، در اندر کی آوازیں سننے لگے۔ استاد اپنے شاگردوں کو بڑی توجہ سے پڑھانے میں مشغول تھا۔ کچھ دیر اسی طرح کھڑے رہنے کے بعد ان پر دفورق غلبہ کیا اور یہ اجازت لے لے بغیر مکان میں داخل ہو گئے۔ اندر کا منظر بڑا دل نشین اور سرخراہ تھا۔ شیخ محمد پر اس کا خاص اثر ہوا۔ انہوں نے اپنی زبان سے تو ایک لفظ بھی نہ ادا کیا۔ بس شاگردوں اور طلب علموں کے سامنے ہاتھ باندھ کر ادب سے کھڑے ہو گئے۔ باریش نورانی چہرے والے استاد نے ایک اچھی نوجوان کو درس گاہ میں داخل ہوتے دیکھا تو وہ بھی بس دیکھتا رہا۔ استاد کی نظر میں یہ عجیب نوجوان جس پر اس کی درس گاہ کے طالب علموں کی کیفیت نے ایک نشہ طاری کر دیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ..... وہ بالآخر ان سے کوئی درخواست کرے گا لیکن ایسا نہیں ہوا اور کچھ دیر بعد جب جو تہ ٹوٹی اور شیخ محمد ہوش میں آئے تو اپنے آس پاس گہرائی نظر میں ڈال کر مکان سے باہر نکل گئے۔ درس گاہ کے استاد نے اپنے شاگردوں کو حکم دیا۔ ”یہ کون شخص ہے، کہاں سے اور کیوں آیا تھا؟ چاہتا کیا ہے؟ اس کو روکو اور اس سے یہ ساری باتیں کر کے جواب حاصل کرو۔“

تیسرا شاگردوں نے باہر نکل کر دوڑ لگائی اور دم کے دم میں شیخ محمد کو پکڑ لیا۔ آپ بہت پریشان ہوئے پوچھا۔ ”دوستو! کیا بات ہے؟ یہ تم کس کے حکم پر مجھے گرفتار کر رہے ہو؟“

ایک شاگرد نے ہنس کر جواب دیا۔ ”ہم اپنے استاد محترم کے حکم پر تجھے پکڑنے آئے ہیں۔ تو ہمارے ساتھ اپنے بیروں سے چل دے تو بہتر ہے ورنہ ہمیں دوسرا طریقہ بھی آتا ہے۔“

شیخ محمد نے جواب دیا۔ ”بھائیو! تمہیں زبردستی اور جبر کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ میں یوں ہی چلا چلوں گا۔ لیکن جانے سے پہلے میری چند باتیں ضرور سن لو۔ اگر ان کے جوابات ممکن ہوں تو ان سے بھی شاد کام کروور تمہاری مرضی!“

اسی شاگرد نے اپنے بقیہ ساتھیوں کی طرف دیکھا، کئی نے اپنی گردن کو خفیف سی جھنجھکی دی، گویا کہہ رہے ہوں، کوئی حرج نہیں اس کے سوالوں کے جواب ضرور دیے جائیں۔

شاگرد نے آپ کو جواب دیا۔ ”صاحبزادے! ہماری یہ عادت تو نہیں کہ استاد محترم اگر کسی کو ہم سے بلوائیں تو ہم اس سے فضول سوال جواب کر کے خواخواہ وقت ضائع کریں لیکن ہم تمہارے سوالوں کا جواب ضرور دیں گے اور تم بھی اس کا خیال رکھو کہ سوالات زیادہ اور طویل نہ ہوں۔“

شیخ محمد نے پوچھا۔ ”تمہارے استاد ہمیں کیوں بلوا رہے ہیں؟“

شاگرد نے جواب دیا۔ ”یہ سوال چونکہ استاد محترم سے تعلق رکھتا ہے اس لیے اس کا جواب بھی وہی دیں گے۔“

شیخ محمد نے دوسرا سوال کیا۔ ”اس مدرسے میں ایسی پڑھائی ہوتی ہے؟“

شاگرد نے جواب دیا۔ ”جناب! ایسا ایک مثالی ادارہ ہے، یہاں کی پڑھائی کا دور دورہ شہر ہے۔“

شیخ محمد نے پوچھا۔ ”یہ پڑھائی باقاعدہ جلدی جلدی ہوتی ہے یا رک رک کر وقفوں سے؟“

شاگرد نے چڑک رہا۔ ”فضول سوالات میں وقت نہ ضائع کر جو کچھ پوچھنا ہے استاد محترم کے سامنے چل کر پوچھ۔ وہیں جوابات مل جائیں گے۔“

شیخ محمد شاگردوں کے ساتھ استاد کی خدمت میں پہنچا دیے گئے، استاد کے چہرے سے غضب اور پریشانی ہوید اٹھی۔ شیخ محمد گود بیکھے ہی ہنسنے لگا۔ ”تو کون ہے؟ اور یہاں کیا لینے آیا تھا؟“

انہوں نے جواب دیا۔ ”میں ان فضول سوالوں کے جواب اگر نہ دوں تو.....؟“

شیخ محمد صلی اللہ

استاد نے غصے میں پکپکاتے ہوئے کہا۔ ”بالا لاق! یہ تو کسی بھٹس کر رہا ہے مجھ سے؟“

آپ نے فرمایا۔ ”بحث کرنا کوئی بری بات نہیں، اس کے دل و دماغ کے خیر اور فضول حصوں میں بہت ساری بے کار باتیں جمع ہو گئی ہوں۔“

استاد نے مشتعل ہو کر سوال کیا۔ ”کس کے خیر اور فضول دل و دماغ میں؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”جو بے کار سوال و جواب میں وقت ضائع کر رہا ہوں۔“

استاد نے گرمی سے پوچھا۔ ”میں پوچھتا ہوں کہ تو یہاں کیا لینے آیا تھا؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”استاد محترم! میں آپ کے مدرسے سے بہت متاثر ہوا تھا۔ اب بھی ہوں۔ یہی میں جانا چاہتا ہوں کہ یہاں تدریس کا قاعدہ ہوتی ہے یا بے قاعدہ؟“

استاد نے کہا۔ ”صاحبزادے! ہم وقت برباد کرنے کے قائل نہیں، یہاں کا سبب یافتہ نوجوان کہیں مار نہیں کھا سکتا۔“

شیخ محمد کی جیس طبیعت نے انگڑائی لی، پوچھا۔ ”حضرت! اگر میں پڑھنا چاہوں تو؟“

استاد نے جواب دیا۔ ”اگر اس مدرسے میں تعلیم حاصل کرنے کی لیاقت رکھتے ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ تمہیں مایوس کیا جائے!“

شیخ محمد نے پوچھا۔ ”تو کہاں کل سے حاضر ہو جاؤ؟“

استاد نے جواب دیا۔ ”بالکل، کسی مزید اجازت کے بغیر۔“

شیخ محمد بے شکریہ سے نکلے۔ وہ جیسے ہی اندر داخل ہوئے شیخ ابوالرمان سے ملاقات ہو گئی۔ انہوں نے لحد بھر کے لیے شیخ محمد کے چہرے پر نظر میں گاڑ دیں۔ اس کے بعد ایک کانڈ پر چند الفاظ لکھ کر شیخ محمد گودے دیا۔ شیخ محمد نے اس پر زور کو نہایت احترام سے رکھ لیا۔ جب یہ پرزہ تہائی میں کھول کر پڑھا تو اس میں لکھا تھا۔

”آج تم کہاں گئے ہوئے تھے؟ کیونکہ میں تمہارے اندر ایک غفلت دیکھ رہا ہوں۔“

شیخ محمد پرزہ بڑھ کر رز گئے اور بیرومرشد کے قدموں میں گر گئے، بولے۔

”حضرت! غلطی ہوئی میں اس پر نام اور سر مسارہوں۔“

مرشد نے جواب دیا۔ ”شرمندہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں اب تو وہاں نہیں جائے گا۔“

شیخ محمد اپنے مرشد کے قدموں میں سر رکھ دے دیر تک روتے رہے اور شیخ ابوالرمان انہیں تسلیاں دیتے رہے۔

☆☆☆

شیخ ابوالرمان کے آس پاس اور سامنے مریدوں کا جھوم تھا۔ آپ فضائل ذکر بیان فرما رہے تھے۔ جب اس سے فراغت ملی تو ایک تونمند مرید کو اپنے پاس بلا کر حکم دیا۔ ”دیکھو مجھ سے کہ باہر ایک بکری بندھی ہوئی ہے اس کو کھلو اور میرے اس عزیز کو پہنچا دو جو مسجد کے سامنے رہتے ہیں۔“

مرید کو تال ہوا، رک رک کر پوچھا۔ ”کون سے عزیز؟ جو یہاں سے تقریباً نصف میل دور مسجد کے سامنے رہتے ہیں؟“

مرشد نے جواب دیا۔ ”ہاں، انہی عزیز کے گھر۔“

مرید نے کچھ پس و پیش کیا اور کہا۔ ”حضرت، بکری تو خاصی وزنی ہے اور شاید اس کا ایک پاؤں ڈنچی بھی ہے اس حالت میں اس کو نصف میل چلا کر لے جانا شاید مشکل کام ہے۔“

مرشد نے فرمایا۔ ”لیکن اس کا لے جانا بہت ضروری ہے، جس طرح چاہو لے جاؤ۔“

مرید نے کہا۔ ”میرا خیال ہے ایک مزدور کر لیا جائے۔“

شیخ ابوالرمان نے ناگواری سے کہا۔ ”میں نے کہہ تو دیا کہ جس طرح چاہو لے جاؤ۔“

مرشد اور مریدی کا تہمت دوسرے مریدوں نے بھی نہیں۔ شیخ محمد بھی کوش برآوازی رہے۔ آخر مریدوں میں وہ پہلے شخص تھے جو اس مرید کے ساتھ باہر چلے گئے۔ مرید مذکور باہر نکل کر بکری کے پاس پہنچا۔ اسے کھرا کر کے زبردستی چلا یا پھرایا۔ وہ اچک اچک کر چلتی اور گرجاتی مرید نے اسے کھینچنا شروع کیا۔ رسی کی رگڑنے بکری کو احتجاج پر مجبور کر دیا۔ وہ ہمیں ہمیں کرنے لگی۔

شیخ محمد نے مرید سے کہا۔ ”بھائی! اس پر اتنا ظلم نہ کرو کہ یہ چیخنے چلانے لگے۔“

مرید نے جھنجھلا کر شیخ محمد کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”جناب! اس بکری کو جہاں تک لے جانا ہے، وہ یہاں سے نصف میل دور ہے ایہ

اگر غزے کرے گی تو میں اس کو بچتا ہوا لے جاؤں گا۔“

شیخ محمد نے فرمایا۔ ”تم اگر اس طرح لے گئے تو یہ وہاں تک پہنچتے پہنچتے یا تو مر جائے گی یا ادھر مری ہو جائے گی اور وہ عزیز حضرت شیخ مرشد سے تمہاری شکایت کریں گے۔ اس وقت تم کیا جواب دو گے؟“

مرید نے لال پیلے ہو کر جواب دیا۔ ”اس وقت میں ہر دوسرے کہوں گا کہ حضرت! آپ کو معلوم نہیں تھا کہ بکری تلوڑی بھی ہے اور ذبیحی بھی، وہ اپنے پیروں سے جانے کے لائق تھی ہی کب؟ چنانچہ اس کو مجبوراً سبچ کر لے جانا پڑا۔ اب وہ مرے یا جینے، میں کیا کر سکتا ہوں؟“

شیخ محمد نے مشورہ دیا۔ ”کوئی طاقتور مزدور لے آؤ۔ وہ اسے گود میں اٹھا کر پہنچا دے گا۔“

مرید نے خونخوار نظروں سے شیخ محمد کی طرف دیکھا۔ ”مزدور لے آؤں؟ کہاں سے مزدور لے آؤں، مزدوری کون دے گا؟ میرے پاس تو دینے کے لیے کچھ بھی نہیں۔“

شیخ محمد نے جواب دیا۔ ”مزدوری میں دے دوں گا، آخر ہر دوسرے کی رضا حاصل کرنی ہے۔“

مرید کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی، بولا۔ ”آدی دلچسپ بھی ہو اور مرشد کے وفادار اور محب بھی۔“ اس کے بعد ایک طرف جاتے ہوئے کہا۔ ”میں ابھی آیا مزدور لے کر۔“

مرید جیسے ہی گیا۔ شیخ محمد نے بکری کو گود میں اٹھانے کی کوشش کی، بکری کلبلائی اور اچھلتے کودنے لگی۔ دو کوششیں بیکار گئیں۔ لیکن تیسری کوشش میں کامیاب ہو گئے اور اس کو گود میں اٹھا کر ایک طرف بھاگنے لگے۔ بھاری بکری، طویل مسافت، شیخ محمد پینا پینا ہو گئے۔ ہر دوڑ حالی سو قدم پر وہ سستانے لگتے۔ کافی دیر بعد انہوں نے شیخ ابوالرشتا کے عزیز کے گھر بکری پہنچا دی۔

مرید مزدور لے کر واپس آیا تو وہاں بکری ٹی نہ شیخ محمد۔ وہ پریشان ہو کر ادھر ادھر بھاگنے لگا۔ وہ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ شیخ محمد اس بکری کو اپنی گود میں اٹھا کر لے گئے ہوں گے۔ وہ پریشان، حواس باختہ اندر مرشد کے پاس پہنچا اور سارا ماجرا بیان کر دیا، بولا۔ ”اب آپ فرمائیں کہ شیخ محمد کو کہاں تلاش کروں۔“

مرشد نے جواب دیا۔ ”تلاش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں اطمینان سے بیٹھا میرے پاس بیٹھے رہو۔ شیخ محمد جہاں کہیں بھی ہوں گے بالآخر یہاں آئیں گے۔“

مرید نے عرض کر دیا۔ ”حضرت! مشکل تو یہ ہے کہ میں اس مزدور کا کیا کروں جو یا ہر کھڑا ہوا ہے، اس سے کیا کہوں؟“

مرشد نے فرمایا۔ ”اس سے کہہ دو کہ واپس چلا جائے، اب تمہاری ضرورت نہیں رہی۔“

مرید نے عرض کیا۔ ”لیکن حضرت! آپ یہ کیوں نہیں سوچتے کہ میں اس کو مزدوری ملے کر لے آیا تھا، کیا وہ مجھے شرمندہ نہیں کرے گا کہ کیا مذاق لگا رکھا ہے؟“

مرشد نے مسکرا کر نرمی سے حکم دیا۔ ”مزدور کو اس کی مزدوری دے دو، وہ خوشی خوشی واپس چلا جائے گا۔“

مرید نے شرمناک عرض کیا۔ ”حضرت! اس وقت تو میرے پاس ایک جہ بھی نہیں میں مزدور کو مزدوری کہاں سے دوں گا؟“

مرشد نے چہیتا ہوا اعتراض کیا۔ ”جب پاس ایک جہ بھی نہیں تھا تو مزدور کو لے ہی کیوں تھے؟“

مرید نے جواب دیا۔ ”حضرت مجھے سے شیخ محمد نے وعدہ کیا تھا کہ مزدور لے آؤں۔ وہ مزدوری دے دیں گے۔“

مرشد نے مزدوری کے پیسے اپنے پاس سے دے دیے اور مرید سے کہا۔ ”تم مزدور کو رخصت کر دو اور میرے پاس موجود رہو۔“

مزدور کو اس کی اجازت دے کر رخصت کر دیا گیا، مرید، مرشد کے پاس دیر تک بیٹھا شیخ محمد کا انتظار کرتا رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ شیخ محمد بکری کو لے کر کہاں چلے گئے؟

کافی دیر بعد جب شیخ محمد واپس آئے تو مرید بے چینی سے کھڑا ہو گیا، پوچھا۔ ”بھائی! کہاں چلے گئے تھے؟ وہ بکری کہاں ہے؟“

شیخ محمد نے بتایا۔ ”وہ بکری میں نے پہنچا دی۔“

مرید نے پوچھا۔ ”کہاں پہنچا دی؟“

جواب دیا۔ ”جہاں پہنچانا تھی۔“

مرید نے حیرت سے پوچھا۔ ”لیکن کس طرح؟ میں تو مزدور لایا تھا اس کے لیے!“

شیخ محمد نے جواب دیا۔ ”میں نے بکری کو گود میں اٹھا کر پہنچا دیا۔“

شیخ محمد رحمہ اللہ

شیخ ابوالرشتا نے دونوں کو مخاطب کر کے فرمایا۔ ”اے شخص! میں نے بکری کو اپنے عزیز کے گھر پہنچانے کا حکم دیا تھا تو نے تساہل سے کام لیا لیکن شیخ محمد نے یہ کام اپنی خوشی سے کر دیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ شیخ محمد کو اس حسن خدمت کی وجہ سے مقربین میں شامل فرما لے گا۔ لیکن تجھے تیرے قصور کی وجہ سے مقام سے محروم رکھے گا۔“

اس دن ان کے مرشد پر عجیب سی کیفیت طاری رہی، مرید تو دل برداشتہ ہو کر چلا گیا لیکن شیخ محمد ان کے پاس ہی موجود رہے۔ رات ہو گئی لیکن ان کی حالت میں کوئی فرق نہ آیا۔ آخر نصف رات گزرنے کے بعد شیخ ابوالرشتا کچھ دیر کے لیے مراجعے میں چلے گئے اس کے بعد شیخ محمد نے فرمایا۔ ”شیخ محمد! تجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں اسے ذرا غور سے سن لے۔“

شیخ محمد نے سعادت مندی سے جواب دیا۔ ”آپ کی ہر بات میرے لیے ایسی ہے کہ میں دنیا جہاں کو فراموش کر کے پوری توجہ سے سنوں فرمائیں! میں سننے کو تیار ہوں۔“

مرشد نے فرمایا۔ ”شیخ محمد! خدا نے تجھے اس لائق کر دیا ہے کہ تو اس کے انسانوں کی رہبری کرے۔ اگر کوئی طالب راہ ملوک تجھ سے رجوع کرے تو یہ تیرا فرض ہوگا کہ تیرے پاس میرا دیا ہوا جو کچھ بھی ہو تو اس کی تلقین کرے، تجھے اس کی اجازت دے رہا ہوں۔“

شیخ محمد ذرا پریشان ہو گئے۔ وہ اس لیے پریشان ہوئے تھے کہ ان کے دل میں کس قسم کا ایسا ویرانہ خیال تک نہیں آیا تھا۔ پھر دیر و مرشد نے ایسی بات کیوں کہی۔

شیخ ابوالرشتا نے فرما کر رازدار اور سعادت مند مرید کے تمام دلی وسوسوں کو بھانپ گئے فرمایا۔ ”دیکھ شیخ محمد! میں نے یہ بات اس لیے کہی کہ اس وقت میرے رب نے ان تمام لوگوں کے نام مجھے بتا دیے ہیں جو براہ راست یا بالواسطہ تجھ سے بیعت کریں گے۔ اگر تو کہے تو میں ان کے نام تک تجھے بتا دوں۔“

شیخ محمد نے جواب دیا۔ ”حضرت! میں تو آپ کا ایک ادنیٰ سا خادم ہوں۔ آپ سے یہ درخواست نہیں کروں گا کہ آپ ان سب کے نام بتا دیجیے۔“

شیخ ابوالرشتا نے بھی نام نہیں بتائے اور معاملہ رفع دفع ہو گیا۔

☆☆☆

اللہ کو درویشوں کی جماعت آپ کے پاس آئی اور خواہش کی کہ اپنا کچھ وقت ہمیں دیں۔ یہ درویش چونکہ اللہ اللہ بہت زیادہ کرتے تھے اس لیے ان کا نام اللہ کو مشہور ہو گیا۔ ان کے بے حد صبر اور آپ ان درویشوں کے ساتھ چلے گئے۔ درویش گلیوں کوچوں میں اللہ اللہ کرتے پھرے تھے۔ یہ درویش جب ایک محلے میں پہنچے جہاں امراء سلطنت رہتے تھے تو ایک امیر کا دروازہ اچانک کھلا اور اس میں سے ایک شخص نکل کر درویشوں کے پیچھے دوڑا۔ اس نے درویشوں سے پوچھا۔ ”میں ایک غرض مند انسان ہوں، بتاؤ میں تم میں سے کس شخص سے بات کروں؟“

ایک درویش شیخ محمد کی طرف اشارہ کر دیا۔ ”ان سے، کیونکہ ہم میں سے ان جیسا ایک بھی نہیں۔“

وہ شخص شیخ محمد کے پاس پہنچا اور درویشوں کو اپنے آپ کا دامن پکڑ لیا، بولا۔ ”حضرت! اب یہ دان اس وقت تک نہیں چھوڑوں گا جب تک آپ میری مشکل حل نہ فرما دیں گے۔“

شیخ محمد نے پوچھا۔ ”اپنی مشکل تو بتاؤ یوں دامن پکڑنے سے کیا حاصل؟“

اس نے عرض کیا۔ ”حضرت! یہ جوتل نظر آ رہا ہے میں اس کا ادنیٰ سا ملازم ہوں، میرا آقا انتہائی نیک اور شریف انسان ہے، وہ آج کئی دن سے چشپا بند ہو جانے کی بیماری... میں جلتا ہوں دنیا کے معایوں نے مایوسی کا اظہار کر دیا ہے۔ بس ایک آپ ہی کی ذات ہے جو مستجاب الدعوات ہیں، آپ چاہیں گے تو میرا آقا صحت پاب ہو جائے گا ورنہ بیٹے کی کوئی امید نہیں ہے۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”دلی میں بڑے بڑے معاینین موجود ہیں ان کے پاس جا اور اپنے آقا کا علاج کرا۔“

اس شخص نے عرض کیا۔ ”حضرت! اگر ایسا ممکن ہوتا تو اس وقت میں آپ کو ہرگز تنگ نہ کرتا۔ اب تو آپ ہی میرے آقا کو صحت یاب کر رہے ہیں۔“

آپ نے پوچھا۔ ”کیا تیرا آقا تہمت اچھا آدمی ہے جس کی مصیبتی کے لیے تو اتنا بے چین ہے؟“

اس نے جواب دیا۔ ”حضرت! اس سے کہیں زیادہ اچھا۔ جتنا خیال کیا جا سکتا ہے، اگر میرا آقا نہ رہا تو میں بھی اس قصر سے نکل جاؤں... کیونکہ میرے آقا کے بعد اس قصر میں ایک بھی جو ہر شے نہیں رہ جائے گا۔“

امیر نے جواب دیا۔ ”حضرت! میں آپ کا کس زبان سے شکر یہ ادا کروں، مجھے دوبارہ زندگی ملی ہے۔“
آپ نے فرمایا۔ ”میرا نہیں، اپنے رب کا شکر ادا کرو جس نے تجھے دوسری زندگی عطا فرمائی۔“

امیر نے کہا۔ ”لیکن میں آپ کا شکر یہ ضرور ادا کروں گا۔ کیونکہ اگر آپ وسیلہ نہ بنے اور دعا نہ فرماتے تو شاید میں صحت یاب نہ ہوتا، اس سے پہلے میرا پورا خاندان میری صحت یابی کی دعا میں مانگ چکا تھا لیکن میں صحت یاب نہیں ہوا تھا۔“

آپ نے جانے کی اجازت مانگی۔ ”اچھا اب میں چلا، اپنے رب کو ہمیشہ یاد رکھو۔“

امیر نے جواب دیا۔ ”حضرت! میں آپ کو انہی نہیں جانے دوں گا، آپ چند دن میرے مہمان رہیں۔“
قصر کے در پر اللہ گوردیش اس وقت بھی موجود تھے۔ انہوں نے اللہ اللہ کی صدائیں لگانا شروع کر دیں۔

آپ نے فرمایا۔ ”دیکھو مجھے وہ بلار ہے ہیں۔“

امیر نے روکنے کی بڑی کوشش کی لیکن آپ نہیں رکے اور باہر نکل کر درویشوں کے ساتھ چل دیے۔

☆☆☆

قریب سرائے کا رئیس آپ کا بے حد معتقد تھا۔ شیخ محمد جب قریہ سرائے جاتے، یہ رئیس چوبیس گھنٹے کی حاضری دیتا۔ آپ بھی اس پر بڑی شفقت فرماتے۔ اس رئیس کو ہر طرح کا طمینان حاصل تھا مگر ایک کاٹا ایسا بھی تھا جو ہر وقت چسپاں رہتا۔ رئیس کا بیڑا سیل علی سخت نافرمان تھا۔ شراب اس کی گھٹی میں پڑی تھی، جوئے کا وہ رسا تھا۔ دنیا بھر کی برائیاں اس میں جمع ہوئی تھیں۔ نیکی اور بھلائی سے اسے چڑھتی۔ باپ سمجھاتے سمجھاتے تنگ آچکا تھا۔ رئیس نے سوچا کہ اگر اس کو شیخ محمد کی خدمت میں پہنچا دیا جائے تو شاید ان کی محبت کچھ اثر کر جائے اور یہ سدھر جائے۔ لیکن سیل علی کا یہ حال تھا کہ اسے درویشوں کے ذکر سے چڑھتی۔ جب بھی ذکر فرماتا وہ اٹھ کر باہر چلا جاتا۔

ایک بار آپ کا قریہ سرائے میں قیام ہوا اور رئیس بھی ان کی خدمت میں پہنچا تو آپ نے رئیس کے چہرے سے اس کی پریشانی محسوس فرمائی، پوچھا۔ ”کیا بات ہے تو پریشان کیوں ہے؟“

رئیس نے جواب دیا۔ ”حضرت! کیا عرض کروں مجھے میرے بیٹے نے بہت پریشان کر رکھا ہے۔“

آپ نے پوچھا۔ ”کیوں، وہ کیا کہتا ہے؟“

رئیس نے جواب دیا۔ ”حضرت! وہ کہتا کو کچھ بھی نہیں، لیکن دنیا کی حقیقی بھی برائیاں ہیں اس میں موجود ہیں۔ میں تو اس کے ذکر تک میں تکلیف محسوس کر رہا ہوں۔“

آپ نے فرمایا۔ ”زیادہ فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں اس کو میرے پاس لے آؤ۔“

رئیس نے کہا۔ ”میں اس کو آپ کے پاس کس طرح لے آؤں، وہ تو نیکی کے ذکر سے بھاگتا ہے۔“

آپ نے فرمایا۔ ”جاؤ اس سے کہو، میں اس کو یاد کر رہا ہوں وہ نہیں بھاگے گا۔ میرے پاس ضرور آئے گا۔“

رئیس نے بے دلی سے عرض کیا۔ ”آپ فرماتے ہیں تو کہہ دوں گا لیکن مجھے یقین نہیں کہ وہ یہاں تک آج بھی جائے گا کیونکہ میں بارہا کہہ چکا ہوں اور اس نے ہر بار انکار کیا ہے۔“

آپ نے نرمی سے فرمایا۔ ”چلو ایک بار اور سنا۔ اس میں ہرج ہی کیا ہے؟“

رئیس امید و بیم میں گھر پہنچا، اس کا لڑکا سیل علی نہیں جانے کے لیے بنا سنورا کھڑا تھا۔ رئیس نے جاتے ہی پوچھا۔ ”کہاں چلے؟“

سیل علی نے مذاق میں جواب دیا۔ ”آپ کے پیرو مشفق محمد کے پاس۔“

باپ کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ بڑی تنبیہ کی سے جواب دیا۔ ”ہاں جیل، کیونکہ تجھے شیخ صاحب نے یاد فرمایا ہے میں تجھ کو لینے آیا ہوں۔“

سیل علی نے جو بات غیر ارادی طور پر مذاق میں کہیں تھی اب وہ بخیرہ ہو چکی تھی۔ اس نے بڑی کوشش کی کہ باپ سے کہہ دے کہ یہ تو میں نے مذاق میں کہا تھا۔ میں نہیں جاؤں گا لیکن وہ نہیں کہہ سکا اور خود کو باپ کے ساتھ جانے پر مجبور محسوس کرنے لگا، آہستہ سے بولا۔

”میں تیار ہوں، چلیے!“

رئیس حیرت زدہ، اپنے لڑکے کو لے کر روانہ ہو گیا۔ شیخ کی یہ کہی کرامت تھی؟ ماورائے عقل، بالائے خرد، ترازو و ہم و گمان۔ وہ اپنے بیٹے کے ساتھ شیخ محمد کی خدمت میں پہنچ گیا، وہاں اور بہت سے لوگ بھی موجود تھے۔ آپ نے اس وقت تو سیل علی پر کوئی توجہ نہ دی۔ دوسرے افراد سے باتیں کرتے رہے۔ لیکن ایک بار آپ اچانک اپنی جگہ سے اٹھے اور سیل علی کے پاس پہنچ گئے، پوچھا۔ ”میاں

آپ نے فرمایا۔ ”تو چلو، میں چلتا ہوں۔ دیکھتا ہوں اسے کیا تیاری ہے اور وہ کیوں نہیں اچھا ہوتا۔“
آپ اس شخص کے ساتھ قصر میں داخل ہو گئے۔ اس شخص نے انہیں بیمار امیر کے سر پر لٹا کر دیا۔ امیر کی آنکھوں میں حسرت و اس... اور مجبوری کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ اس نے اپنے سر پر ایک درویش کو کھڑے دیکھا تو دل بھر آیا اور آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے
آپ نے پوچھا۔ ”تیرا کیا حال ہے؟“

امیر نے گلوگیر آواز میں جواب دیا۔ ”اللہ کے شکر کے سوا کیا عرض کروں، اگر وہ اسی مرض میں اٹھنا چاہتا ہے تو میں راضی بردشاے الہی ہوں۔“

آپ نے پوچھا۔ ”کیا تو صحت یاب ہونا چاہتا ہے؟“

امیر نے جواب دیا۔ ”آپ سے رجوع کرنے کا اور کیا مطلب ہو سکتا ہے؟“

آپ نے فرمایا۔ ”خدا کی راہ میں کچھ دینا پڑے گا!“

امیر نے کہا۔ ”آپ جو فرمائیں، حاضر کروں گا۔“

آپ نے سکوت فرمایا اور کچھ دیر خاموش رہ کر کہا۔ ”فی الحال ایک ہزار روپے فراہم کر دے۔“

امیر نے حکم دیا اور اسی وقت ایک ہزار روپے آپ کے حوالے کر دیا۔ آپ نے ملازم سے کہا۔ ”جا اور اعلان کر دے کہ حاجت مندوں کی ضرورتیں پوری کی جائیں گی، امیر کے دروازے پر جمع ہوجائیں۔“

ملازم نے اسی وقت بازاروں اور گلی کوچوں میں یہ اعلان کر دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے حاجت مندوں کا مجمع لگ گیا۔ آپ نے یہ روپیہ ان میں تقسیم کر دیا۔ لیکن یہ رقم ناقابل ریفی اور حاجت مندوں کا جہوم پھر بھی موجود رہا۔

آپ اندر امیر کے پاس گئے اور پوچھا۔ ”اب تیرا کیا حال ہے؟“

اس نے جواب دیا۔ ”کوئی افادہ نہیں ہوا، میرا بیٹ پھولتا جا رہا ہے۔“

آپ نے فرمایا۔ ”تب پھر ایک ہزار روپے اور دلوا دے۔“

امیر نے کہا۔ ”یہ کوئی بڑی بات ہے ابھی لیجیے۔“

اس کے بعد اس نے ایک ہزار روپے اور دلوا دیے۔ آپ نے یہ روپے بھی ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیے اور اندر جا کر مریض سے دریافت کیا۔ ”کچھ افادہ ہوا؟“

امیر نے کہا۔ ”جواب دیا۔“ کوئی افادہ نہیں ہوا۔“

آپ نے فرمایا۔ ”تب پھر ایک مصلیٰ لایا جائے۔“

خدمت گار نے اسی وقت مصلیٰ آپ کے حوالے کر دیا۔ آپ اس پر بیٹھ کر دعا گو ہوئے۔ ”اے میرے رب! میں نے اس بیمار سے دو ہزار روپے لے کر فرمایا، میں تقسیم کر دیے۔ میرا خیال تھا اس کے اثر سے امیر کے مرض میں کمی واقع ہو جائے گی لیکن اس کا مرض جوں کا توں موجود ہے۔ اب میں اس سے روپے بھی نہیں مانگ سکتا۔ کیونکہ مجھے مانگتے ہوئے شرم محسوس ہو رہی ہے تو یہ میری شرم کی لاج رکھ لے اور اس شخص کو صحت یاب کر دے۔ میں اس وقت تک اس مصلیٰ سے نہیں اٹھوں گا جب تک کہ یہ صحت یاب نہ ہو جائے گا۔“

آپ سجدے میں گر گئے اور بخیرہ گاہ کو رو کر تر کر دیا۔

امیر کو اپنے بیٹ سے کوئی شے نیچے رہتی ہوئی محسوس ہوئی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے پیشاب کی دھار جاری ہو گئی اور وہ خوشی سے چیخ پڑا۔ ”ہوا، ہوا، اثر ہوا، حضرت مرشد آپ کی دعا کا اثر ہو گیا۔ آہ اب میں صحت یاب ہو جاؤں گا، اب میں اچھا ہو جاؤں گا۔“

آپ نے اس کی آواز سنی اور یہ دستور سجدے میں پڑے رہے، سر نہیں اٹھایا۔

کچھ دیر بعد وہ بالکل صبح ہو گیا۔ گھر والوں کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ پورا قصر خوشیوں سے جگمگا اٹھا۔ خدمت گار آپ کے پیچھے بیٹھ گیا اور نہایت ادب سے عرض کیا۔ ”حضرت! آپ کی دعا قبول ہو گئی، خدا نے آپ کی اس لی، سجدے سے سر اٹھائیے!“

کچھ توقف کے بعد آپ نے سر اٹھایا اور یہ منظر بھی نے دیکھا کہ آپ کا چہرہ رونے کی وجہ سے سرخ ہو گیا تھا اور آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔

امیر کو برسر سے اٹھا کر غسل خانے پہنچا دیا گیا۔ اس نے غسل کیا اور لباس بدل کر آپ کے پاس لایا گیا۔ آپ نے پوچھا۔ ”اب تیرا کیا حال ہے؟“

سید علی نے سامان سفر تیار کیا اور کابل روانہ ہو گیا۔ کابل میں سید علی کو ایک سال گزار گیا۔ عبادت و ریاضت اور شیخ کے حضور نے ہر برائی کو مغلوب کر رکھا تھا۔ کبھی بھی اگر کوئی برائی ذرا سا سر اٹھاتی تو سید علی لاجل پڑھ کر اس پر غلبہ حاصل کر لیتا لیکن ایک سال بعد سید علی کے خیالوں میں عورت آنے لگی۔ اس بھوک نے پہلے تو کسی وقت تھوڑا بہت ستایا اور سید علی نے لاجل کے وارے سے اس کو زیر کر لیا۔ پھر کچھ ہی دیر بعد عورت کی خواہش پھر بیدار ہو جاتی۔ کسی خطرناک اور سرخ الاثر مرض کی طرح پہلے تو یہ خیال وقفہ وقفہ سے آتا رہا لیکن اس کے بعد آہستہ آہستہ اس نے پوری طرح قبضہ چھالیا۔ اور ذہن و دل پر عورت ہی چھا جی۔ سید علی کی پریشانی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ ابھی عورت ذہن و دل پر مستور ہی تھی کہ ایک حسین ترین نوجوان لڑکی سید علی سے ملاقات بھی ہو گئی۔ اس لڑکی کا باپ کوئی ہندوستانی تاجر تھا جو اسے اور اس کی ماں کو چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ اس کی ماں کا چند ماہ جو شیر انتقال ہو گیا تھا۔ اس لڑکی کو جب یہ معلوم ہوا کہ ایک ہندوستانی مسلمان تاجر کابل آیا ہوا ہے اور وہ کام تم کر کے ہندوستان واپس چلا جائے گا تو اس نے سید علی سے اپنے سلسلے میں مدد چاہی۔ لڑکی کی خواہش تھی کہ اسے ہندوستان میں اس کے باپ کے پاس پہنچا دیا جائے۔

لڑکی اتنی حسین اور شاباب میں جوڑھی کہ سید علی اس کو دیکھ کر کانپ گیا اور گناہ کی خواہش طوفان کی طرح سرکشی دکھانے لگی۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور جواب دیا۔ ”لڑکی میں تیرے باپ کو ہندوستان میں کہاں ڈھونڈتا پھر لو گا۔ اگر اس کا کوئی پتا نشان ہوتا تو میں تیری مدد ضرور کرتا۔“

لڑکی نے سید علی کے دونوں شانے پکڑ لیے اور بھجوز کر کہا۔ ”یہ تم نے اپنی آنکھیں کیوں بند کر لیں؟ میں یوں تو نہیں مانوں گی کہ تمہیں ایک مسلمان کے ساتھ میرا ساتھ دینا پڑے گا۔“

سید علی نے ہمت کی اور آنکھیں کھول دیں۔ لیکن جیسے ہی لڑکی پر نظر پڑی، تمام شیطانی خواہش عود کر آئیں، اس نے ٹالنے کی غرض سے کہا۔ ”لڑکی! اس وقت تو تو بچی جا، پھر کسی وقت آ جانا۔ میں سوچ کر جواب دوں گا۔“

لڑکی تن کر کھڑی ہو گئی، بولی۔ ”لیکن یہ تو بتاؤ کہ میں جاؤں تو کہاں؟ میرا کوئی ٹھکانہ بھی تو نہیں۔“

سید علی نے جواب دیا۔ ”اب میں کیا بتاؤں کہ تم کہاں جاؤ، کبھی بھی جاؤ لیکن یہاں سے چلی جاؤ۔“

لڑکی نے خوشی سے مسکرا کر کہا۔ ”میں یہاں سے نہیں جاؤں گی کیونکہ میں تم پر تو اعتبار کر سکتی ہوں گی اور تم نہیں۔“

سید علی نے ایک بار پھر لڑکی کے سراپا کا جائزہ لیا اور منہ میں پانی بھر آیا، کہا۔ ”لڑکی! تم ایک بار پھر غور کرو، کہیں اور ٹھکانہ نہ کرلو تو بہتر ہے ورنہ پھر میرے ہی پاس رہ جانا۔“

لڑکی نے جواب دیا۔ ”میں کہیں اور ٹھکانہ نہیں کر سکتی۔ مجھے چند دن تمہارے ہی پاس رہنا ہے، تم مانو یا نہ مانو۔ میں زبردستی رہ پڑوں گی۔“

سید علی میں فیصلیت بیدار ہو گئی، بولا۔ ”بہتر ہے تم میرے ہی پاس رہ جاؤ، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن اس کا خاص خیال رکھنا کہ میں زیادہ بے تکلف ہونا پسند نہیں کرتا۔“

لڑکی نے جواب دیا۔ ”میں نہیں جانتی کہ زیادہ بے تکلفی سے آپ کی کیا مراد ہے؟ ویسے میں کیا کوئی بھی لڑکی پہل کرنا پسند نہیں کرتی، یہ مرد ہی ہے جو اسے درغلا تا اور گمراہ کرتا ہے۔“

سید علی نے کہا۔ ”لیکن میں دھرم نہیں ہوں جو عورتوں اور لڑکیوں کو درغلا کرتے ہیں۔ میں نے اپنے مرشد سے عہد کیا تھا کہ میں برائیوں کے پاس نہیں جاؤں گا۔ مجھے اپنا یہ وعدہ ہر قیمت پر پورا کرنا ہے۔“

لڑکی نے خوشی سے پوچھا۔ ”میں کہاں رہوں؟ کس کمرے میں؟“

سید علی نے اپنے کمرے سے ملحق کمرے میں لڑکی کو بٹھرایا۔

رات کو سید علی نے بڑی پریشانی محسوس کی۔ اس کی نظریں بار بار لڑکی کے کمرے کی طرف اٹھ جاتی تھیں جو دوسری طرف سے بند تھا۔ کئی بار میں آیا کہ دروازے پر دستک دی جائے لیکن پھر معلوم نہیں کیا سوچ کر ایسا نہیں کیا۔

رات کا پچھلا پہر آ گیا، مگر سید علی کو نیند نہیں آئی، اس کی بڑی بری حالت تھی۔ سید علی نے مصلیٰ پچھایا اور جلدی جلدی دوڑ کر کتیں پڑھ کر سجدے میں گر گیا۔ وہ گڑگڑا ہوا تھا۔ ”اے میرے مولیٰ! تو نے مجھے یہ کس آزمائش میں ڈال دیا؟ میں اس سے کس طرح نکلوں؟ میری مدد کر، کیونکہ تیری مدد کے بغیر اگے سے اس دریا کو عبور کرنا ناممکن ہے۔“

وہ سجدے میں پڑا اور ہاتھ اور گڑگڑا ہوا تھا کہ کسی نے اس کی پشت پر ہاتھ رکھ دیا اور بڑی نرمی سے پوچھا۔ ”کیا بات ہے؟ یہ رونا

صاحبزادے، اب ہم اسے برے ہیں کہ تمہیں ہمارا ذکر تک پہنچیں۔“

سید علی نے شرمندگی سے جواب دیا۔ ”نہیں! ایسی تو کوئی بات نہیں۔ آپ کو برا کون کہہ سکتا ہے۔“

آپ نے فرمایا۔ ”پھر کیا وجہ ہے کہ تمہیں میرے پاس لانے کی کوشش کی جاتی ہے اور تم ادھر ادھر بھاگنے کی سوچنے لگتے ہو۔ آخر جب میں نے تمہیں زبردستی پکڑ کر بلوایا تو تم آگے، ورنہ شاید آج بھی نہ آتے۔“

باپ کو خدشہ تھا کہ کہیں نالائق بیٹا شیخ سے گستاخی سے نہ پیش آئے لیکن کوئی بھی بنا دیکھا تو سرتاجت میں ڈوبا رہا۔ بیٹا سید علی شیخ کو جواب دے رہا تھا۔ ”حضرت! آپ نے جیسے ہی یا د فرمایا میں حاضر ہو گیا۔ مجھ سے ایسی گستاخی کبھی نہیں ہوئی کہ آپ نے یا د فرمایا ہو اور میں نے نال معلول سے کام کیا ہو۔“

شیخ نے پوچھا۔ ”اچھا بتاؤ! کاب تک تم کہاں تھے اور کہاں ٹوکر ہو؟“

سید علی کے پاس ان سوالوں کا کوئی جواب نہ تھا۔ اس نے اپنے اندر ایک انقلاب محسوس کیا۔ وہ تھوڑی دیر خاموش کچھ سوچتا رہا۔

آپ نے پھر پوچھا۔ ”ہاں سید علی تم نے میرے سوالوں کا کوئی جواب نہیں دیا!“

سید علی اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور نظریں جھکا کر جواب دیا۔ ”میں آپ کے سوالوں کا جواب واپس آ کے دوں گا۔ آپ ذرا توقف فرمائیں۔“

وہ غصے اور جوش میں محفل سے نکل گیا۔ گھر پہنچا، شراب بہادی، آلات سے کئی توڑ دیے۔ محفل خانے میں گیا۔ محفل کیا اور لباس تبدیل کیا۔ اس کے بعد دوبارہ محفل چھدی محفل میں پہنچ گیا۔ اور پوچھا۔ ”ہاں جناب شیخ! آپ نے مجھ سے کیا پوچھا تھا؟“

شیخ نے اپنا سوال دہرایا۔ ”اب تک تم کہاں تھے اور کہاں ٹوکر ہو؟“

سید علی نے جواب دیا۔ ”اب تک میں جہاں کہیں بھی تھا روانے زمانہ اور بدنام عصر تھا لیکن اب آپ کا ٹوکر ہوں جیسا حکم دیں گے بچاؤں گا میں نے شراب بہادی اور آلات سے کئی توڑ دیے۔ میں نے محفل کیا اور ساری ضیافت پانی میں بہادی۔ میں نے اپنا پرانا لباس اتار کر چھینک دیا اور اب یہ نیا لباس پہن کر آ گیا ہوں اور آپ سے عہد کرتا ہوں کہ اس لباس کی عزت اور حرمت کا ہمیشہ خیال رکھوں گا۔“

شیخ غصے سے مسکرا کر سید علی کے باپ کی طرف دیکھا جسے ان تبدیلیوں اور اعلانات پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ یہ کیا انقلاب تھا جو اتنی آسانی سے آگیا تھا۔ سید علی نے اس محفل میں آپ کے ہاتھ پر بیعت کی اور آپ کی محبت میں من و شام گزارنے لگا۔

کچھ عرصہ بعد سید علی کو کاروبار کے سلسلے میں کابل جانے کا منصوبہ بنانا پڑا۔ پہلے تو وہ اس کو ٹال رہا لیکن جب مجبور ہو گیا تو آپ سے عرض کیا۔ ”میرا مشا میری پوری کوشش تھی کہ اپنی پوری زندگی آپ کی محبت اور عہد میں گزار دوں لیکن ایک اہم ضرورت سے کابل کا سفر درپیش ہے۔ اگر آپ اجازت دیں گے تو چلا جاؤں گا ورنہ نال دوں گا۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”تم کابل ضرور جاؤ لیکن اپنا عہد یاد رکھنا کہ تم نے برائیوں سے توبہ کر لی ہے اور اب ان سے بچتے رہو گے۔“

سید علی نے عرض کیا۔ ”حضرت! میں نے جو بیعت کی ہے اور آپ سے جو عہد کیا ہے اس پر زندگی کے آخری لمحوں تک قائم اور پابند رہوں گا یہ میرا کرم و عہد ہے۔“

شیخ نے فرمایا۔ ”جواب میں میں ایک شعر سناتا ہوں اس کو لکھ لو اور ہمیشہ یاد رکھنا۔“ اس کے بعد آپ نے فارسی کا شبود شعر سنایا۔

گردبینی چو بائنی پیش منی
در پیش منی چوے منی دربینی

(چاہے تم بین میں رہو لیکن مجھے اپنے ساتھ رکھو یہ یوں ہے جیسے تم میرے سامنے ہو اور اگر تم میرے ساتھ بھی رہو مگر میرے تصور کے بغیر رہو تو یہ ایسا ہے جیسے تم بین میں ہو)

شعر سن کر پوچھا۔ ”کیا تم میرا مطلب سمجھ گئے۔“

سید علی نے کہا۔ ”اللہ نے چاہا تو آپ میرے ساتھ ہی رہیں گے، چاہے میں کابل میں رہوں، کاشغریں رہوں یا خراسان اور ماوراء النہر میں۔“

آپ نے فرمایا۔ ”اور یہ وعدہ بھی کرو کہ میری موجودگی میں تم کوئی بری حرکت نہیں کرو گے؟“

سید علی نے جواب دیا۔ ”میں خدا کو حاضر ناظر جان کر آپ سے یہ عہد کرتا ہوں کہ آپ کی موجودگی اور عدم موجودگی میں، میں کوئی بری حرکت نہیں کروں گا۔“

آپ نے کابل جانے کی اجازت دے دی۔ ”اب تم کابل جا سکتے ہو۔“

کیسا؟ یہ پریشانی کس بات کی؟

سید علی نے لڑتے ہوئے سجدے سے سر اٹھایا اور اپنے سامنے لڑکی کو دیکھ کر بہت زیادہ پریشان ہوا، اس نے لڑکی کو ڈانٹ دیا۔
”لڑکی! یہ کیا تیزی ہے جب میں نے تجھے ایک الگ کمراد سے دیا ہے تو تیرا رات کی تاریکی میں میرے پاس آ جانا کیا معنی رکھتا ہے؟“
لڑکی نے جواب دیا۔ ”مجھے اس کمرے میں ڈر لگتا ہے میں وہاں اکیلی نہیں رہ سکتی میرے ساتھ کسی اور کو بھی رہنا پڑے گا۔“
سید علی کو طش آگیا، کہا۔ ”لڑکی! اب زیادہ تنگ نہ کر اور اسی وقت میرے کمرے سے نکل کر جہاں جی چاہے چلی جا، لیکن میرا پیچھا چھوڑ دے۔“

مگر لڑکی پر کسی بات کا اثر ہی نہیں ہو رہا تھا، اس نے بڑے اطمینان سے کہا۔ ”تم کچھ بھی کہو میں نہ تو اس کا برا مانوں گی اور نہ ہی کہیں اور جاؤں گی۔ میں کوئی احمق تو نہیں۔“

سید علی نے عاجز آ کر کہا۔ ”اچھا بابا تو یہیں میرے ہی مکان میں رہ لیکن اس وقت تو اپنے کمرے میں چلی جا کیونکہ اگر کسی نے یہاں دیکھ لیا تو معلوم نہیں کس غلط فہمی کا شکار ہو جائے۔“

لڑکی سید علی کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ اٹھلا کر بولی۔ ”میں نے کہہ جو دیا کہ میں تمہاں نہیں رہ سکتی۔ مجھ کو ڈر لگتا ہے۔ اب یا تو تم بھی میرے ہی کمرے میں چل کر آرام کرو۔ یا پھر مجھ کو اپنے کمرے میں سوجانے کی اجازت دے دو۔“

سید علی نے بڑی کمزور آواز میں کہا۔ ”یہ کسی خدا کر رہی ہے لڑکی، خدا کے لیے میرا پیچھا چھوڑ دے ورنہ میں صحرانوحہ کو نکل جاؤں گا۔“
لڑکی نے جواب دیا۔ ”اگر تم صحرانوحہ کو نکل جاؤ گے تو تمہارے پیچھے پیچھے میں بھی آ جاؤں گی کیونکہ میں نے تمہیہ کر لیا ہے کہ تمہارا ساتھ نہیں چھوڑوں گی۔“

سید علی ایک بار پھر ڈانٹوں ڈول ہو گیا، بولا۔ ”تو نے واقعی یہ فیصلہ کر لیا ہے تو میرا ساتھ نہیں چھوڑے گی۔“
لڑکی نے جواب دیا۔ ”میں نے یہ بات کہہ جو دی۔“

سید علی نے پوچھا۔ ”تو نے اپنی بات کے معانی اور مطلب پر بھی غور کیا؟“
لڑکی نے جواب دیا۔ ”میں جو بات کہتی ہوں پہلے اس پر اچھی طرح غور کر لیتی ہوں۔“

سید علی کو ان باتوں میں بڑا مزہ آ رہا تھا، پوچھا۔ ”تب پھر اپنی بات کے معانی اور مطلب مجھے بھی بتاؤ کہنا کیا چاہتی ہے؟“
لڑکی سید علی سے ہنسنے لگی، بولی۔ ”تم مجھ سے پوچھتے ہو کہ میں کیا چاہتی ہوں؟ میں بتاؤں کیا چاہتی ہوں؟ کیا تم واقعی اسے

بھولے بھالے ہو کہ میری بات کا مطلب نہیں سمجھ سکے یا موصوم بن کر دھوکا دے رہے ہو؟“
سید علی نے دور بیٹنے کی کوشش کی، کہا۔ ”لڑکی! تو میری بات پر یقین کر، میں تیری بات کا مطلب نہیں پاس۔“

لڑکی نے کالی کالی غمور آنکھوں سے دیکھا اور کہا۔ ”اے شخص! جب سے میں نے تمہیں دیکھا ہے، تمہیں اپنا لینے کی خواہش اپنے دل میں محسوس کر رہی ہوں۔ جیسے تم سدا کی اور بھولے پن کا اظہار کرتے ہو، میرا دل اور زیادہ مکمل ہو جاتا ہے۔“

سید علی کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی، حیرت سے پوچھا۔ ”لڑکی! یہ تو کیا کہہ رہی ہے؟“
لڑکی نے جواب دیا۔ ”میں نے جو کچھ کہا، اب بار بار نہیں دہراؤں گی۔“

سید علی نے مٹکی چھوڑ دیا اور لڑکی سے کہا۔ ”لڑکی! تو خدا کے لیے میرا پیچھا چھوڑ دے ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گا۔ میں تجھ سے جتنا

بھاگنا چاہتا ہوں تو اس قدر مجھ سے قریب ہوتی جا رہی ہے۔“
لڑکی اٹھلا کر اٹھی اور سید علی سے لگ کر کھڑی ہو گئی اور بولی۔ ”میں نے جو فیصلہ کر لیا، اب تم بھی بے جا نہ نہ کرو، ہندوستان

میں میرا باپ لے لے یا نہ لے، میں رہوں گی تمہارے ہی پاس۔“
سید علی پر جو مصیبت نازل ہوئی تھی وہ اس حجت کے مانند تھی جو اپنے کلین پر آگری ہو۔ کسی قدر پس و پیش سے کہا۔ ”لڑکی! مجھے تیری

بات منظور ہے، میں تیری خواہش کے مطابق تجھے اپنی بیوی بنالوں گا مگر یہ بات اس وقت تو ممکن نہیں۔ اب تو آرام کر، صبح یا کام کا قاعدہ انجام پا جائے گا۔“

لڑکی سید علی سے چٹ گئی، بولی۔ ”سچ؟ کیا تم نے میری بات مان لی؟“
سید علی نے جواب دیا۔ ”میں نے کہہ جو دیا۔“

لڑکی نے بے اختیار کی بو سے لیے اور کہا۔ ”آج میں اپنے خدا سے جو مانگتی مل جاتا۔ بہر حال اب تم میرے وہاں رہو تمہاری، ابھی

شدید مع محمد علی

اسی وقت سے۔“

سید علی تو پہلے ہی بے چین تھا، لڑکی کی رضامندی اور اجازت نے بالکل بے بس کر دیا۔ لیکن اسی وقت شیخ محمد کا خیال آگیا۔ اس نے لڑکی کے پاس سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”میں ابھی آیا تو میرا انتظار کر، مجھے حاجت محسوس ہو رہی ہے۔“

لڑکی نے اجازت دے دی۔ سید علی نے باہر نکل کر دروازے کو بند کر دیا اور باہر ہی سے یہ آواز بلند کہا۔ ”لڑکی، جو کام جاؤں طریقے پر ممکن ہے اس کو تمام کیوں کر دیا جائے۔ اب تو آرام کر کل صبح ملاقات ہوگی۔“

لڑکی کو بڑا غصہ آیا، پھر کر بولی۔ ”تم نے مجھے دھوکا دیا ہے یہ برا کیا۔ میں تمہیں سچا سمجھتی تھی۔ لیکن اب معلوم ہوا کہ تم مجھ سے بھی ہو۔ میں تم پر آئندہ اعتبار نہیں کروں گی۔“

سید علی نے باہر ہی سے جواب دیا۔ ”نہیں اعتبار کرتی تو نہ کر۔ لیکن میں نے اپنے شیخ سے یہ وعدہ کر رکھا ہے کہ میں منکرات سے باز رہوں گا، میں اپنے اس عہد کو ہمیشہ یاد رکھوں گا۔“

لڑکی نے ناگواری سے پوچھا۔ ”تمہارا راجہ کیوں ہے اور کہاں ہے، مجھے وہاں پہنچا دو۔ پھر میں دیکھوں گی کہ ان کا زہد و تقویٰ کدھر چلا گیا ہے، میں جس سے ایک بار مل لوں۔ وہ مجھ سے بار بار ملنے کی خواہش کرے گا۔“

سید علی نے تڑکی پر جواب دیا۔ ”ہوسکتا ہے تو اپنے دعوے میں سچی ہو لیکن میری مثال تیرے سامنے ہے۔ میں جس شیخ کا مرید ہوں۔ اس کے حکم کا پابند ہوں۔ اس نے مجھے یہ حکم دیا تھا کہ میں عورتوں سے بچوں گا چنانچہ میں بچ گیا۔ جس کے مرید کا یہ حال ہو اس کے شیخ کا کیا جواب۔“

لڑکی خاموش ہو گئی اور سید علی اپنے دوسرے کمرے میں بند ہو گیا۔

☆☆☆

لڑکی سید علی سے ناراض ہو گئی۔ وہ روشی روشی، دور دور رہی لیکن مکان نہیں چھوڑا۔ سید علی اسے جب بھی دیکھتا شوق کی تحریک شدت اختیار کر جاتی۔ لڑکی بھی بڑی بہتر منہ سمجھی، اب وہ بھی سید علی سے دور دورہ کر سید علی کی آتش شوق کو ہوا دے رہی تھی۔ لڑکی کا یہ ایسا خطرناک

حرب تھا کہ اس نے سید علی کو نہ کر لیا۔ اب سید علی کو یہ بے چینی تھی کہ لڑکی اس کو نظر انداز کیوں کر رہی ہے۔ کئی بار جی میں آئی کہ لڑکی کو دونوں شائوں سے بچ کر گرا دیا جائے اور پوچھا جائے کہ۔ ”اے لڑکی! تو اتنی مغرور کیوں ہو گئی ہے؟“

سید علی کو اس نے محسوس کیا کہ لڑکی اپنے کمرے سے اسے دیکھ رہی ہے لیکن جیسے سید علی سے نظریں نہ منہ پھیر کر سامنے سے ہٹ گئی۔
سید علی طش میں لڑکی کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے دروازے کو دھکا دیا لیکن وہ اندر سے بند تھا، سید علی نے غصے میں کہا۔ ”لڑکی! دروازہ کھولو؟“

لڑکی نے جواب دیا۔ ”سید علی! ادائیں جاؤ۔ میں دروازہ نہیں کھولوں گی۔“
سید علی نے دروازے کو زور سے دھکا دیا اور دمکی دی۔ ”اگر تو شرافت سے دروازہ نہیں کھولے گی تو میں دروازہ توڑ کر اندر آ جاؤں گا۔“

لڑکی نے جواب دیا۔ ”میں دروازہ نہیں کھولوں گی، چاہے تم دروازہ توڑ دو۔“
سید علی غصے میں پاگل ہو رہا تھا۔ اس نے زور زور سے دروازے کو جھینٹا شروع کر دیا۔ دروازے مل رہے تھے۔ بالکل اس طرح

گو یا دروازے نوٹ کر گر جائیں گے۔
کچھ دیر بعد دروازہ کھل گیا اور اندر سے لڑکی کا ہنسا مسکراتا ہوا چہرہ نمودار ہوا۔ وہ شوقی سے بولی۔ ”تم تو بلا کے شریر۔ اپنی مرضی پر تو

دروازے سے نکل توڑنے پر تیار ہو گئے اور جب میں بعد میں تو تم حاجت محسوس کرنے لگے تھے۔“
سید علی نے جواب دیا۔ ”اب اس کا ذکر چھوڑ دے، میں تیرے شاب اور حسن کا شیدائی اپنی آتش شوق کو جلد جلد بجھانا چاہتا ہوں

ادھر آ، میرے گلے سے لگ جا۔“
لڑکی نے شوقی سے کہا۔ ”اجی ایسی غلطی کرنا بھی نہیں، اپنے پیرومرشد سے پوچھ لیا نہیں۔“

سید علی جواب دیا۔ ”میں کسی سے بھی نہیں پوچھتا۔ کیونکہ میں اپنی مرضی کا مالک ہوں، جو میں آئے گا کروں گا پھر و مرشد کا میرے اعمال اور افعال سے کیا غلط؟“

لڑکی سید علی کے قریب آگئی۔ سید علی نے جیسے ہی..... غمراہ شوق میں نظریں اٹھائیں اور دروازے کی طرف دیکھا کہ وہ بند ہے یا کھلا اس نے دروازے کے اندر اپنے پیرومرشد کو کھڑے دیکھا جو کلک غلیبہ والی انگلی کو بندھنی میں سے نکالے ہوئے منہ کر رہے تھے کہ خبردار کیا تو

آپ نے جواب دیا۔ ”نہیں ایسا نہیں ہوگا، تجھ کو ہمارے ساتھ ہی چلنا ہوگا۔“
میر عبد اللہ نے عاجزی سے کہا۔ ”حضرت! بخارانا تیرے کمر میں چلا تو پکڑا کے ڈھیر ہو جاؤں گا۔“
کسی دوسرے سرید نے کہا۔ ”میں ان کے لیے سواری کا انتظام کرتا ہوں۔“
آپ نے فرمایا۔ ”سواری کی کیا ضرورت ہے۔ ہم سب کے پاس سواری تو موجود ہے۔ اگر پیدل چلیں تو زیادہ بہتر ہے۔“
میر عبد اللہ نے عرض کیا۔ ”میں پیدل کس طرح چلوں گا مجھ سے تو گھوڑے کی پشت پر بیٹھا ہی نہیں جائے گا۔“
آپ نے فرمایا۔ ”لیکن انہیں سواری ملے گی کہاں؟ انہیں تو پیدل ہی چلنا پڑے گا۔“
مریدوں نے عرض کیا۔ ”ہم کوشش کرتے ہیں، شاید مل جائے۔“
وہ لوگ کافی دیر تک سواری کے لیے سرگرداں رہے لیکن ناکامی رہی، آخر واپس آ کر عرض کیا۔ ”سواری تو نہیں ملی۔ اب جیسا آپ فرمائیں۔“
آپ نے فرمایا۔ ”انہیں پیدل چلاؤ!“
میر عبد اللہ نے خوشامدی۔ ”حضرت! مجھے یہیں رہنے دیں، بعد میں آ جاؤں گا۔“
آپ نے جواب دیا۔ ”نہیں ہو سکتا۔ ہمیں ہمارے ساتھ ہی چلنا ہوگا۔“ آپ کے اصرار نے سب کو لا جواب اور خاموش کر دیا۔
آپ نے میر عبد اللہ سے فرمایا۔ ”عبد اللہ! آج میں تجھے ایک مزے کا ناشا دکھاؤں گا۔ بخارنے تجھے کمزور اور بے حال کر دیا ہے، تیرا تو کھڑا ہونا بھی مشکل ہے اس لیے میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ تجھ کو اپنے گھوڑے کے آگے رکھوں تاکہ میرا گھوڑا تیری رہنمائی میں اپنا سفر کرے۔“
میر عبد اللہ نے حیرت سے عرض کیا۔ ”میں آپ کے گھوڑے کے آگے پیدل چلوں ایسا آپ کیا فرما رہے ہیں؟“
آپ کی یہ بات بعض دوسرے مریدوں نے بھی سنی، ایک نے آہستہ سے کہا۔ ”آج شیخ یہ باتیں کسی کر رہے ہیں؟ کیا یہ مریدوں کو ہلاک کر دیتا چاہتے ہیں؟“
آپ نے بے آواز بلند فرمایا۔ ”حکم ربی یہی ہے اور اسی میں اس کے مرض کی شفا ہے۔“
میر عبد اللہ نے عرض کیا۔ ”شیخ کا حکم سر آنکھوں پر، میں پیدل چلنے پر تیار ہوں۔“
میر عبد اللہ نے بستر سے اٹھنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے، تقابض نے انہیں بالکل بے بس اور مجبور کر دیا تھا۔
آپ نے میر عبد اللہ کو سہارا دیا۔ اور بے مشکل اپنے گھوڑے کے سامنے کھڑا کر دیا۔ پھر اپنے گھوڑے کی طرف واپس آتے ہوئے فرمایا۔
”عبد اللہ، میں جیسے ہی کہوں چلو، تم سب چل پڑنا اور میر عبد اللہ تمہارا قدم سب سے پہلے اٹھے گا۔“
آپ اپنے گھوڑے پر بیٹھ چکے۔ ”تو میر عبد اللہ کو حکم دیا۔“ ”ہاں عبد اللہ! اب کوچ ہونا چاہیے۔“
میر عبد اللہ نے اپنے پاؤں اٹھائے تو ابھی انہوں نے چلنے کی کوئی خاص کوشش نہیں کی تھی کہ پاؤں خود بخود اٹھنے لگے۔ عبد اللہ نے پہلے ہی مرحلے پر تیز چلنے کا معیار قائم کر دیا۔ مریدوں کو حیرت ہو رہی تھی کہ جو شخص بیماری اور بخار کی شدت کی وجہ سے کھڑے ہونے کی طاقت بھی نہ رکھتا تھا، وہ گھوڑے کے آگے آگے چل سکتا تھا۔
کسی سرید نے پوچھا۔ ”عبد اللہ! کیا حال ہے؟ طبیعت کیسی ہے؟“
میر عبد اللہ نے جواب دیا۔ ”مکڑوری رخصت ہو گئی، بخار بھی جاتا رہا، اب میں خود کو اتنا محسوس کر رہا ہوں۔“
میر عبد اللہ نے چلنے میں گھوڑے کی رفتار کو پیچھے چھوڑ دیا۔ جب یہ لوگ منزل مقصود پر پہنچے تو میری عبد اللہ بالکل صحت یاب ہو چکے تھے۔ شیخ نے مریدوں کو تحفہ دیکھ کر فرمایا۔ ”میں جانتا تھا کہ اس بخار کا علاج ہی یہ ہے کہ میر عبد اللہ میرے گھوڑے کے آگے آگے پیدل چلے۔“
لیکن مریدوں کو اس پر یقین نہیں تھا۔ وہ جانتے تھے کہ اس میں شیخ محمد کی دعائیں شامل ہیں۔
آپ نے مریدوں کو کھنکھایا کہ وہ ذکر و فکر میں مشغول ہونے والے ہیں کسی کو جگرے میں نہ آنے دیا جائے۔ لیکن آپ نے جیسے ہی حجرے کا دروازہ اندر سے بند کیا، ایک شخص دروازے سے کھینچا ہوا گیا۔ اور مریدوں سے کہا۔ ”شیخ سے کہو، تمہارے چچا کا بیٹا عبد الوہاب تم سے ملنا چاہتا ہے۔“
مریدوں نے جواب دیا۔ ”لیکن ہم اس وقت اندر نہیں جاسکتے، مجبوری ہے!“
چچا کا بیٹا عبد الوہاب مشغول ہو گیا۔ ”کیا مجبوری ہے، میں گھر سے بے گھر ہوا جا رہا ہوں اور تم لوگ مجھے میرے بھائی سے ملنے نہیں دیتے۔“

نے مجھ سے یہ عہد نہیں کیا تھا کہ تو برائیوں سے بہرہ ریز رہے گا لیکن اب میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ تو میری پروا کے بغیر مانی کیے جا رہا ہے۔
اس کے بعد مرشد نے فارسی کا شعر پڑھا جس کا مفہوم تھا۔
”چاہے تم مین میں رہو لیکن مجھے تم اپنے ساتھ رکھو، تو یہ یوں ہے جیسے تم میرے سامنے ہو، اور اگر میرے ساتھ بھی رہو مگر میرے تصور کے بغیر رہو تو یہ ایسا ہے جیسے تم مین میں رہو۔“
سید علی کا پ گیا اور لڑکی کو ایک طرف دھکیل دیا۔ اس نے آنکھیں میاڑ میاڑ کر شیخ کی طرف دیکھا۔ شیخ بہ دستور موجود اسے منع کر رہے تھے۔ آخر سید علی لڑکی کو چھوڑ کر باہر نکل گیا۔ اس کا نشہ نفسانی اور خواہش شہوانی یکسر معدوم ہو چکی تھی۔ عورت کے خیال میں کوئی مزہ نہ رہا تھا۔ لڑکی کا تصور پیکا اور بے مزہ ہو گیا تھا۔ گھنٹوں کی آوارہ گردی کے بعد جب وہ گھر میں واپس آیا تو اس نے پہلا کام یہ کیا کہ لڑکی کو ذلیل و خوار کر کے باہر نکال دیا۔ اس کے بعد سید علی تین چار سال تک کامل میں رہا لیکن ہمیشہ یہی محسوس کرتا رہا کہ وہ رجولیت سے محروم ہو چکا ہے لیکن جب وہ ہندوستان واپس گیا اور اپنی بیوی کے پاس گیا تو عورت کی خواہش بڑی شدت سے ابھری اور وہ برسوں کے بھوکے کی طرح بیوی کی آغوش میں دیک کر چھپ گیا۔

☆☆☆

شیخ محمد کے ایک مرید سید برہان بخاری آپ کی خصوصی توجہ میں رہتے تھے، ہر روز حاضری دیتے اور جب آپ اجازت دیتے چلے جاتے۔ سید برہان بخاری بھی جب تک آپ کی زیارت نہ کر لیتے، سکون نہ ملتا۔ مریدوں کو سامنے بٹھا کر آپ وعظ و تلقین میں مشغول ہو جاتے۔ ایک دن شیخ نے سید برہان بخاری کو مجلس میں نہیں دیکھا تو بے چین ہو گئے۔ مریدوں سے پوچھا۔ ”کیا بات ہے، آج سید برہان بخاری نہیں نظر آ رہے، کہاں رہ گئے؟“
ایک سرید نے جواب دیا۔ ”حضرت! برہان بخاری بڑی تکلیف میں ہیں۔ آج صبح میں ان کے پاس گیا تھا۔ اس وقت ان کے پاس کئی معالج میں مشغول تھے۔“
شیخ نے پوچھا۔ ”اسے تکلیف کیا ہے؟“
مرید نے جواب دیا۔ ”سکھانے در وقتوں میں تشنہ کیا ہے!“
شیخ نے بہت افسوس کیا اور فرمایا۔ ”ہم اسے دیکھنے جائیں گے، ہم سے جو ہو سکا ضرور کریں گے۔“
اس دن شام کو آپ برہان بخاری کے گھر تشریف لے گئے اطباء نے فیون دے کر مدد کر دیا تھا۔ آپ نے برہان بخاری کے پاس بیٹھ کر دریافت کیا۔ ”بخاری! کیا حال ہے؟“
بخاری نے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی لیکن وہ نیم وا ہو کر رہ گئیں۔ انہیں ایسا لگا جیسے بڑی دور سے آواز آرہی ہو، وہ کوئی جواب نہ دے سکے، آپ نے پھر پوچھا۔ ”بخاری! کچھ بتاؤ تو کسی کیا حال ہے؟ درد کس جگہ ہوتا ہے؟“
بخاری پھر کوئی جواب نہ دے سکے۔ گھر کے کسی بیمار دار نے جواب دیا۔ ”جناب شیخ! انہیں درد قوی اٹھا تھا۔ اس نے انہیں ہلان کر ڈالا ہے۔ اطباء علاج سے عاجز آ چکے ہیں مجھ میں نہیں آتا کیا علاج کیا جائے؟“
آپ برہان بخاری کے سر ہانے بیٹھ گئے اور فرمایا۔ ”ذرا در خاموش رہو اس کا مرض سب کے لیے تھا۔“
آپ نے آنکھیں بند کر لیں اور کچھ پڑھ پڑھ کر اپنا دماغ تھکا۔ پورے جسم پر پھیرتے رہے۔ تقریباً نصف پون گھنٹا اس طرح کرتے رہے، درد کے خاتمے پر آپ نے فرمایا۔ ”میں نے اس درد کو سب کر لیا ہے۔ اللہ نے چاہا تو اب بھی مجھے یہ درد نہیں اٹھنے گا۔“
آپ ذرا دیر اور کے اس کے بعد چلے آئے۔ دوسرے دن علی الصبح برہان بخاری نے آپ کی خاتہ میں حاضری دی، اب وہ بالکل صحت یاب ہو چکے تھے۔ برہان بخاری نے شیخ کا شکر یہ ادا کرتے ہوئے کہا۔ ”حضرت! میں زندگی بھر آپ کا یہ کرم نہیں بھلا سکتا۔“
آپ نے جواب دیا۔ ”برہان بخاری! جب میں نے مرآتے میں تیرے جسم میں مرض کی مدت دیکھی تو وہ تازہ زندگی نظر آیا۔ چنانچہ میں نے اس کو اپنی زندگی میں داخل کر لیا اور تجھے اس سے محفوظ کر دیا۔“
اس واقعے کے بعد درد قوی بھی ابھی آپ کو پریشان کرنے لگا۔ میر عبد اللہ آپ کے مرید ہی نہیں، دوست بھی تھے اور یہی وہ شخص تھے جس نے برہان بخاری کی بیماری کی اطلاع آپ کو دی تھی۔
آپ ان کے ساتھ سفر کر رہے تھے۔ منزل پر پہنچتے کے بعد میر عبد اللہ بخار میں مبتلا ہو گئے اور بخارنا تیز چڑھا کہ ان کی واپسی حال ہو گئی، انہوں نے شیخ سے کہہ دیا۔ ”حضرت! آپ میری وجہ سے کیوں رہیں، تشریف لے جائیں میں بعد میں آ جاؤں گا۔“

یہ آوازیں اندر بھی پہنچ گئیں۔ آپ نے جڑے کا درکھول دیا۔ پوچھا۔ ”کیا بات ہے عبدالوہاب؟ کیسے آہوا؟“
عبدالوہاب فوراً حجرے میں داخل ہو گیا اور گڑگڑا کر عرض کیا۔ ”بھائی صاحب! میں برباد ہو گیا، تباہ ہو گیا۔ میں کہیں کا بھی نہیں رہ گیا۔“

آپ نے فرمایا۔ ”ہوا کیا، یہ تو بتاؤ، کس نے برباد کر دیا، کیونکر تباہ ہو گئے؟“
عبدالوہاب کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے، کہا۔ ”بھائی صاحب! میں جس جگہ رہتا ہوں، اس کا رئیس رستم میری عدم موجودگی میں میرا امکان گرا دینا چاہتا ہے، میں اتنی جلدی گھر پہنچ نہیں سکتا۔ آپ ہی بتائیں میں کیا کروں؟“
آپ نے فرمایا۔ ”واقعی یہ تو بڑی نامناسب بات ہے، رستم میرے بھائی کا مکان گرا دے، یہ نہیں ہو سکتا۔ جنگ وجدل تو ہم فقراء کا شیوہ نہیں البتہ میں دیکھتا ہوں کہ وہ جائے موقع پر کس طرح پہنچتا ہے، میں اسے پہنچنے ہی نہیں دوں گا۔“
ادھر آپ یہ فرمایا رہے تھے، دوسری طرف رئیس رستم کے لشکر میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ اور وہ لوگ آپس میں ہی لڑ پڑے، اس علاقے کے عامل کا بھائی اس تنازعے میں مارا گیا اور مواخذے میں رستم گرفتار کر لیا گیا اور بالآخر تھانے میں ہی جاں بحق ہوا۔ اپنے آخری دنوں میں فرمایا۔ ”لوگو، مجھے خدا نے اتنا زیادہ کمال عطا فرمایا ہے کہ میں اگر چاہوں تو میں یہاں سے بے پلے بغیر متمثل ہو کر دنیا کے دوسرے کنارے پہنچ جاؤں۔“

پاس ہی ایک عمر رسیدہ خاتون بیٹھی تھی۔ آپ کی بات سن کر بولی۔ ”شیخ صاحب! اس وقت جو چاہو کہ لو لیکن ان باتوں کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں، مرنے کے بعد کوئی کس طرح متمثل ہو سکتا ہے۔ اگر میں مر گئی تو آپ میری مدد ضرور کیجئے اور اگر مجھ سے پہلے آپ چلے گئے تو متمثل ہو کر آپے کا اور میں دیکھوں گی کہ میں نے آپ کو پہچانا بھی یا نہیں۔“
اس بات کو ایک عرصہ گزر گیا۔ آپ 8 جمادی الاول 1225ھ میں وصال ہو گیا۔ عورت کو آپ کا وعدہ یاد تھا۔ اس نے آپ کا انتظار شروع کر دیا۔ لیکن آپ نہیں پہنچے۔ اسی انتظار میں وہ بیمار پڑ گئی، جب لرزہ نے اس کی حالت خراب کر دی۔ رات ہوئی تو اس تنہا عورت کو یہ فکروں میں گم ہوئی کہ اس کی تیار داری کون کرے گا۔ اس دن گھر میں کوئی دیا جلانے والا بھی نہ تھا، عورت کراہ رہی تھی اور اندر سے گھر میں آنکھیں کھولے کچھ دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ رات کو کچھلے پیر اس کو پیاس محسوس ہوئی لیکن اس میں اٹھنے کی طاقت ہی نہیں تھی۔ ابھی پیاس تو تنگ کر رہی تھی کہ سردی لگنے لگی۔ لحاف پانچنی پڑا تھا لیکن اس میں اتنی بہت بھی نہ تھی کیسے اوڑھ ہی لیتی۔ آخر خیمہ غم دگی میں اس نے دیکھا، کوئی شخص دیار روشن کر رہا تھا۔ جب دیا جل گیا اور گھر میں روشنی ہوئی تو اس نے اس شخص کو پہچان لیا۔ یہ شیخ محمد تھے۔ دیا جلانے کے بعد وہ ایک پیالے میں پانی لے آئے اور عورت کو پیلا یا۔ اس کے بعد لحاف کو جسم پر ڈال دیا۔ کچھ دیر بعد جب عورت کی حالت تسکین تو اس نے لحاف الٹ دیا اور شیخ محمد کو دیکھنے کی کوشش کی مگر اب وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ شیخ محمد کے انتقال کے بعد شاہ ولی اللہ دہلوی کے والد نے ان کے حزار پر حاضری دی۔ اس وقت ان کے ساتھ دوسرے لوگ بھی تھے۔ شاہ عبدالرحیم والد شاہ ولی اللہ نے ساتھیوں کو حکم دیا کہ ذکر با الجہر کیا جائے۔ حکم کی دیر تھی کہ زور زور سے ذکر کیا جانے لگا۔ شاہ عبدالرحیم خود بھی اس میں شامل تھے۔

ذکر بالجہر سے فارغ ہونے کے بعد شاہ صاحب نے حاضرین سے فرمایا۔ ”حاضرین! ابھی ابھی میں نے کچھ دیکھا ہے، اگر اس کو ظاہر کروں تو تم سب حیران ہو جاؤ گے۔“

حاضرین میں سے چند نے خواہش ظاہر کی کہ آپ نے جو کچھ دیکھا ہے اس کو ظاہر ضرور فرمائیں۔
شاہ عبدالرحیم نے فرمایا۔ ”لوگو! ابھی ابھی میں نے شیخ کی روح کو اپنے سامنے دیکھا، وہ مجھ سے فرما رہے تھے کہ۔
”عبدالرحیم! میں چاہتا تھا کہ اپنے جسم سمیت آپ کے پاس آؤں، کیونکہ خدا نے اس وقت بھی اتنا اختیار دے رکھا ہے لیکن یہ بات مصلحت کے خلاف ہے اس لیے میں نہیں آیا۔“

شاہ عبدالرحیم نے مزید فرمایا۔ ”اس سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ حیات اولیاء ایک حقیقت ہے۔“
یہ شیخ محمد جن کا ذکر کیا گیا، حضرت شاہ ولی اللہ کے جہر ماری تھے، وہی شاہ ولی اللہ دہلوی جن سے آج دنیائے اسلام بہت اچھی طرح واقف ہے اور جنہیں امام وقت کا خطاب عطا ہوا۔

الطبقات الکبریٰ علامہ عبدالوہاب الشعرانی۔ مروضۃ الرہاحین، امی محمد عبد اللہ
سفینۃ الاولیاء، شہزادہ دامت شکرہ۔ تذکرۃ الاولیاء، شیخ فرید الدین عطار

صاخذات

اگر غور کیا جائے تو ظلم حد سے بڑھ جانے کا مطلب ظالم کی رستی کے لپٹنے کا آغاز ہوتا ہے یہ اور بات کہ اس کا دورانیہ کتنا طویل یا مختصر ہو اور دوسری اہم بات یہ کہ جب ظالم رفتہ رفتہ ہر شے کی قید سے آزاد ہوتا جاتا ہے تب ہی قدرت اسے انتقام کا نشانہ بناتی ہے۔ انسان چاہے کتنی ہی کشمکش کا شکار رہے، قدرت اگر چاہے تو انصاف کے تقاضے اتنی ہی سفاکی سے پورے کرتی ہے جتنا ظالم ظلم ڈھاتا ہے۔

انصاف

شمع



اپنے ہاتھوں اپنا ہی خون بہانے والے ایک منصف کا انتقام

تین پولیس کاروں اور میکلنزی کی ایلوٹی ایرجنسی
رپانس ویسل کی نیلی اور سرخ فلیش کرتی ہوئی لائٹوں نے
تنگ رہائی سڑک کے اندر میرے کو رنگ برنگی نیون ڈپلے
میں تبدیل کر دیا تھا۔
اطراف کے گھروں کی کھڑکیوں سے تیز روشنی چمن کر
آ رہی تھی اور ایسی ہی چمک اس چھوٹے سے مجمع کی آنکھوں
اور چہروں پر بھی جو لمحہ بہ لمحہ بڑھتا جا رہا تھا۔
لیونارڈو نے اس چمک دمک کی جانب سے اپنی

نگاہیں پھیر لیں۔ اس نے کسی جگہ پڑھا تھا کہ امیر جنسی لائسنس جنسی گردشی روشتیوں کے اثرات مرگی کے دورے کا سبب بن سکتے ہیں۔

ایک پھل مجاہدینے والے سائرن اور پائل ڈیزل انجن کی زبردست گڑگڑاہٹ اس بات کا اعلان تھی کہ اس چھوٹے قصبے کی دوسری رہائش ویکل بھی موقع پر آن پہنچی ہے جو کہ دو ہزار ملین کا ایک ٹیکر تھا۔ اس کے رکتے ہی اڑ بریکس کی پھکاری فضا میں گھرنی۔ اس شور نے مجمع کی چہ میگوئیوں اور چنگاریاں جھٹنے کی آوازوں کو دبا دیا تھا جو اس بھڑکی آگ کے شعلوں سے بلند ہو رہی تھیں جو سڑک پر اٹی ہوئی پولیس کار میں لگی ہوئی تھی۔ اس کا رننگ بجلی کے لکڑی کے ایک کھمبے کو بھی توڑ دیا تھا جو سڑک کے کنارے نصب تھا۔

پیلے رنگ کے سیفٹی جیکٹوں میں ملبوس فائر کے عمل کو اپنے پانی کے پائپ کھول کر بجھانے اور انہیں قریب ترین ہائیڈرینٹ سے منسلک کرنے میں صرف چند منٹ لگے۔

جلتی ہوئی پولیس کار کے شعلوں پر پانی کی بوچھاڑ پڑتے ہی جس تماشائی جائے حادثہ کی جانب ٹھسکا شروع ہو گئے۔ جو دو پولیس مین جائے حادثہ کا احاطہ کرنے کے لیے سیکورٹی ٹپ تان رہے تھے انہوں نے اپنی کوششیں تیز کر دیں تاکہ مجمع زیادہ قریب نہ آسکے۔

”یقیناً یہی تیرے سر میں ہے“ کسی نے چیخ کر کہا۔
”اس کے زندہ بچ رہنے کی بس امید ہی کی جاسکتی ہے۔“ مجمع کے عقب سے کسی نے جواب دیا۔

لیونارڈو نے آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی روشنیوں سے بچاؤ کی خاطر اپنی آنکھوں پر ایک ہاتھ سے ڈھال سی بناتے ہوئے اپنے اطراف کے لوگوں کے چہروں کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ اسے اس شخص کی تلاش تھی جو اس موقع کا عینی گواہ ہو۔ ایک ایسا گواہ جس کا چنانچہ اس جیسا تجربہ کار رپورٹر ہمیشہ کر لیا کرتا تھا اور گواہ ایسا فرد ہوتا تھا جو حادثے کی مکمل روداد من و عن بیان کر سکتا تھا۔

اس وقت بھی اسے ایسے ہی عینی گواہ کی تلاش تھی لیکن اسے ایسا کوئی چہرہ اپنے آس پاس چہروں کے سمندر میں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ تقریباً مایوس ہو چکا تھا اور اس مولوی عورت سے سوال کرنے ہی جا رہا تھا جو ایک بچے کو اپنی کمر پر لٹکائے لٹکے لٹکے جھکولے دے رہی تھی کہ اس کی نظریں مخالف سمت میں سڑک پار ایک تہا شخص پر جا پڑیں جو لکڑی کے بنے ہوئے ایک خستہ حال گھر کے چبوترے نما

والان پر بیٹھا ہوا تھا۔

لیونارڈو نے مجمع سے نکل کر سڑک پار کی اور فٹ پاتھ پر چڑھ گیا پھر رکا اور پلٹ کر اس جگہ سے جائے حادثہ کا نظارہ کرنے لگا پھر اثبات میں سر ہلایا۔ اگر وہ شخص حادثہ سے قبل اسی جگہ بیٹھا ہوا تھا تو اس نے حادثے کا پورا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا ہوگا۔ اس سے بہتر حادثے کا عینی گواہ اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔

لیونارڈو پلٹ کر بیرونی لان کی خشک جھاڑ جھکاڑ گھاس پر چلتا ہوا ان سڑجیوں کے پاس پہنچ کر رک گیا جو برآمدے تک اوپر جا رہی تھیں۔

برآمدے میں بیٹھا ہوا شخص اتنا عمر رسیدہ نہیں تھا جیسا کہ قاضی سے دکھائی دیا تھا۔ اس کے سر کے رے رے ہے بالوں کی رنگت چاندی کی سی تھی۔ لیونارڈو کے اندازے کے مطابق اس شخص کی عمر پینسٹھ اور ستر برس کے درمیان رہی ہوگی۔ اس گرم رات کی نسبت سے اس شخص نے کوئی ٹیئس نہیں پائین رکھی تھی۔ صرف ایک میلا پچھلا سا بنیان اوپری بدن کو نیم ڈھانپے ہوئے تھا۔ نیچے ایک نیلی نمایاہ رنگ کی ٹراؤز تھی۔

اس شخص کا چہرہ مر جھایا ہوا سا لگ رہا تھا۔ شاید اس کی وجہ اس وکیل جیبر تک محدود ہونا تھا جس پر وہ بیٹھا ہوا تھا لیکن ساتھ ہی اس کے چہرے پر ایک استقلال بھی عیاں تھا۔ لیونارڈو کو یہی امید تھی کہ اس شخص کی روزانہ رات کو یہی عادت ہوگی کہ یہاں برآمدے میں بیٹھ کر باہر کی دنیا کی رونقوں کا نظارہ کر سکے۔

”گڈ ایوننگ سرائر! لیونارڈو ہے۔ میں میکسن لیڈر اخبار کارپورٹر ہوں۔ کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ یہاں کیا واقعہ پیش آیا تھا؟“

اس شخص نے اپنی ٹھوڑی کے بڑھے ہوئے شیعہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اپنی سرخ تنیک کے شیشوں کے پیچھے جہان دیدہ آنکھوں سے بغور لیونارڈو کا جائزہ لیا پھر بولا۔
”ویل، میرا خیال ہے میں بتا سکتا ہوں لیکن جو کچھ ہوا ہے یہ اس کی حقیقی عکاسی نہیں ہوگی، اگر میں نے جنہیں صرف اس حادثے کے بارے میں بتانے تک اکٹھا کیا۔“

لیونارڈو نے اپنی نوٹ بک اور پین جیب سے نکال لیے تھے لیکن اب اسے گمان ہوا کہ اثر دیو کے لیے اس کا یہ انتخاب درست نہیں ہے۔ اس لیے اس نے اپنی نوٹ بک اور پین واہیں جیب میں رکھ لیے۔

تب اس بوڑھے نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگا یا اور اپنا

کھردرا سا ہاتھ لیونارڈو کی جانب لہراتے ہوئے بولا۔
”میسز ہونے کی ضرورت نہیں، میں نے یہ حادثہ پورا دیکھا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ جو انجام تمہاری نگاہوں کے سامنے ہے اس کی ایک مکمل داستان ہے۔ اگر تم میری بات کا مطلب سمجھ رہے ہو۔“

لیونارڈو کو واقعی بوڑھے کی بات کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا تھا لیکن اس کا جس مزید بڑھ گیا تھا۔ وہ بے ساختہ بول پڑا۔ ”وہ کیسے؟“

”اوپر اجاڑ اور میرے پاس بیٹھ جاؤ، بیٹے۔ اس طرح ہم دو سب کچھ دیکھ سکتے رہیں گے جو سامنے ہو رہا ہے اور اس دوران میں تمہیں کلارنس اور ملی رے کے بارے میں بھی سب کچھ بتا دوں گا۔ اب وقت آگیا ہے کہ لوگوں کو سب کچھ بتا چل جائے۔“

لیونارڈو بیڑھیاں چڑھ کر اوپر لکڑی کے بنے ہوئے برآمدے میں آگیا اور موسموں کے اثر سے بدرنگ بید کی بنی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے جیب سے اپنی نوٹ بک اور پین دوبارہ باہر نکال لیے۔ اس مرتبہ وہ پرامید تھا اور اسے یہ عجیب سا احساس ہو رہا تھا جیسے وہ ایک بڑا ہاتھ مارنے جا رہا ہے اور اس خبر کی اشاعت میں حریف پرچوں سے بازی لے جائے گا۔

”ہمیں ماضی سے ابتدا کرنی ہوگی۔“ بوڑھے نے کہا۔ سڑک کی تیز روشنیوں میں اس کا چہرہ چمک رہا تھا اور اس کے چہرے کی سلوٹیں اور خدو خال نمایاں دکھائی دے رہے تھے۔

لیونارڈو نے ایک اچھٹی نگاہ جائے حادثہ کی جانب ڈالی۔ جلتی ہوئی کار کے شعلوں کی شدت میں کی آگئی تھی اور جلتے ہوئے گوشت کی کراہت آمیز یو علاقے میں پھیلنا شروع ہوئی تھی۔ تماشائیوں کی ایک بڑی تعداد نے اب پیچھے ہٹنا شروع کر دیا تھا اور بیشتر نے اپنی ناک اور منہ کو اپنے ہاتھوں سے ڈھانپا ہوا تھا۔

لیونارڈو ایک تجربہ کار رپورٹر تھا اور اس قسم کے ماحول کا عادی تھا۔ اس نے نظریں جاتے ہوئے اپنے مقابل بوڑھے کی طرف دیکھا۔ اگر کراہت آمیز یو کا اثر اس پر بھی ہو رہا تھا تو اس نے اسے ظاہر نہیں ہونے دیا۔ اس کے چہرے پر انفرادی کا عالم تھا اور وہ سنجیدہ دکھائی دے رہا تھا۔
”ہمیں واپس اس دور میں جانا ہوگا جب ملی رے کی عمر آٹھ یا نو سال سے زیادہ نہیں تھی۔ کلارنس نے اس لڑکے میں اس وقت بھی بڑی کو بھانپ لیا تھا۔ وہ اس وقت بھی

آلو

3 چور پولیس سے چھپ کے 3 بوریوں میں سمس گئے۔

پولیس والا آیا اس نے پہلی بوری کو لات ماری۔ اندر سے آواز آئی ”بھوں بھوں“ پولیس والا بولا۔ ”اندر کسے۔“

دوسری بوری کو لات ماری اندر سے آواز آئی۔ ”میاؤں، میاؤں“۔ پولیس والا بولا۔ ”اندر کی ہے۔“

تیسری بوری کو لات ماری۔ ”مگر کوئی آواز نہیں آئی۔“

25، 20 لاتیں ماریں تو اندر سے تیسرا چلایا۔ ”ابے ظالم کے بچے آلو ہوں آلو۔“

مرسلہ: رضوان خونی کر یڑوی، اورنگی ٹاؤن کراچی

اپنے برآمدے میں بیٹھا ملی رے اور دوسرے بچوں کو اسکول سے آتے ہوئے دیکھا کرتا تھا۔ ملی رے کسی کام کا نہیں تھا وہ کچے چراتا تھا، ہر ایک پر پتھر پھینکتا تھا اور چوٹوں سے مار پیٹ کیا کرتا تھا اور لڑکیوں کو بھی نہیں بخشتا تھا۔

لیونارڈو سے سب کچھ اپنی نوٹ بک میں شارٹ ریڈ میں لکھتا جا رہا تھا۔ اسے امید تھی کہ یہ تفصیل جلد ختم ہو جائے گی تاکہ وہ قارئین چیف اور پولیس کے بیانات بھی بروقت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے۔

”بے شک کلارنس کو ہمیشہ یہی توقع تھی کہ بڑا ہو کر ملی رے بچپن کی بری عادتوں کو پیچھے چھوڑ دے گا اور سدھر جائے گا۔ نوعمر لڑکے بڑے بلند حوصلہ ہوتے ہیں لیکن ملی رے میں کچھ ایسی بات تھی کہ برائیاں اس کے اندر رستی جا رہی تھیں۔ جب وہ بڑا ہوا تو اور بھی کمیتہ ہو گیا۔ اب وہ مار پیٹ میں جبر و تشدد سے کام لینے لگا تھا۔ اس نے اپنے لڑکوں کا ایک ٹینک بنالیا تھا۔ کلارنس کو بس یہی معلوم تھا کہ یہ لڑکا مشکلات میں گھرنے والا ہے۔“

پھر اس بوڑھے نے آگ بھانے والے ٹرک کے عقب میں روڑ پار ایک خالی بلاک کی جانب اشارہ کیا۔ ”ایک روز ایک سیاہ فام ٹیلی وہاں آن بسی۔ وہ لوگ ہمیشہ کلارنس کو دیکھ کر ہاتھ لہرا دیا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ ایک مرتبہ اس کے لیے چکن پاٹ بھی پائی بیک کر کے بھیجی۔ اچھے

نفیس لوگ تھے لیکن ملی رے نے فیصلہ کر لیا کہ وہ یہاں رہنے کے قابل نہیں ہیں۔ اس نے ان کا گھر جلادیا۔ کلارنس کو علم تھا کہ اس کا ذمہ دار ملی رے تھا۔ اس نے اپنے برآمدے سے اسے یہ سب کچھ کرتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ وہ وہیں بیٹھا ہوا تھا جہاں ہر رات بیٹھا کرتا تھا۔ اس کا الزام اس بے چارے شخص کے سر منڈھ دیا گیا تھا جو دو ہلاک دور رہتا تھا لیکن بھی کسی نے کلارنس سے یہ نہیں پوچھا کہ یہ سب کچھ کی طرح ہوا تھا اور کلارنس کو محسوس ہوا کہ وہ اس بارے میں کچھ نہیں کر سکتا لہذا ملی رے اس الزام سے صاف فک لگا۔ "یہ کہہ کر بوڑھا سر ہلانے لگا۔ "وہ ایک مکمل برائی تھا جیسا کہ میں نے کہا سرتاپا پادی ہی بدی۔" "ان سب باتوں کا اس حادثے سے کیا تعلق ہے؟" لیونا رڈو نے پوچھا۔ وہ حیران ہو رہا تھا کہ یہ کہانی کس رخ پر جا رہی ہے۔

تب بوڑھے نے اسے گھور کر دیکھا جیسے لیونا رڈو کی دخل اندازی پر خفا ہو گیا ہو۔ "جیسا کہ میں نے کہا یہ سب کچھ کسی کے وہم و گمان سے بھی زیادہ ہے۔" لیونا رڈو نے سر ہلادیا اور اپنی توجہ بوڑھے کی داستان سننے پر مرکوز کر دی۔ اگر بوڑھا جو کچھ کہہ رہا تھا وہ سچ تھا تو پھر ملی رے کا ماضی نیک آدمی کا ہرگز نہیں تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ وہ اس بات کو کس طرح لکھ پائے گا۔

بوڑھے نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "بے شک کلارنس اس سیاہ فام قتل کے بارے میں خاصا اپ سیٹ ہوا تھا۔ وہ لوگ یہ علاقہ چھوڑ کر چلے گئے لیکن کلارنس انہیں نہیں بھول سکا۔ ادھر ملی رے بد سے بدتر اور حقیر سے حقیر تر ہوتا چلا گیا۔ اس نے اپنے لیے پرانی سیاہ شیور لپٹ کاروں میں سے ایک کا رخ خریدی۔ اس نے اس کار کے انجن کی طاقت بڑھائی، اس کے سامنے کے حصے پر سرخ رنگ کے بڑے شعلے پیٹ کر دوائے۔ پتھروں پر کروم کے ہب کیس جڑھادیے اور ایسی ہی دیگر فٹنس کروالیں۔ اب وہ کار بھی ملی رے کے مانند گھٹیا اور مبینہ دکھائی دینے لگی تھی۔ اس دوران ملی رے نے اپنے بالوں کا اسٹائل بھی تبدیل کر لیا۔ اب اس کے تیل میں بیجے ہوئے بال پیچھے کو جتے رہتے تھے اور وہ ہر وقت چمڑے کی جیکٹ پہنتے لگا تھا۔ اس نے اپنی شیور لپٹ کار بڑوں پر فضول ادھر سے ادھر دوڑانا شروع کر دی۔ ہر وقت کسی نہ کسی کو خوف زدہ کرنا اس کا مشغلہ بن گیا تھا۔ کلارنس کو بھی انجن کا شور سنائی دیتا تو بھی لیٹر بکس اور کوڑے دان روندنے کی آوازیں سنائی دیتی

تھیں۔ ملی رے یہ سب کچھ تفریحاً کیا کرتا تھا۔ "بوڑھے نے یہ کہہ کر سانس لینے کے لیے قدرے توقف کیا۔ پھر وہ دوبارہ گویا ہوا۔ "پھر اس کی حرکتیں مزید بدتر ہونے لگیں چند سال قبل ملی رے نے خود کو پولیس میں بھرتی کروالیا پھر تو اسے روکنے والا کوئی بھی نہیں تھا۔ اب وہ لوگوں کو اپنی ربر کی سیاہ چھڑی سے پیٹنے لگا تھا۔ ایلوز کے ڈائنر سے مفت کافی اور کھانے کے قفے کرتا تھا اور اس طرح کے وہ تمام کام جن میں وہ ملوث رہتا تھا، اب ان کاموں کو اس نے اپنی عادت بنالیا تھا لیکن ساتھ ہی ملی رے اپنی ان کارروائیوں کا کوئی نشان، کوئی سراغ نہیں چھوڑتا تھا اور کوئی بھی اس کے خلاف کچھ ثابت نہیں کر سکتا تھا اور نہ کسی کی ہمت ہوتی تھی کہ اس کی ان حرکتوں کا کوئی ثبوت پیش کر دے۔ کلارنس ان تمام باتوں سے عاجز آ گیا تھا لیکن وہ ایک بوڑھا آدمی تھا۔ وہ کبھی کیا سکتا تھا؟"

لیونا رڈو نے ہمدردی سے سر ہلادیا، وہ پتین سنبالے بوڑھے کے مزید آگے بولنے کا انتظار کر رہا تھا۔ "پھر معاملہ اس وقت نازک مرحلے میں داخل ہو گیا جب سیرینائیڈ ماس محلے میں آگئی۔ اس کے ساتھ ایک بچہ بھی تھا۔ اس کا شوہر جنوب میں کہیں کسی حادثے میں مارا گیا تھا لہذا وہ اپنی زندگی کا نئے سفر سے آغاز کرنے کی خاطر اپنے بچے کو لے کر یہاں آگئی تھی۔ وہ ایک اچھی لڑکی تھی اور سب ہی اسے پسند کرنے لگے تھے۔ وہ ہم بوڑھوں کی مدد بھی کیا کرتی تھی۔ کسی کا کھانا پینا دیتی تو کسی کے پیتھامات پہنچانے ہوتے تو پہنچا دیا کرتی تھی اور ایسے ہی دوسرے کئی کاموں میں ہاتھ بٹانے سے گریز نہیں کرتی تھی۔ کلارنس اسے بیٹی کے مانند سمجھتا تھا۔ وہ اس لڑکی اور اس کے بچے کا گرویدہ ہو چکا تھا۔ حتیٰ کہ بعض اوقات بچے کی بے بسی شینگ بھی کر لیا کرتا تھا۔ "بوڑھا یہ کہہ کر خاموش ہو گیا۔

لیونا رڈو اس کے دوبارہ بولنے کا انتظار کرنے لگا۔ قدرے توقف کے بعد بوڑھے نے اپنی بات جاری رکھی۔ "پھر جب ملی رے نے اس دلکش نوجوان بیوہ کے بارے میں سنا تو اس کے گھر جانا شروع کر دیا۔ یہ بات کلارنس کے لیے باعث پریشانی تھی اور پھر زیادہ عرصہ نہیں گزرا جب سیرینائیڈ کلارنس پر بھروسہ کرتے ہوئے ملی رے کے بارے میں اسے سب کچھ بتا دیا کہ وہ کس طرح اس کے ساتھ مار پیٹ اور زور زبردستی کیا کرتا ہے اور اس کو اس کے بچے کے حوالے سے ڈراتا دھمکا رہتا ہے۔ تم سمجھ رہے ہو نا کہ میں کیا کہنا چاہ رہا ہوں؟" بوڑھے نے

لیونا رڈو کی آنکھوں میں آنسوؤں کا آئینہ ہوئے کہا۔ "میں آپ کی بات کا مدعا سمجھ گیا۔" لیونا رڈو نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ گواہی حادثے میں ملی رے مر چکا تھا لیکن اس کی یہ باتیں سن کر لیونا رڈو کو اس سے نفرت سی محسوس ہو رہی تھی۔

"ویل، ملی رے ہر رات کلارنس کے گھر کے سامنے سے فرارے بھرتا گزرا کرتا تھا۔ وہ اپنی بڑی سی پرانی پولیس کار میں ڈرائیونگ سیٹ پر اس شان سے بیٹھا ہوتا تھا جیسے پوری دنیا اس کی ملکیت ہو۔ رعونت اس کے چہرے سے چمک رہی ہوتی تھی۔ کلارنس کو معلوم ہوتا تھا کہ وہ کدھر جا رہا ہے اور کیا ہونے والا ہے پھر ایک رات اس نے اپنے ذہن کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ اب وہ بے چاری سیرینائیڈ مزید کوئی ظلم نہیں ہونے دے گا کیونکہ سیرینائیڈ کے لیے ملی رے کو برداشت کرنا بے حد مشکل ہو رہا تھا۔ ملی رے ایک مکمل شیطان ہو چکا تھا۔ جی ہاں اور کلارنس نے اس معاملے میں کچھ نہ کچھ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔"

وہ بوڑھا شخص اب قدرے تن کر بیٹھ گیا اور لیونا رڈو کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ "جنگ کے دنوں میں کلارنس ایک ماہر نشانہ باز رہ چکا تھا۔ میں نے جنہیں اس بارے میں نہیں بتایا، واقعی؟"

لیونا رڈو نے نفی میں سر ہلادیا اور حادثے کے منظر پر ایک اچھتی نگاہ ڈالنے کا موقع ملنے پر نظریں اس جانب اٹھا دیں۔

آگ بجھانے والا عملہ اپنے پانی پھینکنے والے پائپ لپیٹ رہا تھا اور دیگر عملہ پانی کو خشک کرنے کے لیے پوچا لگا رہا تھا۔ رسانس ٹیم کے ممبر ایٹھ ہوئی پولیس کار کا دروازہ کھولنے میں مصروف تھے۔

لیونا رڈو سوچ رہا تھا کہ ملی رے تھر مین کا کیا بچا ہوگا پھر اس نے اپنی توجہ دوبارہ بوڑھے پر مرکوز کر دی۔

بوڑھے نے اب پھر اپنی ڈبیل چیئر کی پشت سے ٹیک لگلی تھی۔ اس کے چہرے پر اطمینان اور سکون کے تاثرات تھے۔ "ویل، کلارنس جنگ کے دوران کافی تحفہ جیت چکا تھا۔ اس جیسا ماہر نشانہ باز ان کے پاس بھی نہیں رہا تھا۔ وہ اب بھی تھری ناٹ تھری رائفل اپنے پاس تیار رکھتا تھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح اس کی باقاعدگی سے صفائی کیا کرتا تھا اور اس کو تیل بھی دیتا رہتا تھا۔ اس رات اس نے اپنی وہ رائفل نکال لی اور اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھ کر ملی رے کے آنے کا انتظار کرنے لگا جو فرارے بھرتا ہو اور زندہ وہاں سے گزرتا

تھا۔ جلد ہی اسے ملی رے کی کار کی آواز سنائی دی۔ ہمیشہ کی طرح اسی مخصوص وقت پر وہ وہاں سامنے سے گزرنے والا تھا۔ تب کلارنس نے اس تیز رفتار پولیس کار کی پیٹروں کی ٹشٹی کو اپنا ہدف بنالیا۔"

یہ سننے ہی لیونا رڈو کا قلم چلتے چلتے رک گیا اور وہ ناقابل یقین نظروں سے بوڑھے کی صورت دیکھنے لگا۔ "کیا آپ مجھے یہ بتا رہے ہیں کہ کلارنس نے ملی رے کی پولیس کار کی پیٹروں کی ٹشٹی کو نشانہ بنا کر گولی چلائی تھی اور یہ کوئی حادثہ نہیں تھا؟"

بوڑھے نے شانے اچکا دیے۔ "تم جانتا چاہتے تھے کہ کیا واقعہ پیش آیا تھا۔"

لیونا رڈو نے حیرت سے سر ہلادیا۔ "میں اس کلارنس کو کہاں تلاش کر سکتا ہوں، میں اس کا انٹرویو لینا چاہتا ہوں۔"

"وہ تمہارے سامنے موجود ہے، بیٹے۔"

لیونا رڈو نے نظریں اٹھائیں اس کا منہ حیرت سے کھل گیا تھا۔ "آپ..... آپ کلارنس ہیں؟ بوڑھے نے اثبات میں سر ہلادیا۔

"کیا آپ کو اس بات کا احساس ہے کہ اگر یہ سب کچھ سچ ہے تو آپ نے ابھی ابھی خود کو مجرم ٹھہرا دیا ہے؟"

لیونا رڈو نے کہا۔

بوڑھا یہ سن کر مسکرا دیا۔ "وہ میرے ساتھ کیا کریں گے؟ آخری درجے کے کیئر میں مبتلا ایک اناج شخص کو لالک اپ میں ڈال دیں گے؟ میرے نزدیک اس بات کی کوئی اہمیت نہیں ہے، بیٹے۔ میں نے وہی کچھ کیا جو مجھے کرنا چاہیے تھا۔" اس نے افسردگی سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "مجھے یہ سب کچھ برسوں پہلے کر لینا چاہیے تھا۔"

لیونا رڈو نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے اپنی نظریں اپنی نوٹ بک پر جمادیں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا وہ اس انٹرویو کے بارے میں پولیس کو سب کچھ بتا دے؟ "آپ کا پورا نام کیا ہے بیٹے؟"

"کلارنس تھر مین۔" بوڑھے نے زری سے جواب دیا۔

لیونا رڈو نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا اور بوڑھے کو کھینچی نگاہوں سے گھورتے ہوئے بولا۔ "لیکن..... ملی رے؟"

کلارنس نے اثبات میں سر ہلادیا۔ اس مرتبہ وہ بے حد بوڑھا اور غمزہ لگ رہا تھا۔ "ہاں، ملی رے میرا اکلوتا بیٹا تھا۔" اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ ساتھ ہی اس کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔



بیول

کسی نے کیا خوب کہا ہے انسان روپ سے نہیں اپنے کرم یعنی نصیب سے کھاتا ہے... اگر حسن اتنا ہی دیر پا ہوتا تو وہ بھی یوں صحرا صحرا ابلہ پائی کا سفر نہ کر رہی ہوتی۔ اس نے کبھی کسی کتاب میں پڑھا تھا، انا کے ہیں حصار میں... جلے ہیں اعتبار میں... اجڑ گئے بہار میں... بھلا یہ کیا حصول ہے، یہ زندگی بیول ہے۔ قریب تھا کہ تھا گماں... سمجھ رہے تھے ساقیاں... وہ پھر رہے ہیں مکان... نہ حاصل نہ وصول ہے، یہ زندگی بیول ہے... اور اب وقت کی چال نے حرف بہ حرف زندگی کے اس مفہوم کو اس پر یوں منکشف کیا کہ وہ دلبری کا ہر انداز بھلا بیٹھی... ستاروں کے جھرمٹ میں اس کی قسمت کا ستارہ چانے کہاں ٹوٹ کر گرے کہ محبت بیول بن کر اس کے چکا چوند حسن کو کہنا گئی اور وہ اعتبار کی دھوپ میں تنہا چھلستی رہ گئی۔ وہ جو ہوائوں کی شوخی، آبشاروں کا ترنم اور مہکے گلابوں کا حصار بن کر کسی کے دامن میں گری تھی، کیا خبر تھی وہی چاہت ٹھوکر میں ڈھل جائے گی اور وہ منزل کی تلاش میں ڈگر ڈگر اپنے نقش پا چھوڑتے ہوئے اپنی شناخت بھی کھو بیٹھے گی... جسے اس نے اپنی زندگی کا سنگ میل سمجھا اسی نے اسے رستے کا پتھر بنا دیا۔ ایک ایسی بیول نے اس کے ہر رشتے کو بیول بنا ڈالا تھا جس کی تلافی وہ اپنی موت کی صورت میں بھی نہ کر پائی اور آخری لمحات میں زیست کی سولی پر وہ ایک اور عزیز ترین ہستی کو تنہا چھوڑ گئی... شاید یہی اس کی زیست کا حاصل اور وصول تھا۔ بہت آخر میں اسے یہ بات سمجھ آئی تھی کہ... اجڑ گیا میرا وطن... ادھر ادھر جلے بدن... خزاؤں میں ڈھلا چمن... دھواں ہے اور دھول ہے، یہ زندگی بیول ہے۔

سازشوں اور خواہشوں کے درمیان رشتوں اور رستوں کے انتخاب کی کشش میں مبتلا ایک موی پیکر کا اضطراب

”اللہ اکبر۔“ دونوں ہاتھوں کو بلند کرتے ہوئے اس نے نماز کا آغاز کیا ہی تھا کہ ایک جھٹکا سا لگا اور وہ بہ مشکل خود کو کھڑا کرنے سے بچا کر اگلے رکن کی ادائیگی کرنے لگی۔ اس کے جسم کو گتے والا یہ جھٹکا نماز کے لیے اور مٹی مٹی چادر کے کونے کو زور سے پکڑ کر پیچھے جانے کے باعث لگا تھا اور وہ اپنے گلے پر چادر پھینچنے جانے کی رگڑ رگڑات کے دوران بھی محسوس کرتی رہی تھی لیکن پھر تکلیف کے اس احساس پر دوسری تکلیف غالب آگئی۔ یہ تکلیف رکوع میں جاتے ہوئے اسے اپنی دائیں پنڈلی پر دھنسنے لگے باریک دانتوں کی وجہ سے برداشت کرنی پڑی تھی اور اس کی شدت اتنی زیادہ تھی کہ اس کے لیے اپنی سسکی کو روکنا مشکل ہو گیا تھا لیکن بہر حال وہ نماز جاری رکھتا چلائی تھی اس لیے رکوع ادا کر کے یہی کھڑی ہوئی اور تسبیحات ادا کرنے کے بعد سجدے کے لیے بیٹھنے لگی۔ سجدے میں جاتے ہوئے اسے پیچھے سے اتنی زور سے دھکا دیا گیا کہ اس کی

خواہش سے پہلے ہی سر زور سے زمین سے جا لگا کر تھا کہ بچے پھٹیں جائے نماز بھی ہوئی تھی۔ اس لیے چوٹ زیادہ شدید نہیں آئی پھر بھی لمحہ بھر کے لیے سر پکڑا ضرور کیا تھا۔ پھر کی اس کیفیت سے سنبھل کر اس نے دوران سجدہ پڑھی جانے والی تسبیحات کو ادا کیا لیکن جب تیسری بار تسبیح پڑھ کر اٹھنا چاہا تو احساس ہوا کہ وہ اپنی کمر پر لدے وزن کی وجہ سے فی الحال سجدے سے اٹھنے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔ اپنی کمر کے اس بوجھ سے آزاد ہونے کا دورانیہ اس نے بہت مبر سے تسبیحات پڑھتے ہوئے گزارا اور جیسے ہی بوجھ اٹھا سیدی ہوئے کے بعد دوسرے سجدے میں جانے کی تیاری کرنے لگی۔ حسب قاعدہ اس نے پہلے اپنے دونوں ہاتھ مقام سجدہ پر رکھے اور سر بھی رکھنا ہی چاہتی تھی کہ اپنے ہاتھوں پر قدرے گرم سے پانی کی دھاری گرتی محسوس ہوئی۔ اس پانی کی حقیقت کو سمجھنے میں اسے ایک سیکنڈ بھی نہیں لگا اور حلق سے بے اختیار ایک چھٹ لگی۔ نماز کو مزید جاری

سَمِينٌ ذَاتُ الْحَبِ

کو بھلا کیسے اس بات کی خبر ہو سکتی تھی کہ اس کے جسمانی نشیب و فراز اتنے خوب صورت ہیں کہ کسی جسمہ ساز کا شاہکار قرار دیے جاسکیں۔ اس راز پر سے تو اس سیاہ جھلملائی شیون کی باریک ساڑی نے پردہ اٹھایا تھا جو باہر بیٹیشن نے نہایت مٹاٹی سے اس طرح اس کے تن پر لپٹی تھی کہ محال ہے جو ساڑے چھ گز کی یہ ساڑی اس کے جسم کی خوب صورتی کو چھپا سکے۔ وہ تو کچھ اس طرح اس کے وجود سے چھٹی تھی کہ سارے خدو خال اور نمایاں ہو کر سامنے آ گئے تھے۔ ساڑی سے کئی انچ اونچے مختصر بلاؤز سے جھانکی اس کی پٹلی کر اپنی سفیدی کی وجہ سے سیاہ رنگ پر کچھ زیادہ ہی نمایاں ہو کر دکھائی دے رہی تھی۔ بلاؤز کی آستینیں سیلوئس تھیں اور ان سے نکلنے گورے گورے بازو اس لیے بھی زیادہ خوب صورت اور قابل توجہ لگ رہے تھے کہ آج پہلی بار ہی ان پر دیکھیں، پتہ چلتا، مٹی کیور اور نہ جانے کون کون سے نئے آزمائے گئے تھے۔ وہ توجہ تھا کہ ان ساری چیزوں سے واقف ہی نہیں تھی اور کسی کی ہدایت پر نہایت تابعداری سے خود کو اس بیونی سیلون کی ماہرین کے حوالے کر دیا تھا۔ جہاں اسے صبح تا شام کے بعد پہنچایا گیا تھا اور تب سے اب تک نہ جانے وہ کتنے اور کون کون سے مراحل سے گزر کر آئینے کے سامنے اس عالم میں کھڑی تھی کہ خود ہی یہ یقین کرنے سے قاصر تھی کہ آئینے میں نظر آتا کس اسی کا ہے۔ اسے تو یوں لگ رہا تھا کہ وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہے اور پھر آنکھ کھلے گی تو پھر اسی عام سے مڈل کلاس گھر میں موجود ہوگی جہاں اس کے سارے کے سارے کپڑے ایک الماری میں اس کے لیے مختص کیے گئے کل دو خانوں میں ساجاتے تھے اور وہ جوڑے بھی اتنے معمولی تھے کہ ان کی کل قیمت بھی اس کے جسم پر اس وقت موجود ساڑی کی قیمت سے کئی گنا کم تھی۔ ایسی ساڑی تو اسے حقیقت میں کبھی قریب سے دیکھنا بھی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ نہ ہی وہ جانتی تھی کہ ساڑی پر جن مختلف قسم کے ترشے ہوئے نئے پتھروں کے ساتھ نفاست سے کام بنا ہوا ہے ان کے نام کیا کیا ہیں، ہاں البتہ اس بات کا اسے خوب اندازہ تھا کہ وہ اتنے قیمتی اور بیش قیمت ہیں کہ اپنے والدین کے منتخب کیے گئے کسی رشتے پر پائی بھرنے سے وہ زندگی بھر بھی ان کا دیدار بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس اعتبار سے وہ نہایت خوش قسمت تھی کہ من چاہا زندگی کا ہر مغربی پالیا تھا اور ساتھ ہی زندگی کی بے شمار ایسی نعمتیں بھی جن کا اس سے قبل شاید وہ تصور کرنے کی بھی قابل نہیں تھی۔ اس کے دائیں ہاتھ کی کلائی میں نہایت نازک

ایک برسلٹ تھا جن میں نئے نئے ہیرے جڑے ہوئے تھے اور بائیں ہاتھ میں باریک باریک سی درجن بھر وائٹ گولڈ کی چوڑیاں۔ اس نے دائیں ہاتھ کی سچ کی انگلی میں صرف ایک انگلی پنہن رکھی تھی لیکن اس انگلی میں جڑا ہوا کھٹا ہیرا اتنا چمک دار تھا کہ دور ہی سے نظروں کو خیرہ کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ اس کی ستواں ناک میں بھی ہیرے کی لونگ پڑی تھی جو اس کی ذرا سی جنبش پر یوں جھلملاتی تھی کہ چہرے پر شعاعیں سی۔ بکھرتی محسوس ہوتی تھیں۔ ہیرے اسٹائلٹ نے اس کے ریشمی بالوں کا اونچا سا جوڑا کچھ اس انداز میں بنایا تھا کہ اس کی راج ہنس جیسی لمبی گردن حریذ نمایاں ہوئی تھی اور ساتھ ہی گردن میں پہنایا گیا نازک سا ٹیٹکس اور کانوں میں لٹکتے قدرے لمبے آؤبز بھی۔ وہ سرو قد بھی اور اس وقت بیرون میں موجود نازک، قیمتی اور اونچی اڑھی کی سینڈل میں کچھ اور نمایاں ہو رہی تھی۔ اپنے لباس، جیولری، میک اپ، ہیرے اسٹائلٹ سے لے کر سینڈل تک ایک ایک شے کا سراپہ والی نظروں سے جائزہ لیتے ہوئے اس کے ذہن نے ان شادیوں اور دلہنوں تک اڑان بھری جنہیں اب تک کی زندگی میں دیکھی آئی تھی۔ وہ ڈنہیں جو سچی اسے اچھی لگا کرتی تھیں یکدم ہی اس کی نظروں سے گر گئیں اور اس نے آئینے میں نظر آتے اپنے عکس پر ایک ناقص بھری نظر ڈالی۔ دلہن وہ بھی تھی لیکن اس سے کسی کا بھلا کیا مقابلہ تھا۔ پھولوں کے نام پر جوڑے میں انکی انگریزی پھولوں کی دو دیکھوں کے سوا کچھ نہیں تھا لیکن اپورنڈ پر فیم اور پاڈی اسپرے کے چھڑکاؤ کی وجہ سے اس کا وجود چمک رہا تھا۔ سیدھی مانگ میں افشاں ضرور جھلملا رہی تھی لیکن روایتی پکا، جمورسب غائب تھا پھر بھی وہ دلہن تھی۔ ایک امیر اور مشہور آدمی کی دلہن جو بہت خوب صورت، اسٹائلٹ اور منفرد تھی۔ اپنے اس روپ کو پسندیدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے وہ دھیمے سے مسکرائی، اسی وقت اس کی نظر اپنے بلاؤز کے گلے پر جا پڑی۔ گلا آگے اور پیچھے دونوں طرف سے کچھ زیادہ ہی گہرا تھا اور گہرے گلے نے آئینے میں اسے ایک ایسا نظارہ کر دیا تھا کہ پہلی بار اسے حیا سی آگئی اور بے ساختہ ہی اس کا ہاتھ ساڑی کا پلو درست کرنے کے لیے اٹھا۔ ”نو میڈم پلیز ساڑی کو اس طرح مت چھوئیں۔ ساری سینگ آؤٹ ہو جائے گی۔“ ابھی اس کی انگلیوں نے جنبش بھی نہیں کی تھی کہ پیچھے کھڑی بیٹیشن یوں چلائی کہ یادہ اس کی کھنٹوں کی محنت کو برباد کرنے چلی ہو۔ اس نے بولکھا کر اپنا ہاتھ پیچھے ہٹالیا۔ اسے اس کی دید کا بھرپور جائزہ

لینے کے لیے آئینے کے سامنے لا کھڑا کرنے والی بیٹیشن نے آگے بڑھ کر گویا پلو کی سینگ کی طرف سے ایک بار پھر اطمینان حاصل کیا۔ ”یہ گلابت زیادہ ہی گہرا ہے اس لیے میں پلو ذرا سا اوپر کرنا چاہ رہی تھی۔“ اس نے ذرا کھیا نے انداز میں وضاحت پیش کی۔ ”آپ ایسے ہی کانشس ہو رہی ہیں میڈم۔ سب کچھ بالکل پریکٹ ہے۔ دیکھیں یہ ساری بڑی بڑی ہیر وئیں بھی ایسے ہی ساڑی پہنتی ہیں اور آپ کا فکر تو ان سب سے زیادہ زبردست ہے پھر کیوں آپ پریشان ہو رہی ہیں۔“ بیٹیشن نے اس کی توجہ بڑے سے ڈرینگ روم میں آؤیزاں پوسٹرز کی طرف مبذول کروائی۔ وہ کئی بڑی ہیر وئیں کے ہوش رہا پڑتے۔ ”مگر میں کوئی فلمی.....“ وہ کہنا چاہتی تھی کہ میں کوئی فلمی ہیر وئن تو نہیں ہوں لیکن پھر اپنی زبان روک لی۔ وہ فلمی ہیر وئن نہ کسی فلمی دنیا کی ایک اہم شخصیت سے وابستہ ہو چکی تھی اور ظاہر ہے اب اسے رواج کے مطابق وہیں کے طور طریقے اختیار کرنے تھے اور میڈیا کی مہربانی سے وہ اتنا تو جانتی تھی کہ بالی وڈ کی دنیا میں طرح دار ہیر وئوں کا مقابلہ کرنے کے لیے فلمی دنیا کے مردوں سے وابستہ ان کی بیویوں کو بھی ٹھیک ڈرینگ کرنی پڑتی ہے ورنہ یہ شوہر ایک کر لے جاتی ہیں اور وہ اپنے اس شوہر کو کھونے کا رسک نہیں لے سکتی تھی جس کے لیے اس نے ساری دنیا چھوڑ دی تھی۔ چنانچہ بیٹیشن سے اختلاف کا خیال دل سے نکال کر ایک بار پھر ہر زاویے سے اپنا جائزہ لینے لگی۔ اسی وقت ڈرینگ روم میں رکھا انٹرکام بجا اور اس کے ساتھ آنے والی بیٹیشن ریسورٹھا کر دوسری طرف کی بات سننے لگی۔ ”آپ کی گاڑی آگئی ہے میڈم۔“ بیٹیشن نے دوسری طرف سے نلے والا پیغام اس تک پہنچایا تو اس نے آئینے میں نظر آتے اپنے بلاؤز حسن پر آخری نظر ڈالی اور اونچی نکل پر تک تک کرنی باہر نکل گئی۔ ”آر یو سیلنگ میڈم؟“ استقبالیہ پر موجود سیلون کی انچارج نے اسے دیکھ کر پوچھا۔ ”فیور۔“ اس نے مسکرا کر جواب دیا اور آگے بڑھ گئی۔ باہر سیاہ رنگ کی ہی چھپائی کار اس کی منتظر تھی۔ کار کے شیشے منڈ تھے اس لیے وہ اندر بیٹھے افراد کو نہیں دیکھ سکتی تھی البتہ باہر مستعد کھڑا سیکیورٹی گارڈ فوراً نظر میں آ گیا۔ سیکیورٹی گارڈ نے اس کے قریب پہنچنے پر پچھلی جانب

کا دروازہ کھولا تو وہ اندر بیٹھ گئی اور بیٹھے ہی اسے خوش گوار حیرت کا سامنا کرنا پڑا۔ سیاہ ڈزسوٹ میں بلیک، گرے اور ریڈ لائٹنگ والی ٹائی لگائے اس کا میڈم شوہر اس کے استقبال کے لیے موجود تھا۔ اس کے اندر بیٹھے ہی اس کے شوہر نے ایک خوب صورت سا کیک اسے پیش کیا۔ ”مجھے امید نہیں تھی کہ آپ خود مجھے لینے آئیں گے۔“ بیکتھام کس نے مسرور لہجے میں اپنی خوشی کا اظہار کیا۔ ”ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ میں خود نہیں لینے نہیں آتا۔ اصولاً تو مجھے گاڑی سے باہر نکل کر نہیں دیکھ کرنا چاہیے تھا لیکن صرف اس ڈر سے باہر نہیں نکلا کہ پھر لوگوں کا رش لگ جائے گا اور ہمارا نام پر ہوں پہچانا مشکل ہو جائے گا۔“ وہ اسے وارفتگی سے کتکتے ہوئے بولا تو وہ تھوڑا سا شرمائی اور تلخی انداز میں سر کو جنبش دے کر مسکرائے لگی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ غلط نہیں کہہ رہا ہے۔ وہ اتنا ہی مقبول اور ہر دل عزیز تھا کہ اگر کوئی اس کی ایک جھلک بھی دیکھ لیتا تو وہاں لوگوں کا جھوم لگ جاتا۔ اسی لیے تو اتنی احتیاط برتی تھی کہ بیونی سیلون والوں تک کو تنبیہ کر دی تھی کہ کسی کو اس بات کی خبر نہ ہونے پائے کہ اس کی دلہن وہاں تیار ہو رہی ہے۔ وہ کوئی عام بیونی سیلون نہیں تھا۔ شوہر کی دنیا کی بڑی بڑی شخصیات خاص تقریبات کے لیے وہاں سے تیار ہونا پسند کرتی تھیں اور سیلون کی مغربوں تک چڑھی بالک جو اپنے اسٹاف کو سیلون سے ہٹ کر کہیں اور بھیجے کی قائل نہیں تھی کسٹمرز کی خواہش پر اس امر کو یقینی بناتی تھی کہ جو نہ چاہے اس کی یہاں موجودگی کا کسی کو علم نہ ہو نہ پائے چنانچہ وہ بھی نہایت رازداری سے یہاں سے تیار ہو کر روانہ ہو رہی تھی۔ ”تم اتنی حسین لگ رہی ہو کہ میرا دل چاہ رہا ہے کہ آج کی پارٹی کینسل کروں اور جنہیں ساتھ لے کر کہیں غائب ہو جاؤں۔“ اپنا پایاں بازو اس کی کمر کے گرد حاصل کر کے اسے خود سے قریب کرتے ہوئے وہ غمور سے لہجے میں بولا تو وہ اگلی نشستوں پر موجود ڈرائیور اور گاڑی کی موجودگی کے باعث ذرا سا گھبرا گئی لیکن وہ دونوں تو یوں بیٹھے تھے جیسے پتھر کے دو ٹکسے ہوں اور انہیں پیچھے موجود افراد کی حرکات و سکنات کا سرے سے علم ہی نہ ہو۔ ان کا یہ انداز دیکھ کر وہ قدرے مطمئن ہوئی اور خود سہر دگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے محبوب شوہر کے شانے سے سر نکالیا۔

☆☆☆

”آپ مجھے ہر انہیں کتے ٹھیک بھائی۔ میں اسکول

کے زمانے سے بیڑ مشین کھیل رہی ہوں اور اس وقت بھی اپنے کالج میں سب سے بہترین کھلاڑی ہوں۔“ کھیل کو ایک خوب صورت ریٹرن دیتے ہوئے اس نے چپکنی ہوئی آواز میں اسے چیلنج کرنے کے انداز میں کہا تو اس کے لیے میں ہمواریت کے باعث کھیل کو تسلیم کرنا پڑا کہ واقعی وہ درست کہہ رہی ہے اور اس کا اسٹینڈا غضب کا ہے جبکہ خود اس کا یہ حال تھا کہ سانس بری طرح پھولنے لگا تھا اور اسے جیتنا تو دور اسکو برابر کرنے کا بھی امکان نظر نہیں آ رہا تھا۔ کھیل، صباحت کے بڑے ماموں کا بیٹا تھا۔ وہ ایم اے صحافت کر رہا تھا۔ اس کے سانولے چہرے پر بچی بڑی بڑی آنکھیں اس کی ذہانت کا اعلان کرتی تھیں۔ اس کے بارے میں گھروالوں کا کہنا تھا کہ وہ گھر سے زیادہ باہر پایا جاتا ہے لیکن ان لوگوں کی بھارت آمد کے بعد سے یہ رائے غلط ثابت ہو رہی تھی اور وہ اپنی یونیورسٹی کے اوقات کے علاوہ مہمان داری کے تقاضے نبھانے کے لیے زیادہ تر وقت گھر پر ہی گزارتا تھا البتہ اس حقیقت سے بھی وہ خود ہی واقف تھا کہ یہ مہمان داری کے تقاضوں سے زیادہ اس کشش کا تقاضا تھا جو وہ صباحت کے لیے اپنے دل میں محسوس کرتا تھا۔ پسندیدگی کا یہ جذبہ کوئی آج کا نہیں تھا۔ وہ بچہ ہی صباحت کو دیکھ کر ہی وہ اسے پسند کرنے لگا تھا لیکن بھی اس پسندیدگی کے اظہار کی جسارت نہیں کرتی تھی۔ اسے کسی اظہار کے لیے وہ مناسب وقت کا منتظر تھا اور اس کے خیال میں مناسب وقت وہی ہو سکتا تھا جب صباحت اور وہ ایک دوسرے کے روبرو ہوں۔ ان لوگوں کو دہلی پہنچے ہوئے دو دن ہو گئے تھے اور ان دونوں میں دن کا بیشتر حصہ گھر پر گزارنے کے باوجود وہ ایسا کوئی موقع تلاش نہیں کر سکا تھا اور دل کا یہ عالم تھا کہ اسے روبرو پا کر اظہار محبت کے لیے چلا جا رہا تھا۔ اس بار آئیہ اپنے خاندان کے ساتھ پورے پانچ سال بعد دہلی آئی تھیں اس لیے ادھر ادھر بٹھرے بہن بھائی ان کے استقبال کے لیے آ پائی گھر میں آجیح ہوئے تھے اور اس جھوم میں دل کی بات کرنے کی گنجائش کیسے کھل سکتی تھی چنانچہ فی الحال وہ دید پر ہی گزارہ کر رہا تھا اور اس کی کوشش ہوئی تھی کہ صباحت کو زیادہ سے زیادہ نظروں کے سامنے رکھ سکے۔ کل رات گفتگو کے دوران جب راحت اور وائٹ کی زبانی اسے اس بات کا علم ہوا کہ صباحت بیڑ مشین کی ایک اچھی کھلاڑی ہے تو فوراً ہی اسے مقابلے کی دعوت دے دی۔ وہ خود اوسط درجے کا کھلاڑی تھا پھر بھی اس کا خیال تھا کہ ایک نازک ہی لڑکی میں

بھلا کہاں اتنا اسٹینڈا ہوگا کہ اس کا مقابلہ کر سکے۔ فوراً ہی مقابلے کا وقت طے ہو گیا اور سرشام جملہ نوجوانوں کی ٹوٹی اس مقابلے کو دیکھنے کے لیے گھر کے کچھوڑے جمع ہو گئی۔ اس موقع پر کھیلنے نے فراؤز کے ساتھ ہاف آسٹیوں والی سفید ٹی شرٹ پہن رکھی تھی اور خاصا وجہہ رنگ رہا تھا۔ صباحت کے پاس کھیل کے حساب سے لباس نہیں تھا چنانچہ اس نے اپنے عام استہلال کے کپڑوں میں سے ہی سفید رنگ کا ایک ایسا لباس منتخب کر لیا تھا جو چست چوڑی وار یاغچاے اور گھٹنوں سے قدرے اونچی نہیں پر مشتمل تھا۔ فیص جی آسٹین ہاف تھیں اور اس کے گلے اور دائر پر آنے سے اپنے ہاتھوں سے نازکی کی گڑھا جاتی تھی۔ یہ لباس صباحت نے چند ماہ قبل ہی کالج کے ایک فٹکشن میں شرکت کے لیے ضد کر کے بنوایا تھا اور آئندہ دو بارہ اسے نہیں پہننے دیا تھا کہ وہ چاہتی تھی کہ بھارت جاتے ہوئے نئیوں بچوں کے پاس معقول ملبوسات کا مناسب ذخیرہ موجود ہو۔ آج اتنے دنوں بعد صباحت نے وہ لباس پہنا تو اسے احساس ہوا کہ اس کا جسم پہلے کے مقابلے میں ٹھوڑا بھر گیا ہے جس کی وجہ سے لباس اسے قدرے چست ہو رہا ہے لیکن اس کے خیال کے مطابق یہ اتنا بھی چست نہیں تھا کہ پہنانا چاہیے۔ ویسے بھی مقابلے کے لیے طے شدہ وقت ہو چلا تھا اور ہر اچھے اسپورٹس مین کی طرح وہ وقت کی پابندی کو اہمیت دیتی تھی۔ کھیل کے مقابل ٹیٹ کی دوسری طرف کھڑے ہو کر اس نے دوپٹے کو اسٹول کی شکل میں دائیں کندھے پر ڈالا اور اس کے دونوں سرے بائیں جانب کمر پر لے جا کر باندھ دیے۔ دوسرے ہی لمحے وہ کھیل میں بری طرح منہمک ہو چکی تھی اور اسے ذرا بھی احساس نہیں تھا کہ اس کا سفید رنگ کا چست لباس ایک روم کے ساتھ حرکت کرتے اس کے جسم کو کتنا نمایاں کر کے دکھا رہا ہے۔ اس کے بہن بھائی اور دوسرے کم عمر کنز کی تو خیر اس طرف توجہ نہیں دیتی تھی اور وہ صرف اور صرف کھیل سے لطف اندوز ہو رہے تھے لیکن جو بالغ اور ہوش مند تھے وہ اپنی تمام تر شرافت کے باوجود نظریں اس کے وجود پر پھسلنے سے خود کو روکنے میں ناکام تھے۔ اس کے مقابل موجود کھیل کو بھی یقین تھا کہ اس کی اچھل پھٹل ہوتی سانسوں کے پیچھے زیادہ دل صباحت کے وجود کی دلکشی و رعنائی کا تھا ورنہ وہ اتنا بھی کچا کھلاڑی نہیں تھا۔

”میں ایک بار پھر آپ کو بتا رہی ہوں کھیل بھائی آپ مجھے ہرا نہیں سکتے۔“ کھیل کی پانچویں سانسوں کو محسوس کر کے وہ

شوخی سے چلائی۔ ویسے کھیل شروع ہونے اب اتنی دیر ہو چکی تھی کہ خود اس کے ماسموں سے بھی پسینا پھوٹنے لگا تھا جو اس کے چست لباس کو مزید جسم سے چپکار ہاتھا۔ ”گھر مت کرو میں تم سے ہار کر بھی خوش محسوس کروں گا۔“ کھیل کو یہ حال دل سانے کا ایک موقع میسر آیا لیکن وہ اس کی بات کی تہ میں پہنچے بغیر کھلکھلا کر ہنسی اور شوخی سے بولی۔ ”یہ تو انقلاب ہے بھئی کہ بھارت، پاکستان سے ہار کر کھلے دل سے تسلیم کرنے کو تیار ہے ورنہ ہار کر تو یہاں والوں کی شکلیں ایسی مانگی ہو جاتی ہیں کہ لگتا ہے ابھی دھاڑیں مار کر روتے ہوئے سین پٹنا شروع کر دیں گے۔“ ”یا ہوو۔۔۔ صبا آپ جیت گئیں۔“ کھیل شاید اس کی بات سننے میں زیادہ ہی منہمک ہو گیا تھا کہ اس کے شارٹ کے جواب میں ریٹرن نہ دے سکا اور فٹل زمیں یوں ہو گئی۔ اس منظر کو دیکھتے ہوئے سب سے پہلے راحت نے نعرہ لگایا اور پھر باقی چھوٹے بڑے بھی اس کے ساتھ شامل ہو گئے۔ وہاں اچھا خاصا شور مچ گیا۔ آئندہ جو کسی کام سے ڈرائنگ روم میں بھی محفل چھوڑ کر پھسلے کرے میں ان آوازوں کو سن کر چوٹیں اور کھڑکی کھول کر کچھوڑے کے احاطے میں چھانکا۔ شور مچ کر نئی نوجوان پارٹی میں ان کی لگا ہوں نے تھمتاتے چہرے والی صباحت تک فوراً رہی رسائی حاصل کر لی اور ان کا چہرہ بیٹی کے چہرے سے زیادہ تھمتا اٹھا۔

”صباحت فوراً اندر میرے پاس آؤ۔“ انہوں نے وہیں سے بلند آواز میں اسے پکار کر قہقہہ صادر کیا۔ ان کے لیے کی تھی کہ صباحت سمیت ہر ایک نے محسوس کیا۔ صباحت تو بولکھائی گئی اور جس حال میں بھی جاگ کھڑی ہوئی۔ منٹ بھر کے اندر وہ پریشان ہی ان کے روبرو ہوئی۔

”تم میں ٹھوڑی بہت شرم و حیا ہے یا نہیں؟ بہت اچھا لگ رہا تھا وہاں ننھے بچوں کی طرح کد کڑے لگاتے ہوئے۔“ انہوں نے فوراً ہی اسے آڑے ہاتھوں لیا۔

”وہ۔۔۔۔۔ امی۔۔۔۔۔ کھیل بھائی نے مجھے چیلنج دیا تھا کہ میں اگر اتنی اچھی کھلاڑی ہوں تو انہیں ہار کر دکھاؤں سو سب کے اصرار پر میں نے ان کے ساتھ ایک میچ کھیل لیا لیکن آپ اتنی فحاشیوں ہو رہی ہیں؟ میں تو بچپن سے ہی گیم کھیل رہی ہوں اور آج سے پہلے بھی آپ نے اعتراض نہیں کیا۔“ اس کے لیے ماں کا رویہ ناقابل فہم تھا چنانچہ وضاحت دیتے ہوئے تھوڑی سی جھٹ بھی کر بیٹھی۔

”مع اس لیے نہیں کیا کہ تم اسکول اور کالج میں لڑکیوں کے ساتھ کھلتی رہی ہو اور یہاں لڑکیوں کے بھی موجود تھے

بلکہ تم صلی ہی ایک لڑکے کے ساتھ رہی تھیں۔“ آئندہ بیگم نے دانت چپکا کر اپنی ناراضی کی وجہ ظاہر کی۔ ”سو واٹ۔۔۔ وہ سارے گھر ہی کے تو لوگ ہیں اور میرے لیے بالکل بھائیوں جیسے ہیں۔“ اس نے شانے اچکاتے ہوئے۔۔۔۔۔ بے پروائی سے جواب دیا جیسے خود پر عائد کی جانے والی فرد جرم بالکل فضول محسوس ہو رہی ہو۔ ”تم اب اتنی بچی نہیں رہی ہو صبا کہ معاملات کی نزاکت کو نہ سمجھ سکو۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ بھائی صبا ہونے اور بھائی ہونے میں بہت فرق ہوتا ہے اور تم جس طبقے میں ہو اس میں تو سگے بھائی کے سامنے جاتے ہوئے کوئی باجیا لڑکی حجاب محسوس کرے گی۔“ انہوں نے ایک دم اسے بازو سے قہقہہ کر پانی وضع کی الماری میں جسے قد آدم آئینے کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا۔ آئینے کے مقابل کھڑے ہو کر صبا کو احساس ہوا کہ ذرا چست محسوس ہونے والا لباس حقیقت میں اچھا خاصا چست ہو رہا ہے اور رہی بھی کسر لباس کو جسم سے چپکا دینے والے پسینے نے پوری کر دی ہے۔ جہاں جہاں سے لباس چپکا ہوا تھا وہاں وہاں سے اس کے جسم کی گوری رنگت جھلک رہی تھی۔ اگر وہ پٹا پھیلا کر اوڑھا گیا ہوتا تو پھر بھی کچھ بچت ہو جاتی لیکن وہ تو ایک شانے سے لگا کر پھر بندھا ہوا تھا اور پٹا کوئی حق ادا کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ اس نے آئینے سے نظر ہٹا کر ماں کی طرف دیکھنا چاہا لیکن وہ وہاں موجود نہیں تھیں اور اسے آئینے کے مقابل شرمندہ ہونے کے لیے تہا چھوڑی تھیں۔

☆☆☆

”یہ مسز مہتا ہیں بہت بڑے فلم پروڈیوسر۔ تم نے ان کی فلمیں دیکھ رکھی ہوں گی۔ میرے کئی گیت ان کی فلموں میں شامل رہے ہیں۔ انہیں بالی وڈ میں لیکر اور فوج میکر کے ناموں سے پکارا جاتا ہے کیونکہ جس اداکار، شاعر، گلوکار اور موسیقار کو ایک بار ان کے ساتھ کام کرنے کا موقع مل جاتا ہے وہ کامیابی کی سیڑھی چڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ مجھے یہاں تک لانے میں ان کا بہت بڑا رول ہے۔“ وہ دونوں استقبال پر کھڑے آنے والے مہمانوں کا خوش دلی سے استقبال کر رہے تھے اور اس کا شوہر سندر آنے والوں کی مبارک بادیں قبول کرنے کے ساتھ ساتھ ان کا اس سے مختصر تعارف بھی کروا رہا تھا۔ چھوٹی ڈائری والے قیتی لباس میں موجود ادیبہ عروس کا تعارف کر دیتے ہوئے اس نے یہ جملے ادا کیے تو اس نے غور سے اس شخص کو دیکھا۔ اس شخص کا نام اس کے لیے اجنبی نہیں تھا اور نہ ہی وہ اس کے

لیے دی جانے والی اس رائے سے ناواقف بھی جوابی ایسی سندر نے دی تھی لیکن سندر کا برملا اعتراف سن کر اسے خوشی ہوئی تھی۔ صاف گوئی اور احسان شناسی کی یہ خصوصیات ہر ایک میں نہیں پائی جاتیں۔ وہ سمجھتی تھی کہ یہ اوصاف صرف ان ہی لوگوں میں ہوتے ہیں جو مضبوط کردار اور شخصیت کے مالک ہوں چنانچہ سندر کو ایسا یا کر اسے بہت اچھا لگا تھا اور اس کے دل میں سندر کی محبت کچھ اور بڑھ گئی تھی۔

”میری تعریفوں کو چھوڑو سندر مجھے دشواری ہے کہ آج کے دن تمہاری جتنی سے زیادہ تعریف سننے کا ادھر کا رسی کو نہیں ہوسکتا۔ اتنی سندر تار کے ساتھ کھڑے آج تم جج سندر لگ رہے ہو۔“ مہتاب نے اپنی غور نگاہوں سے اس کا انگ انگ تولتے ہوئے یہ کمٹس پاس کیے تو سندر زوردار قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ وہ جو آئینے کی گواہی کے بعد لوگوں کی زبانی اپنے حسن کی تعریفیں سن کر تازاں ہو رہی تھی۔ ان نگاہوں سے تھوڑی جڑ بڑھوئی لیکن اس دنیا کے اخلاقی تقاضے بھانے کے لیے سکڑانے لگی۔ اسے معلوم تھا کہ یہ فلم نگری کے لوگ ہیں اور ان کی نگاہیں اور زبانیں اظہار کے معاملے میں عوام لوگوں کے مقابلے میں ڈرا زیادہ ہی بے باک ہوتی ہیں اس لیے اس کے پاس برامانے کی گنجائش نہیں۔ سندر سے شادی کے نتیجے میں اس کی زندگی میں جو انقلاب رونما ہوا تھا اس کے ساتھ ایڈجسٹ کرنے کی وہ بھرپور کوشش کر رہی تھی۔ اگر ایسا نہ کرتی تو یہاں سندر کے پہلو میں کھڑی آنے والے مہمانوں کا استقبال کیسے کرتی کہ اس کی کلاس میں تو ویسے کی دہن کے یوں کھلے سر کے ساتھ چلنے پھرنے اور پیر پٹا میں کرنے کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا تھا اور استقبال پر کھڑے ہونا تو دور کی بات وہ آج پریٹھے ہوئے بھی کھل کر کسی سے بات نہیں کر سکتی تھی کہ تقریب میں شامل جملہ خواتین کی طرف سے بے جا جانی و بے شری کا الزام فوراً عائد کر دیا جاتا لیکن یہاں کون تھا جو اسے یہ الزام دیتا۔ یہاں تو وہ کوئین آف دی ایونٹ تھی اور اسے اپنے ہر عمل میں آزادی حاصل تھی۔

”ایسا لگتا ہے سندر کہ آپ بات بہت کم کرتی ہیں۔“ مہتاب کی آواز اسے اپنے خیالوں کی دنیا سے باہر کھینچ لائی۔ ”ایسی بات نہیں ہے کہ مہتاب صاحب ہم پہلی بار مل رہے ہیں نا اس لیے تھوڑی سی ہیزی ٹیشن ہے۔“ اس نے مسکرا کر فوراً وضاحت دی۔

”یعنی اور کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں کے بعد۔“ مہتاب نے قہقہہ لگا کر ہمارکس پاس کیے اور اس پر ایک

اور پرشکوہ نظر ڈال کر آگے بڑھ گیا۔ وہ کسی سندر کے ساتھ مزید آنے والے مہمانوں کے استقبال میں مصروف ہو گئی۔ مہمانوں کی آمد کا سلسلہ تھا تو محفل کا اصل رنگ بننے لگا۔ میوزک، ڈانس، ہلاکلا، شراب کی ایک کے بعد ایک کھلی بوتلیں یہ سب کچھ کہاں اس کے لیے مانوس تھا۔ ان چیزوں کو اب تک اس نے اسکرین کی حد تک ہی دیکھا تھا اور کمان نہیں تھا کہ ایک دن وہ خود اس دنیا کا ایک حصہ ہوگی۔ عجیب عالم خواب میں وہ یہ سب دیکھ رہی تھی اور خود کو اس باجول سے ہم آہنگ رکھنے کی بھرپور جدوجہد بھی کرتی جا رہی تھی۔ اس کے باوجود اس کی ہتھیلیاں پیسے سے جھنجھکی جا رہی تھیں اور اسے اعتراف تھا کہ اگر سندر نے اسے اپنے بازو کے حصار میں نہ لے رکھا ہوتا تو اس کے لیے وہاں کھڑا رہنا دشوار ہو جاتا۔ ذرا سی ہمت اور بروقت فیصلے نے اسے کہاں سے کہاں لا کھڑا کیا تھا۔ وہ سوچتی تو دنگ رہ جاتی۔ آج کی تقریب کے لیے جن ڈیزائنرز نے اس کی جیولری اور لباس تیار کیا تھا ان کے ناموں سے بھی اس کے طبقے کی شاید چند خواتین ہی واقف ہوں گی۔ یہ تقریب جس سیون اسٹار ہوٹل میں ہو رہی تھی اس تک رسائی کا تو کوئی تصور ہی نہیں کر سکتا تھا اور یہ تقریب اپنی نوعیت کے اعتبار سے کتنی خاص تھی اس کا اندازہ اس بات سے لگا یا جاسکتا تھا کہ سندر نے تقریب کی ویڈیو اور فوٹو گرافی بنانے کے حقوق بھاری معاوضے پر صرف ایک ایسے نیوز گروپ کو دیے تھے جو بیک وقت الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا پر چھاپا ہوا تھا۔

”کل جب اس تقریب کے ٹکٹس اور تصویریں ٹی وی اور نیوز چینل کے ذریعے منظر عام پر لائیں گے تو ان سب کا کیا حال ہوگا؟“ نہ چاہتے ہوئے بھی یہ خیال اس کے ذہن میں آیا تو دل پر گھبراہٹ کی طاری ہونے لگی اور کمرہ میں کے اصرار کے باوجود وہ فون پر مسکراہٹ چھپا کر پڑ گئی۔

”کیا ہوا اتنی تھک گئی ہو گی؟“ سندر کی نظروں سے اس کی یہ کیفیت چھپی نہ رہ سکی اور وہ فوراً جھک کر سرگوشی میں گلہ مندی سے پوچھنے لگا۔

”بس تھوڑا سا لیکن ڈوونٹ وری، میں بیچ کر لوں گی۔“ اس نے فوراً ہی خود کو تسلیانے کی کوشش کی اور ارد گرد پھیلے رنگ و بو کے سیلاب نے جلد اسے اس کوشش میں کامیاب بھی کر دیا۔

☆☆☆

”جانے کیا مجھ سے صفائی کو نصف ایمان قرار دینے والی قوم کے ہاں ہی صفائی کا سب سے زیادہ فقدان پایا

جاتا ہے۔“ چکن کی سفید چادر اوڑھے جامع مسجد دہلی کی پہلی سڑکی پر قدم رکھتے ہوئے آمنہ بیگم نے نہایت ڈسوزی سے تبصرہ کیا۔ ان کے اس تبصرے کے پیچھے وہاں غیر معیاری صفائی کا انتظام تھا۔ سڑکیوں کے بالکل نیچے اور آس پاس خاصا کوڑا کرکٹ نظر آ رہا تھا اور اس کوڑھے میں بٹی بٹی خوراک کے بھی کیڑا شامل تھے جن کے حصول کے لیے وہاں آوارہ کتے گھومتے پھر رہے تھے۔

”یہ تو تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو۔ وہاں اپنے لاہور میں بھی کتنی تاریکی عمارتیں اور مقامات ہیں جو حکام کی بے توجہی کی وجہ سے گلست و ریتخت کا شکار ہیں اور کچھ زیادہ وقت نہیں جا تا کہ ہم اپنے اسلاف کے اس ورثے سے محروم ہو جائیں گے۔“ نجم الدین نے ان کے ساتھ سبز حلیاں چڑھتے ہوئے جوانی تبصرہ کیا۔

”لیکن یہاں ایسا نہیں ہے پھوپا جان۔ انڈین گورنمنٹ تاریخی ورثے کی حفاظت کے لیے خاصی سرگرم رہتی ہے اور ہر سال اسی وجہ سے کثیر زر مبادلہ بھی کمائی ہے۔“ ٹھیکل نے ان کی گفتگو میں دخل دیتے ہوئے گویا بھارت کی بڑائی جتانے کی کوشش کی۔

”جی ہاں اس میں تو کوئی شک نہیں کہ آپ کی گورنمنٹ سیاحت کے شعبے سے ہر سال کثیر زر مبادلہ کمائی ہے لیکن اسلامی ورثے سے ان کا متصب رویہ بھی واضح ہے۔ شاہ جہاں کی تعمیر کردہ اس اتنی بڑی تاریخی مسجد کا ناقص انتظام اس کا ثبوت ہے اور تو اور آپ لوگوں نے تو تاج محل جیسے عجائبات زمانہ میں شامی تعمیر کے نادر نمونے کو بھی ڈھنگ سے سنہال کر نہیں رکھا۔ میری معلومات کے مطابق تو تاج کی وہ دو دھپا رنگت دن بدن ماند پڑتی جا رہی ہے اور بڑھتی ہوئی فضا کی آلودگی نے اسے خاصا میلا میلا سا کر دیا ہے۔“ یہ صاحت تھی جس نے تیز سمجھ میں حقائق کا اظہار کر کے ٹھیکل کی بڑی کا اثر زلزل کر دیا تھا۔

”ذرا آہستہ بولے محترمہ کہیں آپ کا یہ کفن بھاڑ کر بولنا ہمیں کسی مصیبت میں نہ پھنسا دے یہاں سیکوری کے حساس آلات اور کمرے وغیرہ لگے ہوئے ہیں۔“ ٹھیکل نے ذرا گھبرا کر اس کا ویلوم کم کرنے کی کوشش کی۔ جواب میں وہ اس پر طنز کا کوئی اور تیر چلاتی اس سے ٹھل نجم الدین نے بھی تبصرہ کیا۔

”ٹھیکل میاں ٹھیک کہہ رہے ہیں بیٹا۔ ہم پردیس میں ہیں اور ہمیں اپنے رویوں میں محتاط رہنا چاہیے۔“ ان کے ٹوکنے کے بعد اس کے پاس مزید بولنے کی گنجائش نہیں تھی

چنانچہ منہ بنا کر خاموش ہو گئی۔ اندر سے مسجد اچھی طرح گھوم پھر کر دیکھنے کے بعد وہ اس کے وسیع محن میں آگئے جہاں آمنہ بیگم سمیت سب نے دعا کے لیے ہاتھ بلند کر دیے۔ حقیقتاً اس وقت وہ لوگ آمنہ بیگم کی فرمائش پر ہی جامع مسجد دہلی کی زیارت کے لیے آئے تھے۔ انہیں یہ مسجد بہت اچھی لگتی تھی اور ہر بار دہلی آمد پر ان کی خواہش ہوتی تھی کہ مسجد کا ایک چکر ضرور لگائیں لیکن اتفاق سے پچھلی بار ان کا یہاں آنا نہیں ہوسکا تھا اس لیے وہ خاصے طویل وقفے کے بعد اس مسجد کو دیکھ رہی تھیں۔ مسجد سے نکل کر انہوں نے عین مقابل موجود ٹھیکل کے بازار کا رخ کیا۔ یہ پرانی دہلی کا مصروف ترین بازار ہے جہاں دنیا بھر کا سامان فروخت ہوتا ہے۔ صباحت اور راحت نے مصنوعی زیورات سے اٹاٹے بھری دکانوں میں سے کئی سے اپنے لیے کئی خوب صورت زیورات منتخب کر کے خریدے۔ آمنہ بیگم نے بھی پاکستان میں موجود عزیز واقارب کے لیے تحفے لے جانے کو کچھ چیزیں منتخب کیں۔ وائٹ کونجی الیکٹرانک کی چند چیزیں پسند آئیں۔ خریداری کے اس سلسلے نے آمنہ اور نجم الدین کو خاصا تھکا دیا تھا البتہ لڑکیوں کے جوش و خروش میں کچھ خاص فرق نہیں آیا تھا۔ وہ یہ مشکل منہ بسورنی ہوئی قریبی ریسٹوران جانے کے لیے راضی ہوئیں۔ اس ریسٹوران کا مالک مسلمان تھا چنانچہ انہوں نے بلا جھجک خوب ڈنٹ کر کھا یا پیا، کھانے پینے کے بعد آمنہ بیگم نے گھر واپس چلنے کی خواہش کی لیکن لڑکیاں سر ہو گئیں کہ انہوں نے لال قلعہ دیکھنا ہے آخر نجم الدین نے ہی اس مسئلے کا حل نکالا۔

”ایسا کرتے ہیں کہ میں اور آمنہ واپس گھر چلے جاتے ہیں۔ تم لوگ ٹھیکل میاں کے ساتھ جا کر لال قلعہ دیکھاؤ۔“ ”یہ بالکل ٹھیک رہے گا۔“ ٹھیکل کی چھوٹی بہن مہوش نے سب سے پہلے تائید کی پھر باقی بھی اس کے حق میں اپنا ووٹ ڈالتے چلے گئے یوں ریسٹوران سے نکل کر آمنہ اور نجم الدین تو گھر کے لیے روانہ ہو گئے جبکہ وہ سب ٹھیکل کی معیت میں ایک آٹورکسٹ میں سوار ہو کر لال قلعے کی طرف عازم سفر ہوئے۔ وہ تعداد میں کل چھ تھے جن میں ان تینوں بھائی بہنوں، ٹھیکل اور اس کی چھوٹی بہن مہوش کے علاوہ چھوٹے ناموں کی سبیل بھی شامل تھی۔ سبیل تقریباً صباحت کی ہم عمر ہی تھی اس لیے وہ دونوں زیادہ تر ساتھ ساتھ رفتی تھیں۔ راحت کی مہوش سے اچھی بننے کی تھی جبکہ وائٹ بے چارہ عمر کے واضح فرق کے باوجود ٹھیکل کے ساتھ رہنے پر مجبور تھا کہ لڑکیاں تو اسے لفٹ ہی نہیں کرواتی تھیں۔ لال

قلعہ پہنچ کر انہوں نے سرخ اینٹوں سے تعمیر کردہ قلعے کی طویل بیرونی فصیل دیکھی تو مبہوت رہ گئے۔ باقی قلعہ بھی انہیں بے حد پسند آیا۔ خصوصاً قلعے میں قائم کردہ تین عجائب گھروں کو دیکھ کر تو وہ دنگ رہ گئے۔ ان عجائب گھروں میں تاریخی واقعات کو مجسموں کی شکل میں محفوظ کیا گیا تھا۔ یہیں پانی پت کا میدان اس تھا تو کہیں جنگ آزادی کو مجسم کر دیا گیا تھا۔ ان عجائبات کو دیکھ کر صاحت کول میں تسلیم کرنا پڑا کہ بھارتی حکومت اپنے تاریخی ورثے کو سنبھالنے میں اتنی بھی بے پروا نہیں ہے۔ وہ آنکھوں میں بے پناہ اشتیاق لیے یہ سب دیکھ رہی تھی اور ان پر شوق لگا ہوں ہے بے نیاز تھی جو صرف اور صرف اسی کا احاطہ کیے ہوئے تھیں۔ اس نے سرخ چوڑی دار پانچائے پر انگریز رنگ کی کٹیوں والی فراک پہن رکھی تھی۔ کٹیوں پر سرخ رنگ کے دھاگے سے مشینی کڑھائی کی نازک سی تیل بنی ہوئی تھی اور سرخ اور انگریز رنگوں کے امتزاج کا بڑا سادہ پٹا جو اوڑھا تو سر پر کیا تھا لیکن جانے کب پھسل کر شانوں پر آگرا تھا۔ اسے کسی مغل شہزادی کی یاد دل رہا تھا۔ ٹھیکلے فلم جو دھا اکبر دیکھ رکھی تھی۔ اس فلم میں ایٹور یارائے نے جو دھانی کا کردار ادا کیا تھا اور فلم کی زیادہ تر عکس بندی اسی لال قلعے میں ہوئی تھی لیکن وہ شرط یہ کہہ سکتا تھا کہ ایٹور یا کے مقابلے میں صاحت زیادہ خوب صورت لگ رہی تھی۔ اب معلوم نہیں یہ اس کا حسن نظر تھا یا حقیقت بہر حال اس کا دل تو صاحت کو ہی سب سے زیادہ خوب صورت قرار دے رہا تھا۔ یہاں اسے اس کی دید کا موقع بھی مل رہا تھا۔ اس کے سارے مراعی عجائبات میں بھوئے ہوئے تھے اور وہ خود اس کی دید میں گھر میں تو بڑوں کی موجودگی کے احترام میں اسے اپنی نظروں کو بھی قابو میں رکھتا پڑتا تھا۔ یہاں اس کے شوق کا یہ عالم تھا اور حسن بے نیاز سبیل سے باتوں میں تم اپنی ذات سے بھی بے پروا تھی۔ شانوں پر دھرا ملکی دوپٹا کب پھسل کر اس حد کو پہنچا کہ اس کا ایک پلو زمین پر لڑنے لگا اسے خبر ہی نہیں ہوئی۔ ٹھیکل چپکے سے آگے بڑھا اور زمین کو چومنے اس کے دوپٹے کو اپنے ہاتھ میں تھاما۔ اسی لمحے اس نے قدم آگے بڑھائے لیکن دوپٹے کا پلو ٹھیکل کی گرفت میں ہونے کے باعث اسے جھٹکا سا لگا۔ اس نے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا اور پلو ٹھیکل کی گرفت میں دیکھ کر اس کی آنکھوں میں ٹھیکل کا تاثر ابھرا۔

”کسی کو روکنے کا یہ کون سا طریقہ ہے؟ آپ مجھے آواز بھی دے سکتے تھے۔“ آنکھوں کی طرح اس کے لیے

میں بھی ٹھیکل تھی۔ ٹھیکل کو یا کسی سحر سے آزاد ہوا اور جواباً خود بھی لہجے میں ٹھیکل سموتے ہوئے بولا۔

”مجھے آپ کو اس طرح روکنے کا کوئی شوق نہیں ہے محترمہ۔ میں صرف آپ کے اس دوپٹے کو میلا ہونے سے بچانا چاہتا تھا جو پورے قلعے کی جھاڑو دینے پر تلا ہوا ہے۔“ ٹھیکل کا یہ جواب سن کر وہ تجوڑی سی خفت کا شکار ہوئی اور آہستہ سے شکر یہ کہہ کر اپنا دوپٹا سمیٹ لیا۔ وہ سبیل کی ہر اسی میں دو قدم آگے بڑھی تو ٹھیکل نے اپنے دائیں ہاتھ کو بڑی چابوت سے ہونٹوں کے ساتھ لگا لیا۔

☆☆☆

آنکھ کھلنے پر اس نے اپنے پہلو میں دیکھا۔ سندر وہاں موجود نہیں تھا لیکن ٹھیکے پر رکھا کاغذ سبز رنگ کی مدہم روئی میں بھی صاف نظر آ رہا تھا۔ اس نے ایک زوردار انگڑائی لی اور ہاتھ بڑھا کر کاغذ اٹھالیا۔ کاغذ پر درج تحریر پڑھنے کے لیے اسے سائز ٹیبل پر رکھا لیپ روشن کرنا پڑا تھا۔

”شوٹنگ کے لیے جا رہا ہوں۔“ واپسی میں دیر ہو جانے کی تم ذکر کر لیتا۔“ کاغذ پر لکھا یہ مختصر پیغام اسی کے لیے تھا۔ پیغام پڑھ کر اس نے لیپ بچھا دیا اور کچھ دیر بستر پر کسیندی سے پڑے رہنے کے بعد آہستہ سے اٹھی اور اپنے ریشمی گاؤن کی ڈور یاں باندھتی کرے کے اس صے کی طرف بڑھی جہاں مگی فریج وینڈو سے شہر کا نظارہ کیا جاسکتا تھا۔ کمرے کو تاریک اور پرسکون رکھنے کے لیے وینڈو پر دبیز پردے پھیلا دیے گئے تھے۔ اس نے پردے کھینچ کر ہٹائے تو گویا عیبرس کی ساری روشنیاں اس کے کمرے میں چلی آئیں۔ وہ مبہوت سی دور تک نظر آنے والی ان جھگاتی روشنیوں کو دیکھتی رہی۔ اچھی کل ہی تو وہ سندر کے ساتھ اپنی مون کے لیے بیٹھ آئی تھی اور یہاں آتے ہوئے جہاز میں ہی سندر بڑے محذرت خوابانہ لہجے میں اسے بتا رہا تھا کہ اس کی فلم کا پائونٹ بھی عیبرس پہنچا ہوا ہے۔ اس کے مطابق فلم شیڈول پہلے سے طے شدہ تھا جبکہ ان کی شادی بالکل اچانک انجام پائی تھی اس لیے وہ پائونٹ کے ساتھ شوٹنگ پر جانے کے لیے مجبور تھا۔ دوسری طرف اسے اپنے اپنی مون کو لیٹ کرنا اور اس سے دور رہنا بھی گوارا نہیں تھا اس لیے اس نے اسے بھی اپنے ساتھ ہی عیبرس لے جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ بطور ہیر وہ سندر کی پہلی فلم تھی۔ اس سے قبل وہ شاعر، گلوکار اور موسیقار کی حیثیت سے اپنے آپ کو اچھی طرح منوا چکا تھا اور شہرت کی بلندیوں تیزی سے طے کرتا ہوا اس مقام پر پہنچ گیا تھا کہ فلم ساز اسے بخوشی منہ مانگا معاوضہ ادا کرنے کے

لیے تیار رہتے تھے۔ سندر کی عمر زیادہ نہیں تھی اور وہ تھا بھی خاصا خوش شکل اور اسارٹ اس لیے اگر سہانے اسے اپنی اس فلم میں ہیر کا سٹ کر لیا تھا تو کچھ ایسا غلط نہیں تھا۔ دیکھا جائے تو یہ فلم پوری طرح سندر کی تھی۔ فلم کے گانے لکھنے سے لے کر گلوکاری اور موسیقی تک ہر کام اسی کو کرنا تھا۔ وہ پرتھین تھا کہ بطور ہیر وہ خود کو منوالینے میں کامیاب ہو جائے گا۔ اس کے مقابل ہیر وٹن کا کردار ایک نئی اداکارہ ادا کر رہی تھی اس لیے دیکھا جائے تو فلم کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کا سارا بوجھ سندر کے شانوں پر ہی تھا اور وہ چاہتا تھا کہ اس کے سب سے فوریٹ فلم ساز مہتا کا یہ تجربہ کسی طور ناکام نہ ہونے پائے۔ ایک اچھی بیوی کی طرح اس نے شوہر کی ان مجبوریوں کو سمجھ لیا تھا اور اپنے ہر ممکن تعاون کی یقین دہانی بھی کر دیتی تھی۔ اپنے مہتا سے تعلقات کی بنیاد پر سندر نے اپنے لیے یہ خصوصی رعایت حاصل کر لی تھی کہ فلم پائونٹ کے ساتھ ٹھہرنے کے بجائے اس کے ساتھ علیحدہ ہوٹل میں ٹھہرے۔ اس طرح وہ اپنی پرسل اور پیلک لائف کو الگ الگ رکھ سکتا تھا۔ کل دن کا زیادہ تر حصہ انہوں نے طویل فلائٹ کی وجہ سے تھکے ہوئے ہونے کے باعث آرام کرتے ہوئے گزارا تھا اور سندر بس تجوڑی دیر کے لیے اسے دریا کی سیر کے لیے لے گیا تھا جہاں ایک ریستورنٹ میں انہوں نے ڈنر کیا تھا۔ آج صبح ناشتے کے بعد ہی وہ اپنے کام کے سلسلے میں چلا گیا تھا اور سہ پہر کو واپس آیا تھا۔ سارا دن پوریت میں گزارنے کے باوجود وہ اس سے شکوہ نہیں کر سکی تھی کہ یہ تو اسے معلوم تھا کہ ایک پیلک فکر کی لائف پائونٹ ہونے کی اسے یہ قیمت تو ادا ہی کرنی پڑے گی۔ ہوٹل واپس آنے کے بعد سندر نے اس سے تجوڑی دیر ہی بات چیت کی تھی پھر وہ آرام کی غرض سے لیٹ گیا تھا۔ بھارت اور عیبرس کے الگ الگ ٹائم زون میں ہونے کی وجہ سے اس کی اپنی بائیو ٹیکل کلاک بھی فی الحال عیبرس کے ٹائم کے ساتھ مطابقت نہیں پیدا کر سکی تھی چنانچہ دن دہاڑے وہ بے حد گہری نیند سوئی اور اب اٹھی تو سندر جاچکا تھا اور رات نے عیبرس میں اپنے پر پھیلا لیے تھے۔ کچھ دیر کھڑکی سے باہر کا نظارہ کرنے کے بعد اس نے ہاتھ روم کا رخ کیا اور جب وہاں سے باہر نکلی تو اس کے جسم پر نیلی جینز کے ساتھ ریڈی ٹی شرٹ بھی ہوئی تھی جو اس کی شہابی رنگت پر خوب چر رہی تھی۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اس نے ہلکا سا میک اپ کیا اور لمبے بالوں کو برش کر کے پونہی کھلا چھوڑ دیا پھر فرکار سرخ ہی مٹھر اپنی گردن کے گرد بٹھائی ہوئی

نیت پر آپ کی شادی کی خوشی میں مسٹر سندر کی طرف سے کئی دُعا پاری کی تصویریں دیکھی گئیں۔ میرا اپنا تعلق انڈیا سے ہے اس لیے وہاں کی خبریں دیکھی سے ڈھونڈتا، پڑھتا اور دیکھتا ہوں۔“ عاشر نے اس کے صبح چہرے کو دیکھتے ہوئے کچھ ایسے انداز میں یہ بات کی کہ وہ ہنس دی۔ سندر کے اپنی زندگی میں آنے کے بعد وہ اپنی قوتِ تخیل سے بہت اچھی طرح واقف ہو گئی تھی اور ہر شوق نگاہ کو اپنا حق سمجھ کر قبول کر لینے کی عادی ہوئی جا رہی تھی۔

”شاید آپ لوگ ہنی مون ٹرپ پر نکلے ہوئے ہیں لیکن ایسی صورت میں تو مسٹر سندر کو آپ کے ساتھ ہونا چاہیے۔“ اس کی بیزس میں موجودگی کی وجہ کا اندازہ لگا لینے کے بعد اس نے بڑی بے تکلفی سے اعتراض بھی جڑ دیا۔ ”اصل میں سندر کو شوٹنگ پر جانا تھا اس لیے میں اس وقت آپ کو تنہا نظر آ رہی ہوں۔“ قدرے کھیسے ہوئے اس نے اپنے تنہا ہونے کی وجہ بیان کی۔

”گویا ایک تیرے دو شکار کر رہے ہیں مسٹر سندر۔ ویسے ان جیسے مصروف انسان کے لیے ایسا کرنا ضروری بھی ہے۔ ایک طرف شو بیز کی مصروفیت دینا ہے تو دوسری طرف فائینو اسٹار ہوٹل کا انتظام۔ انہوں نے بیک وقت خود کو ایک اچھا آرٹسٹ اور بزنس مین ثابت کر دکھا یا ہے۔ یہ لہجہ ہے کہ آج کل کے اسٹارز اپنے فوج کو سیف کرنے کی فکر پہلے کرتے ہیں ورنہ پہلے تو جب تک شہرت ساتھ دیتی رہی عیش کرتے اور بعد میں وقت بدلنے پر برے حالوں میں رہنا پڑتا تھا۔ میں ایسے کئی اسٹارز سے واقف ہوں جو آج لوگوں کو یاد بھی نہیں ہیں۔“ وہ خاصا باتونی تھا اور اپنے اس باتونی پن میں اسے، ایک اہم اطلاع دے گیا تھا ورنہ وہ واقف ہی نہیں تھی کہ سندر کی فائینو اسٹار ہوٹل کا مالک بھی ہے۔

”آپ تو خاصی معلومات رکھنے والے بندے ہیں۔“ ”آج کے دور میں انسان کا باخبر رہنا ضروری ہے ورنہ بے خبری میں اپنا نقصان کر بیٹھتا ہے۔“ وہ مثنیٰ خیز لہجے میں بولا لیکن اس نے توجہ نہیں دی۔ اس کا ذہن سندر کے ہوٹل میں لگا ہوا تھا۔

”اچھا تو مسٹر باخبر فدا تو بتائیے کہ سندر کا یہ فائینو اسٹار ہوٹل کہاں ہے؟“ اسے تجسس نے بے سوال کرنے پر اکسایا جسے سن کر عاشر مسکرایا اور ذرا آگے کی طرف جھک کر پوچھنے لگا۔

”آپ میری معلومات چیک کر رہی ہیں یا اپنی معلومات میں اضافہ؟“

”آپ جو بھی سمجھ لیں۔“ اس نے شانے اچکا کر خود کو بے نیاز ظاہر کرنے کی کوشش کی اور ویکٹر کو اپنی نیپل پر دیا گیا آرڈر سرور کرتے ہوئے دیکھنے لگی۔

”مسٹر سندر کا یہ ہوٹل کھنڈالہ میں ہے اور اس سے سالانہ انہیں لاکھوں روپے کی انکم ہوتی ہے۔ اگر آپ جانا چاہیں گی تو میں آپ کو بالکل انگریز فکری بھی معلوم کر کے بتا دوں؟“ اس نے کچھ شریر سے لہجے میں پیشکش کی۔

”فونیکس، مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے اگر کچھ معلوم کرنا ہوگا تو سندر سے معلوم کر لوں گی۔“ ایک اجنبی سے اس موضوع پر گفتگو کرنا اچھا نہیں لگا حالانکہ ایک بیوی کی حیثیت سے اسے اپنی بے خبری بھی اچھی نہیں لگی تھی۔ وہ خود کو یہ کہہ رہی تھی کہ سندر کے ہاتھ میں ان کی شادی کو عرصہ ہی کتنا ہوا ہے۔ آہستہ آہستہ وہ سندر کے بارے میں سب کچھ جان لے لی لیکن ساتھ ہی اسے یہ بات بھی ٹھنک رہی تھی کہ اس نے ایک دن باتوں باتوں میں سندر سے کسی روز کھنڈالہ چلنے کی فرمائش کی تھی تو وہ اسے ٹال گیا تھا حالانکہ وہاں کے ذکر پر اسے فطری طور پر یہ بتانا چاہیے تھا کہ کھنڈالہ میں اس کا اپنا ہوٹل ہے۔

”میں شرط لگانے کو تیار ہوں کہ مسٹر سندر نے آپ کو ہوٹل کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔“ اس کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے عاشر نے دعویٰ کیا تو اس کے نیٹیکن پھیلاتے ہاتھ ہل بھر کر کے۔

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ سندر کے بارے میں اور بھی کئی ایسی باتیں ہوں گی جو میرے علم میں نہیں ہیں اور جنہیں میں وقت کے ساتھ ساتھ جان لوں گی۔ آپ پلیز ڈز لہجے۔“ لہجے کو باوقار بنا کر کہتے ہوئے اس کا دل تو یہی چاہ رہا تھا کہ اس بندے کو وہاں سے چلے جانے کو کہیں اخلاقیات کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے ذہنی طرف متوجہ کیا۔

”شکر ہے۔“ وہ بے تکلفی سے اس کے ساتھ شامل ہو گیا اور اس کی ناپائیدگی محسوس کر لینے کے باوجود گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”تو آپ نے بالکل ٹھیک کہا کہ وقت کے ساتھ ساتھ آپ کو بہت سی باتوں کا علم ہو جائے گا لیکن مسٹر سندر ان میں سے ہر بات ایسی تو نہیں ہوگی جس سے آپ کو فرق نہ پڑے کچھ باتوں سے انسان کو بہت فرق پڑتا ہے۔“

”آپ کی اس بات کا مطلب جان سکتی ہوں میں؟“ اس نے مشروم کو کانٹے میں پھنسا یا اور عاشر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ذرا کاٹ دار لہجے میں پوچھا۔ اب اسے یہ

بیوٹ

لگنے لگا تھا کہ یہ شخص سندر سے کوئی عناد رکھتا ہے اور اسے اس کے شوہر سے بدگمان کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

”مطلب بھی آپ کو وقت کے ساتھ ساتھ سمجھ آتا جائے گا۔“ اس کے لہجے سے متاثر ہوئے بغیر اس نے اسی سابقہ انداز میں جواب دیا اور بڑی رغبت سے کھانے سے انصاف کرنے لگا۔

”آپ کا اپنا تعارف کیا ہے مسٹر عاشر؟“ میرا مطلب ہے کہ آپ کیا کرتے ہیں اور یہاں بیزس میں کس سلسلے میں قیام کر رکھا ہے؟“ وہ کچھ دیر تو اسے کھاتے ہوئے دیکھتی رہی پھر چپا چپا کر پوچھا۔

”آپ نے یہ سوال ذرا تیز کیا۔ بہر حال میں بتا دیتا ہوں کہ میں ایک جرنلسٹ ہوں اور سندر کیپور کے فلم یونٹ کے ساتھ ہی یہاں آیا ہوں۔“ عاشر نے گویا اس کے سر پر دھماکا کر دیا۔ اس کا منہ کی طرف کاٹا لے جاتا ہاتھ درمیان میں ہی مقفل رہ گیا اور وہ ہکا بکا اس کی صورت دیکھنے لگی۔

”پلیز آپ ڈز لہجے۔“ میں آپ کو نقصان پہنچانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔“ اس کی کیفیت کو مہذب کر وہ تسلی دینے والے لہجے میں بولا لیکن ایک جملے سے اس کی تسلی کیسے ہو سکتی تھی۔ وہ تو اپنی بے وقوفی کو کوس رہی تھی کہ کیسے ایک اجنبی سے اتنی آسانی سے بے تکلف ہو گئی حالانکہ سندر کیپور کی بیوی ہونے کی حیثیت سے اسے محتاط رہنا چاہیے تھا۔ میڈیا والے تو چھوٹی سے چھوٹی بات کا ایٹو بنانے میں ماہر ہوتے ہیں۔ اب یہ اس کے سامنے بیٹھا جرنلسٹ نہ جانے کس انداز میں خبر بناتا۔

”سندر کیپور کی سندر یعنی ہنی مون ٹرپ پر اس کی زندگی کرتی ہوئی۔ سندر کیپور کی بیوی اپنے بچے کے رازوں سے نہ آشنا۔ سندر کیپور بیوی دہن کو چھوڑ کر شوٹنگ پر جا نکلے،“ کئی طرح کی سرخیاں تھیں جو اس کا ذہن اسے بتانا کر دکھا رہا تھا۔

”میں نے کہا ہے کہ آپ فکر نہ کریں۔ میں آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔“ اس کے چہرے کے ہل پل بدلتے رنگوں کو دیکھ کر وہ ایک بار پھر تسلی دینے لگا لیکن اسے قرار کہاں تھا اور کچھ سمجھ نہیں آیا تو نیٹیکن ہٹا کر ایک طرف ڈالا اور میز پر دھرا اپنا پرس اٹھا کر تیز قدموں سے چلتی ہوئی لفٹ کی طرف بڑھ گئی۔ اس وقت اسے اپنے کمرے کے سوا کوئی جائے پناہ بھائی نہیں دے رہی تھی۔

☆☆☆

دونوں پیرسمیٹ کر صوفے کے اوپر رکھے اس نے

گھٹنوں پر ٹھوڑی لٹکانی ہوئی تھی اور ہاتھوں کو پیروں کے گرد اس طرح پھینا ہوا تھا کہ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں بیوست تھیں۔ دائیں ہاتھ کی درمیانی انگلی میں چاندی کی ایک انگوٹھی تھی جس میں بڑا ساقین جڑا ہوا تھا۔ اس کی لمبی سنگ مرمری ترشی ہوئی انگلیوں میں تھی یہ واحد انگوٹھی گویا اس کے ہاتھوں کی خوب صورتی کو بڑھانے سے زیادہ شاید اپنی خوش بختی پر نازاں تھی کہ ایسے حسین ہاتھ میں جتنا نصیب ہوا ہے کہ خود اس کی شان بڑھ گئی ہے۔ اپنے اس ملکوتی حسن سے بے نیاز وہ سرخ و سیاہ استخراج کے شلوار قمیض میں ملبوس بڑی محویت سے ٹیلی وژن کی اسکرین کی طرف متوجہ تھی۔

شانے پر دھرا سرخ و سیاہ ٹائی اینڈ ڈائی کا دو پٹا صوفے سے نیچے زمین تک پہنچا ہوا تھا لیکن اسے ذرا خبر نہیں تھی اور کسی تسلی جیسے کی طرح جسے وہ حرکت بیٹھی اس طرح اسکرین کی طرف متوجہ تھی کہ مہاراجہ کی بھی چھپکی تو منظر بدل جائے گا۔ کمرے کے اندر آتے ٹھیکل نے اسے یوں بیٹھا دیکھا تو خود بھی ساکت رہ گیا۔ وہ یوں ساکت بیٹھی کسی سنگ تراش کا شاہکار لگ رہی تھی اور وہ دل کی دھڑکنوں کو سنبھالتا سوچ رہا تھا کہ آخر اس لڑکی کے کتنے روپ ہیں اور یہ ہر روپ میں اتنی خوب صورت کیوں لگتی ہے کہ دل دھڑکنا بھولنے لگتا ہے؟ اپنے اندر ابھرتے سوالوں سے الجھتا وہ اس سے کچھ فاصلے پر جا بیٹھا لیکن اسے خبر نہیں ہوئی۔ ٹھیکل نے بھی اس کی محویت کو نہ تو ذرا وہ خود ہی اس ٹرانس سے اس وقت باہر آئی جب اسے پرفیکٹر گلوکار تالیوں کی گونج میں لوگوں کا شکر یہ ادا کرتا ہوا منظر سے غائب ہوا اور گویا مجسمے میں زندگی کی لہر جاگ اٹھی۔ پہلے اس نے پٹلیں جھپکیں پھر ہاتھوں کو جنبش دے کر ایک دوسرے سے الگ کیا اور آخر میں ٹانگیں سیدھی کر کے صوفے سے نیچے زمین پر دھر دیں۔ اسی وقت اسے ٹھیکل کی وہاں موجودگی کا احساس ہوا۔

”ارے ٹھیکل بھائی آپ کب آئے؟“ اس نے قدرے حیرت سے چونک کر دریافت کیا۔

”جب تم ساری دنیا سے بے خبری دی میں مصروف تھیں۔“ ٹھیکل نے جواب دیا تو وہ جھینپ گئی۔ ”لگتا ہے تمہیں موسیقی کا بہت شوق ہے؟“ ٹھیکل نے اسے دیکھی سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”جی اچھی موسیقی کا، کوئی کوئی گلوکار یا موسیقار ہی ایسا ہوتا ہے کہ اس کی آواز اور ذہن ذہن کو جکڑ لیتی ہے ورنہ میں ہر ایک کو سنا پند نہیں کرتی۔“ اس نے اپنی فطری بے نیازی کے ساتھ ایک اداسے جواب دیا۔

”گو یا حضرت جو ابھی اسٹیج پر موجود تھے آپ انہیں مابرفن ہونے کی سند دیتی ہیں۔“ وہ مسکراتے ہوئے قدرے پرحراز لہجے میں پوچھ رہا تھا لیکن صبا لنگل بنجیدہ تھی۔
 ”یہ تو میرے موٹ فوٹ سکر ہیں۔“
 ”ارے.....“ ٹھیکل حیران ہوا۔ ”اب ایسا بھی نہیں ہے آپ جیسی لڑکیوں نے زیادہ ہی سرچڑھا رکھا ہے۔“
 ”آپ تو ایسے منٹس دے رہے ہیں جیسے وہ آپ کا رقیب ہو۔“ صبا نے اس کا مذاق اڑایا۔
 ”تم جتنے غور سے اس کی رفتار منٹ دیکھ رہی تھیں وہ مجھے اپنا رقیب ہی محسوس ہوا۔“ ٹھیکل نے بڑی سبکدوشی سے اس کی بات کا جواب دیا جس پر وہ منہ کھولے حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔
 ”ایسے کیا دیکھ رہی ہو، میرے سر پر سینگ تو نہیں نکل آئے ہیں۔ چلو آؤ باہر والا ان میں چلتے ہیں۔ بڑے ماموں کی ٹیلی آئی ہوئی ہے۔ میں تمہیں یہی اطلاع دینے آیا تھا۔“ اسے ٹوکتے ہوئے ٹھیکل نے ٹھنگو کا موضوع بدل دیا تو وہ بھی سابقہ بات پر زیادہ غور کرنے کے بجائے اس پر خفا ہونے لگی۔
 ”اطلاع دینے آئے تھے اور سارے جہاں کی باتیں کرنے کے بعد اپنی دیر سے بتا رہے ہیں۔“
 ”غلطی ہوگئی، معاف کر دو۔“ ٹھیکل نے فوراً ہتھیار ڈال دے کہ وہ تو پہلے ہی اس سے ہار چکا تھا۔ اس کے اس انداز پر ہنسی ہوئی باہر کی طرف بدلتی صبا کو خبر نہیں تھی کہ اس کی یہ ہنسی کسی حرا انگیز ہے جو ٹھیکل کے ساتھ ساتھ کسی اور دل کو بھی ابھر سکتی ہے۔

☆☆☆

اس نے بلو جینز پر پنک ٹکری سیلیویس ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ ٹی شرٹ سے نکلنے اس کے عریاں بازوؤں کی رنگت گلابی ٹی شرٹ کی رنگت سے ہم آہنگ تھیں۔ بائیں بازو پر اس نے گلابی اور سفید گلوں سے مزین ایک بازو بند باندھ رکھا تھا جس پر سورج کی کرنیں پڑتیں تو نگ بھللا اٹھتے۔ اس کے گھٹنے سیاہ چمک دار بال پشت پر پھیلے ہوئے تھے اور سر پر تنکوں کا بڑا سا ہیٹ تھا وہاں پھرتے بھانت بھانت کے چہروں میں بھی وہ بے حد دنیا بیاں تھیں اور جو نظر ایک بار اس پر پڑتی تھی دوبارہ پلٹ کر ضرور آتی تھی لیکن ہر ایک سے بے نیاز دریا پر نظر نہیں جمائے وہ جانے اس کی لہریں گن رہی تھی یا پھر ذوقی گفتگو کا نظارہ کر رہی تھی یا شاید دونوں میں سے کوئی کام نہیں کر رہی تھی۔ اس کی گھور

سیاہ آنکھوں میں دریا کے عکس کے علاوہ بھی کچھ تھا۔ شاید ان سوچوں کی پرچھائیاں جو اس کے ذہن میں ٹھیک رہی تھیں۔ یکا یک اس نے ٹک کی ہلکی آواز سنی تو چونک کر آواز کی طرف پلٹی۔ اس روز ہوٹل میں ملنے والا فوٹو گرافر عاشر نور کیرا ہاتھ میں لیے ڈھٹائی بے مسکرایا تھا۔ اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔
 ”تمہیں بغیر پریشن میری تصویر کھینچنے کی ہمت کیسے ہوئی؟“ اس نے غضب ناک لہجے میں اس سے باز پرس کی۔
 ”سوری میڈم، آئی ایم رینگی سوری لیکن بات یہ ہے کہ دریا کے پیش منظر میں کھڑی آپ اتنی خوب صورت لگ رہی تھیں کہ میں خود کو روک ہی نہیں سکا۔ میں ایک فوٹو گرافر ہوں اور میرا کام ایسے کسی منظر کو دیکھ کر خود بخود ہی چل پڑتا ہے۔“ وہ مسکراتے ہوئے ایسے انداز میں صفائی پیش کر رہا تھا کہ صاف محسوس ہو رہا تھا کہ اسے اپنے عمل پر کوئی شرمندگی نہیں ہے۔
 ”میں راہ میں کھلا کوئی پھول نہیں ہوں مسٹر عاشر کہ آپ نے پسند کیا اور تصویر کھینچی۔“ اخلاقی طور پر آپ مجھ سے اجازت لینے کے پابند تھے۔“ اس کے لہجے کی سختی میں کوئی کمی نہیں آئی۔
 ”شاید آپ اتنی ہائپر اس لیے ہو رہی ہیں کہ میں سندر پور جیسا باحیثیت نہیں ہوں جو اپنی دولت کے بل بوتے پر ہر پسند آجانے والے پھول کو اپنے کار میں سجالیاتا ہے۔“ عاشر کا جملہ اس کی چابک کی طرح لگا۔
 ”واٹ ڈو یو مین؟ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں نے دولت کے لالچ میں سندر سے شادی کی ہے؟“ غصے کی شدت سے اس کی آواز کاغذ بننے لگی تھی۔
 ”ایک دنیا بے ازم لگاتی ہے آپ کو مجھ سے سن کر برا کیوں لگا؟ وہ بھی جیسے بدتمیزی دہرائی ہے۔“
 ”جبکہ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ مجھے تو ڈھنگ سے سندر کے اثاثوں کا بھی علم نہیں ہے۔“ وہ جیسے یکدم ہی نڈھال ہو گئی۔ عاشر کو بھی ذرا شرمندگی کا احساس ہوا تھا۔ ابھی حال ہی میں تو خود اس نے اسے سندر کے ہوٹل کے بارے میں آگاہ کیا تھا لیکن یہ بھی سچ تھا کہ سندر کے اثاثوں کی تفصیل نہ جاننے والا بھی یہ تو جانتا تھا کہ وہ روپوں میں کھیلتا ہے اور یہ لڑکی جس نے ساری دنیا کو چھوڑ کر سندر کو اپنا یا تھا یونہی تو اس کی نہیں ہو گئی تھی۔ سندر نے اسے اپنے بس میں کرنے کے لیے ہر حربہ استعمال کیا تھا۔
 ”آئی ایم سوری، مجھے بس یونہی غصہ آ گیا تھا۔ آپ

کو اگر اپنی تصویر کھینچنے پر اعتراض ہے تو میں وہ آپ کو دے دوں گا۔“ وہ بھی یہ تصویر میں نے نہیں چھپوانے کے لیے نہیں کھینچی تھی بس یونہی بے اختیار اس میں کھینچ بیٹھا تھا۔“ وہ اس کا نڈھال اور ہارا ہوا انداز برداشت نہیں کر سکا اور محضرت کرنے لگا۔ وہ ایک بار پھر دریا کی طرف دیکھنے لگی۔
 ”آپ آج پھر تنہا ہیں جبکہ اس وقت تو شوٹنگ بھی نہیں ہو رہی؟“ وہ قلم پوائنٹ کی سرگرمیوں سے اچھی طرح واقف تھا۔

”سندرات بھری شوٹنگ سے تھکے ہوئے ہیں اور ہوٹل میں سو رہے ہیں۔“ اس بار اس نے بہت سادگی سے جواب دیا تھا تو عاشر کی آنکھوں میں ہیرودی آرائی۔ کل رات شوٹنگ دو بجے رات کو ختم کر دی تھی لیکن وہ جانتا تھا کہ سندر اپنی بیوی کے پاس واپس جانے کے بجائے ایک دوسرے ہوٹل میں قلم کی نوخیز ہیروں کے ساتھ رنگ رلیاں منارہا تھا۔ وہاں سے وہ یقیناً صبح واپس آیا ہوگا اور قلمی دنیا کے طریقوں سے ناواقف بیوی کو رات بھر شوٹنگ میں مصروف رہنے کا بتا کر اطمینان سے سو گیا تھا لیکن یہ لڑکی جو ابھی پچھلے صبح ہی سندر کی اپنی دیوانگی کے نتیجے میں اس کی زندگی کا حصہ بنی تھی اس سلوک کی حق دار نہیں تھی۔
 ”اوہ تو میڈم اس لیے اداس ہیں لیکن اس میں اداس ہونے کی کیا بات ہے۔ آپ کو سندر صاحب کی مصروفیات کا اچھی طرح اندازہ ہے انہیں ان کی ٹھکان اتارنے دیں۔ آئیں میں آپ کو بیکس کی سیر کرواتا ہوں۔ اس خوب صورت شہر میں ایک خوب صورت خاتون اداس رہیں یہ مجھے منظور نہیں۔“ سنجیدگی سے اسے سمجھاتے ہوئے آخر میں وہ قدرے شوخی سے بولا تو وہ بھی بے دلی سے مسکرا دی لیکن عاشر کی پیشکش قبول کرنے سے انکار نہیں کیا۔ اس روز وہ دونوں کئی گھنٹوں تک ساتھ گھومتے رہے۔

”آج میں نے نیٹ پر سندر اور کلپنا کی وہ تصویر دیکھی ہے جو کسی فوٹو گرافر نے ٹین بجے رات کو انہیں ایک ساتھ کسی ہوٹل میں جاتے دیکھ کر اتاری تھی۔“ وہ جائے اور اسٹیکس کے لیے ایک اوپن ایئر ریٹورنٹ میں بیٹھے تو اس نے عاشر کو بتایا اور اس کی شرمندگی مزید گہری ہو گئی۔ وہ جس تصویر کا ذکر کر رہی تھی وہ اسی نے تو کھینچ کر اپ کوڈ کی تھی۔
 ”اور آپ اسی لیے اداس تھیں؟“
 ”ہاں، کیا مجھے نہیں ہونا چاہیے۔“ اس نے چائے کی پیالی کے کنارے پر اپنی خردلی انگلی کو پھیرتے ہوئے پوچھا۔
 ”میرے خیال میں تو نہیں۔“ عاشر نے اپنے شانے

اچکائے۔ ”یہ سب باتیں گہری دنیا کا حصہ ہیں اور سندر پور سے شادی کرتے وقت آپ کو اس سب کے لیے ذہنی طور پر تیار رہنا چاہیے تھا۔“ اس نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔
 ”مجھے غور سے دیکھو عاشر، کیا میں ایسی عورت ہوں کہ میرے شوہر کو مجھ سے بے وفائی کی ضرورت پیش آئے؟“ وہ اپنے زعم حسن میں یہ سوال کرنے کی حق دار تھی لیکن یہ بھی سچ تھا کہ وہ جس دنیا سے وابستہ ہو گئی تھی وہاں کئی پری چہروں والیاں بڑی آسانی سے مٹی میں مل جاتی تھیں اور اس کی حیثیت تو سندر پور کے اس پسندیدہ کھلونے سے بڑھ کر نہیں تھی جسے اس نے منہ مانتی قیمت پر حاصل کیا تھا۔
 ”اگر آپ میرا مشورہ مانیں میڈم تو ان سب باتوں کو نظر انداز کرنا سیکھ لیں۔ صرف یہی ایک طریقہ ہے جس پر عمل کر کے آپ سندر پور کے ساتھ کامیاب زندگی گزار سکتی ہیں، دوسری صورت میں آپ کے حصے میں تلخیاں اور اختلافات ہی آئیں گے اور جہاں تک میرا خیال ہے آپ اس کی مکمل نہیں ہو سکتیں۔“ کرسی پر ڈرا پیچھے ہو کر بیٹھے عاشر نے پورے خلوص اور سنجیدگی سے اسے مشورہ دیتے ہوئے اس پر اس کی پوزیشن واضح کی تو وہ دم بخود رہ گئی۔
 وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ واقعی اس کے پاس کوئی دوسرا آپشن موجود نہیں تھا۔ محبت کتنی جلدی سمجھوتے کی راہ پر چل پڑی تھی۔ دکھ کے شدید احساس سے اس کی آنکھ سے بے اختیار ایک آنسو ٹپک پڑا لیکن دوسرے کو اس نے بے قابو ہونے کی اجازت نہیں دی۔ ایک انجینی پر وہ اپنا آپ جتنا عیاں کر چکی تھی اس سے زیادہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ عاشر نے بھی اس کی اس کیفیت کو محسوس کیا اور اسے اس کا بھرم قائم رکھنے کا موقع دینے کے لیے چپکے سے نظر پڑ گیا۔

☆☆☆

”کیا ہوا ٹھیکل بھائی آپ ابھی تک تیار نہیں ہوئے؟“ سیاہ رنگ کے اسٹائلش سوٹ میں لمبوس ٹک ٹک سے تیار وہ ٹھیکل کے سامنے آکر کھڑی ہوئی تو وہ اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ جو عام طے میں بھی خاص لگتی تھی اتنے اہتمام سے تیار ہونے کے بعد تو کوئی ماورائی مخلوق ہی محسوس ہو رہی تھی جس کے وجود سے گویا کرنیں پھوٹ رہی تھیں لیکن آج پہلی بار ایسا ہوا کہ اسے دیکھ کر ٹھیکل کا دل خوشی کے بجائے اداسی سے بھر گیا۔ وہ جسے بہت خاموشی سے چاہتا رہا تھا کسی اور کی ہونے والی تھی اس کے لیے یہ احساس بہت تکلیف دہ تھا اور وہ بھی کہ اسے احساس ہی نہیں تھا بلکہ اس کی جگہ گاتی آنکھوں کو دیکھ کر تو لگتا تھا کہ وہ بہت خوش ہے۔

”ایسے کیا دیکھ رہے ہیں۔ جلدی تیار ہو جائیں تا راحت کی پہلی مسلسل امی کے کان بھرنے میں لگی ہوئی ہے۔ اگر امی اس کی باتوں میں آگئیں تو مجھے بھی جانے سے روک لیں گی۔“ اس کی حالت سے بے خبر وہ اپنی ہی فکروں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس کے موسیقی کے شوق کو دیکھتے ہوئے گھٹیل نے پتا نہیں کتنی جدوجہد کے بعد آج شام ہونے والے ایک میوزیکل کنسرٹ کے دو ٹکٹ حاصل کیے تھے۔ ٹکٹ صرف دو ہی مل سکے تھے اس لیے کسی تیسرے کا جانا ممکن نہیں تھا اور اسی بات پر راحت ذرا فحاشی کا وہ لوگ اسے چھوڑ کر خود انجوائے کرنے جا رہے ہیں۔ آمنتیم کو بھی یہ بات کچھ اچھی نہیں لگی تھی لیکن وہ سنجیدگی کی صورت میں چپ ہوئی تھیں اور صبا کا بس نہیں چلتا تھا کہ فوراً سے بیشتر روانہ ہو جائے کہ مبادا ڈر اسی تاخیر ماں کے ارادے کو بدل ڈالے چنانچہ وہ گھٹیل کے سر پر سوار ہو گئی، ناچار اسے تیار ہو کر لکھنا ہی پڑا۔ بائیک پر پیچھے بیٹھی صبا کی قربت اس کو مزید بے چین کر رہی تھی اور وہ یہ سوچ کر پاگل ہو رہا تھا کہ وہ اس کے سامنے کسی اور کی بنائی جانے والی ہے۔

”کیا بات ہے آج آپ کو تنگے کا گڑ کھائے کیوں پیٹھے ہیں؟“ ہوا سے اڑتی اپنی زلفوں کو سینے کی کوشش کرتی وہ اس کے کان کے پاس زور سے بولی تو اس کی آواز میں محسوس کی جانے والی گھٹیل تھی۔

”لیکن تم تو بہت خوش لگ رہی ہو۔“ گھٹیل بے اختیار رشکوہ کر بیٹھا۔

”ہاں خوش تو میں بہت ہوں۔“ وہ کھلکھلا کر ہنسی تو گھٹیل کے کانوں کے پاس جلتے لگ اٹھی۔

”شاید تمہیں خوش ہونا بھی چاہیے۔ جاوید کے پاس وہ سب کچھ ہے جس کی کوئی لڑکی خواہش کر سکتی ہے۔“ یہ کہتے ہوئے اس کے لیے اپنی اداسی پر قابو رکھنا مشکل تھا۔ جاوید

اس کا تایا زاد اور صبا بحت کا ماموں زاد تھا جس کا رشتہ صبا کے لیے آنے کی خبر اسے آج صبح ہی لگی تھی اور وہ مضطرب ہو ا تھا۔ شکل، تعلیم اور اسٹیشن ہر اعتبار سے جاوید اس سے

بہتر تھا اس لیے وہ سمجھتا تھا کہ صبا کے والدین اس رشتے کو رد نہیں کر سکیں گے جبکہ خود اس کی پوزیشن یہ بھی کہ جاوید کا رشتہ

آ جانے کے بعد وہ اپنے والدین کو صبا کے لیے رشتہ دینے پر بھی راضی نہیں کر سکتا تھا کہ اس کے والد بڑے بھائی کے

بچے کے مقابل اپنے بیٹے کا رشتہ دینا بدتہذیبی قرار دیتے اور ہرگز یہ بات منظور نہ کرتے کہ بیٹے کی خواہش کے پیچھے اپنے

بھائی سے تعلقات خراب کریں جبکہ زیر تعلیم گھٹیل کا رشتہ

جاوید جیسے سلیڈ لڑکے کے مقابلے میں قبول کیے جانے کا کوئی امکان بھی نہیں تھا۔

”میرے خوش ہونے کا جاوید بھائی سے کیا تعلق؟“ اس کے اندر اٹھتے جوار بھانے سے بے خبر وہ حیرت سے پوچھ رہی تھی۔

”کیوں تمہیں معلوم نہیں ہے کیا کہ تمہارے لیے جاوید کا رشتہ آیا ہے؟“ وہ جو اس کی خوشی کا سبب جاوید کے رشتے کو بھڑکا رہا تھا اس کی حیرانی پر حیران ہوا۔

”معلوم ہے لیکن اس میں خوش ہونے والی کیا بات ہے میرے لیے تو آنے دن کوئی نہ کوئی رشتہ آتا ہی رہتا ہے تو کیا میں ہر رشتے پر خوش ہونی رہوں گی۔“ یہ جملہ کہتے ہوئے اس کے لیے جس دُعا تھا جو ایسا غلط بھی نہیں تھا۔ گھٹیل خود بھی اندازہ لگا سکتا تھا کہ اس جیسی لڑکی کے لیے ڈھیروں کے حساب سے رشتے آتے ہوں گے۔

”میں سمجھا کہ تمہیں جاوید کا رشتہ پسند آیا ہوگا۔“ اس کی بے نیازی سے گھٹیل کی جان میں جان آئی۔

”وہ کوئی ایسے شہزادہ سلیم بھی نہیں ہیں کہ میں ان کے رشتے پر خوش ہو جاؤں۔ میں نے امی سے صاف کہہ دیا ہے کہ مجھے یہ رشتہ پسند نہیں ہے۔“ اس نے ناک چڑھاتے ہوئے بتایا اور دوپٹے کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگی جو ہوا سے اڑ کر گھٹیل کے شانے پر چلا گیا تھا۔

”تم شادی کے لیے کسی شہزادہ سلیم کا انتظار کر رہی ہو؟“ اس کے انکار کا کن کر گھٹیل ہلکا ہلکا ہو گیا اور شوق سے پوچھا۔

”تو میں کسی شہزادی سے تم ہوں کیا؟“ اس نے شوق ہنسی کے ساتھ سوال کیا تو گھٹیل نے بریک لگا کر بائیک

کو روکا اور اس کی طرف دیکھا۔ اپنی صراحی دار گردن اکڑا کر بیٹھی وہ کسی معنی شہزادی کا پرتو لگ رہی تھی۔

”تم تو انارکلی ہو جسے دیکھ کر ہر سلیم اپنا دل ہار سکتا ہے۔“ اس نے بہت جذب سے یہ جملہ کہا تو اس نے ایک

گھٹکھٹاتا ہوا قہقہہ لگایا اور شوق سے بولی۔

”بس اب مجھے بنانا چھوڑیے اور اندر چلیے۔ کہیں یہ نہ ہو کہ شو شروع ہو جائے اور ہم یہیں کھڑے باتیں کرتے رہیں۔ ایسا

ہوا تو یہ آج کی انارکلی آپ کو پورا میں چنوا دی گئی۔“

”یہ انارکلی تو خاصی خوشخوار ہے یہی۔“ گھٹیل ہنسا اور اسے اپنے ساتھ لیے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ وہ اندر داخل

ہوئے تو وہاں پہلے ہی ایک جم غفیر موجود تھا۔ وہ بھی اسی کا حصہ بن گئے۔ اس موقع پر گھٹیل نے صبا بحت کا بڑا پر جوش

روپ دیکھا۔ وہ بے تحاشا خوش تھی۔ خاص طور پر جب سندر

موٹاپا کریں کم...
Young!!
slim، فٹ اور
رہیں

طیبی
عرق
مہزل



موٹاپے میں کمی کی قدرتی دوا
100 فیصد قدرتی جڑی بوٹیوں سے تیار شدہ معنوی رنگ اور میٹل سے پاک

- جسم سے ناکہ جڑی خالص کرتا ہے • باہر دست اور میکر کو قوی کرتا ہے
- اجابت صاف لاتا ہے • آنکھوں کی سوزش دور کرتا ہے
- ہاتھ اور پاؤں کی سوجن میں فائدہ مند ہے

طیبی
دواخانہ (پیرامیڈیٹ) لمیٹڈ
کراچی۔ پاکستان www.tayyebi.com.pk 1815

کپور سٹیج پر آیا اور اس نے پر فارمنس دی تو صبا کا یہ حال تھا کہ لگتا تھا ابھی تاج اٹھے گی۔ اس کے انگ انگ سے جوش اور خوشی کا اظہار ہو رہا تھا۔

”مجھے اس کا آؤگراف لینا ہے کھیل بھائی۔“ وہ دو تین گانے گانے کے بعد سٹیج سے اتر آو دوسروں کی طرح تالیاں پیٹ پیٹ کر ہاتھ سرخ کر لینے والی صبا نے سرخ چہرے کے ساتھ اس سے فرمائش کی۔

”مشکل ہوگا۔ میں نے سنا ہے کہ سندر کپور کی سیکورٹی خاصی سخت ہوتی ہے اور اس کے گاؤ ڈسکی کو اس کے قریب نہیں جانے دیتے۔“ کھیل نے مجبوری کا اظہار کیا۔

”میں کچھ نہیں جانتی، مجھے ہر حال میں سندر کا آؤگراف چاہیے۔“ وہ ہندی لہجے میں بولی۔ یہاں ان دونوں کو ایک دوسرے تک اپنی بات پہنچانے کے لیے بالکل نزدیک ہونے کے باوجود چیخ چیخ کر پوچھنا پڑ رہا تھا اور کھیل کے لیے تو اس کے چہرے پر موجود خفگی کے تاثرات ہی کافی تھے۔ وہ صبا کے لیے آسمان سے تارے بھی تو ڈر لاسکتا تھا سندر کپور کے آؤگراف کی کیا بات تھی۔

”اچھا آؤگراف کرتے ہیں۔“ وہ اس کا ہاتھ تمام کر جوم سے باہر لے گیا اور اس راستے کی طرف بڑھا جو صرف آرٹسٹوں اور مخصوص لوگوں کی آمدورفت کے لیے مخصوص تھا۔ سندر کپور ڈانس اور گانے کی لائیو پر فارمنس دینے کے بعد پیشانی سے پھونٹے سینے کو رد مال سے صاف کرتا ہوا اپنے گاؤ ڈسکی کے جلو میں چلا آ رہا تھا لیکن گاؤ ڈسکی کے فیئر کی دیوانگی کو قابو میں کرنے میں ناکام تھے۔ نو جوان لڑکے لڑکیاں پردانوں کی طرح اس پر ٹوٹ رہے تھے۔

گاؤ ڈسکی شاید ان سے سختی سے نمٹتے لیکن سندر نے انہیں اشارہ کیا تو وہ ذرا نرم پڑ گئے۔ سندر مسکراتا ہوا اپنے فیئر کو آؤگراف دینے لگا۔ صبا بھی کھیل سے اپنا ہاتھ چھڑوا کر اس کی طرف دوڑ پڑی۔ اس وقت اس کا جوش اتنا بڑھا ہوا تھا کہ اس نے جوم میں گھس کر بھی سندر تک رسائی حاصل کر لی اور اپنی آؤگراف بک اس کی طرف بڑھائی۔ سندر کی انگلیاں آؤگراف بکس پر دستخط کر رہی تھیں اور اسے آؤگراف لینے والوں کے چہروں پر نظر ڈالنے کی فرصت نہیں تھی لیکن صبا کی آؤگراف بک نے اسے چونکا دیا۔ کسی سٹیج کی طرف سے تجھے میں دی گئی اس آؤگراف بک کے ہر صفحے پر ہزر رنگ کے پاکستانی پرچم کا عکس تھا۔

سندر نے نظر اٹھا کر صبا کی طرف دیکھا۔

”پاکستانی؟“ اس کے لبوں سے ایک لفظی سوال نکلا۔

”جی ہاں۔“ صبا نے کپکانی آواز میں اسے جواب دیا۔ اس جوم میں وہ واحد تھی جسے سندر نے ایک لفظی ہی کسی گفتگو کا شرف بخشا تھا۔ اس کا جواب سن کر سندر مسکرایا اور اگلے ہی لمحے اس کا قلم صبا کی آؤگراف بک پر محرک ہو گیا۔ اسے آؤگراف دینے کے بعد وہ کسی اور طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ صبا کا مہمانی حاصل کر کے تھمتاے ہوئے چہرے کے ساتھ جوم سے باہر نکلی اور یہ دیکھنے کہ سندر کپور نے کیا لکھا ہے آؤگراف بک پر نظر ڈالی۔ یہ دیکھ کر اس کے چہرے پر حیرت کے رنگ دوڑ گئے کہ وہاں سندر کے دستخط کے علاوہ چند ہند سے جملے لکھے ہیں۔

”لاؤ بھئی دکھاؤ کہ سندر نے تمہیں کیا آؤگراف دیا ہے؟“ کھیل جو پیچھے ہی رہ گیا تھا اس کے قریب آ کر بولا تو وہ چونک گئی۔

”کچھ نہیں صرف دستخط کیے ہیں۔“ اس نے جلدی سے آؤگراف بک بند کر کے اپنے پرس میں ڈال لی۔

☆☆☆

مسلل رونے کی آواز پر اس نے یہ مشکل آنکھیں کھول کر دیکھا۔ اس کی نظروں کے سامنے ایک دھندلا سا چہرہ تھا لیکن وہ اس چہرے کے ایک ایک نقش کو اچھی طرح پہچانتی تھی۔ اسے دیکھنے کے لیے اسے ظاہری آنکھوں کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ وہ اس کے وجود کا حصہ تھا اور اپنے وجود سے کون ناواقف ہوتا ہے۔ وہ بھی اپنی دھندلائی ہوئی بصارت کے باوجود اس کی خوب صورت آنکھوں سے نکل کر پھولے پھولے گالوں پر پھلتے آنسوؤں کو دیکھ سکتی تھی۔ اسے اس کے رونے کی وجہ میں معلوم تھی لیکن اپنی حالت کی وجہ سے ایسی جھنجھلاہٹ میں مبتلا تھی کہ کچھ بھی کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ حقیقتاً اس وقت وہ اتنی شدید تکلیف میں مبتلا تھی کہ اسے خود کی پیار داری کی ضرورت بھی لیکن نہ چاہتا سب باتوں کو کہاں سمجھ سکتا تھا۔ اس کے اپنے تھکانے اور ضروریات نہیں جب ہی اس نے ماں کو دوبارہ آنکھیں بند کر دیے دیکھ کر اس کے رخساروں پر زور زور سے ہاتھ مارتے ہوئے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ اب پتا نہیں بچے نے ہاتھ ہی زور سے مارا تھا یا اس کے روز بروز لاغر ہوتے جسم میں قوت برداشت کی بے حد کمی ہو گئی تھی جو اسے بہت شدت کی چوٹ محسوس ہوئی اور اس نے جھنجھلا کر اسے ایک زوردار چھڑو دے مارا۔ پہلے ہی سے روتا ہوا بچہ پھر کھا کر مزید لگا پڑا کر رونے لگا۔ اس کے رونے سے اپنے سر کے درد میں مزید اضافہ محسوس ہونے لگا لیکن سر سے زیادہ تکلیف کی لہر سینے میں اٹھی

تھی جہاں موجود ایک ماں کا دل بری طرح تڑپ اٹھا تھا اور اسے ملامت کر رہا تھا کہ اس نے بچے پر ناحق ظلم کیا۔ اس چھوٹے سے لٹیکہ کی محدود فضا میں کسی بھی توجہ اور تفریح سے محروم وہ بچہ کم از کم اتنا تھکا تو رکھتا تھا کہ اسے زندگی کی بنیادی ضروریات فراہم کی جائیں اور بھوک..... بھوک تو ایسا عفریت ہے جو بڑوں پڑوں کی چوٹیں پلا دیتا ہے اس بھی جان کی پھر بساط ہی کیا تھی۔ احساس ندامت میں گھری وہ چہرے سے سر کو دونوں ہاتھوں سے تمام کر بستر سے اٹھنے کی کوشش کرنے لگی۔ اسی وقت اس نے کی ہول میں چابی گھومنے کی آواز سنی اور پھر کوئی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ وہ یہاں آنے والے واحد فرد سے واقف تھی اس لیے آنے والے کے بارے میں کسی تجسس کا شکار نہیں ہوئی۔

”ارے بھئی یہ ہمارا بیٹا کیوں رو رہا ہے؟“ خوشبو کا جھونکا اندر آیا اور پھر آنے والے نے بولتے ہوئے روتے ہوئے بچے کو گود میں اٹھا لیا۔

”ممانے والا۔“ بچے نے ہچکیوں کے ساتھ روتے ہوئے انگلی سے اس کی طرف اشارہ کیا۔

”آپ نے ماما کو تک کیا ہوگا؟“ اس نے بستر پر بیٹھی عورت پر ایک اچھتی ہوئی نظر ڈالی۔ ہڈیوں کا ڈھانچا بنا جسم، بکھرے بال اور آنکھوں کے نیچے پڑے گہرے حلقے اس کی حالت کا پتا دے رہے تھے۔

”مجھے بھوک لگی ہے۔“ بچے کے جواب سے اس کے رخساروں سے آنسو چھتی انگلیاں ذرا سی ساکت ہوئیں۔ اس نے عورت کو ملامت کرنے کے لیے لب کھولے لیکن پھر کچھ سوچ کر لب بچھ لے لیے اور بچے کو گود میں اٹھاتے ہوئے بچن میں بچھ گیا۔ فریج کھول کر اس میں سے ڈبل روٹی اور جیلی کی بوتل نکالی اور بچے کو وہیں جتن کاؤنٹر پر بٹھا کر اسے ڈبل روٹی لگا کر ایک سلاکس تمھایا۔ بچے نے پھرتی سے سلاکس کھانا شروع کیا۔ وہ جس رفتار سے کھا رہا تھا اس سے صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ بہت زیادہ بھوکا ہے۔ اس کے لیے ایک اور سلاکس پر جیلی لگانے کے بعد اس نے فریج سے دودھ کا ٹیڑا پیک نکالا اور اسے گرم کرنے کے لیے ساس پین میں ڈال کر چولھے پر رکھ دیا۔ اس دوران بچے نے دوسرا سلاکس بھی ختم کر لیا تھا۔ اس نے اسے ایک اور سلاکس کھانے کے لیے دیا اور نیم گرم دودھ میں اوٹوٹین ملا کر دو گلاسوں میں نکالا۔ گلاسوں کو ٹرے میں رکھنے کے بعد اس نے ایک ہاتھ سے ٹرے تھامی اور دوسرے سے بچے کو اٹھا کر دوبارہ کمرے میں واپس آیا۔ وہ دوبارہ بستر پر لیٹ چکی

تھی اور آنکھیں کھولے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے ٹرے کے قریب ساڑھنیل پر رکھی اور تھکسانہ لہجے میں بولا۔

”یہ دودھ پی لو۔“

”میرا دل نہیں چاہ رہا۔“ اس نے مرجھائی ہوئی آواز میں کہہ کر آنکھیں بند کر لیں۔

”دل کی سنتا ہے کار ہوتا ہے۔“ اٹھو اور یہ دودھ پیو۔“ اس نے اس کا ہاتھ تمام کر ایک جھٹکے سے اٹھا کر بٹھا دیا اور زبردستی گلاس اس کے ہاتھوں میں تمھایا۔ وہ جیسے مجبور ہو کر گھونٹ گھونٹ دودھ پینے لگی۔ اس کی طرف سے مطمئن ہو کر وہ بچے کی طرف متوجہ ہوا جو ہاتھ میں موجود سلاکس ختم کر چکا تھا۔ پہلے کی نسبت اس نے یہ سلاکس قدرے اطمینان سے کھایا تھا جس کا مطلب تھا کہ اس کا پیٹ کافی حد تک بھر گیا ہے۔ اس نے اوٹوٹین لے دودھ کا دوسرا گلاس اٹھا کر بچے کے لبوں سے لگا یا تو بچہ مزے لے لے کر دودھ پینے لگا۔

”جو کچھ ہوا اس میں اس معصوم کا کوئی قصور نہیں تھا پھر تم اسے کس بات کی سزا دیتی ہو؟“ بچے کو دودھ پلاتے ہوئے اس نے عورت کو ملامت کی تو اس کی آنکھوں میں آنسو چھنے لگے لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

”میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا کہ کسی ایسی عورت کا بندوبست کر دیتا ہوں جو دن بھر سوئی دیکھ بھال بھی کرے اور گھر کے کام کاج بھی دیکھ لے لیکن تم راضی نہیں ہوئیں حالانکہ تمہیں خود کسی کیئر ٹیکر کی ضرورت ہے۔“ وہ خفا تھا سا بول رہا تھا۔

”میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا کہ میں مزید تمہارا نہیں بننا چاہتی۔ میں نہیں چاہتی کہ کوئی یہاں آئے اور میرا حال دیکھے۔ میں بس خاموشی سے مرجانا چاہتی ہوں۔“ عورت نے جیلی بار لب کھولے اور پتی سے جواب دیا۔

”اور یہ..... اس کے بارے میں تم نے کیا سوچا ہے۔“ اس نے غصے سے ذرا بلند آواز میں کہتے ہوئے بچے کی طرف اشارہ کیا جو دودھ پینے کے بعد اوٹوٹین پلا تھا۔

”میں اسے ان ہاتھوں میں دے دوں گی جو اس کی صحیح پرورش کر سکیں بس ذرا میں خود میں تھوڑی سی ہمت پیدا کر لوں۔“ اس کا لہجہ یکدم ٹھٹھکا ہوا تھا۔ وہ دل میں اس کے لیے گہرا دکھ محسوس کرنے لگا اور بچے کو صوفہ کم پیڈ پر لٹا دیا تاکہ وہ آرام سے سو سکے۔

”اس نے مجھے پیغام بھیجا ہے، وہ تم سے ملنا چاہتا ہے۔“ خاموشی کے ایک مختصر وقفے کے بعد اس نے اپنے لب کھولے۔

”میں دوبارہ یہ غلطی نہیں کر سکتی۔“ عورت کی آنکھوں میں شعلے سے لپکنے لگے۔ ان لپکتے شعلوں میں جانے ماضی کے کون کون سے مناظر کا عکس تھا کہ وہ اپنے بے حد لاغر وجود کے باوجود ایک آتش فشاں محسوس ہونے لگی۔

”میرے خیال میں تمہیں اس سے مل لینا چاہیے۔ شاید وہ تم سے معافی مانگتا چاہتا ہے اور آریان کے حوالے سے بھی کچھ کہنا چاہتا ہے۔“ وہ اسے سمجھانے لگا۔

”معافی.....“ اس نے اس ایک لفظ کو استہزاءیہ انداز میں سمجھ کر ادا کیا پھر بڑبڑائی۔ ”معافی تو میں خود اپنے لیے حاصل نہیں کر پائی پھر اسے کیسے دے سکتی ہوں۔ اسے کہہ دو کہ میں اسے قیامت تک نہیں معاف کر سکتی بلکہ اللہ بھی معاف نہیں کرے گا۔ جیسے اس نے مجھے دھوکا دینے کی کوشش کی۔“ اس کی آواز بتدریج بلند ہوتی چلی گئی۔ ”اور رہی آریان کے حوالے سے کچھ کہنے کی بات تو اس سے کہنا ہمیشہ کی طرح آریان کے لیے سارے فیصلے جب تک میں زندہ ہوں خود کروں گی اور میرے مرنے کے بعد بھی کم از کم اسے کوئی اختیار حاصل نہیں ہوگا کہ وہ میرے بیٹے کے حوالے سے کچھ کہہ سکے۔“

”میں تم سے اصرار نہیں کروں گا لیکن بہتر ہے کہ تم اس معاملے پر غور سے دل سے سوچ لو۔“ اس نے مشورہ دیا پھر اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ”میں ضرورت کا سامان لینے اسٹور تک جا رہا ہوں۔ واپسی میں میرے ساتھ ایک عورت بھی ہوگی۔ وہ بے سہارا ہوگئی، بہری عورت ہے جس سے تمہیں کوئی ڈر نہیں ہونا چاہیے کیونکہ وہ تمہارا حال دنیا کو سنا کر تماشا بنانے کی قدرت ہی نہیں رکھتی۔“ وہ قدرے سخت لہجے میں بولا ہوا ہر ایک کی طرف بڑھ گیا۔ عورت نے اس کے سخت لہجے کا برا نہیں مانا۔ وہ مان ہی نہیں سکتی تھی، کیونکہ اسے پورا یقین تھا کہ دنیا میں کتنی کے جو چند لوگ اس کے ساتھ قلعہ ہیں وہ ان میں سے ایک ہے۔

☆☆☆

آنوگراف بک کھولے وہ سندر کپور کے دستخط کے نیچے لکھے ہندو کوغور سے دیکھ رہی تھی۔ یہ ہندو دراصل ایک موبائل نمبر تھا جو اسے وہ کہہ کر حیران کر رہا تھا۔

”سندر نے یہ موبائل نمبر میری آنوگراف بک پر کیوں لکھا؟“ اس نے چنانچہ کون سی بارخود سے یہ سوال کیا۔ حالانکہ مطلب تو بالکل واضح تھا۔ سندر چاہتا تھا کہ وہ اس نمبر پر اس سے رابطہ کرے لیکن کیوں؟ اپنی قوتِ تخیل سے واقف ہونے کے باوجود وہ اس سوال کا درست جواب

حاصل کرنے سے قاصر تھی۔ سندر جس دنیا کا باقی تھا وہاں چاند چروں کی کوئی کٹی نہیں تھی اس لیے اپنے بے حد حسین ہونے کے باوجود وہ پوری طرح یہ یقین کرنے کے لیے تیار نہیں تھی کہ وہ ایک نظر میں اس کے حسن کے آگے دل ہار گیا ہوگا۔ اپنی اس آنکھوں کو دور کرنے کے لیے بالآخر اس نے

سندر سے رابطہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ ان بے شمار لڑکیوں میں سے ایک تھی جو سندر پر جان چڑھتی تھیں اور اسے ایک نظر دیکھنے کے لیے دیوانی رہتی تھیں۔ اس نے بھی سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ بھی سندر کو رو بردو دیکھ سکے گی لیکن کمال ہو گیا تھا کہ نہ صرف اس نے سندر کو لڑکیوں پر فاقم کرتے ہوئے دیکھا تھا،

اس سے آنوگراف لیا تھا اور اب اس کا دیا ایک موبائل نمبر ہاتھ میں لیے بیٹھی تھی۔ ایسے میں وہ اس سے رابطہ کرنے کا فیصلہ نہ کرتی تو اور کیا کرتی لیکن مشکل یہ تھی کہ اس کے پاس موبائل فون نہیں تھا۔ آمنہ بیگم نے کبھی بیٹیوں کو اس بات کی اجازت ہی نہیں دی تھی اور یہاں ماموں کے گھر وہ لینڈ لائن استعمال کرنے کی ہمت نہیں کر پارہی تھی کیونکہ ٹیلی فون سیٹ گھر کے ایسے کمرے میں رکھا ہوا تھا جہاں زیادہ تر کوئی نہ کوئی بیٹھا ہی رہتا تھا۔ خاص طور پر نانی تو اکثر وہیں پائی جاتی تھیں اور ان کی قوتِ سماعت اس عمر میں بھی بڑی زبردست تھی۔ دو دن سے وہ یوں بھی اس سے تھوڑی سی ناراض تھیں کہ اس نے ان کے لائق قاتل پوتے کے رشتے سے انکار کر دیا تھا۔ البتہ آمنہ اور نجم الدین نے اس سلسلے میں اس پر کوئی دباؤ نہیں ڈالا تھا۔ جاوید کی تمام تر خوبیوں کے باوجود وہ بیٹی کر پردیس بیاہ کر بیٹھنے میں تذبذب کا شکار تھے۔ خاص طور پر آمنہ اس بات کو اچھی طرح سمجھتی تھی کہ آمدورفت اور رابطوں کی تمام تر سہولیات کے باوجود دوری بہر حال دوری ہی ہوتی ہے اور انسان خاص خاص مواقع پر اکثر اپنا دل سوس کر رہ جانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

”میں ٹھیک بھائی سے ان کا موبائل مانگ لیتی ہوں۔“ وہ اپنے منسلک پر سوچتی رہی تو آخر ایک صل بھی سوچھ

ہی گیا اور فوراً ہی ٹھیکل کے کمرے کا رخ کیا۔ وہ یونیورسٹی جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا۔

”آج کا سورج کہاں سے نکلا ہے اور حیرت ہے کہ نکلتے ہی سیدھا میرے کمرے میں اتر آیا ہے۔“ ٹھیکل نے اسے دیکھ کر چھیڑا۔ اس کا جاوید کے رشتے سے انکار سب کے علم میں آچکا تھا اس لیے ٹھیکل کا موڈ ایک بار پھر خوش گوار تھا۔

”مجھے آپ کا موبائل چاہیے ٹھیکل بھائی۔“ صبا کوئی بچی نہیں تھی جو اس کے جذبات کو سمجھ نہ پائی بس جان کر بے

نیازی برتی تھی۔
”خیریت، اتنی صبح موبائل کی کیا ضرورت پڑیگی؟“ ٹھیکل چونکا۔

”آپ موبائل دے سکتے ہیں تو دے دیں اتنی انویسٹی کیسٹ کیوں کر رہے ہیں؟“ وہ بگڑی تو ٹھیکل فوراً سنبھل گیا۔

”ارے نہیں بھی انویسٹی کیسٹ کی کیا بات ہے۔ یہ لو، سمجھو تمہارا اپنا موبائل ہے۔“ ٹھیکل نے فوراً سیٹ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

”ٹھیکل یو۔“ وہ مسکراتی ہوئی اس کے کمرے سے باہر نکل گئی اور پچھواڑے کی طرف جانگلی۔ یہ جگہ اپنے مسائل کے لیے سب نوجوانوں کی پسندیدہ تھی لیکن یہاں عموماً شام کے وقت ہی رونق ہوتی تھی اس وقت تو ہوکا عالم

تھا۔ اس نے چوبی تخت پر بیٹھ کر سندر کا نمبر شیخ کیا۔ رات سے اب تک وہ اس نمبر کو اتنی دفعہ دیکھ چکی تھی کہ اسے اذیر ہو گیا تھا۔ کئی گھنٹوں کے بعد کال ریسپونڈ گئی اور اس نے

سندر کی نیند میں ڈوبی ہوئی ملبوس۔ اسے یکدم ہی احساس ہوا کہ گھر کی دنیا سے تعلق رکھنے والی کسی شخصیت کو فون کرنے کے لیے یہ وقت قطعی نامناسب تھا۔ وہ ہیلو کے جواب میں کچھ کہنے کے بجائے جھجک کر چپ سی ہو گئی۔

”اب اگر آپ نے اتنی صبح فون کر کے ڈسٹرب کر ہی دیا ہے تو بات بھی کر لیں۔“ دوسری طرف سے سندر کی کچھ بیزار سی آواز سنائی دی۔

”سوری، آئی ایم ویری سوری۔ میں رات سے سوچ رہی تھی کہ آپ کے دیے نمبر پر فون کروں یا نہیں اور جب فیصلہ ہاں میں ہو گیا تو انتظار نہیں کر سکی اور وقت کا خیال کیے بغیر نمبر لایا۔“ اس نے بہت مجھتے ہوئے دہمی آواز میں یہ

وضاحت پیش کی۔
”کون..... پاکستانی؟“ اس بار سندر کی نیند مکمل طور پر غائب ہو چکی تھی اور وہ بہت بے تابی سے پوچھ رہا تھا۔

”جی۔“ اس نے صرف ایک لفظ میں تصدیق کی۔
”بہت وقت لیا تم نے فیصلہ کرنے میں۔ میں تو کنسرٹ سے واپس آنے کے بعد سے تمہارے فون کا انتظار کر رہا تھا۔“ اس کے لہجے سے بے چینی مایاں تھی۔

”لیکن کیوں؟“ حیرت کا اظہار کرتے ہوئے اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔
”کیوں کا جواب تو شاید مجھے بھی پوری طرح نہیں

معلوم۔ میں نے تمہیں ایک نظر دیکھا اور بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ اگر اس کیٹل بننے کا ڈر نہ ہوتا تو میں وہاں ہی تم سے پورا تعارف جاننے کی کوشش کرتا میں ایک آس پر تمہاری آنوگراف بک پر اپنا نمبر لکھ دیا کہ شاید تم مجھے کال کرلو۔ اپنا نام تو بتاؤ بیاری لڑکی۔“ اپنی مسکون آواز میں وہ اس کے حواسوں پر چھار ہاتھ اور اسے یوں لگتا تھا کہ اس کا دل پسلیاں تو ڈر کر باہر نکل آئے گا۔ وہ سندر کپور جس پر دنیا مارتی تھی اسے ایک نظر دیکھتے ہی اس کا اسیر ہو گیا تھا یہ کوئی معمولی بات تو نہیں تھی۔

”میرا نام صاحت ہے لیکن زیادہ تر سب مجھے صبا ہی کہتے ہیں۔“ اس نے کاٹنی آواز میں سندر کو اپنے بارے میں بتایا پھر اس کے استفسار پر بہت کچھ بتاتی چلی گئی۔ درمیان میں ٹھیکل کے موبائل کا بلیٹن ختم ہو گیا تو سندر نے خود کال کر لی۔

”میرا پرسل نمبر ہے صبا جو میں بہت ہی خاص لوگوں کو دیتا ہوں۔ تم اس نمبر پر جب جاؤ گال کر سکتی ہو میں نے بھی تمہارا نمبر سیکر لیا ہے۔ اگر تم پریشن دوگی تو میں تمہیں اس نمبر پر کال کر لیا کروں گا۔“ وہ تو جیسے اسے آسمانوں پر اڑائے لے جا رہا تھا۔

”پلیز آپ کال مت کیجیے گا۔ یہ میرا نمبر نہیں ہے میں نے آپ کو کال کرنے کے لیے ایک کزن سے اس کا موبائل لیا ہے۔“ اسے سندر کو حقیقت بتانی پڑی کیونکہ اسے بہر حال اس بات کا اندازہ تھا کہ سندر کپور چاہے کتنی بھی سلی بریٹی سہی اسے اس سے تعلق رکھنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ اس کی ماں تو اسے کزنز تک سے بہت زیادہ بے تکلف

ہونے کی اجازت نہیں دیتی تھیں۔ فلمی دنیا سے تعلق رکھنے والے کسی فرد سے ربط و ضبط کا کیا سوال تھا۔ اسے تو کل رات بھی کنسرٹ سے واپس آنے کے بعد ماں سے اچھی خاصی ڈانٹ سنی پڑی تھی۔

”یہ تو بڑی گڑبڑ ہوگئی۔ تم ایسا کرو کسی بہانے سے آج کے دن یہ موبائل اپنے پاس رکھ لو میں کوئی سلوشن نکال کر تمہیں کال کرتا ہوں۔“ سندر نے کہا تو اس نے بے تحاشہ قبول کر لی اتنا تو وہ جانتی تھی کہ ٹھیکل اسے نہ نہیں کر سکے گا، ہوا بھی یہی۔

”ٹھیکل بھائی آپ برا نہ مانیں تو میں آج آپ کا موبائل اپنے پاس رکھ لوں۔ اصل میں پاکستان سے میری ایک سہیلی کا فون آنے والا ہے۔ میری رول نمبر سلپ کا کچھ مسئلہ ہے وہ کال کیجئے کے بعد معلومات کر کے مجھے کال کرے گی۔“ اس نے ٹھیکل کے دامن طرف بیٹھے ہوئے

سپینس ڈائجسٹ 267 مارچ 2014ء

اتنی دھبی آواز میں اس سے یہ بات کہی کہ کچن میں ممانی کے ساتھ ہاتھ بٹائی آئینہ تک اس کی آواز نہ پہنچ سکے۔

”ٹھیک ہے تم رکھ لو۔“ ٹھیکل نے فراخ دلی کا مظاہرہ کیا۔ جاوید کی طرح ناکامی کا منہ دیکھنے کے بجائے وہ پہلے صباحت کے دل میں اپنی جگہ بنانے کا فیصلہ کر چکا تھا اس لیے یہ سب کرنا ضروری تھا۔

”سو سوئٹ آپ بہت اچھے ہیں ٹھیک بھائی۔“ اس نے بے ساختگی سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے ٹھیکرے ادا کیا تو چائے کا کھونٹ بھرتے ٹھیکل کے منہ میں مٹھاس کی گھل گئی حالانکہ ابھی تھوڑی دیر قبل وہ ماں سے شکوہ کر رہا تھا کہ آج آپ نے چائے میں چینی کم ڈالی ہے۔

☆☆☆

بیرس سے ان کی وابستگی ہو گئی تھی اور واپس آتے ہی مصروفیات کا ایسا لہجہ سلسلہ شروع ہو گیا تھا کہ اسے سندر سے ڈھنگ سے بات کرنے کا موقع بھی نہیں ملتا تھا۔ ایک طرف سندر اپنی فلی مصروفیات میں گمن تھا تو دوسری طرف اس کے لیے بھی بہت سی مصروفیات کا بندوبست کر ڈالنا تھا۔

”تم بہت برائی ہو رہی اور مجھے تم سے زیادہ دنیا میں کچھ اچھا نہیں لگتا لیکن میں چاہتا ہوں کہ دیکھنے والے کسی بھی اینگل سے تم پر آنکھیں نہ کر سکیں۔“ تیم اکیم ہیرا ہو جو ذرا سی تراش خراش کے بعد لوگوں کی آنکھوں کو چکا چوند کر سکتا ہے۔ سندر کپور کی بچی کو ہر ایر اینگل سے پرفیکٹ نظر آتا چاہیے۔“ اس نے یہ چند جملے بہت محبت سے اس سے کہے تھے اور وہ سمجھ گئی تھی کہ سندر نے اسے اپنے ساتھ بیرس لے جانے کے باوجود دوسرے لوگوں سے الگ کیوں رکھا تھا۔ وہ خائنا تھا کہ وہ اس کی دنیا کے طور طریقے سے آگاہ نہیں ہے پھر آگاہی کے لیے تربیت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ وہ پڑھی لکھی تھی لیکن انگریزی روانی سے بولنے پر قدرت نہیں رکھتی تھی۔ اسے روزانہ تین گھنٹے اس کی ٹیوشن دی جانے لگی۔ اس کے علاوہ اخٹا بیٹنا، چلنا پھرنا، کھانا پینا سکھانے کے لیے ایک ٹرینر الگ سے بھی جو اسے جدید فیشن کے تقاضوں سے بھی آگاہ کرتی رہتی تھی۔ اس ٹرینر نے اسے کئی ایسی ویب سائٹس سے بھی متعارف کروا دیا تھا جہاں سے وہ جدید فیشن کے بارے میں معلومات حاصل کر سکتی تھی۔ اشیائے ضرورت ویش کی مختلف برانڈز لے کر نامور فیشن ڈیزائنرز، جیولرز اور شاہنگ مالز تک نہ جانے کیا کچھ تھا جو اسے اس عرصے میں ازبر کر دیا گیا تھا اور وہ ہر بار حیران ہوتی رہتی تھی کہ یہ دنیا کتنی وسیع ہے۔ وہ تو اب تک کنوین کے مینڈک کی سی زندگی گزارتی رہی تھی۔ ایک روز تو

اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس کی ٹرینر نے اسے مختلف اقسام کی شرابوں کے نام، ان کی خصوصیات اور پینے کے صحیح اوقات یاد کروانے کے ساتھ ساتھ ڈرنک کی تیاری کے طریقوں سے آگاہ کرنا شروع کیا۔

”اس کی کیا ضرورت ہے کس شلپا؟“ وہ الجھی گئی۔

”ضرورت ہے میم، مشر کپور کے ملنے جلنے والوں میں ہر طرح کے لوگ ہیں اور ان کی مزگی حیثیت سے آپ کو ہر طرح کے لوگوں کو ڈیل کرنا پڑے گا اس لیے آپ کو یہ سارے میز راجی آنے چاہئیں۔ آپ صرف اتنے ہی میں پریشان ہو رہی ہیں حالانکہ مشر کپور کی انٹرکشن ہے کہ میں آپ کو بھی ڈرنک لینے کے طور طریقے سکھاؤں۔ جب آپ مشر کپور کے ساتھ پارٹیز اینڈ کریں گی تو آپ کو ڈرنک لینے پڑے گی اس لیے بہتر ہے کہ پہلے ہی عادی ہو جائیں۔“

ٹرینر کے جواب نے اسے حیرت سے بھی آگے مددے کی کیفیت میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس رات وہ رات گئے تک سندر کے انتظار میں جاتی رہی تھی ورنہ تو اب اکثر یہ ہوتا تھا کہ وہ اس کے آنے سے پہلے ہی سو چکی ہوتی تھی۔ اسے صبح جلدی جاگنا ہوتا تھا اور پھر پورا دن وہ اپنی نام نہاد تربیت کی وجہ سے اتنی تھک جاتی تھی کہ رات کو بہت دیر تک جاگ ہی نہیں پاتی تھی اور سندر کا یہ حال تھا کہ وہ آدھی رات سے پہلے بھی واپس نہیں آیا تھا اور کبھی بھی دوسرے سے آتا ہی نہیں تھا۔ اس کا کچھ پتا نہیں چلتا تھا کہ وہ کب آؤٹ آف ٹی ہے اور کب آؤٹ آف کنٹری اور بعض اوقات وہ شہر میں موجود ہو کر بھی آؤٹ آف نوکس ہو جاتا تھا۔ ان سب باتوں کے باوجود وہ بہت مہرے وقت گزار رہی تھی کہ بہر حال اسے سندر کپور کی بیوی ہونے کا شرف حاصل ہے اور وہ اس سے محبت بھی کرتا ہے۔ جب ہی اسے تراشے خراشنے کے لیے اتنی جدوجہد کرنا ہے لیکن شراب نوشی..... شراب نوشی تو اس کے تصور سے بھی دور کی چیز تھی اس لیے وہ اس مرحلے کے آنے سے پہلے سندر سے بات کر لینا چاہتی تھی۔

”او مائی سوٹ ہارٹ، آج تم جاگ رہی ہو۔“ گھائی نائی میں ملیوس اپنی خوب صورت بیوی کو دیکھ کر وہ ہنسنے لگا بلکہ بہک تو وہ پہلے ہی رہا تھا۔ کیوں اس کا جواب اس کی سانپوں سے آتی بدبودے رہی تھی۔

”مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔“ اپنی ناگواری پر قابو پاتے ہوئے اس نے بڑے ضبط سے گفتگو کا آغاز کیا۔

”تو کرونا میری جان۔“ وہ جوتوں سمیت بستر پر گرا اور اسے بھی ہاتھ پکڑ کر بچھا لیا۔

”پلیز سندر، میں بہت سنجیدہ ہوں۔“ وہ تھوڑے سے بلند لیجے ہوئی لیکن تھوڑی دیر میں اس کی طرف سنجیدگی سے متوجہ ہوا۔

”کیا بات ہے؟“

”میں شلپا کپور رہی تھیں کہ مجھے شراب پینا بھی سیکھنا ہوگا۔“ اس نے اپنا مسئلہ بیان کیا۔

”سو واٹ؟“ جواب میں اس نے بھوئیں اچکا کر یوں استدھار کیا جیسے اس کا مسئلہ سمجھنے سے قاصر ہو۔

”کیا مطلب؟ کیا آپ میرا مسئلہ نہیں سمجھتے ہیں؟“ وہ شاک کی سی کیفیت میں تھی۔

”تم ایک فضول بات کو مسئلہ بنا رہی ہو۔ ہماری دنیا میں سب پیتے ہیں۔ مہتا سے لے کر ڈیوڈ، عبدالرحمان جاوید، نادرہ اور نرسنگ تک۔ یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے جس پر پریشان ہوا جائے اور تھکے ماندے گھر آئے جتنی سے گھر کی جائے۔ دنیا کے جمیلوں سے بچ کر رات گئے گھر آنے والا مرد اپنی خوب صورت بچی سے گھر نہیں کچھ اور چاہتا ہے۔“ اس کا لہجہ بتدریج تبدیل ہوتا چلا گیا اور سائیں پوچھل ہونے لگیں اپنے اس موڈ کے ساتھ وہ منٹوں میں اس پر جھگڑا۔ اس کی قربت کی دیوانی نے سمجھ لیا کہ اسے ہمیشہ کی طرح اس بار بھی سندر کے سامنے پھڑا لینی ہوگی کہ محبوب کے حکم سے انکار تو ممکن ہی نہیں ہوتا ورنہ یہ محبت کے ان لکھے قانون کی خلاف ورزی شمار ہوتی ہے۔

☆☆☆

”ہاں بھی مہتا تیار ہو تو چلیں شاہنگ کے لیے؟“ ٹھیکل نے کمرے کے دروازے پر آکر اسے آواز دی تو وہ سینڈل کا اسٹریپ بند کر کے تیزی سے باہر کی طرف لپکی۔ گورے گورے بیروں میں سیاہ نازک سی سینڈل بہت بچ رہی تھی۔ اس نے سیاہ لکیر اینڈی والا فیروز سی سوٹ پہن رکھا تھا جس کے ساتھ جارح کا سیاہ اور فیروز سی دھاری دار دوپٹا تھا۔ کانوں میں اس نے میچنگ کے ٹاپس پہن رکھے تھے اور چہرے پر پٹاخوں ہونے والا ہلکا سا میک اپ تھا۔ ٹھیکل اسے دیکھ کر حسب معمول بہوت رہ گیا۔

”نایاب اور راحت کہاں ہیں؟“ ٹھیکل کی تحویت کو توڑنے کے لیے اس نے پوچھا۔

”وہ دونوں گاڑی میں بیٹھ چکی ہیں۔ آپ کے سولہ سنگار ختم ہونے کا انتظار کر رہی ہیں۔“ ٹھیکل نے جواب دیا تو اس نے اس پر ایک خفا سی نگاہ ڈالی اور ایک ادا سے بولی۔

”کیا سر جھاڑو نہ پھاڑا ٹھیکرے چل پڑتی؟“

بیوں

”اس صورت میں بھی تم بری نہیں لگتیں لیکن اب تو راہ چلتوں کو گرانے کا انتظام کر لینی ہو۔“ ٹھیکل نے برجستگی سے اس کی بات کا جواب دیا پھر اس کے سر پر پاور اختیدی نظر ڈال کر بولا۔

”تم کوئی چادر لے لو تو اچھا ہے۔“ اس کا مشورہ سن کر صبا نے ذرا سامنے بنایا پھر کچھ سوچ کر سیاہ رنگ کی چادر نکال کر اوڑھ لی۔ وہ خود بھی اچھی طرح جانتی تھی کہ اس کی قمیص کی فٹنگ ذرا زیادہ ہی چست ہو گئی ہے اور ہاف آستیں سے جھانکتے بازو بھی نمایاں ہو رہے ہیں۔ یہ انتہام اس نے آج دوپہر میں خود ہی کیا تھا۔ اپنے ڈھیلے ڈھالے لباس کو فٹنگ اور فل آستیں کو ہاف کرنے میں اسے تھوڑی سی محنت تو کرنی پڑی تھی لیکن اب وہ مطمئن تھی کہ اس کا لباس تھوڑا سا ڈرن لگ رہا ہے۔ اس کی یہ کارستانی اس لیے عجیبی رہ گئی تھی کہ آئینہ گھر کی جملہ خواتین کے ساتھ کسی عزیز سے ملاقات کے لیے گئی ہوئی تھیں گھر پر ہی موجود نجم الدین ظاہر ہے ان باتوں کا دھیان نہیں رکھ سکتے تھے۔ نایاب اور راحت کو بھی جتن جتن میں مصروف ہونے کی وجہ سے خبر نہیں ہو سکی تھی۔

”آپ بھی نا آئی کمال کرتی ہیں۔ یونیورسٹی سے آتے ہی بے چارے ٹھیکل بھائی کی جان کھالی کہ شاہنگ کے لیے چلنا ہے اور خود تیار ہونے میں اتنی دیر لگا دی۔“ وہ گاڑی میں بیٹھنے لگی تو راحت نے اسے ٹوکا۔ یہ گاڑی ٹھیکل کے کسی دوست کی تھی جو وہ چند گھنٹوں کے لیے مانگ کر لایا تھا۔

”چلو کوئی بات نہیں، مہمانوں کا اتنا توقع جتنا ہے۔“ ٹھیکل نے بحث کی فضا بننے سے پہلے ہی معاملہ رفع دفع کر دیا۔ راحت اور نایاب پچھلی نشستوں پر بیٹھی تھیں چنانچہ صبا کو اس کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھنا پڑا تھا اور یہ اتنی سی بات بھی ٹھیکل کے لیے بڑی خوشی کا سبب تھی۔ وہ ہواؤں میں اڑتا ہوا انہیں شاہنگ سینئر تک لے گیا۔ صبا اس کے جذبات کو خوب سمجھتی تھی اور اسی کا فائدہ اٹھا رہی تھی البتہ اسے اندازہ تھا کہ شاہنگ سینئر میں اسے ٹھیکل کی طرف سے ہی سب سے زیادہ ہوشیار رہنا ہوگا۔ اس کی نظریں جس طرح اسے ہر وقت اپنے حصار میں لیے رکھتی تھیں ان سے بچ کر ٹھیکل آسان نہیں تھا لیکن خود اس کا جذبات اتنا طاقتور تھا کہ اس نے راہ نکال ہی لی۔

”ٹھیکل بھائی آپ ذرا اس دکان سے ابو کے لیے کرتے تو دیکھ لیں میں جب تک اپنی خریداری کرتی ہوں۔“ اس نے ایسی دکان کے گلاس ڈور کے سامنے رکھے

ہوئے گھٹیل سے یہ بات کہی جہاں خواتین کی ذاتی ضروریات کا سامان فروخت ہوتا تھا۔ گھٹیل نے یہ سمجھتے ہوئے کہ وہ اس قسم کی خریداری اس کی موجودگی میں نہیں کر سکتی قدم آگے بڑھا دیے۔ نایاب اور راحت پیچھے جبولری کی ایک دکان پر مصروف تھیں۔ گھٹیل کی نظروں سے غائب ہوئے ہی وہ تیزی سے حرکت میں آئی اور پھر چند منٹوں میں ہی شاہنگ سینئر کی چلی منزل پر موجود اس ریسٹورنٹ میں پہنچی جہاں آنے کا مشورہ اسے سندر نے دیا تھا۔ سندر کی بتائی ہوئی میز پر سیاہ سوٹ میں ملبوس ایک شخص اس کا منتظر تھا۔ اسے دیکھتے ہی وہ کھڑا ہو گیا۔

”آجے میڈم، سر آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔“ وہ کچھ گہرائی ہوئی تھی اس کے پیچھے چل بڑی۔ احتیاطاً چادر کے پلو سے اپنا اوجھڑا چہرہ بھی چھپا لیا۔ وہ شخص اسے ایک قیمتی گاڑی تک لے گیا اور اس کا پچھلا دروازہ کھولا۔ وہ گاڑی میں بیٹھی تو یہ دیکھ کر اس کی سانس رکنے لگی کہ سندر خود بھی وہاں موجود ہے۔ سندر کے اتنے قریب ہونے کا تو اس نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔

”چادر اتار دو۔ اس گاڑی کے شیشے نفوذ ہیں۔ باہر سے کوئی نہیں دیکھ سکتا۔“ سندر نے اپنی سمورن کی آواز میں کہا تو وہ چونکی اور آہستہ سے چادر اتار دی۔ اب اس کا حسین سراپا پوری طرح سندر کے سامنے تھا اور وہ پے ثوق نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ جو اس کی خاطر ہی اتنے اہتمام سے تیار ہوئی تھی شرمائی گئی۔

”مجھے دھواں نہیں ہو رہا ہے کہ تم اس سے میرے ساتھ ہو۔“ اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے وہ خواب ناک لہجے میں بولا تو صاحبہ خود کو ہواؤں میں اڑتا محسوس کرنے لگی۔ سندر کچھ جس کی ایک دنیا دیوانی تھی اس کے لیے ایسے الفاظ ادا کر رہا تھا کوئی معمولی بات تو نہیں تھی۔

”میں فکمی دنیا کا بندہ ہوں اور دیکھو... میرے ساتھ کیسا فکمی سین ہوا ہے۔ میں پہلی نظر میں تمہارے سامنے اپنا من ہار بیٹھا اور کئی ہی دہروں کی طرح ہی ہمیں آپس میں ملنے کے لیے اتنا کشٹ اٹھانا پڑا ہے۔“ وہ جیسے اس کے کانوں میں امرت گھول رہا تھا اور وہ ایسی حیر زدہ تھی کہ اسے یہ بھی علم نہیں تھا کہ گاڑی کون کون سے راستوں سے گزر کر کہاں جا رہی ہے۔

”میں تو بہت عام سی لڑکی ہوں کم سے کم آپ کے سامنے تو کچھ بھی نہیں ہوں۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ آپ سچ بچ میرے ساتھ ہیں یا میں کوئی خواب دیکھ رہی ہوں۔“ آخر

اس نے بھی اپنے لب کھولے۔ گاڑی کے اگلے اور پچھلے حصے کے درمیان ایک شیشے کا پارٹیشن تھا اس لیے آواز ڈرائیور اور اس شخص تک نہیں جا سکتی تھی جو اسے ریسٹورنٹ سے گاڑی تک لایا تھا۔ وہ شاید سندر کا گارڈ تھا۔

”تم خود کو عام اس لیے کہہ رہی ہو کہ تمہیں آج تک مجھ جیسا چاہنے والا نہیں ملا ہوگا۔ میری نظریں جاتی ہیں کہ تم کتنی خاص ہو اور مجھے اختیار ملے تو میں تمہیں جاسٹینوار کر لیا بنا دوں گا کہ دنیا کی نظریں تم پر سے ہٹا بھول جائیں گی۔“ سندر کی اس طرح کی باتوں میں راستے کیسے تمام ہوا اسے علم نہ ہو سکا۔ وہ اسے اپنے ساتھ ایک سیون اسٹار ہوٹل لے کر آیا تھا۔ گاڑی سے سندر کے کمرے تک وہ دونوں الگ الگ پہنچے تھے۔ اس کی رہنمائی سندر کے گارڈ نے کی تھی۔

”میرا تو چاہتا تھا کہ تمہارا ہاتھ تمام کمرے میں اپنے ساتھ یہاں لاؤں لیکن تمہیں معلوم ہی ہوگا کہ میڈیا والے کیسے ہماری بوسہ لگتے پھرتے ہیں۔ مجھے اپنی پروا نہیں۔ میرا تو یہی چاہتا ہے کہ تمہارا ہاتھ تمام کمرے میں دنیا کو بتا دوں کہ یہ ہے میرے پیسوں کی رانی لیکن تمہاری بدنامی سے ڈرتا ہوں۔ تم شاید یہ سب اور نہیں کر سکتیں۔ اسی لیے میں نے اتنی احتیاط کی ہے۔“ ہوٹل کے عالی شان سوٹ میں سندر کے روبرو یہ سب سنتے وہ کسی خواب نگری میں پہنچی ہوئی تھی۔ متوسط طبقے کی اس لڑکی نے اسکرین کے سوا سندر سمیت یہ سب کچھ کبھی آنکھوں سے دیکھا ہی کب تھا اور ہر شے ہی اسے بہت متاثر کر رہی تھی خاص طور پر سندر کا خود پر فدا ہونا۔ لاکھوں دلوں کی دھڑکن سندر کو اس نے ایک نظر میں ہی فتح کر لیا ہے۔ یہ احساس بڑا پر غبار تھا لیکن اس غبار میں بھی اسے ایک بات ضرور یاد رہی تھی کہ اپنی عزت کی حفاظت ہر حال میں کرنی ہے چنانچہ سندر کی وارنٹوں کو بھی اس نے ایک حد سے زیادہ نہ بڑھنے دیا۔ اسے یہ فکر بھی لاحق تھی کہ وہ سب کی نظروں میں دھول چھو کر سندر سے ملے آئی ہے۔ پیچھے اس کے اس طرح غائب ہونے پر اچھا خاصا ہنگامہ مچا ہوا ہوگا۔ دل نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے سندر سے واپسی کا تقاضا کیا۔

”پھر کب ملے آؤ گی؟ مجھے کل مئی واپس جانا ہے لیکن میں تمہاری خاطر سب کام چھوڑ کر یہاں رک سکتا ہوں۔“ سندر نے گویا بحالت مجبوری اسے جانے کی اجازت دیتے ہوئے بہت بے قراری سے پوچھا۔

”میرا دوبارہ آنا بہت مشکل ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ آج بھی میں کتنی مشکل سے آئی ہوں اور آج بھی ترکیب بار

بار نہیں لڑائی جا سکتی۔ ہم پاکستان میں ہوتے تو پھر بھی کوئی چانس تھا۔ وہاں میں کالج یا کسی دوست سے ملاقات کے بہانے گھر سے نکل سکتی تھی یہاں ایسا کوئی بہانہ نہیں کیا جا سکتا۔“ اس نے اپنی مجبوری بیان کی۔ اس وقت حقیقتاً وہ خود کو بڑے بس محسوس کر رہی تھی۔ دل سندر سے بار بار ملنے اور ملنے رہنے کو چاہتا لیکن کوئی راہ نظر نہیں آ رہی تھی۔

”ٹھیک ہے اس کا بھی کوئی حل سوچتے ہیں لیکن اب تم اپنے پاس سے موبائل رکھو۔ اس سے ہمیں آپس میں کامیاب رکھنے میں آسانی ہوگی۔“ اس نے ایک نہایت مہنگا موبائل سپٹ اس کے حوالے کیا۔ عام حالات میں وہ کسی سے اتنا قیمتی تحفہ بھی نہ لیتی لیکن اس وقت اس لیے قبول کر لیا کہ سندر سے رابطے کا اس کے سوا کوئی دوسرا ذریعہ نہیں تھا۔ سندر نے اس کو بہت والہانہ انداز میں پیچ کر وہاں سے رخصت کیا تو اس کا چہرہ خوشی اور شرم سے سرخ ہو رہا تھا۔ وہ اسی گاڑی میں وہاں سے رخصت ہوئی جس میں بیٹھ کر یہاں آئی تھی۔ گاڑی میں بیٹھ کر اس نے خود کو اچھی طرح چادر میں لپیٹ لیا۔ ڈرائیور نے اس کی خواہش پر اس علاقے کے قریب اسے ڈراپ کر دیا جہاں اس کا انتہائی گھر واقع تھا۔ اس جگہ سے وہ ایک انٹور کشالے کرناٹا کے گھر پہنچی تو سب نے اسے دیکھتے ہی زور زور سے بولنا شروع کر دیا۔ گھٹیل جس کے چہرے پر بارہ بج رہے تھے اسے دیکھ کر سب سے زیادہ جوش میں آ گیا۔

”کہاں چلی گئی تھیں تم۔ پچھلے دو گھنٹے سے میں تمہیں پاگوں کی طرح ڈھونڈ رہا ہوں۔“ اس نے صبا کو دونوں شانوں سے تمام کرت کر تقریباً جھنجھوڑ ڈالا۔

”یہ کیا تمیزی ہے، ہاتھ ہٹا نہیں اپنا۔“ وہ اس سے زیادہ بلند آواز میں پہنچی۔ اس وقت وہ جارحیت ہی بہترین دفاع ہے والی پالیسی پر عمل پیرا تھی۔ گھٹیل بھی باوجود غصے اور پریشانی میں جھٹلا ہونے کے اس کے اس طرز عمل پر ذرا سا شپٹ گیا اور اس کے شانوں پر رکے ہاتھ تیزی سے ہٹائے۔

”سچ تو پوچھ رہا ہے بچہ، کہاں تھیں تم اتنی دیر سے؟“ کتنی دیر شاہنگ سینئر میں تمہیں ڈھونڈنے کے بعد ملکاں ہو کر تینوں گھر واپس آئے ہیں کہ تم شاید گھر پہنچ گئی ہو لیکن تم یہاں بھی نہیں پہنچی تھیں۔ تمہارے ابو اور ماموں پریشان ہو کر خود گھٹیل کے ساتھ نکلے لگے تھے لیکن تم ہو کہ سیدھی طرح جواب دینے کے بجائے انا غصہ کر رہی ہو۔“ وہ گھٹیل کو اونچی آواز سے ڈرنا سکتی تھی لیکن آمنہ اس کی ماں تھیں۔ انہوں نے بغیر کسی لحاظ کے اسے خوب آڑے پاھوں لیا۔

”میں کتنی پریشانی اور خواری کے بعد گھر پہنچی ہوں آپ کو کیا معلوم؟ آپ کو گھٹیل بھائی کی پریشانی کا احساس ہے لیکن میرا خیال نہیں کہ اتنی دیر میں کن حالات سے گزرتی رہی۔“ اس نے فوراً ہی چپکوں پیکوں روٹا شروع کر دیا۔ ماموں جان فوراً لپک کر اس کے پاس پہنچے اور شفقت سے سر پر ہاتھ رکھ کر بولے۔

”نہیں بیٹا، ایسی بات نہیں ہے ہمیں اصل پریشانی تو تمہاری طرف سے ہی گئی کہ تم نہ جانے کس مشکل میں گرفتار ہو گئی ہو۔ گھٹیل بھی پریشانی کی وجہ سے ہی تم سے ایسا برتاؤ کر گیا ورنہ یہ ایسا بدتمیز نہیں ہے۔“ وہ اس کی دلجوئی کے ساتھ ساتھ بیٹے کی صفائی بھی نہیں کرنے لگے۔ بڑی دیر میں جا کر اس نے اپنے آسپوٹ پیچھے۔

”ہاں تو لڑکی اب پھوٹ بھی دے کہ تیرے ساتھ کیا بیٹی؟ خدا کی کہوں تو مجھ بڑھیا کے تواتی دیر میں ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے اور لگتا تھا کہ دم اب نکلا کر جب نکلا لیکن تو ہے کہ اصل پتا کہہ کر ہی نہیں دے رہی۔“ اس بار نانی اماں میدان میں آئیں اور وہ اس کی ماں کی بھی ماں تھیں جنہیں وہ غلطی ٹال نہیں سکتی تھی چنانچہ پہلے سے ہی سوچی ہوئی کہانی سنا ڈالی۔

”گھٹیل بھائی کتوں کی دکان پر تھے اور میں ایک دوسری دکان سے سامان دیکھ رہی تھی۔ وہاں مجھے کچھ پسند تو نہیں آیا لیکن غلطی سے کسی دوسرے دروازے سے باہر نکل گئی اور بس پھینک گئی۔ بڑی دیر تک میں ان لوگوں کو وہاں ڈھونڈتی رہی لیکن جب کوئی نہیں ملا تو میں نے سوچا یہاں بھٹکنے سے بہتر ہے گھر واپس چلی جاؤں لیکن گھر کا پتا بتانے میں مجھ سے غلطی ہوئی اور رکشے والا مجھے کسی اور علاقے میں لے گیا بس پھر میں بھٹکتے بھٹکتے بہت مشکل سے گھر پہنچی۔ سچ پوچھیں نانی تو مجھے اتنا ڈر لگ رہا تھا۔ اکیلے لڑکی کسی اجنبی ملک میں بھٹکتی پھر رہی ہو تو اس کے دل کی کیا حالت ہوگی آپ سمجھ ہی سکتی ہیں۔“ وہ لاڈ لٹانے کو نانی کے شانے سے جا لگی۔

”اے بھو، تمہیں ضرورت ہی کیا پڑی تھی اکیلے سارے شہر میں بھٹکتے پھرنے کی۔ وہیں گیٹ کے پاس کھڑی ہو جاتیں۔ یہ لوگ باہر نکلتے تو ہمیں دیکھ لیتے۔“ اس کی لاڈ سے متاثر ہوئے بغیر نانی نے مسئلہ کا سادہ ماحل پیش کیا تو وہ دل ہی دل میں انہیں داد دینے بغیر نہ دیکھ سکتی کہ اس عمر میں ان کا دماغ کیا خوب کام کرتا ہے۔ بہر حال وہ بھی ان کی نواہی کی سوا تھے پر ہاتھ مارتے ہوئے نہایت مصیبت سے بولی۔

”واقعی نانی آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں لیکن گھبراہٹ میں.... یہ سامنے کی بات مجھے سمجھ ہی نہیں آئی۔“

”تمہارا دماغ تو ہے ہی ایسا ناکارہ۔ ویسے تمہیں دنیا کی باتیں بتانی آتی ہیں لیکن وقت پر کام کی بات بھائی نہیں دیتی۔“ اس بار آمنہ نے اسے گھر کا۔

”بس اب جانے دو اور بچی کا پچھا چھوڑو۔ جو ہوا سو ہوا۔ اللہ کا شکر ہے یہ سچ سلامت واپس گھر تو آگئی۔“

ماموں نے ایک بار پھر بھائی کی سائل کی۔

”ہاں یہ تو خیر اللہ کا احسان ہے کہ بچی خیریت سے گھر آگئی لیکن آئندہ کے لیے احتیاط کرنا۔ اسے ٹھیک۔۔۔۔۔

میں تجھے بتا رہی ہوں کہ خبردار جو آئندہ بڑوں کے بغیر لڑکیوں کو لے کر اکیلا گھر سے نکلا ہو تو۔“ انہوں نے روئے سخن فوراً لاڈ لے پڑے کی طرف کر لیا۔

”میری توبہ دادی اماں، میں تو خود آئندہ کے لیے کان پکڑتا ہوں۔“ خاموش کھڑے ٹھیک نے سچ کان پکڑ لیے توب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ ان افراد میں نجم الدین شامل نہیں تھے۔ بیٹی کے غیاب کی خبر سن کر وہ جتنے بند حال ہوئے تھے اس کی واپسی پر شکرانے کے لعل ادا کرنے کی بھی انہیں اتنی ہی فکر ہوئی تھی اور وہ جلد از جلد یہ فریضہ انجام دینے کے لیے کسی تفصیل میں جانے بغیر فوراً ہی وضو کرنے چلے گئے تھے۔

☆☆☆

”دینی۔۔۔۔۔؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں، دینی۔“ سندر نے مسکراتے ہوئے اسے جواب دیا۔

”لیکن میں وہاں اکیلی جا کر کیا کروں گی؟“ وہ ابھی۔

”اکیلی کہاں بس شلیپا ہوں گی تمہارے ساتھ۔“

”پھر بھی میں نہیں جا رہی۔ میری طبیعت کچھ ڈل سی ہو رہی ہے۔ میرا کچھ کرنے کا دل نہیں چاہ رہا۔“ اس نے منہ بسورتے ہوئے کہا اور اپنی کمر کے نیچے تکیہ لگا کر بیڈ پر نیم دراز ہو گئی۔

”تم بڑے کمال کی عورت ہو یا۔ میرے کو لیکچری پتیاں تو ہر دوسرے منہ دینی جانا چاہتی ہیں اور وہ بڑی مشکل سے انہیں نالتے ہیں۔“ سندر نے فس کر اسے بتایا۔

”تو ان کی شادیوں کو کتنی سال بیت گئے ہوں گے ناں ہماری شادی کو تو اتنا سا ہی عرصہ ہوا ہے میں تو سارا وقت آپ کے قریب رہنا چاہتی ہوں۔“ اس نے سندر کے شانے پر اپنا سر ٹکاتے ہوئے بڑی محبت سے کہا۔

”ساتھ تو ہمیں ہمیشہ ہی رہنا ہے لیکن میں چاہتا ہوں کہ تم اس وقت دینی ضرور جاؤ۔ وہاں جا کر تمہیں بہت کچھ

سیکھنے کو ملے گا۔ خوب دل بھر کر گھومنا اور شاہنگ کرنا۔ میں تو ویسے بھی آنے والے دنوں میں بہت مصروف ہوں گا۔ گھر واپس آنے کی فرصت بھی شاید ہی ملے۔“ اس کے ریشمی بالوں سے کھیلنے ہوئے ذہ دھیرے دھیرے اسے سمجھانے لگا تو اسے قائل ہونا ہی پڑا۔

”ٹھیک ہے، آپ کہتے ہیں تو میں چلی جاتی ہوں ورنہ میرا بالکل بھی دل نہیں چاہ رہا۔“ اس نے منہ بسورتے ہوئے ہامی بھری۔

”یہ بری بات ہے ہنی، مس شلیپا بھی کچھ سن کر رہی تھیں کہ آج کل تم کسی بھی چیز میں زیادہ انٹرسٹ نہیں لے رہی ہو۔“ سندر نے اسے سمجھانے کی تو وہ جلد ہی ہوشی اور صفائی پیش کرنے لگی۔

”وہ بس۔۔۔۔۔ میں نے کہا نا کہ میری طبیعت تھوڑی ڈل ہو رہی ہے۔“

”اسی لیے تو میں چاہتا ہوں کہ تم دینی جاؤ۔ دیکھنا وہاں جا کر تم کتنی فریش ہو جاؤ گی۔ تم شاید ابھی تک میری اس اچھا کو بھی طرح سمجھ نہیں سکی ہو کہ میں تمہیں ایک بہت ہی پالندہ اور گرم پرستانہ دیکھنا چاہتا ہوں تاکہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ سندر کپور کی بیٹی اس کے اسٹینڈرڈ کی نہیں ہے۔“ وہ اس طرح اسے سمجھاتا تھا کہ اس کے پاس بحث کی گنجائش ہی نہیں رہتی تھی۔

”اچھا بابا کہہ تو رہی ہوں کہ چلی جاؤں گی دینی۔ اب تو خوش ہو جائیں اور آج جو قسمت سے میرے پاس ہیں تو اس وقت کو انجوائے کریں نا۔“ وہ سندر کپور کی سن پند بیوی تھی اس لیے اسے ناز و ادا دکھانے کا حق رکھتی تھی۔

”ٹھیک ہے کرتے ہیں انجوائے۔ تم ذرا ڈرنک تو تیار کرو۔“ سندر نے جواباً اس کے ساتھ ایک شوخ شرارت کی اور پھر فرمائش کر ڈالی۔ اس فرمائش پر وہ داسی جھگڑ گئی۔

”کیا سوچنے لگیں یا ڈرنک کے بغیر میں کچھ بھی انجوائے نہیں کر سکتا۔ میں تمہیں بتاؤں ہر اچھا گیت اور اچھی کمپوزیشن میں نے نشے کی حالت میں ہی تیار کی ہے۔ شراب تو میری رگوں میں خون کی طرح دوڑتی ہے اور یہ نہ ہو تو میں بالکل بے کار ہو جاتا ہوں۔ کچھ کر ہی نہیں پاتا۔ سچ بتاؤں تو یہ بغیر مجھے اپنی آواز بھی بھونڈی بھونڈی سی لگتی ہے۔“ اپنی بات کہہ کر وہ زور سے ہنسا تو اسے ناچار اس کی فرمائش پوری کرنے کے لیے حرکت میں آنا پڑا۔ بحث کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا کیونکہ اس کا نتیجہ وہ پہلے ہی دیکھ چکی تھی۔ سندر کو کسی دوسرے کی دلیل سے قائل ہونا آتا ہی

نہیں تھا۔ اگلے ہی لمحے وہ مس شلیپا کے سکھائے ہوئے طریقے کے مطابق ڈرنک تیار کر رہی تھی تو اس کا دل بچھا ہوا تھا لیکن سندر مسکرا رہا تھا۔

”زبردست، تم نے بہت اچھی ڈرنک تیار کی ہے۔“

اس کی مرمریں اٹھیوں سمیت جام تھام کر سندر نے ایک گھونٹ لیا اور تو مصفیٰ لہجے میں بولا تو اس کے ہونٹوں پر ہنسکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔

”کہتے ہیں ایک دوسرے کا جھوٹا پینے سے محبت بڑھتی ہے، لقمہ بھی پیو۔“ یکدم ہی سندر نے جام اس کے ہونٹوں سے لگا دیا اور وہ سندر کی محبت کے لیے زہر بھی بن سکتی تھی، شراب تو کچھ بھی نہیں تھی۔ کم از کم اس لمحے اس نے یہی سوچا تھا۔

☆☆☆

اس نے ڈاکٹر کے خاموش ہونے پر اسے بے یقین نظروں سے دیکھا۔ اسے لگا کہ جو کچھ اس نے سنا اس کا مفہوم وہ نہیں ہے جو وہ سمجھتی ہے اور ابھی ڈاکٹر ایسا کوئی جملہ کہہ گا جس سے اس کی غلط فہمی دور ہو جائے گی لیکن ڈاکٹر کی نظروں میں موجود تم کہہ رہا تھا کہ کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی ہے اور حقیقت وہی ہے جو وہ سن اور سمجھ چکی ہے پھر بھی اس نے دل کی تسلی کے لیے میز پر دھرا اور لفاظی اٹھایا جس میں اس کی رپورٹ تھیں۔ لفاظی کھول کر رپورٹ نکالتے ہوئے اس نے دیکھا کہ اس کی انگلیاں لرز رہی ہیں۔ کا پتھی اٹھیوں سے اس نے بے مشکل کاغذ کی تہ کوئی۔ وہاں وہی ہمایا تک حقیقت موجود تھی جسے ڈاکٹر کی زبانی سن لینے کے باوجود وہ ماننے کے لیے تیار نہیں تھی لیکن نہ ماننے سے کیا ہوتا ہے، حقائق بھی نہیں بدلتے۔

”میں آپ کے لیے یہ میڈیسن لکھ رہا ہوں۔ اس ایچ پر علاج کی امید دلانا تو مشکل ہے لیکن آپ کی تکلیف میں کمی ضرور ہو جائے گی۔“ نرم اور دھردلہ لہجے میں کہتے ہوئے ڈاکٹر نے ایک سفیر کاغذ اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے مشینی انداز میں وہ نسخہ تھام لیا جو اس کے مرض کا علاج میں تھیک پو کچھ کر کر سی ہے اٹھ گئی۔ ڈاکٹر کے کمرے سے اٹھ کر ہسپتال کے لان تک پہنچنے کے لیے اسے اپنے پیروں کو گھسیٹنا پڑا تھا۔ ایک بیچ تک بیٹھ کر وہ گرنے کے انداز میں اس پر بیٹھتی۔ موم سرد تھا اور ٹھنڈا گویا ہڈیوں تک میں اتر رہی تھی لیکن وہ یکدم ہر احساس سے بے نیاز ہو گئی تھی۔ اس کی گرم شال شانے سے پھسل کر بیچ سے نیچے لٹک رہی تھی لیکن اس کی توجہ کا مرکز صرف اور صرف اپنے ہاتھ میں موجود وہ کاغذات تھے جس میں اس کی عمر کا کل کوشوارہ

موجود تھا اور وہ جانتی تھی کہ وہ مکمل خسارے میں رہی ہے۔ اپنے نقصان کا حساب کرتے ہوئے وہ بہت دیر تک اس بیچ پر بیٹھی رہی۔ کتنے ہی آنسو اس کی آنکھوں سے نکل کر اس کے رخساروں اور گرمیوں کو بھگو گئے۔ بہت دیر بعد اسے احساس ہوا کہ وہ ایک پبلک ٹیلیس پر بیٹھ کر آنسو بہا رہی ہے۔ پرس میں سے رو مال نکال کر اس نے اپنے آنسوؤں کو خشک کیا اور پھر بہت سی سے سوچا۔

”یہ احساس زیاں، حیرت اور ماتم کیوں؟ میں نے جو زندگی گزاری اس کا حاصل تو یہی نکلتا تھا۔“ پھر وہ وہاں سے اٹھ کر پارکنگ کی طرف بڑھ گئی جہاں اس کی قیمتی گاڑی کھڑی تھی۔ گاڑی نے نہایت سبک رفتاری سے اسے اس کے محل نما گھر تک پہنچا دیا۔ گھر تک کا مختصر فاصلہ طے ہونے تک وہ اپنی زندگی کا ایک اہم فیصلہ کر چکی تھی۔

”میں گھر چھوڑ رہی ہوں۔ کیا تم میری رہائش کا انتقام کر سکو گے؟“ اس نے اپنے قیمتی موبائل سے آخری کال اس شخص کو کی جس کے تعاون کا اپنے سوال سے پہلے بھروسہ تھا۔

”ہاں لیکن تم نے گھر چھوڑنے کا فیصلہ کیسے کر لیا؟“

حسب توقع اس نے فوراً ہامی بھری لیکن حیرت کا اظہار کیسے بغیر نہ رہ سکا۔

”تمہارے تمام سوالوں کے جواب میں ملاقات پر دوں گی۔ تم بس دس منٹ میں مجھے لینے آ جاؤ، آ جاؤ گے؟“

”ہاں۔“ اسے ایک بار پھر اثبات میں جواب ملا تو اس نے موبائل کو پاور آف کر کے ایک طرف اچھال دیا۔ ٹھیک آٹھ منٹ بعد وہ اپنے شاندار گھر کے گیٹ سے باہر نکلی تو اس کے ساتھ اپنے ضروری کاغذات کے علاوہ صرف ایک شے موجود تھی۔ دو منٹ میں وہ پیدل چل کر اپنی اسٹریٹ کے کارٹر تک پہنچی تو ایک گاڑی کے ٹائر اس کے قریب چرچرائے اور وہ دروازہ کھول کر اطمینان سے اندر بیٹھ گئی۔ پیچھے گیٹ پر کھڑا کچا دیوار ہکا بکا تھا کہ آرام دہ گاڑی کو چھوڑ کر اس کی بالین پیدل کدھر کو چل پڑی ہے لیکن اس کی اتنی اوقات نہیں تھی کہ اس سوال کو اپنے لبوں پر لاسکا۔

☆☆☆

سندر کے کہنے پر وہ دینی بیچ کی تھی۔ اس سفر میں مس شلیپا اس کے ساتھ تھی اور اس کا ساتھ قیمت تھا کیونکہ دینی جیسی اپنی سر زمین پر وہ خود سے تو انجوائے بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اسے کیا معلوم تھا کہ ابن بطوطہ مال کدھر ہے اور شیخ زائد شاہ ہر کدھر کوجا جاتی ہے۔ حرہ اور شیرن ہوٹل کا کل وقوع

بولی۔ ”سندر، سندر کہاں تھے آپ؟ میں نے کتنی بار آپ کا نمبر ڈائل کیا لیکن آپ کا موبائل ہی آف تھا۔“ اپنی بے قراری میں اسے ذرا تاخیر سے احساس ہوا کہ دوسری طرف سے لائن کاٹی جا چکی ہے۔ احساس ہونے پر اس نے شلیپا ہی کے موبائل سے دوبارہ سندر کا نمبر ڈائل کیا لیکن فون بارڈ آف کیا جا چکا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور فون یوں ہاتھوں سے گر گیا جیسے اب ان ہاتھوں میں کسی بھی شے کا وزن سہارنے کی طاقت باقی نہ رہی ہو۔

☆☆☆

وہ بالکل ساکت بیٹھی شیشے کے پار کرتی برف کو دیکھ رہی تھی۔ بچے اور بڑے اس برف میں ہنستے، کھیلتے، کھلکھلاتے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ دولت کے بل بوتے پر عریوں کی برف باری کے شوق کو پورا کرنے کے لیے صحرا میں سجایا گیا ایک طلسم لیکن وہ اس طلسم کو دیکھ کر پتھر نہیں ہوتی تھی۔ اسے تو اس طلسمی دنیا نے پتھر ادیا تھا جس کی چمک دمک نے دور سے اسے ایسا مسحور کیا تھا کہ وہ اس دنیا میں داخل ہونے کے لیے چل گئی تھی لیکن اب کچھ نہیں آتا تھا کہ خود کو اس دنیا میں کیسے ایڈجسٹ کرے۔ سندر اس سے بدستور ناراض تھا اور ان کی پورے تین دن سے آپس میں بات نہیں ہوئی تھی۔ مہتا دینی میں دو دن گزارنے کے بعد واپس پہنچی جا چکا تھا۔ اس کے قیام کے وہ دو دن اس نے اپنی بقا کی جنگ لڑتے ہوئے گزارے تھے۔ دوسرے دن بھی اس نے بے تحاشا شراب نوشی کی تھی اور خود کو کمرے میں بند کر لیا تھا یوں مہتا کو منانے کی مشکل سے بچ گئی تھی۔ اپنی دو دن کی بے تحاشا شراب نوشی کا نتیجہ اسے طبیعت کی بے حد خرابی کی صورت میں پہنچتا پڑا تھا لیکن تجربہ کار شلیپا کی تدبیروں کی وجہ سے کافی سنبھل گئی تھی اور اب ذہنی شام میں یہاں موجود اپنی اداسی کو دور کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس جگہ وہ شلیپا کے ساتھ پہلے بھی آچکی تھی لہذا اسے بتائے بغیر کیب لے کر اکیلی چلی آئی تھی۔ وہ کچھ وقت اپنی مرضی سے گزارنے کی خواہش مند تھی اس لیے شلیپا کا دم چملا ساتھ لگا نا پسند نہیں کیا تھا۔

”آج پھر آپ تنہا ہیں؟“ اپنی سوچوں میں الجھے اسے احساس ہی نہیں ہوا کہ کوئی اس کے قریب کھڑا ہوا ہے وہ بولا تو چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

”مشرعاشر انور..... کیا آپ میرا پیچھا کیا کرتے ہیں؟“ اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ عاشر کو وہاں پا کر تھوڑی سی خوش کیوں ہوئی تھی۔

کے صل کے لیے اس سے کوئی مدد نہیں مل سکتی۔ اسے اپنے پیڑروم سے چلے جانے کا اشارہ کر کے وہ دوبارہ بستر پر ڈھیر ہو گئی۔ رات کی شراب نوشی اور نیند کی کمی کے باعث اس کے سر میں سخت درد ہو رہا تھا۔ طبیعت کا بھاری پین جسے وہ کئی دنوں سے نظر انداز کر رہی تھی اب کچھ اور بھی واضح طور پر محسوس ہونے لگا تھا۔ پریشانی اور بے کنفی کے اس عالم میں اسے کچھ بھائی کی نہ دیا تو خود کو مدہوش کر لینے کی خواہش میں زندگی میں پہلی بار خالصتاً اپنی مرضی سے شراب نوشی کرنے لگی۔ رات اس نے بہت ڈٹ کر کھانا کھا یا تھا اس لیے شراب بالکل خالی پیٹ میں نہیں جا رہی تھی لیکن بہر حال وہ نڈھال تو ہو ہی گئی۔ عادی شرابی نہیں تھی کہ شراب کی اتنی زیادہ مقدار سہارا جاتی جلد ہی اس کے حواس نے ساتھ چھوڑ دیا اور بستر پر نڈھال ہو کر گر گئی۔ نئے کی زیادتی سے بھاری ہو کر بند ہو جانے والے پتھروں نے اسے عارضی طور پر ہی سہی درد پیش سکتے تھے نجات بھی دلا دیتی لیکن آخر کب تک چند گھنٹوں بعد ہی سہی اسے ہوش و خرد کی دنیا میں واپس آنا ہی تھا۔ ہوش میں آتے ہی اس کا شلیپا سے سامنا ہوا۔ وہ اس کے قریب ہی بیٹھی اسے تشویش ناک نظروں سے گھور رہی تھی۔

”مائی گاڈیم۔ آپ نے یہ ساری شراب ایک وقت میں اکیلی ہی پی ڈالی۔“ اسے آنکھیں کھولتے دیکھ کر شلیپا نے شراب کی بڑی سی خالی بوتل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ دے ہی نہیں سکتی تھی۔ اس کا سر درد سے چننا جا رہا تھا اور اتنی بری طرح ایکائیاں آ رہی تھیں کہ لگتا تھا کہ آنتیں باہر نکل کر آجائیں گی۔ شلیپا اس کی کیفیت کو سمجھ گئی اور تیزی سے اٹھ کر کمرے سے باہر نکلی۔ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں لین جوس سے بھرا ہوا گلاس تھا۔ وہ گلاس اس نے زبردستی اس کے ہونٹوں سے لگا یا اور کھونٹ کھونٹ کر کے پلائی رہی۔ آدھا گلاس جوس پی کر ہی اسے تھو گئی۔ شلیپا اسے سنبھالنے لگی۔ اسی وقت شلیپا کا موبائل بجایا، اس نے کال ریسیو کی۔

”میڈم کی حالت بہت خراب ہے سر۔ انہوں نے اوور ڈرنک کر لی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق کل میج تک ان کی حالت سنبھلا مشکل ہے۔“ اپنی بے حد خراب ہوتی حالت کے باوجود اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ شلیپا سندر سے بات کر رہی ہے۔

”مجھے دو موبائل، میں سندر سے بات کروں گی۔“ اس نے شلیپا کے ہاتھ سے موبائل چھپٹ لیا اور تیزی سے

کھنٹی نے جگا دیا۔ یہ سندر کی کال تھی اس لیے وہ نظر انداز نہیں کر سکی اور ریسیو کا بزن دبا دیا۔

”تم نے مہتا صاحب کے ساتھ کیا حرکت کی ہے جنہیں کچھ اندازہ بھی ہے۔ ابھی ان کا فون آیا تھا میرے پاس۔ وہ سخت ناراض ہیں کہ میری بیٹی نے ان کے ساتھ کسی بیوی کی اور اس حد تک چلی گئی کہ انہیں زخمی کر ڈالا۔“ اس کی ہیلو کے جواب میں سندر نے سخت برہمی سے بولنا شروع کر دیا۔

”میں نے ان کا بہت خیال رکھا تھا سندر لیکن انہوں نے مجھ سے بدتمیزی کی تو میں برداشت نہیں کر سکی۔“ اس کے ساتھ سندر نے پہلی بار اس لہجے میں بات کی تھی اس لیے وہ سہمی گئی اور دبے دبے لہجے میں اپنی صفائی پیش کرنے لگی۔

”میں یہ سب نہیں سنا چاہتا۔ میں بس اتنا جانتا ہوں کہ مہتا میرے لیے بہت اچھوت پر سن ہے۔ میرا پورا کیریئر اس پر ڈھکی پینڈ کر رہا ہے اس لیے اس کی ناراضی انور ڈھکی کر سکتا۔ تمہیں بہر حال میں اسے منانا ہوگا، سن لیا تم نے۔“ وہ پہلے سے بھی زیادہ بلند آواز میں چیخا اور لائن کاٹ دی۔ اسے لگا کہ سندر معاملے کو پوری طرح سمجھ نہیں سکا ہے اس لیے اس پر صورت حال واضح کرنے کے لیے کال بیک کرنے لگی لیکن سندر کا نمبر بند جا رہا تھا۔ اس کی ہر کوشش ناکام ہو گئی۔ تھک ہار کر اس نے شلیپا کو اپنے پاس بلایا اور اس سے مہتا کے بارے میں دریافت کیا۔

”میں نے ان کی ڈورینگ کر دی تھی لیکن میرے بہت انسٹ کرنے پر بھی وہ یہاں رکنے پر راضی نہیں ہوئے اور رات کو ہی ہوٹل شفٹ ہو گئے۔“ شلیپا نے اسے بتایا۔

”اب کیا کروں، سندر کا کہنا ہے کہ انہیں منانا ضروری ہے۔“ اس نے اپنے دونوں ہاتھ بے چینی سے مسلے۔

”مشر کپور غلط نہیں کہہ رہے ہیں۔ مہتا صاحب کی ناراضی سے ان کا کیریئر برباد ہو جائے گا۔“ شلیپا نے اسے مزید ڈرایا۔

”میں ان سے سوری کہہ سکتی ہوں لیکن مجھے معلوم ہے کہ وہ شخص صرف میرے سوری کہنے سے بات ختم نہیں کرے گا۔ میں نے اس کی نظروں میں ہوس دیکھی ہے اور اپنی ہوس پوری کیے بغیر وہ کسی طرح راضی نہ ہوگا۔“ بڑبڑانے کے انداز میں اس نے شلیپا پر حقیقت واضح کی۔

”کیا فرق پڑتا ہے۔ سندر عورتوں کو اپنے پتی کی کامیابی کے لیے بھی کتنی یہ قربانی بھی دینی پڑتی ہے۔“ شلیپا کے جواب نے اس پر دماغ کر دیا کہ اپنے مسئلے

کیا ہے اور سندر میں با دہانی بخشی کی طرح نظر آتے برج دینی ہوئے تک کیسے پہنچا جا سکتا ہے۔ شلیپا نے اسے پورا دینی گھمایا۔ بہترین شاہک سینئر سے خریداری کر دانی اور ہر قابل ذکر ہوئے میں کھانا کھلانے لے گئی۔ ان سارے کاموں کے دوران وہ اس کی معلومات میں اضافے کے ساتھ اس بات کا قریب بھی سمجھاتی رہی کہ کہاں کس قسم کے رویوں کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ وہ جو دینی آنے سے پہلے بہت ادا اس ہو رہی تھی یہاں آ کر نہ صرف بیل گئی بلکہ پوری طرح گمن ہو گئی۔ بغیر سوچے سمجھے بے تحاشا شہک کرنے اور کرتے چلے جانے کا لطف بھی اس نے زندگی میں پہلی بار اٹھایا تھا۔ سندر سے اس کی بھی بھار فون پر بات ہو جاتی تھی اور وہ نئے نئے بچوں کی طرح اس کو ایک ایک بات تفصیل سے بتانے کی کوشش کرتی لیکن سندر کے پاس عموماً اتنا وقت نہیں ہوتا تھا کہ تفصیل سے اس کی باتیں سن سکے۔ وہ وہاں سندر ہی کی ملکیت ایک اپارٹمنٹ میں مقیم تھی جو ہر طرح کی سہولیات سے آراستہ تھا۔ ایک روز سندر نے اسے اطلاع دی کہ مہتا صاحب دینی آ رہے ہیں اور وہ اسی کے اپارٹمنٹ میں قیام کریں گے چنانچہ وہ ان کی مہمان نوازی کا پورا خیال رکھے۔ وہ جانتی تھی کہ مہتا سندر کے لیے بہت اہم شخص ہے اس لیے بہت خیال سے اس کے لیے بیڈروم تیار کیا اور قسم قسم کے پکوان کا بھی انتظام کر ڈالا۔ مہتا نے اس کے حسین انتظام کو خوب سراہا اور اسے مہتا کی خوشنودی کے لیے اس کے ساتھ بیٹنے پلانے کی محفل میں بھی شریک ہونا پڑا۔ خود اس نے تو اپنی برداشت کے مطابق حد میں رہتے ہوئے ہی بی لیکن مہتا جام پر جام لٹھ کا تا رہا اور نئے میں چور ہو کر آپے سے باہر ہونے لگا۔ ابتدا اس نے اس کی زبانی کلائی تحریف سے کی پھر فٹس لینے سنانے لگا اور آخر میں دست درازی پر اتر آیا۔ یہ تیسرا مرحلہ ایسا نہیں تھا جو وہ برداشت کر جاتی۔ اس نے پوری قوت سے مہتا کو دھکا دے ڈالا، اس کا سر جا کر گئی وہی ٹرائی سے ٹکرایا اور خون بہنے لگا۔ خون بہنے کی رفتار اتنی زیادہ نہیں تھی کہ وہ پریشان ہوئی۔ ویسے بھی اسے شدید غصہ آ رہا تھا اس لیے پروا کیے بغیر وہاں سے ہٹ کر اپنے پیڈروم میں چلی گئی اور دروازہ اندر سے لاگ کر لیا۔ وہ دیکھ چکی تھی کہ اب تک منظر سے غائب شلیپا مہتا کو سنبھالنے کے لیے وہاں پہنچ چکی ہے۔ وہ ساری رات اس نے بہت بے چینی سے سوتے جاتے گزار دی۔ شلیپا نے آ کر اس کے دروازے پر دستک بھی دی لیکن وہ انجان بن گئی۔ صبح کے قریب جا کر اسے گہری نیند آئی ہی تھی کہ موبائل کی

قد چھوٹا ہے تو کیا ہوا؟

گروٹال
جو ہے!



ایک ماہ کی پلائی صرف -/495Rs



اگر آپ کی عمر 30 سال سے کم ہے تو گروٹال آپ کا قد بڑھا سکتی ہے!

ملک بھر کے ہر اچھے میڈیکل سٹور، ہومیو پیتھک سٹور اور دوا خانہ پر دستیاب

042-35789145&6, 0334-4266255

Email: toptreatments@gmail.com, Website: www.toptreatments.net

II

”اچھا آج، ہم بھی چل کر صحرایہ برفی سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔“ وہ یکدم ہی موضوع بدل گیا اور تھوڑی دیر بعد جب وہ.... دینی میں اس کے ساتھ انجوائے کر رہی تھی تو قی طور پر ساری پریشانیوں اس کے ذہن سے نکل گئی تھیں بالکل اسی طرح جیسے یہاں موجود افراد قبول ہوئے تھے کہ کسی یورپی ملک جیسے برف کے اس ماحول سے باہر وہی دینی ہے جو اہل میں صحرا میں بسایا گیا ہے اور جہاں کی گرمی کا انکڑیشنز کے بغیر مقابلہ کرنا نازک مزا جوں کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔

☆☆☆

”سندر پلینز آپ میری بات تو سنیں۔“ اس نے دینی میں تقریباً پورا مہینہ گزارا تھا اور اس عرصے میں سندر نے اس سے ایک بار بھی بات نہیں کی تھی۔ وہ سندر کو منانے کے لیے واپس بسنی آنا چاہتی تھی لیکن بقول شلیا سُر کی طرف سے اجازت نہیں ہے۔ اجازت ملنے تک پورا مہینہ گزارا تھا اور واپس آنے کے بعد بھی پندرہ دن تک اسے سندر کی شکل دکھائی نہیں دی تھی۔ شلیا کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق وہ فلم پونٹ کے ساتھ مصروف تھا۔ بے قراری سے دن گزارتی وہ سندر کی مصروفیت ختم ہونے کا انتظار کرتی رہی آخر کار سولہویں دن جا کر اسے سندر کی صورت گھر میں دیکھنے کو ملی وہ بھی اس عالم میں کہ وہ اس کی طرف سے قطعی بے نیاز نظر آ رہا تھا۔

”میں تمہاری کیا بات سنوں؟ باتیں تو مجھے مہتانے سنائی تھیں۔ تم اندازہ نہیں کر سکتی ہو کہ مہتا کی زبانی ہی جتنی کے کس بی ہو کا سن کر مجھے کتنا برا لگا۔ تم نے تو ایک طرح سے اس پر قحطانہ حملہ کر ڈالا تھا۔ اگر وہ پونٹ کے پاس چلا جاتا تو تمہارا کیا ہوتا؟“ بہت بلند آواز میں سندر نے اسے تازہ شروع کیا تو اسے اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ نہ جانے کیوں آج کل دل کی ایسی ہی کیفیت تھی وہ بار بار اسے ڈوبتا بھرا محسوس کرتی اور سوچتی کہ یہ شراب نوشی اور فیشن کا نتیجہ ہے۔

”یقین کر سندر میں نے مہتا کی مہمان نوازی میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی لیکن جب وہ شراب کے نشے میں دھت ہو کر مجھ سے دست درازی کرنے لگا تو مجھے فوراً اس کے ساتھ وہ سلوک کرنا پڑا۔ میں اسے آپ کی امانت میں خیانت کیسے کرنے دے سکتی تھی؟“ اس نے بہت ہمت کر کے اپنی توانائیاں یکجا کیں اور خود ہی سندر کے سامنے وکیل صفائی کا کردار ادا کرنے لگی۔

”ریش..... تمہیں معلوم ہے مہتا نے اپنی اس بے

”آپ یوں بھی تو سمجھ سکتی ہیں کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔“ عاشر کے ہونٹوں پر شوش مسکراہٹ ابھری۔ وہ خاصی معقول شکل و صورت کا بندہ تھا اور جتنی پہناوے اسے کچھ اور اسماٹرنس بنا دیتے تھے۔ بیس میں اس کے ساتھ گزارے وقت میں وہ عاشر کے بارے میں اتنا تو جان چکی تھی کہ وہ ایک ویل آف فٹنل سے تعلق رکھتا ہے اور فوٹو گرافی وغیرہ بس شغل کے طور پر اپنا رکھی ہے۔

”تو اب تم مجھے سے فلرٹ کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔“ اس نے مصنوعی خشکی سے عاشر کو گھورا۔

”تہا، حسین خاتون کو دیکھ کر تو کسی کا بھی دل بے ایمان ہو سکتا ہے۔“ وہ ڈھٹائی سے مسکرا کر بولا لیکن وہ دیکھ سکتی تھی کہ اس کی آنکھیں شفاف ہیں اور ان میں مہتا جیسی غلاطت نہیں بھری ہوئی پھر بھی یکدم ہی اس کی اداسی اس پر حاوی ہو گئی۔

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو جس عورت کے ساتھ اس کا شوہر موجود نہ ہو لوگ اسے لوٹ کا مال ہی سمجھ لیتے ہیں۔“ آپ غلط سمجھ رہی ہیں، میں صرف مذاق کر رہا تھا۔“ اس نے فوراً صفائی پیش کی۔

”تم بھی غلط سمجھ رہے ہو میرا اشارہ تمہاری طرف نہیں تھا۔ تمہارے معصوم فلرٹ سے میرا کچھ نہیں بگڑنے والا۔“ ”کیا کوئی ایسی بات ہوئی ہے جو آپ کے مزاج پر گراں گزری ہے؟“ اس بار عاشر نے اسے ذرا غور سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں کے نیچے چلتے تھے اور رنگت بھی ذرا زرد محسوس ہو رہی تھی۔ عاشر کے سوال کے جواب میں وہ بس ہونٹ کا پٹی رہتی زبان سے کچھ نہ بولی۔

”میں نہیں جانتا کہ آپ کس مسئلے کا شکار ہیں لیکن یہ بتا سکتا ہوں کہ آپ جس کلاس میں شامل ہو گئی ہیں وہاں مرد حسین عورتوں سے ان کے شوہروں کی موجودگی میں بھی آرام سے فلرٹ کرتے ہیں اور شوہر حضرات صرف اس لیے ہنس کر مال دیتے ہیں کہ سامنے والے بندے سے ان کا کوئی نہ کوئی مفاد وابستہ ہوتا ہے۔“ وہ جیسے اس کے بتائے بغیر بھی اس کا مسئلہ سمجھ گیا تھا۔

”لیکن میں یہ سب برداشت نہیں کر سکتی۔ میں نے سندر پر اپنا سب کچھ قربان کر دیا ہے لیکن عزت..... عزت کی قربانی دینا میرے لیے ممکن نہیں ہے۔“ اس کے لہجے میں دبا دبا غصہ تھا۔

”اگر آپ یہ جنگ جیت گئیں تو مجھے خوشی ہوگی۔“ عاشر کا انداز ایسا تھا جیسے اسے اس کے جیتنے کا یقین نہ ہو۔

”حور کے پہلو میں لنگور۔“ موتی تو ند، سیاہ رنگت اور نائے قد کے مالک شخص نے اس کے لیے اپنی بی ایم ڈبلیو کا دروازہ کھولا ہی تھا کہ قریب ہی پارک کی گلی میں سے اترے بے فکرے نوجوان کے ایک گروپ میں سے کسی نے فقرہ چست کیا اور پھر پورا گروپ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ بی ایم ڈبلیو کے مالک کے چہرے کی رنگت غصے اور شرمندگی کے باعث مزید سیاہ پڑ گئی لیکن اس کے سین چہرے پر کوئی تاثر نہیں ابھرا بلکہ یوں محسوس ہوا کہ اس نے کچھ سنا ہی نہ ہو لیکن یہ درست نہیں تھا حقیقت صرف اتنی تھی کہ اسے اس

بہت روکھا تھا۔
”کیا مطلب..... کسی حماقت؟“ اس کا سارا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔
”بھئی نیچے والی حماقت۔ میں اتنی جلدی بچہ نہیں چاہتا۔ ابھی تو ہم نے سچ سے ایک دوسرے کا ساتھ انجوائے بھی نہیں کیا اور تم بچے کی الجھن میں پڑ گئیں۔“ سندر کا لہجہ ذرا نرم ہوا۔

”ایک ساتھ لائف انجوائے کرنے کے لیے تو شاید آپ کو بھی فرصت ہی نہ ملے۔“ اس کے لبوں پر شکوہ چل گیا۔
”فضل باتیں مت کرو، میں اتنی جلدی بچہ نہیں چاہتا۔ ختم کرو یہ سلسلہ میں نے شلیا سے کہہ دیا وہ اس سلسلے میں ڈاکٹر سے بات کر لے گی۔“ اس کے لہجے کی نرمی غائب ہو گئی اور سختی سے فیصلہ کن انداز میں کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔ اس ظالمانہ فیصلے پر وہ تڑپ اٹھی۔ ڈیوٹی پر موجود نرس کرے میں آئی تو اسے سسکا دیکھ کر پریشان ہوئی۔ اس وقت اسے کسی ہمدردی کی ضرورت تھی اس لیے نرس سے سارا ماجرا کہہ ڈالا۔
”تو پرائیلم، آپ کی پریشانی کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا۔“

آپ ڈاکٹر کو ریفوز کر دینا وہ بھی میرا خیال ہے کہ اس اسٹیج پر ڈاکٹر خود بھی ابا رشن کرنا پسند نہیں کرے گی۔ آپ اتنی ویک ہیں کہ ایسا کرنے سے آپ کی جان بھی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔“ نرس کے الفاظ نے اسے راہ بھادی۔ اس کے انکار کے بعد ڈاکٹر نے بھی انکار کر دیا۔ ویسے بھی وہ خود اسے مناسب نہیں سمجھ رہی تھی۔ شلیا اس کے انکار پر اسے سمجھاتی رہی۔ اسے سندر کی ناراضی سے بھی ڈرایا لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوئی۔ بہت با اختیار ہونے کے باوجود شلیا بہر حال تھی تو ایک ملازمہ ہی اس لیے آخر کار بے بس ہو گئی۔ دو تین دن بعد اسے اسپتال سے ڈسچارج کر دیا گیا۔ اس عرصے میں سندر نے بھی اسے فون کیا لیکن اس نے جان کر سندر کی کوئی کال ریسپونڈ نہیں کی۔ گھر واپس آنے کے بعد بھی وہ جو کہ ہر مل سندر کا انتظار کرتی تھی یہی دعا کرتی رہی کہ بہت دنوں تک سندر کو گھر واپس آنے کی فرصت نہ ملے۔ اس کی یہ دعا قبول ہوئی اور مزید ڈیڑھ ماہ گزر گیا تو اسے یہ اطمینان ہو گیا کہ اگر ابا رشن کا کوئی امکان تھا بھی تو اب بالکل نہیں رہا۔ سندر بہت تھا ہو گا یہ جاننے کے باوجود وہ اپنی ممتا کی قربانی دینے کے لیے تیار نہیں تھی۔ اسے معلوم تھا کہ جب بچہ دنیا میں آئے گا تو سندر کا موڈ خود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔ کوئی باپ اپنے خون سے آخر تک تک منہ موڑ سکتا ہے۔

☆☆☆

اس کے چہرے پر تناؤ محسوس کر کے نرس نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تو وہ چونک گئی۔
”بے بی؟“ اس کے ہونٹوں نے حیرت سے جنبش کی۔
”ہیں آپ کا بے بی، آپ اسپیکیٹ کر رہی ہیں نا۔“ نرس نے اس کے کانوں میں امرت سا کھولا۔ اس نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی لیکن نرس نے ہاتھ کے ہلکے سے دباؤ سے اسے اس حرکت سے باز رکھا۔
”حیرت ہے آپ کو اندازہ ہی نہیں تھا حالانکہ اچھا خاصا ٹائم گزر چکا ہے۔“ نرس شوخی سے ہمہ تن تو وہ بھی دھیرے سے مسکرا دی۔ اسے کیا بتانی کہ وہ سندر کے مزاج کی دھوپ چھاؤں اور خود کو اس کے باحوال سے ہم آہنگ کرنے کی جدوجہد میں اتنی بری طرح الجھی ہوئی تھی کہ اپنے آپ سے غافل ہو گئی تھی۔
”نیمیرے بچی کہاں ہیں؟“ ہر عورت کی طرح وہ بھی یہ یقین رکھتی تھی کہ بچے کی خوش خبری سن کر سندر اتنا خوش ہوگا کہ اپنے سارے گلے شکوے بھول جائے گا۔
”آئی ڈونٹ نویم بٹ آپ کی اسٹیڈنٹ مس شلیا وینٹیک روم میں موجود ہیں۔ آپ کہیں تو میں انہیں آپ کے پاس بھیج دیتی ہوں۔“ نرس نے لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے اسے پیشکش کی۔

”ٹھیک ہے۔“ اس نے اپنی رضامندی دی۔ چند منٹ بعد ہی شلیا اس کے سامنے موجود ہو گئی۔
”مسٹر کیور پونٹ کے ساتھ شملہ گئے ہوئے ہیں لیکن انہوں نے کہا ہے کہ آج شام کسی وقت آپ کو کال کریں گے۔“ شلیا کی اطلاع نے اس کے دل کو اداس کر دیا۔ وہ سندر کو جلد از جلد خوش خبری سنانا چاہتی تھی لیکن وہ تو اسے اس حال میں چھوڑ کر شملہ جا چکا تھا۔ شام تک کا وقت اس نے بہت بے چینی سے گزارا اس کی نرس بہت الجھی لڑکی تھی اسے وقت پر غزا اور دوا بھی دیتی رہی۔ وہ بھی دل نہ چاہتے ہوئے نرس سے اس لیے تعاون کرتی رہی کہ اب اسے خود سے زیادہ اپنے وجود میں چلتی دوسری زندگی کا دھیان رکھنا تھا۔

”سندر..... سندر آپ نے سنا آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے ہاں ایک تنہا مہمان آنے والا ہے؟“ شام ڈھلنے والی تھی تب جا کر سندر کا فون آیا۔ سندر سے بات کرتے ہوئے اس کی آواز خوشی سے کانپ رہی تھی۔
”سن چکا ہوں میں اس حماقت کے بارے میں اور اسی کے کارن تمہیں کال کی ہے۔“ جواب میں سندر کا لہجہ

عزتی کا انتقام لینے کے لیے کیا کیا ہے؟ اپنی اگلی فلم میں وہ کسی اور کو بہرہ دلے رہا ہے۔ فلم کے میوزیشن اور سکر کے طور پر بھی میرا نام شامل نہیں ہے۔ جو فلم شوٹ ہو رہی ہے اس کے میڈیا فینچر نے مجھے بتایا ہے کہ فلم کی پہلی سچون چلائی جائے گی اس میں بھی مجھے نظر انداز کرنے کی پلاننگ ہے اور یہ سب صرف اس وجہ سے ہوا کہ تم نے مہتا کو ناراض کر دیا۔“ وہ پہلے سے بھی زیادہ چیخ کر بولا۔
”تو کیا میں اس کی بات مان لیتی؟“ شدید حیرت سے یہ سوال کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں بے چینی تھی۔
”مان لیتیں، مان لینے سے کوئی تم میں بڑے ہیرے موتی نہیں جھڑ جاتے۔ میں نے تم سے بھی تمہاری پارسانی کا سرٹیفکیٹ نہیں مانگا ہے۔ کیا کبھی میں نے تم سے پوچھا کہ تم شادی سے پہلے کہاں کہاں منہ مار چکی ہو؟ نہیں نا تو اب بھی کیا فرق پڑ جاتا۔“ سندر کے جومن میں آ رہا تھا وہ بولتا جا رہا تھا اور وہ بے ہوش ہونے سے پہلے آخری لمحے تک خود کو یہ دھوکا دینے کی کوشش کرتی رہی تھی کہ سندر یہ سب کچھ صرف فینشن کی وجہ سے کہہ رہا ہے ورنہ وہ اس کے بارے میں اس انداز سے سوچ ہی نہیں سکتا۔

☆☆☆

اس کی دوبارہ آنکھ اسپتال کے کمرے میں کھلی تھی۔ جہاں سفید یونیفارم میں لمبوں ایک نوعمری نرس ہونٹوں پر پیاری سی مسکراہٹ بھجائے اس کے سر ہاتھ لکھ رہی تھی۔
”گڈ ایوننگ میم، اب آپ کیسٹل کر رہی ہیں؟“ نرس نے مسکراتے لبوں سے اس سے پوچھا تو وہ اسے جواب دینے کے بجائے اپنے اوپر غور کرنے لگی۔ اس کے دائیں ہاتھ میں ڈرب لگی ہوئی تھی اور پورا جسم اتنی بری طرح دکھ رہا تھا جیسے اب تک پتھر کوٹنے کی مشقت کرتی رہی ہو۔
”مجھے کیا ہوا ہے؟“ اسے بالکل یاد نہیں تھا کہ وہ سندر سے باتیں کرتے ہوئے بے ہوش ہو چکی تھی۔
”آپ کا نرس بریک ڈاؤن ہو گیا تھا میڈم لیکن اب آپ بالکل ٹھیک ہیں۔“ نرس کے ہونٹوں پر دلا سادہ ہوتی پیشہ ورانہ مسکراہٹ تھی لیکن اسے یاد آ گیا کہ وہ کس کس تجربے سے گزری تھی۔ سندر کی شراب نوشی، عورتوں سے تعلقات اور بے توجہی کے الزامات اس کی فیلڈ کے سرخوہپ کر اس نے خود کو کسی حد تک مطمئن کر لیا تھا لیکن اس کی بے غیرتی کو برداشت کرنے کی ہمت نہیں کر سکتی تھی۔
”پلیز میم خود کو ریلیکس رکھیں۔ آپ کے لیے فینشن لینا ٹھیک نہیں ہے۔ اس سے بے بی پر برا اثر پڑے گا۔“

قارئین متوجہ ہوں

پرچا نہیں ملتا

کچھ عرصے سے بعض مقامات پر یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچا نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ بک اسٹال کا نام جہاں پرچا دستیاب نہ ہو۔
☆ شہر اور علاقے کا نام۔
☆ مکمل پتہ بک اسٹال کا PTCCL یا سہ ماہی کال فون نمبر

رابطے اور مزید معلومات کے لیے

شعبہ عباس

03012454188

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

سپنس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگشت

C-63 قریب ۱۱۱ سٹیشن ڈسٹ ہاؤسنگ اتھارٹی میں کورنگی روڈ کراچی

ہماری ویب سائٹ پر بھی سب کچھ

35802552-35386783-35804200

ای میل: jdpgroup@hotmail.com

بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا اور نہ وہ اپنے اور اپنے ساتھی کے مابین فرق سے پوری طرح آگاہ تھی۔ وہ اگر چمکتا ہوا دن تھی تو اس کا ساتھی رات کا گھورا اندھیرا۔ اس کے ساتھ کھڑی وہ کچھ زیادہ ہی چمکتی ہوئی لگ رہی تھی۔

”دودھ پینے کو کوڑا“ نہ جانے کیوں اسے ماضی میں سنی گئی تھی۔ اس وقت یاد آگئی جو رات چلنے ایک جوڑے کو دیکھ کر اس کی نانی کی زبان سے بے اختیار پھسل گئی تھی۔ اس وقت اس مثل کون کر اس سمیت سارے لوگ بہت بے تحاشے بلکہ اسے توہنی کا دورہ ہی پڑ گیا تھا اور ہنستے ہنستے آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ وہ جوڑا تھا ہی ایسا۔ دودھ ملائی سے پئے پئے کی طرح کی کوری عورت کے ساتھ اس کا بہت بلی رنگت والا شوہر واقعی کسی چپوٹنے کی طرح محسوس ہو رہا تھا لیکن قسمت کی ایسی تم نظر لگی تھی کہ خود ایسے ہی مرد کے ساتھ کھڑی وہ کچھ بھی محسوس کرنے سے قاصر تھی۔

اس کے سارے احساسات تو عرصہ ہوا مر چکے تھے۔ وہ جانتی تھی تو صرف اتنا کہ مرد صرف مرد ہوتا ہے۔ اس کا گورا کالا، لمبا، نانا مٹھا کاٹا کچھ بھی ہونا اہمیت نہیں رکھتا۔ اگر کچھ اہمیت رکھتا ہے تو وہ ہے اس کی حیثیت۔ عرصہ ہوا اس نے مردوں کو انسان کے طور پر محسوس کرنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ اس کے لیے صرف ایک ٹارگٹ ہوا کرتے تھے۔ اس وقت بھی وہ لی ایم ڈبلیو فرنٹ سیٹ پر بیٹھی یہی غور کر رہی تھی کہ اس نائے قد مگر اونچے اسٹیش والے بلڈز کو کیسے اپنی ٹانگیں میں لے لے کہ وہ اس کے اشارے پر اپنے دونوں ہاتھوں سے دولت لٹانے کے لیے تیار ہو جائے۔ یہ بھی اس کی زندگی کا عجیب مذاق تھا کہ اسے اپنے دن رات اس دولت کے حصول کے لیے خرچے پڑتے تھے جس کی اس کے دل میں کوئی چاہ ہی باقی نہیں رہی تھی۔

☆☆☆

”دیکھ لی تمہاری محبت، تم تو کہا کرتی تھیں کہ میں تمہیں دنیا کی ہر شے سے بڑھ کر عزیز ہوں لیکن تم نے ثابت کر دکھایا کہ یہ سچ نہیں ہے۔“ سندرواپس لوٹا تو حسب توقع اس کا موڈ خراب تھا لیکن مزاج کی یہ خرابی اس کے انداز سے کچھ کم ہی تھی۔ بس وہ ناقدانہ نظروں سے اس کے جسم کو ٹوٹا رہا تھا۔ تبدیلی کے عمل سے گزرتا اس کا جسم ذرا بھرا بھرا سا لگنے لگا تھا۔

”میں اب بھی یہی کہتی ہوں کہ مجھے آپ سے بے حد محبت ہے اور میں آپ کے حکم کی تعمیل بھی صرف اس لیے نہیں کر سکتی کہ میں آپ کی دی ہوئی سب سے قیمتی نشانی کو ضائع

پھر بولا۔ ”مس شلپا کی محنت رنگ لارہی ہے۔ تم اس عرصے میں خاصی گروڈ ہو چکی ہو۔“

”اس میں تو کوئی شک نہیں جس تھوڑے عرصے کی بات ہے پھر آپ مجھے واقف کے طور پر ہر ایک سے فخر یہ ملوا سکیں گے۔“ رواں انگلیں میں بہت ادا سے یہ جملہ بول کر اس نے سندرو کو مزید خوش کر دیا۔ آج وہ دونوں ہی ایک دوسرے کو خوش کرنے کے موڈ میں تھے۔ سندرو ڈنر کے لیے اسے ایک ایسی جگہ لے گیا جہاں نیم تاریک خواب ٹاک سے ماحول میں کینڈل لائٹ ڈنر کا انتظام تھا۔ ماحول کی خواب ناک کی کے ساتھ ساتھ جوڑوں کو پرائیویسی بھی خوب میسر تھی۔ اپنی شہرت کے سبب سندرو کو ایسی ہی جگہوں کا انتخاب کرنا پڑتا تھا۔ بے حد روٹینگ ماحول میں ان دونوں نے وہاں ڈنر کیا۔

”تمہارا بے بی دنیا میں آجائے تو پھر میں تمہارے دعوے کی آزمائش کروں گا۔“ ڈنر کے دوران سندرو نے اسے ایک بار پھر یاد دہانی کروائی۔

”کر لیتا بابا، میں ریڈی ہوں۔“ وہ اس بات کو بہت لائٹ لے رہی تھی یا پھر اس کا ذہن اس مسئلے میں زیادہ الجھا ہوا تھا جسے وہ آج ہی سندرو سے ڈسکس کر لیتا چاہتی تھی۔ آخر کار واپسی کے سفر میں اس نے اس نازک موضوع پر گفتگو چیخیر ہی دی جو شادی کے بعد سے اب تک ڈسکس نہیں ہو سکا تھا۔

”ہم اپنے بے بی کا نام کیا رکھیں گے سندرو؟“ بہت سلجھاؤ سے اس نے گفتگو کا آغاز کیا۔

”کوئی بھی اچھا سا اپنی پسند کا رکھ لیتا یا۔ ابھی سے اس بارے میں کیا سوچنا۔ پہلے یہ تو معلوم ہو جائے کہ چٹا ہوگا یا بیلی۔“ سندرو نے بے پروائی سے جواب دیا پھر کوئی خیال آنے پر پوچھنے لگا۔ ”بچے کا حیدر تو تمہیں معلوم ہی ہوگا؟ آج کل تو انٹراساؤنڈر سے پہلے ہی معلوم ہو جاتا ہے؟“

”نہیں میں نے نہیں معلوم کیا۔ اچانک معلوم ہونے سے زیادہ خوشی ہوتی ہے۔“ اس نے تجبیدی سے جواب دیا۔ ”چلو جی تمہاری خوشی۔“ سندرو نے بات ختم کر دی۔ وہ بچے کے موضوع پر گفتگو کرنے میں ویسی دلچسپی نہیں لے رہا تھا جیسی پہلی بار باپ بننے والے شخص کو عموماً ہوتی ہے۔

”میرے ذہن میں بابا اور بے بی دونوں کے لیے کئی خوب صورت نام ہیں لیکن میں چاہتی ہوں کہ میرا بچہ مکمل نام اور شخصیت کے ساتھ اس دنیا میں آئے لیکن اس کے لیے آپ کو اسٹیپ لیتا پڑے گا۔“ اپنی بات کہتے ہوئے

اس نے سندرو کا چہرہ غور سے دیکھا۔ ”کیا مطلب، میں سمجھا نہیں؟“ اس کی بات سن کر وہ ذرا سا الجھا۔

”کیا آپ کو یاد نہیں ہے کہ آپ نے ایک بات پبلک سے چھپائی ہوئی ہے اور اب وہ مناسب وقت آچکا ہے جب آپ کو اناؤنس کر دینا چاہیے۔“

”واٹ؟“ سندرو زور سے چٹھا۔ ”تم چاہتی ہو کہ.....“ اس نے حیران نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ”ہاں سندرو میرے بچے کو مکمل شناخت ملنے کے لیے یہ ضروری ہے۔“ وہ ہمت کر چکی تھی تو اب بات کو مکمل کر لینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔

”رہش۔“ سندرو نے زور سے سر جھٹکا۔ ”میرا دماغ خراب ہے کہ میں اس موقع پر ایسی اناؤنسٹ کرنا چھڑوں۔ بطور ہیرو میری پہلی فلم آئندہ چند ہفتوں میں ریلیز ہونے والی ہے اس فلم پر مہتا کا کردار ڈون روہیہ لگا ہوا ہے میری ایسی کسی اناؤنسٹ سے ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوگا۔ لوگ فلم کا بائیکاٹ کر دیں گے اور میرا فلمی کیرئیر تباہ ہو جائے گا۔“ اس نے ایک بار پھر سر کو زور سے جھٹکا۔ ”آئندہ مجھ سے ایسی کوئی فضول بات مت کرنا۔ وہ جو کچھ تھا صرف تمہیں مطمئن کرنے اور تمہارے گھروالوں کی شرط پوری کرنے کے لیے کیا تھا ورنہ میں ایسی کسی بات میں بالکل انٹریٹڈ نہیں تھا۔“ اس کے اتنے صاف اقرار پر وہ صدمے سے منہ کھولے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ سندرو کے اس اقرار نے ان کی ازدواجی زندگی پر ایک بڑا ساسوالیہ نشان لگا دیا تھا۔

☆☆☆

وہ جیسے نشے میں رہنے لگی تھی۔ قدم رکھتی کہیں تھی تو پڑتا کہیں تھا۔ کھوئی کھوئی سی آنکھیں، مسکراتے لب، لہراتی چال سب نے مل کر اسے پہلے سے بھی زیادہ خوبصورت بنا دیا تھا۔ صرف پندرہ دن میں وہ ایسی گھمڑی تھی جیسے کسی صابن، لوٹن یا کریم کے اشتہار میں کام کرنے والی ماڈل کو خصوصی ٹرینٹمنٹ کے ذریعے نکھار دیا جاتا ہے۔

”صباحت بھئی کو دہلی کی فضا اس آگئی ہے۔“ بیٹے کی دلی خواہش سے کچھ کچھ آگاہ ممانی اسے دیکھ کر ہنسنے لگی۔

”لوکی جانے کن ہواؤں میں اڑ رہی ہے۔“ جہانمیدہ تانی لاجول پڑتے ہوئے منہ منہ میں بد بد باتیں۔ ”آبی کو نہ جانے کیا ہو گیا ہے بس ایسی پیٹھ کر مسکرائے جاتی ہیں۔ ہم لوگوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا، عموماً پھرتا اور بولنا بالکل چھوڑ دیا ہے۔“ راحت اور تابیاب کو

شکایت تھی۔

”کیا بات ہے صبا ہر وقت کوئے کھدروں میں اکیلی کیوں بیٹھی رہتی ہو؟ یہاں ہم سب سے ملنے کے لیے آئے ہیں اور تم ہو کہ نہ کسی سے ملنے جانے کے لیے راضی ہوتی ہو نہ ملنے کے لیے آنے والوں کے پاس دو گھڑی تک کریمیتھی ہو۔“ آمنہ بیگم سے ڈانٹیں۔

”پہلے ہی کیا تمہیں کہ اب غضب ڈھانے لگی ہو۔ حسن کی اس دولت کو پاکستان واپس بھیجنے کا دل نہیں چاہے گا ہمارا۔“ ٹھیکل سے سامنا ہوتا تو وہ جیسے سے سرگوشی کر جاتا۔ وہ سب کی سختی اور اپنے آپ میں گن ریتی۔ سندر کے سوا اسے کچھ بھائی بھی کب دیتا تھا۔ سندر کا دیا قیمتی موبائل ڈوری میں بندھا بہت خاموشی سے اس کے گریبان میں چھپا رہتا۔ تھر تھراہٹ اطلاع دیتی کہ سندر کا فون ہے تو وہ سب کے درمیان سے چپکے سے اٹھ کر پچھواڑے پہنچ جاتی۔ رات کی تاریکی میں سب کے سو جانے کے بعد بھی سرگوشیوں میں گفتگو کا سلسلہ جاری رہتا تو بھی ایس ایم ایس کیے جاتے۔ موبائل کی چار جگہ بھی وہ بہت احتیاط سے اسٹور میں موجود سوچ بورڈ کے ذریعہ کرتی۔ پہلی محبت کا نشہ تو ہر ایک کو پاگل کر دیتا ہے اور اسے تو اس احساس میں مبتلا کرنے والا سندر کپور تھا جو خود لاکھوں دلوں کی دھڑکن تھا۔ وہ سوچتی تو اسے خود پر فخر محسوس ہوتا۔ وہ جسے ایک دنیا چاہتی تھی اس کا دیوانہ تھا تو یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔

”میں تمہیں واپس پاکستان نہیں جانے دوں گا۔“ اس کے کانوں میں رس گھولتا وہ بھی اچانک ہی کہہ اٹھتا۔

”تو کیا کریں گے؟ کیا بارڈر پر گرفتار کروادیں گے؟“ اس کی بے تابی پر شرارہ لکھلا کر کہتی۔

”کچھ نہ کچھ تو کرنا پڑے گا۔“ سندر کی آواز سوچ میں ڈوب جاتی پھر وہ چانک ہی اٹھتا۔ ”میں دہلی آجاتا ہوں تم سے ملنے کو بہت دل چاہ رہا ہے۔“

”میں نے بتایا تھا سندر کہ یہ ممکن نہیں۔ اب میں پہلے کی طرح موقع نہیں نکال سکوں گی۔“ اسے اپنے حالات کا مکمل ادراک تھا۔ ان پندرہ دنوں میں وہ سب ایک بار باہر نکلی تھیں اور آمنہ بیگم نے اس کا اور راحت کا ہاتھ یوں تھام رکھا تھا جیسے وہ فحشی بیچیاں ہوں اور ان کے بھیڑ بھاڑ میں گم ہو جانے کا ڈر ہو۔

”تم میری بے قراری کو سمجھتی نہیں ہو۔“ سندر کو شکوہ ہوتا۔

”آپ سے زیادہ میں بے چین ہوں۔ بائیں دن بعد ہمارا ویزا ختم ہو جائے گا۔ واپس جانے کے بعد نہ جانے

راہی کی کیا صورت بنے گی؟“ وہ اداس ہو جاتی۔

”واپس تو میں تمہیں کسی حال میں جانے نہیں دوں گا۔“ سندر نے ایک بار پھر دعویٰ کیا۔

”پھر کیا کریں گے؟“ اس نے بھی اس بار سنجیدگی سے سوال کیا۔

”میں تم سے شادی کر لیتا ہوں پھر تو تمہارے یہاں رہنے کا قانونی جواز بن جائے گا۔“ سندر نے یکدم ہی وہ بات کہہ دی جو اتنے دن کے رابطے میں ایک بار بھی نہیں کہی تھی بس اس کے حسن کی تعریف اور اپنی بے قراری کے قصے ہی سناتا رہتا تھا۔

”ہماری شادی کیسے ہو سکتی ہے۔ میرے گھر والے نہیں مانیں گے۔“ ناپتے ناپتے مور کی نظر اپنے پیروں پر پڑ جاتی۔

”کیوں نہیں مانیں گے۔ دھرم کی وجہ سے؟“

”ہاں۔“ اسے اعتراف کرنا پڑا۔

”تو چھوڑ دو گھر والوں کو ہم کو رٹ میرج کر لیتے ہیں۔“ سندر کی دی ہوئی تجویز پر اس کا دل کانپا۔

”نہیں، میں ایسا نہیں کر سکتی۔ میرے ماں باپ کے چہروں پر ہمیشہ کے لیے سیاہی مل جائے گی۔“ اس نے انکار کر دیا۔ ماں باپ کی عزت کے خیال کے علاوہ دل میں یہ خیال بھی تھا کہ ایک ہندو سے شادی جائز نہیں۔ بچپن سے دی گئی تعلیم پندرہ دن کی محبت میں بالکل ہی ذہن سے صاف نہیں ہوئی تھی۔

”تو پھر کیا صورت ہوگی ہمارے ملنے کی؟“ سندر کے لہجے میں شکلی درائی۔

”اگر آپ مسلمان ہوتے تو میرے گھر والوں کو کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔“ وہ یہ تو نہیں کہہ سکی کہ میری خاطر مسلمان ہو جاؤ لیکن ڈھکے چھپے انداز میں اپنا مذہب عیاں کر گئی۔

”تمہارے لیے میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔ تم انتظار کرنا کل شام میں تمہارے گھر آ رہا ہوں۔“ سندر نے جو کہا اسے سن کر اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ سندر نے بھی مزید یقین دہانی نہیں کروائی اور فون بند کر دیا پھر دوسرے دن تک صبا کو اس کا فون بند ہی ملتا رہا۔ وہ بار بار منشر ہوتی دل کی دھڑکنوں کو سننا جاتی ہے طبع کی لمبی کی طرح پورے گھر میں پکرائی رہی۔ نہ ڈھنگ سے نیند آئی اور نہ کھانا کھایا گیا۔

”کیا بات ہے بچی تیری طبیعت تو خشک ہے، شکل اتاری اتاری سی ہے۔“ اس کی طبیعت کے لیے بچپن کو محسوس کر کے نانی نے اس سے پوچھا بھی لیکن اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

جواب سندر کی آمد کی صورت میں سب کو اکٹھے ہی ملا۔ ماموں کے گھر کے عام سے ڈرائنگ روم میں بیٹھے گھر کے جملہ بزرگ جو پہلے ہی سندر کپور بھی شخصیت کی اپنے گھر آمد کی وجہ سے حیران تھے اس کا مطالعہ بن کر مزید دنگ رہ گئے۔ سندر سیاہ شیشوں کی گاڑی میں بہت چھپ چھپا کر وہاں آیا تھا، ورنہ گھر کے باہر لوگوں کا جنم غفریح ہو جاتا۔

”آپ کا شکر ہے کہ آپ نے ہمیں اس عزت کے لائق سمجھا لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ یہ جوڑی کسی طور مناسب نہیں ہے۔“ نجم الدین باپ تھے اس لیے انہیں جواب دینا تھا۔

”دیکھیے بزرگوار شادی بیاہ کے معاملے میں سب سے اہم چیز لڑکے اور لڑکی کی پسند ہوتی ہے اور یہاں یہ سب سے اہم فیصلہ موجود ہے۔“ وہ کہہ رہا تھا اور سب حیران تھے کہ یہ عجیب واقعہ کب کہاں اور کیوں کر پیش آیا۔

”دیکھو میاں ہو سکتا ہے تمہارے لیے یہ بات سب سے اہم ہو لیکن ہمارے لیے کچھ اور چیزوں کی اہمیت اس سے بھی بڑھ کر ہے اور اسی لیے ہم اپنی لڑکی تم سے بیاہنے کے لیے تیار نہیں۔“ ایک غیر موزوں ڈرائنگ روم میں بیٹھا دعویٰ کر رہا تھا کہ اس گھر کی بیٹی اس سے محبت کرتی ہے شرم سے نجم الدین کی زبان لنگ ہو گئی تھی۔ ایسے میں نانا صاحب یہ جگہ ملنے میدان میں اترے۔

”غالباً آپ مذہب کی بات کر رہے ہیں۔ میں صبا کے لیے اپنا مذہب بدلنے کو تیار ہوں۔“ سندر نے جیسے سب کو لا جواب کر دیا لیکن ٹھیکل جیز بزرگوں کی اس مجلس میں واحد جوان شخص تھا ترپ اٹھا۔

”مذہب کسی کے لیے نہیں بدلا جاتا۔ مسلمان ہونے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے آپ اسلام کو دل سے قبول کریں۔“

”آپ شاید اس قسم کے دلائل اس لیے دے رہے ہیں کہ آپ خود صبا کے امیدواروں میں سے ایک ہیں۔“ سندر نے اس کی طرف ایک طنز کرتی مسکراہٹ اچھالی اور روئے سخن دوبارہ بزرگوں کی طرف کر لیا۔

”میں نے اس رشتے میں پیش آنے والی واحد کاوٹ دور کر دی ہے۔ اس کے باوجود اگر آپ کی طرف سے انکار ہوتا ہے تو میں اسے آپ کی تنگ نظری ہی سمجھوں گا لیکن انکار کرنے سے پہلے ایک بار صبا سے بھی پوچھ لیجئے گا کہ وہ آپ کے ایسے کسی فیصلے کو قبول کرنے کے لیے تیار ہے یا نہیں۔“ اس کا پراعتاد لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ اپنے دعوے میں سچا ہے۔ اس کی رودادگی کے بعد صباحت سے پوچھ کچھ کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس

نے اعتراف کر لیا کہ وہ سندر سے محبت کرتی ہے اور ہر صورت اسی سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ اپنے اس فیصلے میں وہ اتنی اکل تھی کہ نہ نانی اور ماں کی گھر کیوں کا اثر ہوا، نہ ٹھیکل کی التجا نہیں رنگ لائیں، نانا اور ماموں کی خاموش ملامت بھی رانگاں گئی اور تو اور اسے اپنے عزت دار باپ کی نگاہوں میں موجود التجا جس بھی نظر نہ آئیں۔

”بچا نجم الدین..... اب ہمارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا ہے کہ اس عاقبت نانا ندیش لڑکی کو اپنے ہاتھوں عزت سے رخصت کر دیں ورنہ دوسری صورت میں یہ خاندان کی رہتی سہی عزت بھی یلٹام کر دے گی۔“ آخر کار نانا صاحب نے نجم الدین کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے غصے اور رنج کی ملی جلی کیفیت میں مشورہ دیا۔

”ایسے کیسے سب کل کی لڑکی کے آگے سر جھکا دیں گے؟ اپنا سامان باندھو میاں اور لڑکی کو لے کر فوراً پاکستان لوٹ جاؤ۔“ نانی نے کلبلا کر میاں کا مشورہ رد کیا اور دادا کو تجویز دی۔

”نہیں اماں، ابامیاں خشک کہہ رہے ہیں ہمیں ان کا مشورہ قبول کرنا ہوگا۔ آمنہ اور نجم الدین کے پاکستان واپس لوٹ جانے سے مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ لڑکی پر جنون سوار ہے آج کے دور میں فاصلوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ پاکستان جا کر بھی رابطے کی کوئی صورت نکال لے گی۔ سندر پیسے والا آدمی ہے اور بہت کچھ کر سکتا ہے اس لیے بہتر ہے کہ تمنا کھڑا کرنے کے بجائے ہم مدد راہ اختیار کریں جس میں خاندان کی عزت ہے۔“ ماموں نے بھی وہی بات کی تو نانی کو خاموش ہونا پڑا۔ آمنہ بیگم بے چاری کو تو بہت دیر سے چپ لگ گئی تھی۔ اولاد نے وہ دن دکھایا تھا جس کا کبھی انہوں نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ فیصلہ ہو جانے کے بعد صباحت کو وہاں بلا گیا۔

”ہم نے تمہاری خواہش پوری کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ کل دوپہر تک تمہارا سندر کے ساتھ نکاح کر کے تمہیں یہاں سے رخصت کر دیا جائے گا اور پھر کبھی زندگی میں دوبارہ لوٹ کر آنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ سندر کے ساتھ رخصت ہونے کے بعد تمہیں اپنے غم، خوشیاں اور پریشانیاں سب تنہا ہی چھینی ہوں گی۔ جب یہاں سے جاؤ تو ذہن میں یہ بات اچھی طرح بٹھا کر جانا کہ تم اپنے والدین سمیت پورے خاندان کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر جا رہی ہو۔ بھی تم لوٹ کر واپس بھی آئیں تو ہم میں سے کسی کے دروازے تمہارے لیے نہیں کھلیں گے کیونکہ ہم تمہیں یہاں سے رخصت کرتے

ہومیو اور دیسی جڑی بوٹیوں کے حیرت انگیز نسخہ جات

حیرت انگیز نسخہ جات سے موٹاپے سے مکمل نجات پائیے

ایک ماہ 30 یا ونڈوز کم 6 کمر کم

موٹاپا
یقینی ختم
ایڈیل

سلمنگ کورس

بغیر لیزر

گارٹی شرہ
علان



HR کورس کوئی کے جڑے دوا
کے تمام حصوں کے ساتھ ہالوں کا
لاچر لکھنا
کے کسے جلد کو دما دم، قدرتی سن،
جسک اور تازہ ہونا ہے جو کورس
کی اندر فی ہاں جو کہ پال کا گئے
کا جب جی ہیں ان کو جڑے
کے کہ دوا دوا دوا دوا دوا
جی تک 17 کا ہے

ایک ماہ میں کم
فیہ مشورہ جی فالتو
یالوں کا ایچ۔ آر کورس
مستقل علاج



چہرے کیل مہارے داغ و جھوٹ کا یقینی
ایڈیل بیوٹی کورس

برلیٹ آپ
نسوانی حسن میں نمایاں اضافہ

پاکستان ہومیو ہرزل کلینک
چوہدری ثناء اور پلازہ چوک چوہدری پاکستان
+92-42-37470123
+92-42-37470128
+92-300-4370496 E-mail: pkhnc@hotmail.co.uk Website: www.pkhnc.com

ہوئے یہ سوچ لیں گے کہ ہم بٹنی کی ڈولی نہیں جتا رہے رخصت
کر رہے ہیں۔“ نجم الدین نے بٹنی کو فیصلہ سنانے کا کٹھن
مرحلہ طے کیا اور فوراً ہی کمرے سے باہر نکل گئے۔ کامیابی کی
خوشی سے سرشار صحبت کو نہ تو باپ کا لانا انداز نظر آیا اور نہ
ہی ماں کی آنکھوں سے ٹپکنے والے خاموش آنسو۔ اس نے
فوراً ہی سندر سے رابطہ کر کے اسے خوش خبری سنائی۔ اس
کے بعد سندر کا فون نجم الدین کے پاس آیا۔

”میرے ساتھ میرا صرف ایک دوست آئے گا۔
آپ کے ہاں بھی میں زیادہ بھیڑ بھاڑ دیکھنا پسند نہیں کروں
گا۔ بس سادی سے نکاح کے بعد رخصتی کر دی جائے۔“ اس
نے نجم الدین سے مطالبہ کیا۔
”ٹھیک ہے۔“ نجم الدین نے اس سے بحث نہیں
کی۔ ان کے لیے کون سا وہ خوشی کا موقع تھا کہ وہ لوگوں کو جمع
کرتے۔ ”اور تمہارا قبول اسلام.....“ یہ بات بہر حال
ان کے لیے اہم تھی۔

”نکاح سے پہلے یہ کام بھی ہو جائے گا لیکن میں فی
الحال اسے پیٹک میں آؤں نہیں کر سکتا۔ میری کچھ
مجبوریاں ہیں۔“ اس نے جواب دیا۔ نجم الدین پہلے ہی ہار
چکے تھے اس لیے اس سے بحث نہیں کر سکتے تھے۔ دوسرے
دن ظہر سے بل سب کچھ طے شدہ پروگرام کے مطابق انجام
پا گیا۔ گھر میں موجود افراد کے علاوہ کچھ بڑے ماموں کو
اس نکاح میں مدعو کیا گیا تھا۔ عجیب شادی تھی جس میں نہ تو
دلہن کا بار سنگار کیا گیا تھا، نہ اسے وہوی آئی پی پروڈکٹوں مل
رہا تھا جو گھر سے رخصت ہونے والی بٹنی کو دیا جاتا ہے۔

بزرگ خواتین ناراض تھیں تو راحت اور نایاب کچھ کچھ خوف
زدہ اور تجسس۔ خوف اپنے بزرگوں کے بکڑے مزاجوں کی
وجہ سے تھا تو تجسس سندر کی پوری جیسی مشہور ہستی سے صحبت
کے تعلق پر۔ وہ حیران تھیں کہ یہ سب کچھ کیسے ہو گیا البتہ اتنا
اندازہ ضرور لگا لیا کہ کہانی جب سے ہی شروع ہوئی ہوگی
جب صبا کیل کے ساتھ کنسرٹ میں شرکت کے لیے گئی تھی۔
شائینگ سینئر سے اس کے غائب ہوجانے کا قصہ بھی اب
سب کو سمجھ آ گیا تھا لیکن کسی بات کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ سچ یہ
تھا کہ صبا سب کی دلی رضامندی کے بغیر ہمیشہ کے لیے سندر
کیور کے ساتھ رخصت ہو رہی تھی۔ ٹھیک اس موقع پر گھر
میں نہیں رکا تھا۔ وہ سب سے زیادہ تھا لیکن بزرگوں نے
اسے احتجاج کی اجازت نہیں دی تھی چنانچہ وہ خاموش
احتجاج کرتے ہوئے منظر سے غائب ہو گیا تھا۔ جاوہر کی دنیا
کے سفر پر روانہ ہوتی صبا کو کسی بھی بات کی پروا نہیں تھی۔ وہ

”دو، اے، سواری..... یہاں آؤ۔“ وہ بیچے کے
کمرے کے دروازے پر جا کر حلق کے بل دباؤ لیکن
کوئی اس کی پکار پر رد نہ کر رہا تھا۔ وہ باہر ہونے لگی۔ اس
کا بچہ بیٹس منٹ کے اندر اندر اپنے ہی گھر سے غائب ہو گیا
تھا اور گھر میں موجود لوگ اسے جواب نہیں دے رہے تھے۔
”کہاں مر گئے سارے کے سارے ایڈیشن؟“ وہ
چلاتی ہوئی آگے بڑھی اسی وقت سندر ایک کمرے کا دروازہ
کھول کر باہر نکلا۔
”آریاں آپ کے پاس ہے سندر؟ اس کی شکل
دیکھتے ہی صبا نے بے چینی سے پوچھا۔
”تم یہاں آؤ، میرے ساتھ۔“ سندر اس کا بازو تھام
کر اسے واپس کمرے میں لے گیا جہاں سے وہ نکلا تھا۔
”آریاں یہاں تو نہیں ہے۔“ کمرے میں داخل ہوتے
ہی اس نے ہر طرف نظر دوڑائی اور بے قراری سے بولی۔
”وہ پورے گھر میں کیوں نہیں ہے۔“ سندر نے اسے

اطلاع دی تو وہ بوجھ گئی۔ دو ماہ کا بچہ آخر گھر سے باہر کہیں کیسے جاسکتا ہے۔

”یہ سب کیا ہے سندر مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی ہے۔“ اس نے اپنا سر تھام لیا۔ پٹیلی کی سادار عرصہ اس نے تقریباً انتہائی گزرا تھا۔ سندر بھی کبھی گھر آتا تھا اور بھی فون پر بات ہو جاتی تھی۔ بچے کی ڈیوری کے بعد بھی وہ صرف ایک بار اس سے ملنے آیا تھا۔ بچے کا نام بھی اس نے خود ہی رکھا تھا اور اب دو ماہ بعد وہ اس کی شکل دیکھ رہی تھی تو اس صورت میں کہ اس کا بچہ غائب تھا۔

”تمہیں یاد ہے ابھی تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ تم میرے لیے کچھ بھی کر سکتی ہو؟“ اس کی ابھن دور کرنے کے بجائے سندر ایک الگ ہی موضوع نکال کر بیٹھ گیا تھا۔

”مجھے سب یاد ہے لیکن ابھی تو آپ آریاں.....“ اس نے سندر کو ٹھکنے کی کوشش کی۔

”پہلے میری بات غور سے سنو۔“ جواباً سندر نے سختی سے اسے ٹوکا تو وہ اس کی شکل دیکھنے لگی۔ ”دودن بعد میری فلم ریلیز ہونے والی ہے۔ مہتانے مجھ سے پرس کیا ہے کہ اگر میں اس کی ایک شرط پوری کر دوں تو وہ اپنی اعلیٰ فلم کے ہیرو کو کٹ کر کے مجھے اس کی جگہ لے لے گا لیکن اس کی شرط تمہارے تعاون کے بغیر پوری نہیں کی جاسکتی۔“ سندر کی بات سن کر اس کے پورے وجود میں سردی لہر دوڑ گئی۔ وہ جان گئی تھی کہ مہتانے کیا شرط رکھی ہوگی۔

”تم کیسے آدمی ہو سندر؟ مجھے تم سے گھن آ رہی ہے۔“ اس نے نفرت سے اس شخص کی طرف دیکھا جس کی محبت میں وہ بھی اندھی ہو گئی تھی۔

”اگر تم آریاں کو دوبارہ دیکھنا چاہتی ہو تو تمہیں یہ بات مانتی ہوگی۔ دوسری صورت میں تو تم آریاں کو دوبارہ کبھی دیکھ سکو گی اور نہ ہی تمہارے لیے اس گھر میں کوئی مہنگائش رہے گی۔“ سندر کو اس کی قلبی کیفیت سے کوئی غرض نہیں تھی۔

”ایسا کیسے ہو سکتا ہے سندر، میں تمہاری بیوی ہوں۔ تم میری عزت کا سودا کیسے کر سکتے ہو؟“ اس نے بے بسی سے التجا کی۔ نفرت کا اظہار کرنے کی پوزیشن میں وہ بھی نہیں۔

”ہماری دنیا میں ہر چیز کا سودا ہو سکتا ہے۔“ اس نے ڈھٹائی سے جواب دیا اور بولا۔ ”تم فیصلہ کرو کہ میری بات مانو گی یا آریاں سمیت اس گھر اور مجھ سے ہمیشہ کے لیے دور چلی جاؤ گی؟“

”تم تو مجھ سے محبت کرتے تھے؟“ اس نے دہائی دی۔

”میں تو سال کے تین سو بیسٹھ دنوں میں تین سو بیسٹھ لڑکیوں سے محبت کرتا ہوں۔“ وہ زور سے ہنسا۔

”لیکن میں تمہاری بیوی ہوں۔“ اس نے یاد دہانی کروائی۔

”صرف اس لیے کہ تمہارے حصول کا اس کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔ تمہارے من نے مجھے دیوانہ کر دیا تھا۔ اس لیے اس وقت جذبات میں آ کر سب کچھ کر بیٹھا لیکن سچ یہ ہے کہ کسی ایک عورت پر گزارا کرنے والا آدمی نہیں ہوں۔ میری زندگی میں عورتیں آتی اور جاتی رہتی ہیں ہاں مجھے یہ اعتراف ہے کہ تم ان سب سے بڑھ کر حسین ہو اس لیے بھی میں نے تمہیں اپنے گھر میں ڈال لیا کہ ترقی کے زینے چڑھتے ہوئے تمہاری مدد ملتی رہے گی۔ تمہاری ٹریننگ کر کے تمہیں پائل کرنے میں، میں نے اتنا روپیہ ایسے ہی خرچ نہیں کیا ہے اور تمہاری جیسی لوڑ مڈل کلاس کی عورت کو چاہیے بھی کیا۔“ ڈھیر ساری عیاشیوں کے ساتھ سندر کپور کی بھتی ہونے کا اعزاز تمہارے لیے کم تو نہیں ہے۔“ وہ تیر پر تیر چلا رہا تھا اور وہ اس کے گھٹیا پن کی انتہا دیکھ رہی تھی۔ محبت، قبول اسلام، شادی سب ایک ڈھونگ تھا اور وہ اس ڈھونگ کی وجہ سے ایسے حال میں پھنس گئی تھی جس سے آزاد ہونا اس کے بس میں نہیں تھا۔ واپسی کے سارے در اس کے لیے پہلے ہی بند تھے۔ عزت بچانے کے لیے مہتا کی قربانی دینی بھی تو کہاں جاتی؟ باہر کی دنیا میں اس جیسی تنہا خوب صورت عورت کو شکار کرنے کے لیے سندر جیسے کئی شکاری گھوم رہے تھے۔

”میں جا رہا ہوں، اگر تم خود کو راضی کر سکو تو مس شاپا کو بتا دیا۔ وہ تمہیں تیار... کر دے گی اور ٹھیک نو بجے گاڑی تمہیں لینے کے لیے پہنچ جائے گی۔ دوسری صورت میں رات نو بجے کے بعد تم اس گھر میں رہنے کی کوشش مت کرنا ورنہ میرے ملازم دھکے دے کر تمہیں یہاں سے نکال دیں گے۔“ سفاک لہجے میں کہہ کر وہ وہاں سے چلا گیا اور وہ نڈھال سی بیٹھے بیٹھے وہیں لڑھک گئی۔ فیصلہ کیا کرتی سندر کی بات مان لینے کے سوا اس کے پاس کوئی آپشن تھا ہی نہیں یا پھر شاید اس میں جرات کی کمی تھی۔ سندر کو جیت کر اس نے اپنے مقدر میں ہمیشہ کی شکست اور رسوائی لکھ لی تھی۔ اس رات کے بعد اس کی زندگی میں ایسی بے شمار باتیں آئیں جب وہ ج سنو کر کسی غیر مرد کے پہلو میں اس کی گاڑی میں بیٹھی۔ وہ جتنا جتنا اس دلدل میں دھنکتی گئی، سندر کی کامیابی، شہرت اور دولت کا گراف اتنا ہی بلند ہوتا گیا۔ اس

بیبل

”مجھے یقین تھا کھیل بھائی کہ آپ میرا پیغام ملنے پر مجھ سے ملے ضرور آئیں گے۔“ بہت عرصے بعد اپنے کسی رشتے دار کو سامنے پا کر وہ تھوڑی سی جذباتی ہو گئی۔

”میں شاید نہ آتا لیکن عاشر انور صاحب نے مجھے مجبور کر دیا۔“ کھیل نے ساٹ لہجے میں جواب دیا تو اسے دکھ تو ضرور ہوا لیکن جانتی تھی کہ اس کے ماضی کے ہر رشتے کو اس سے یہ انداز اختیار کرنے کا حق ہے۔

”آپ کو معلوم ہوگا کہ میں نے سندر سے علیحدگی اختیار کر لی ہے۔“ اسے گفتگو تو بہر حال کرنی تھی۔

”ہاں، تم جیسی مشہور شخصیت کے بارے میں خبریں نہ چاہتے ہوئے بھی تک پہنچ ہی جاتی ہیں۔“ کھیل کے ہونٹوں پر تضحکی مسکراہٹ ابھر کر معدوم ہو گئی۔

”میں بہت شدید بیمار ہوں کھیل بھائی، کسی بھی وقت میری زندگی ختم ہو سکتی ہے۔“ اس کی آواز رندھ کی گئی۔ اپنی زبان سے کسی کو اپنے مرنے کی خبر دینا بھی آسان نہیں ہوتا۔ کھیل کے چہرے کے تاثرات میں بھی پہلی بار زنی اتری۔

”سندر نے مجھے محبت کے نام پر دھوکا دیا۔ وہ کبھی مسلمان نہیں ہوا لیکن میں چاہتی ہوں کہ میرا بیٹا ایک مسلمان کی حیثیت سے زندگی گزارے۔ کیا آپ اسے اپنے ساتھ رکھ لیں گے کھیل بھائی؟“ اس نے بہت آس سے پوچھا تو کھیل چند لمحوں کے لیے سوچ میں پڑ گیا پھر بولا۔

”سوری صبا، یہ تو پہلے ہی طے ہو چکا تھا کہ ہماری زندگیوں میں تمہاری کوئی تعلق نہیں ہوگی۔ میں تمہارے بیٹے کے لیے بھی تعلق نہیں نکال سکوں گا۔ ڈیڑھ سال پہلے میری شادی ہو گئی تھی۔ ایک پانچ مہینے کی بیٹی ہے اور مجھے نہیں لگتا کہ مجھے اپنی بیٹی کے ساتھ سندر کمپور کے بیٹے کو رکھ کر اس کی پرورش کرنی چاہیے۔ خون سمی نہ بھی اپنا اثر دکھاتا ہے اور میں زندگی میں دوسری بار چوٹ کھانے کے لیے تیار نہیں ہوں۔“ اپنا فیصلہ سنا کر وہ یکدم ہی کھڑا ہو گیا۔

”خدا حافظ!“ وہ ہاں ہنسنے کے لیے پٹا۔

”کھیل بھائی.....“ صبا نے بے اختیار ہی اسے پکارا۔

وہ گردن موڑ کر اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

”امی، ابو اور راحت.....؟“ برسوں بعد اس نے اپنے پیاروں کے بارے میں کچھ جاننے کی خواہش کی۔

”پھوپھا جان تو تمہیں رخصت کرنے کے اگلے دن ہی دل بند ہو جانے کے باعث اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔ پھوپھا کو واثق اور راحت کے ساتھ تنہا پاکستان جانا پڑا۔ وہاں جا کر وہ مسلسل بیمار رہیں پھر ان کا بھی انتقال ہو گیا۔ مرنے

نے بس اتنے پر قناعت کر لی تھی کہ اس کا بیٹا اس کے پاس ہے جسے وہ چاہنے کے باوجود کوئی واضح شناخت نہیں دے سکتی تھی۔ سندر اپنے قبول اسلام سے صاف طور پر بکر گیا تھا اور وقت کے دھارے میں بہتی وہ خود بھی کچھ نہیں رہی تھی۔ نہ ہندو، نہ مسلمان بالی ووڈ کی دنیا میں ان جیسے کئی جوڑے تھے اس لیے ان کے میل ملاقات والوں میں سے کوئی اس حوالے سے سوال بھی نہیں کرتا تھا لیکن وہ جانتی تھی کہ دنیا میں کچھ لوگ ایسے ہیں جن کے لیے یہ موضوع بہت اہم بھی ہوگا اور تکلیف دہ بھی۔ ڈھیروں رسوائی کا سامنا کرتے ہوئے وہ آج بھی اس دن کا انتظار کرتے ہوں گے جب سندر اپنے قبول اسلام کا اعلان پبلک میں کرے گا لیکن انفس کہ وہ دن بھی نہیں آتا تھا۔

☆☆☆

”تم ان صاحب کو ملاقات کے لیے میرے پاس لے آؤ۔“ کاغذ پر ایک نام اور پتا لکھ کر عاشر کے حوالے کرتے ہوئے اس نے بہت عرصے بعد اس سے کوئی فرمائش کی۔ عاشر سے اس کا تعلق عجیب تھا اتفاقاً ہونے والی ملاقاتوں سے شروع ہونے والی دوستی وقت کے ساتھ اتنی گہری ہو گئی تھی کہ وہ اپنا ہر دکھ سکھ عاشر سے بیان کر دیتی تھی۔ پورے دو سال سندر کے اشاروں پر ناپتے رہنے کے بعد جب اس نے محسوس کیا کہ وہ کچھ بیماریاں رہنے لگی ہے تو عاشر کے مشورے پر ہی اپنا چیک اپ کروایا اور اس پر یہ ہولناک انکشاف ہوا کہ مستقبل شراب نوشی نے اس کے گردوں کو ہی نہ کا رہا نہیں کیا بلکہ وہ ایڈز جیسا مرض بھی لگا بیٹھی ہے۔ جو زندگی وہ گزار رہی تھی اس میں یہ کوئی انوکھی بات بھی نہیں تھی لیکن موت کو بالکل سامنے دیکھ کر سارے سمجھوتوں اور مصیبتوں کی دیوار یکدم ہی گر گئی تھی اور وہ آریاں کو لے کر سندر کا گھر چھوڑنے کے بعد مسلسل اس فکر میں تھی کہ کسی طرح اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگ سکے لیکن لگتا تھا اللہ بھی معاف کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ جھنجھلاہٹ اور ڈپریشن میں بھی وہ دو سالہ آریاں کو بھی تشدد کا نشانہ بناتے بیٹھتی تھی لیکن پھر مہتا کے ہاتھوں مجبور ہو کر خوب پیار کرتی تھی۔ عاشر جو اس کی ذہنی کیفیت سے اچھی طرح واقف تھا ان مشکل حالات میں اس کا پورا ساتھ دے رہا تھا۔ اب بھی اس نے اس کا دیا ہوا پرچہ لے کر خاموشی سے رکھ لیا۔ دودن بعد عاشر کے اپارٹمنٹ میں کھیل اس کے رو بردھا اور اس گھٹے ہوئے وجود کو بے نیازی سے دیکھ رہا تھا جس کی حسن و رعنائی نے کبھی اسے اپنا دیوانہ بنا رکھا تھا۔

حاکم دارچمیں اور آریان کو ٹھہرایا ہے۔ میں نے ٹھیکل کو یہ بات نہیں بتائی تھی کیونکہ مجھے اندازہ تھا کہ تم اسے کس مقصد کے لیے یہاں بلارہی ہو اور میری خواہش تھی کہ دولت کی چمک دمک کے بجائے وہ صرف تمہاری محبت کی بنیاد پر کوئی فیصلہ کرے۔“ آج اس کے لیے انکشافات کا دن تھا۔ ”تمہیں یہ شک تو نہیں ہے کہ میں نے تم سے محبت کا اظہار اور آریان کی حواگی کا مطالبہ اس ول کے سامنے آنے کے بعد کیا ہے؟“ یکدم ہی عاشر نے اس سے پوچھا تو اس نے زور سے نفی میں گردن ہلائی۔ وہ جانتی تھی کہ شوق کی خاطر گلے میں کمر لگائے دنیا بھر میں آوارہ گردی کرنے والا عاشر خود مای طور پر بہت مستحکم ہے۔

”شکر یہ تم نے میرا اعتبار کیا۔“ اس کے جواب پر عاشر مسکرایا۔

”تم کسی ایسے دیکل کو میرے پاس لے آنا عاشر۔ انجام تو میرا بھی قریب ہے۔ وصیت مجھے بھی تیار کروادینی چاہیے۔“ اس کے اس چاکم مطالبے پر عاشر نے شکایتی نظروں سے اس کی طرف دیکھا لیکن وہ اس کی نگاہوں کے شکوے کے بجائے یہ منظر دیکھ رہی تھی کہ عاشر کی گود میں بیٹھے ہوئے اس کے بیٹے نے چاکلیٹ سے اس کی صاف ستھری قیمتی شرٹ پر چاکلیٹ کے بے شمار دھبے لگا دیے تھے اور اسے پروا نہیں تھی۔

☆☆☆

پانچ سالہ آریان کے ساتھ عاشر اور ایک قبر کے پاس کھڑا ہوا تھا۔ آریان نے اپنے ہاتھوں میں ٹنگوں کی ایک ٹوکری تمام رکھی تھی جس میں پھولوں کی پتیوں تھیں۔ اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے اس نے پتیوں پوری قبر پر پھیلا دیں۔ عاشر خاموشی سے کھڑا اسے یہ عمل کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ آریان جب ٹوکری میں موجود تمام پتیوں قبر پر پھیلا چکا تو اس نے ٹوکری ایک طرف رکھ دی اور دعا کے لیے ہاتھ بلند کر دیے اس بار عاشر نے بھی اس کا ساتھ دیا۔

”بیارے اللہ تعالیٰ میری ماما کو معاف کر دیں اور انہیں اپنی جنت میں رہنے کی جگہ دے دیں۔“ بلند آواز میں دعا مانگتے آریان کی صوفی آواز عاشر کے کانوں میں پڑ رہی تھی۔ یہ دعا لیے خود صباحت نے سکھائی تھی اور عاشر سے درخواست کی تھی کہ اس کے مرنے کے بعد بھی وہ آریان سے یہ دعا کرواتا رہے کہ سنا ہے معصوموں کی دعائیں قبول ہوتی ہیں۔ آریان اتنا چھوٹا تھا کہ ڈھنگ سے گناہ کا اور اک بھی نہیں رکھتا تھا لیکن ہر ہفتے پابندی سے ماں کی قبر

طرف اس کاموں زاد ٹھیکل تھا جو اس کے بیٹے کو صرف اس لیے درگیا تھا کہ اس کی رگوں میں سندر کپور کا خون دوڑتا ہے اور یہ عاشر تو تھا کہ اس کے بیٹے کو اس لیے ہمیشہ اپنے پاس رکھتا چاہتا تھا کہ وہ اس کے وجود کا حصہ تھا۔ اس سے محبت کے دونوں دعوے دار تھے لیکن دونوں کا طرز عمل ایک دوسرے سے کتنا مختلف تھا۔

”میرا بیٹا تمہارے ساتھ رہے اس سے بڑھ کر میرے لیے خوشی کی کیا بات ہوگی لیکن شاید سندر کپور ایسا نہ ہونے دے۔ اس کے سامنے تمہاری قانونی حیثیت بہت کمزور ہے۔ وہ آسانی سے آریان کو تم سے چھین لے گا۔“ وہ خوف زدہ تھی۔

”سندر کچھ نہیں کر سکتا۔ اس وقت وہ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہے۔“ عاشر نے اسے اطلاع دی تو وہ چونک گئی۔ اس کے عاشر کے پارٹنر شٹ ہوجانے کے دو دن بعد ہی سندر کا بہت شدید ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ اس ایکسیڈنٹ میں اس کی زندگی تو بچ گئی تھی لیکن وہ ہمیشہ کے لیے معذور ہو کر بستر کا ہو رہا۔ اس موقع پر میڈیا نے بہت خبریں دیں۔ اکثر نے یہ خیال ظاہر کیا کہ سندر کپور کی حسین چٹنی نے بڑے دنوں میں شوہر کا ساتھ دینا قبول نہیں کیا اور جبکہ اسے اسے چھوڑ گئی۔ اسے خود پر گرنے والے ان الزامات کی پروا نہیں تھی۔ وہ مطمئن تھی تو اس بات پر کہ کوئی اس کا کھوج نہیں لگا سکا تھا اور سندر بھی اس لائق نہیں رہا تھا کہ اسے کوئی زک پہنچا سکے بلکہ شاید معذوری اور بے بسی کی زندگی نے اسے اپنے گناہوں کا احساس دلادیا تھا۔ جب ہی اس نے ایک بار میڈیا پر یہ پیغام دیا تھا کہ وہ اس سے ملنا چاہتا ہے۔ وہ خود ٹیلی وژن انکس دیکھتی تھی لیکن عاشر نے اس تک سندر کا یہ پیغام پہنچا دیا تھا لیکن وہ پھر بھی اس سے ملنے پر آمادہ نہیں ہوئی تھی اور آج پھر عاشر اسے اطلاع دے رہا تھا کہ سندر کپور موت وزیت کی کشمکش میں مبتلا تھا۔

”سندر نے سوسائڈ کر لی ہے۔ وہ معذوری کی زندگی سے تنگ آ گیا تھا چنانچہ آج اس نے اپنے سر ہانے رنگی پھل کاٹنے والی چھری سے اپنی دونوں کلائیوں کی رگیں کاٹ لیں۔ ملازم نے جب دیکھا تو اس کا بہت زیادہ خون بہہ چکا تھا۔ ڈاکٹر زکوش کر رہے ہیں لیکن انہوں نے امید نہیں دلائی ہے۔ تمہارے کزن ٹھیکل صاحب بھی ان خبروں سے واقف تھے لیکن میں نے انہیں کچھ بھی نہیں بتانے سے منع کیا تھا۔ میرے پاس ایک اندری خبر بھی ہے۔ سندر نے کل ہی اپنے وکیل کو اپنی ول ٹھکانی تھی جس میں اپنی تمام دولت

کے پکڑ میں پڑے نہیں دیکھا۔“ اس کے سوالات کا مقصد نہ سمجھنے کے باوجود وہ پوری دیانت داری سے جواب دے رہی تھی۔

”کیا تین سال کے اس عرصے میں تم نے کبھی محسوس کیا کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ بہت شدید محبت؟“ عاشر کا یہ سوال اس کے لیے انکشاف کا درجہ رکھتا تھا کیونکہ ہر موقع پر اسے یہاں دینے کے باوجود عاشر نے بھی ایسی کوئی بات نہیں کہی تھی جس سے وہ یہ گمان کرتی کہ وہ اس کی محبت میں مبتلا ہے۔ وہ تو بس یہی سمجھتی تھی کہ وہ دوستی نبھانے والا آدمی ہے اور اس کے ساتھ بھی دوستی ہی نبھا رہا ہے۔ عاشر نے تو بھی اس کا ہاتھ نہیں تھا تھا۔

”اتنی حیران کیوں ہو؟“ وہ ذرا سا مسکرایا۔

”یقین نہیں آ رہا کہ تم جیسا آدمی بھی مجھ سے محبت کر سکتا ہے۔ میں تو بہت پختہ ہوں گری ہوئی عورت ہوں۔“ آج کل اس پر ہر وقت خود ملائی کی کیفیت طاری رہتی تھی۔

”تم یہی ہو اور کیسی نہیں، میں اس پر تبصرہ نہیں کر سکتا لیکن ایک بات جانتا ہوں کہ محبت کسی انسان کے اختیار کا معاملہ نہیں۔ اللہ نے میرے دل میں تمہاری محبت ڈالی اور میں نے اس محبت کو تسلیم کر لیا لیکن اس محبت نے مجھے یہ حق نہیں دیا تھا کہ میں تمہاری زندگی کے فیصلے کرتا چنانچہ میں نے خود کو ایک دلا سا بیٹے والا دوست بنالیا۔ تم یہ شکوہ تو نہیں کرو گی نا کہ ایک دوست کی حیثیت سے میں بھی نا کام رہا؟“

”نہیں، بالکل نہیں۔ تم نے تو مجھے میری اوقات سے بڑھ کر عزت دی۔“ وہ ایک بار پھر رو پڑی تو عاشر کی گود میں موجود اس کا بیٹا بھی اسے دیکھ کر رونے لگا۔

”پلیز تم اس طرح رو کر اس معصوم کو موت دلاؤ نا۔“ بچے کو شانے سے لگا کر بہلانے کی کوشش کرتے ہوئے عاشر نے اس سے التجا کی تو اس نے تھوڑی سی کوشش سے خود کو سنبھال لیا۔ اس دوران عاشر بچے کو بھی ہلکا چکا تھا اور اپنی جیب سے ایک چاکلیٹ نکال کر اسے تھما دی تھی۔ مزے سے چاکلیٹ کھاتے ہوئے بچے کو احساس بھی نہیں تھا کہ اس کی ماں اور وہ خود کس امتحان سے دوچار ہے۔

”ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ جب میں ایک برا آدمی نہیں ہوں اور مسلمان بھی مناسب ہی ہوں تو کیا تم اپنے بیٹے کے سلسلے میں مجھ پر بھروسہ نہیں کر سکتیں۔ یہ تمہارے وجود کا حصہ ہے اور میں ساری زندگی اسے بہت احتیاط سے سنبھالوں گا۔“ عاشر کی بات نے اسے گنگ کر دیا۔ ایک

سے پہلے انہوں نے ابو سے عہد لیا تھا کہ وہ راحت کو اپنی بہو بنائیں گے۔ ابو اور پچھو کی خواہش پر ہمارا انیٹ پر ہی نکاح ہو گیا تھا۔ پچھو کے انتقال کے بعد میں پاکستان جا کر راحت کو یہاں لے آیا اور وہ میری بیٹی کی ماں ہے لیکن تمہیں یہ ساری خبریں کیسے ملتیں ہم کوئی تمہارے شوہر کی طرح مشہور و معروف تھوڑا ہی تھے۔“ ٹھیکل جاتے جاتے اسے جتا گیا کہ اپنی دنیا میں مکن ہو کر اس نے بھی اپنے پیاروں کی خبر نہیں لی۔ وہ اسے کیسے بتاتی کہ وہ جس نے بھی سوچا تھا کہ ماں باپ کو کسی صورت مٹانے کی اپنے چہرے پر کتنے والی سیانی کے ساتھ ان کا سامنا کرنے کی ہمت ہی نہیں کر سکی۔ ٹھیکل کے جانے کے بعد وہ سسک سسک کر رونے لگی۔ ایک طرف ماں باپ کے دنیا سے چلے جانے کا غم تھا تو دوسری طرف ایک ہی ملک میں رہنے والی بہن سے نڈل کتنے کی لک۔ بھروسہ ان کا چھپا اکھوتا بھائی واثق بھی تو تھا جو دنیا کے چھوڑے کھانے کے لیے اکیلہ رہ گیا تھا حالانکہ ابھی اسے ماں باپ کے سامنے اور رہنمائی کی ضرورت تھی۔ وہ اپنے بہن بھائی سے رابطہ کرنے کی کوشش بھی کرتی تو وہ اس کو نفرت سے دھککا دیتے کہ انہیں ماں باپ کے سامنے سے محروم کرنے کی قصور دار ہوتی تھی۔

”بس کرو صبا، رونے سے کچھ بھی نہیں بدلے گا۔“ آریان کو گود میں لیے عاشر اس کے سامنے آ بیٹھا۔

”میں کیا کروں عاشر، اس بچے کی وجہ سے میں سکون سے مر بھی نہیں سکتی۔ میں نہیں چاہتی کہ یہ میرے گناہوں کا تسلسل بن کر چلے۔ میں اسے سندر کپور کا بیٹا نہیں عام سا مسلمان بن کر سینا دیکھنا چاہتی ہوں۔ میں جتنے نقصان اٹھا چکی ہوں ان کے دھاوے کی میرے پاس کوئی صورت نہیں ہے لیکن آریان..... آریان کو تباہ ہوتا نہیں دیکھنا چاہتی۔“ اس کے لہجے میں زمانے بھر کا رعب تھا۔

”ایک بات پوچھوں صبا.....؟“ عاشر نے آہستہ سے اس سے دریافت کیا تو وہ سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ ”تم نے مجھے کیا انسان پایا ہے؟“

”سندر سے شادی کے بعد میں نے ایک ہی کو تو انسان پایا ہے عاشر وہ باقی تو یہاں انسان کے روپ میں بھیڑے ہیں۔“ اس نے پوری سچائی سے جواب دیا۔

”تمہارے خیال میں، میں مسلمان کیسا ہوں؟“

عاشر نے دوسرا سوال کیا۔

”مناسب ہی لگتے ہو۔ تمہاری عبادات وغیرہ کا مجھے علم نہیں لیکن میں نے تمہیں بھی شراب نوشی کرتے یا عورتوں

لوہو گیب

جب کیر سے ملے تو LOVE بوبی جاتا ہے



پتھر پھٹی، آئینہ آئیں، ملک پروٹین،
ایلو ویرا اور صلیبی، وٹامن ایس، LOVE



Care
Natural Honey
Lotion



جوہر مشائے بے رنگ، زور ڈاک سبائٹس،
دینا ہے نیک نیتیں، سنسکرتی کی پوری کیشن

کیر سے بے ترکیا

پر آکر یہ دعا ضرور مانگتا تھا۔ اس سلسلے کو جاری و ساری رکھنے میں یقیناً عاشر انور کا بہت اہم کردار تھا جس نے صباحت عرف صبا سے بالکل بے لوث اور سچی محبت کی بھی اور اب بھی آریان کو بھرپور محبت اور توجہ دے کر اس محبت کا حق ادا کر رہا تھا اس نے شادی نہیں کی تھی اور خود کو صرف اور صرف آریان کے لیے وقف کر دیا تھا۔ آریان اسے پایا کہا کرتا تھا لیکن یہ طے تھا کہ جب آریان باشعور ہو جاتا تو وہ اسے اس کے اصل باپ کے بارے میں بتا دیتا۔ سچائی بتانے کے لیے اسے سب کچھ تفصیل سے بتانا ضروری نہیں تھا جس اتنا بتانا کافی ہوتا کہ اس کی ماں نے سندر کپور سے پسند کی شادی کی تھی لیکن سندر کپور اسلام پر قائم پرندہ رہ سکا اس لیے یہ شادی ختم ہو گئی اور بعد میں سندر کی ایک حادثے میں موت کے بعد اس کی مرنی ہوئی ماں نے اسے عاشر کے حوالے کر دیا۔ صباحت کے زندگی کے اہم موڑ پر کمزور ثابت ہونے کے باوجود وہ اسے اس کے بیٹے کی نظروں میں پست نہیں کر سکتا تھا۔ ایک بیٹے کی نظر میں اس کی ماں کا کردار ہمیشہ بلندی پر رہتا تھا یہ تا کہ وہ دوسرا اٹھا کر جی سکے۔

اپنی عمر کے آخری حصے میں صباحت جس طرح گڑ گڑا کر اپنے رب کے حضور معافی مانگتی رہی تھی اس سے عاشر کو یقین ہو گیا تھا کہ رب العزت مرنے کے بعد کم از کم اسے رسوا نہیں کرے گا اور وہ اپنے بیٹے کی نظروں میں معتبر ہی رہے گی۔ اس اعتبار کو قائم کرنے کے لیے وہ فلاحی ادارہ بہت مددگار ثابت ہوتا جس کی بنیاد صباحت مرنے سے پہلے رکھ گئی تھی۔ سندر کپور کی دولت کا اس سے بکھرے مصرف کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ اس ادارے کے تحت بلائیں، رنگ اور مذہب کے امتیاز کے دھجی انسانیت کی خدمت کی جاتی تھی۔

فی الحال عاشر خود کچھ معاویین کی مدد سے اس ادارے کا انتظام دیکھتا تھا۔ بڑے ہونے کے بعد آریان نے اس کی ذمہ داری سنبھالی تھی۔ عاشر کی پوری کوشش تھی کہ آریان کو صباحت کی خواہش کے مطابق ایک ایسا اچھا مسلمان بنائے جو اپنی دینی اقدار کے ساتھ ساتھ جدید دور کے تقاضوں سے بھی ہم آہنگ ہو۔ اصل میں اسلام تو بے ہی دنیا کا سب سے جدید مذہب جہاں اخلاقیات اور علم و ہنر کی تعلیم پر سب سے زیادہ زور دیا جاتا ہے اور اپنے ساتھ ساتھ دوسروں کے بھی جیسے کے حق کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ آریان کی ایسی تربیت کرنے کے لیے عاشر کو سخت محنت کرنی پڑی تھی۔ اپنے تمام مشاغل چھوڑ کر وہ سنجیدگی سے کاروبار سنبھال چکا تھا اور کوشش کرتا تھا کہ اپنے علم میں بھی اضافہ

